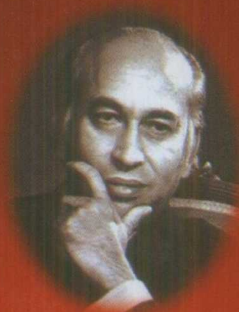


راحت بیتی

اور

بھٹو کے آخری ایام

میجر جنرل (ر) راحت لطیف

راحت بیتی اور بھٹو کے آخری ایام

راحت بیتی اور بھٹو کے آخری ایام

میجر جنرل (ر) راحت لطیف

ساگر پبلشرز
الحمد مارکیٹ 40 اردو بازار، لاہور
042-37230423
e-mail:- sagarpublishers@hotmail.com

نام کتاب	راحت بیتی اور بھٹو کے آخری ایام
مصنف	میجر جنرل (ر) راحت لطیف
ناشر	ساگر پبلشرز، لاہور
اشاعت دوم	2013ء
زیر نگرانی	محمد افضل
کمپیوٹر کوڈ	1S145
قیمت	-/800روپے
پاران	ایم ایچ پنھور انسٹیٹیوٹ آف سنڌ اسٽڊيز، ڄامشورو.

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور — فون:37221953 فیکس:37238010

9۔الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور — فون:37225085-37247350

14۔انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی — فون:021-32212011-32330411

فیکس:۔021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

Visit our website:- www.zia-ul-quran.com

انتساب

شکر گزاری اور محبت کے ساتھ تمام بقید حیات اور مرحوم رشتہ داروں کے نام جن کے ساتھ میں اپنے آبائی گھر فضل منزل میں رہتا تھا۔ میرے دادا، والدین، بھائی، بہن، چچا، چچیاں، چچا زاد بہن بھائی، جن کی شفقت، سرپرستی، مدد اور رفاقت نے میری ذات اور شخصیت کے ننھے پودے کو بچپن اور جوانی کے مختلف مراحل سے ہوتے ہوئے ایک جوان آدمی کے روپ میں ڈھال دیا اور بطور سپاہی مادر وطن کی خدمت کے لیے مسلح افواج میں شامل ہونے کے لیے تیار کیا۔

فہرست

عرض ناشر

بھٹو کیس ملک کی عدالتی تاریخ کا اہم اور مشہور مقدمہ ہے جو پاکستانی عدلیہ میں ہی نہیں عالمی سطح پر بھی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ ملک وقوم پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ یہ مقدمہ ذوالفقار علی بھٹو کے اپنے ہی دور میں ان کی پارٹی کے ایک سابق رہنما احمد رضا قصوری نے اپنے والد محمد احمد خان کے قتل کے سلسلے میں ان کے خلاف درج کرایا۔ جس کے نتیجے میں ان کو پھانسی کی سزا ہوئی اور آخر 4/اپریل 1979ء کو رات دو بجے انہیں پھانسی دے دی گئی۔

بلاشبہ بھٹو کیس ملک کی سیاسی تاریخ کا المیہ باب ہے۔ اس پر بہت کچھ لکھا گیا۔ یہ عدالتی قتل تھا یا مارشل لاء حکومت کا انتقام؟ اس پر بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے۔

زیر نظر کتاب ''راحت بیتی اور بھٹو کے آخری ایام'' بھی چند ایسے ہی حقائق کا بیان ہے جس میں اس سوال کا بہت حد تک شافی جواب ملتا ہے۔ مصنف، میجر جنرل (ر) راحت لطیف ان دنوں راولپنڈی میں سب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے فرائض سرانجام دے رہے تھے جہاں بھٹو مرحوم جیل میں قید تھے۔ وہ بہت حد تک اس مقدمے کی کارروائی کے چشم دید ہیں۔ وہ بڑی دیانتداری اور عرق ریزی سے اس مقدمے کے وہ گوشے سامنے لائے ہیں جن پر ابھی تک حالات کی گرد پڑی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس کتاب کے مطالعہ سے وہ بہت سی کہانیاں اور افسانے غلط ثابت ہو جائیں گے جو بھٹو کیس کے حوالے سے مشہور ہیں۔

بلاشبہ یہ کتاب بھٹو کیس کے حوالے سے تاریخی دستاویز ثابت ہوگی جو ملک کی تاریخ ساز شخصیت کی زندگی کے المیہ باب کا احاطہ کرتی ہے نیز اس کتاب میں جنرل صاحب نے اپنی آپ بیتی بھی بیان کی ہے۔ اپنی زندگی کے کئی گوشوں سے پردہ اٹھایا ہے اور اپنے تجربات کا ذکر کیا ہے جن میں یقیناً ہمارے لیے بھی رہنمائی موجود ہے۔

امید ہے آپ کو ہماری یہ تازہ کاوش پسند آئے گی۔ اللہ تعالیٰ سب کا حامی و ناصر ہو۔

ساگر پبلشرز، لاہور

تعارف مصنف

جنرل راحت کو 18 ستمبر 1954ء کو 5/13 فرنٹیئر فورس رائفلز میں (جواب 10 فرنٹیئر فورس کے نام سے جانی جاتی ہے) کمیشن ملا۔ انہوں نے راج شاہی یونیورسٹی بنگلہ دیش سے بی اے کیا اور وار سٹڈیز (جنگی مطالعہ) میں قائداعظم یونیورسٹی سے ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے بھارت کے خلاف 1965ء اور 1971ء کی جنگوں میں بھر پور طور پر حصہ لیا اور اعزازات حاصل کیے۔ مزید برآں انہوں نے اپنی اعلیٰ خدمات کی وجہ سے ہلالِ امتیاز (ملٹری) کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ وہ 10 ایف ایف کے اعزازی کرنل بھی رہے، جس کی انہوں نے بھارت کے خلاف 1971ء کی جنگ میں قیادت کی تھی۔

انہوں نے سرکاری وفود کے ساتھ بیشتر مما لک کے دورے کیے۔ ان کی مختلف سطحوں پر کمانڈ، سٹاف اور بطور معلم تقرریاں ہوئیں۔ ساڑھے تین سال تک ڈگری سطح کے ادارے پاکستان ملٹری اکیڈمی کے کمانڈنٹ اور وائس چانسلر رہے۔ ان کی آخری تقرری جی۔ ایچ۔ کیو میں نیشنل گارڈز کے ڈائریکٹر جنرل کے طور پر تھی۔

اپنی ملازمت کے دوران جنرل راحت نے مارشل لاء حکومت میں دو دور گزارے۔ ایک دفعہ سب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر راولپنڈی جب ذوالفقار علی بھٹو ڈسٹرکٹ جیل میں محصور تھے اور سپریم کورٹ پاکستان میں ہائی کورٹ کی جانب سے سزائے موت کے خلاف اپنی درخواست کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے، دوسری دفعہ دو سال کے لیے ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سرگودھا ڈویژن رہے۔

وہ بہت اچھے کھلاڑی ہیں اور مہم جوئی کو پسند کرتے ہیں۔ وہ فوج کے رسائل میں بطور آزاد صحافی لکھتے ہیں۔

اعتراف

کتاب لکھنا کوئی آسان کام نہیں اور ایسی کتاب لکھنا جو کہ واقعات کی یادداشتوں پر مبنی ہو، میرے لیے بہت بڑی آزمائش تھی۔ جب بازار میں ایسے مصنفین کی کتابیں آنا شروع ہوئیں جو جناب بھٹو کے آخری دنوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے تو جنرل غلام محمد نے مجھے اس بارے میں کچھ لکھنے پر اصرار کیا۔ اپنے ٹھوس لہجے میں وہ پرعزم لگ رہے تھے جب انہوں نے کہا ''جو کچھ حقیقت میں واقع ہوا اگر تم نے بیان نہ کیا تو تاریخ دان تمہیں معاف نہیں کریں گے''۔ میں نے ان کی بات مان لی۔ برسوں پر محیط بکھری ہوئی یادداشتوں کو یکجا کرنے میں ڈھائی برس لگ گئے۔ کام بہت مشکل تھا مگر تحریک دلانے والی قوتیں زیادہ مؤثر تھیں اور اس کے لیے میں جی ایم کا خصوصی طور پر ممنون ہوں۔

تحریری ریکارڈ موجود نہ ہونے کی وجہ سے مجھے زیادہ تر اپنے حافظے، واقعات کی یادداشتوں اور اپنے ساتھیوں پر انحصار کرنا پڑا۔ مجھے جناب سعید مہدی اور جناب جہانزیب برکی دونوں کے ساتھ بہت سی ملاقاتیں کرنا پڑیں۔ دونوں نے ہمیشہ کھلے دل سے میرے ساتھ تعاون کیا۔ اس خلوصِ دل سے تعاون کرنے پر میں ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔

میری توجہ زیادہ تر جیل کے باہر امن و امان قائم رکھنے اور جناب بھٹو کو کسی بھی بیرونی خطرے کی صورت میں حفاظتی انتظامات سخت کرنے پر تھی۔ جیل میں کیا ہوتا تھا یہ سپرنٹنڈنٹ جیل اور اس کے عملے کی ذمہ داری تھی۔ لہٰذا جیل کے اندر ہونے والی تمام سرگرمیوں کی معلومات جاننا صرف اس وقت ممکن تھا جب یہ سب مجھے بتائی جاتیں۔ ان سب معلومات کے لیے میں سپرنٹنڈنٹ جیل جناب یار محمد، اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جیل جناب مجید قریشی اور میڈیکل آفیسر جناب ڈاکٹر اصغر کی مدد حاصل کرتا تھا۔ جب کبھی بھی میں نے ان سے درخواست کی تو انہوں نے خوش دلی کے ساتھ

میرے لیے اپنا وقت نکالا۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ اس کتاب کی ترتیب واشاعت میں بھی میرے ساتھ شریک رہے۔ میں ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں، خاص طور پر جناب یار محمد کا جنہوں نے جیل میں انتہائی سخت دفتری مصروفیات اور دل کی بیماری کے باوجود دل و جان سے میری معاونت کی۔

کتاب کے اردو ترجمے میں خصوصی کاوش پروفیسر محمد سعید (مرحوم) کی ہے وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے لیکن جس طرح انہوں نے اس کتاب کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ اس کے علاوہ میں محمد نوید مرزا کا بھی مشکور ہوں کہ جنہوں نے اس کتاب کو مرتب کرنے، پروف پڑھنے اور اس کے مختلف ابواب کے کچھ حصے ترجمہ کرنے میں خاص طور پر معاونت فرمائی۔ اس کے علاوہ میرے عزیز دوست کرنل ولی، ڈاکٹر حسن مدنی اور ڈاکٹر ظفر راجہ صاحب نے بھی کتاب کے مسودے کو پڑھنے میں میری رہنمائی کی۔ میں ان کا بھی بہت بہت شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔

عرض مصنف

یہ میرے لیے اعزاز کی بات رہی ہے کہ میں نے اپنے ملک کے بہت سے تاریخی اور اہمیت کے حامل ولولہ انگیز واقعات میں شرکت کی۔ اس وجہ سے میں نے ان چیزوں کے بارے میں لکھنے کا فیصلہ کیا، جو میرے ذاتی تجربے میں آئیں یا جو مجھ سے وابستہ تھیں۔ تاریخ لازمی طور پر انہی یادوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس کے لیے ہمارے پاس بہت زیادہ سمجھنے کی صلاحیت اور نظر ہونی چاہیے۔ یہ ضروری ہے کہ ہم جو کچھ جانتے ہیں اسے محفوظ کر لیا جائے۔ حقیقتاً میں نے صرف چند الگ الگ واقعات کے بارے میں لکھنے کا سوچا تھا لیکن جیسے جیسے میں آگے بڑھتا گیا تو مجھ پر یہ واضح ہوا کہ اس میں زیادہ جامع تفصیلات شامل کرنا بہتر رہے گا تا کہ قاری مصنف کے ادراک کی گہرائی کا اندازہ لگانے کے قابل ہو سکے۔

میں اپنی عملی ملازمت سے 31 جنوری 1989ء کو ریٹائر ہوا۔ اس کے بعد ہی مجھے اپنی پیشہ ورانہ فوجی زندگی اور ان تاریخی واقعات کو جن پر یہ زندگی مبنی تھی، کو مڑ کر دیکھنے کا موقع ملا۔ اب جب کہ میں وردی میں نہیں ہوں، تو میرے لیے یہ ممکن ہے کہ میں اپریل 1952ء میں فوج سے منسلک ہونے کے بعد سے لے کر اب تک جو کچھ بھی دیکھا اس کی ترجمانی کروں۔

میں نے اپنی زندگی کے واقعات حقیقت پسندی سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان خاص واقعات کی اہمیت کے پیش نظر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ بجائے اس کے کہ اپنی رائے اور تجزیے کا اظہار کیا جائے، مجھے یہ کوشش کرنی چاہیے کہ میں ان واقعات کو درحقیقت جو ہوا اسی طرح بیان کروں۔ کیونکہ محض قیاس آرائیاں فائدہ مند کم ہوتی ہیں اور نقصان زیادہ پہنچاتی ہیں۔ جو زندگی میں نے گزاری اس میں دکھ اور پریشانیوں کا ایک حصہ ہے لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو میں خاصا خوش قسمت رہا ہوں۔ اس کے لیے میں خدا کا بہت زیادہ شکر گزار ہوں۔ میں سختی سے اس بات کا قائل ہوں کہ ہمیں دنیا میں جس قدر ممکن ہو سکے خوشیاں اور مسرتیں لانے کی کوشش کرنی چاہئے۔

ایک اچھے سپاہی کا معیار یہ ہے کہ آیا اس نے محض اپنے فرائض ادا کیے یا اچھے طریقے سے

انہیں انجام دیا۔ ایک اچھے انسان ہونے کا معیار یہ بھی ہے کہ آیا اس نے زندگی عزت، ایمانداری اور اپنے ساتھیوں کی خدمت کے احساس کے ساتھ گزاری اور اگر اس کے ساتھ ہی وہ زندگی میں راحت اور خوشیاں پہنچانے کے بھی قابل ہو جائے تو یہ اور بھی زیادہ اچھا ہے۔

فوج کا صحیح کردار یہ ہے کہ وہ لوگوں کی مدد کرے۔ تحفظ کے احساس اور ضروری حفاظت کو مہیا کرنے کو ممکن بنائے۔ اس کے بعد عام سماجی شعبے پر منحصر ہے کہ وہ لوگوں کے لیے انصاف اور خوشحالی کے حصول کے قیام کی نگرانی کرے۔ پاکستانی فوج میں میرا کردار یہ رہا ہے کہ میں نے یہ کوشش کی کہ بنیادی مقصد سے میری نظر نہ ہٹے۔ ایسا ہمیشہ آسان نہیں رہا کیونکہ پاکستان غربت، جاگیرداری نظام، جہالت اور قانون کے احترام کی کمی کا شکار رہا ہے۔

کسی حکومت کا بنیادی کام امن وامان کی صورت حال قائم رکھنا اور لوگوں کو انصاف فراہم کرنا ہے۔ جب ایسی صورت قائم نہیں رہتی تو لوگ تبدیلی کی خواہش کرنے لگتے ہیں۔ بدقسمتی سے پاکستان میں عام طور پر تبدیلی سے مراد مفاد اور اثر ورسوخ کی وہی پرانی روایات اور آئین کے نفاذ میں مداخلت ہے۔ آخر میں مارشل لاء وہ تدارک نہ کرسکا جس کی خواہش کی گئی تھی۔ ہم میں سے وہ لوگ جنہوں نے مخلصانہ طور پر انصاف کے نفاذ کی کوشش کی، ان کے لیے رکاوٹ پیدا کی گئی اور انہیں ایسا کرنے سے روکا گیا۔ لہٰذا یہ سوال بار بار ذہن میں اٹھتا رہا کہ مارشل لاء نافذ کرنے کا مقصد کیا ہے؟

پاکستان کا مسئلہ یہ ہے کہ یہاں جمہوریت نہ ہی پھل پھول سکتی ہے اور نہ ہی مؤثر ہوسکتی ہے کیونکہ یہاں زیادہ تر لوگ جاہل اور غیر تعلیم یافتہ ہیں۔ یہاں تک کہ لوگ یہ بھی نہیں جانتے کہ ان کے حقوق کیا ہیں اور نہ ہی ان کے منتخب نمائندے جانتے ہیں کہ ایک جمہوری طرز کی حکومت کو کس طرح کا کام کرنا چاہیے۔ لہٰذا لوگ اپنے ان جاگیرداروں اور طاقت ور حاکموں کا شکار بنے رہتے ہیں جنہیں حسب سابق حالات کی تبدیلی میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ صرف تعلیم ہی ایسا طریقہ عمل ہے جو معجزے کا باعث بن سکتا ہے۔

اصل میں کوئی بھی ادارہ اپنی قیادت کے کردار کا آئینہ دار ہوتا ہے جس کا طرز عمل اور لہجہ بلند رکھا جاتا ہے۔ اس کی مثالیں دنیا میں کئی جگہوں پر دی جاسکتی ہیں۔ اگر رہنما مخلصانہ طور پر ایماندارانہ خدمت کے تصورات پر یقین رکھے اور ان پر عمل کرے تو اس کے عقائد بتدریج اس سے نیچے کام کرنے والوں کو متاثر کریں گے اور تنظیم پھلے پھولے گی۔ کوئی شخص کسی صحیح شخصی مرکزیت والے معاشرے کو محض وقت گزاری کی بنیاد پر قائم نہیں کرسکتا۔ یہ ضروری ہے کہ منتخب

رہنما اور نمائندے ملک اور اس کے عوام کے ساتھ مخلصانہ وفاداری کی بنیاد پر چنے جائیں۔ اس طرح کی وفاداری وہ ضروری رشتہ عمل مہیا کرسکتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ مخالف جماعتوں کو بھی مل جل کر کام کرنے اور پاکستان کو درپیش نا قابل حل مسائل سے نبرد آزما ہونے کا موقع مہیا کرسکتی ہے۔

حد سے زیادہ خود غرضی اور عام شائستگی کی کمی کی وجہ سے، پاکستان بہتان اور افواہ طرازی کی زد میں ہے۔کردار کشی روزانہ کا معمول بن گیا ہے۔کسی حقیقت کو جانے بغیر، لوگ لاپرواہی یا نقصان پہنچانے کی نیت سے ایک دوسرے پر الزام لگاتے ہیں۔ ایک دوسرے پر دھوکہ دہی، غداری اور یہاں تک کہ قتل کا کسی بھی صورت میں الزام لگانا عام بات ہے۔لہٰذا حقیقت کو جھوٹ سے علیحدہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر ہم اونچی سطح کی تہذیب یافتہ قوم کا درجہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس طرح کا نامعقول رویہ ختم کرنا ہوگا۔

میں اپنے پیشہ وارانہ کیریئر میں بہت جوش اور ولولے کے ساتھ داخل ہوا تھا تا کہ میں اپنے اس نئے ملک کی حفاظت کے لیے جو کچھ ممکن ہو کرسکوں۔ دوسری کئی نسلوں کی طرح میں قائداعظم محمد علی جناح کی زیر قیادت قائم ہونے والی مسلم لیگ کی تحریک سے متاثر رہا تھا۔ قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کے خواب میرے دل میں بستے تھے۔ سالہا سال تک بہت سی مشکلات کے باوجود میں ہمیشہ پاکستان کے تصور کے ساتھ وابستہ رہا اور چاہتا رہا کہ اس خواب کو حقیقت میں تبدیل کردوں۔

میں نے نہ صرف ایک اچھا سپاہی بلکہ ایک اچھا انسان بننے کی بھی کوشش کی تھی۔آخر میں اس کا فیصلہ خدائے ذوالجلال ورحیم وکریم پر ہے کہ میں اچھے طریقے سے اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوا یا نہیں۔ اس زمین پر خالق حقیقی ہم میں سے ہر ایک کو مخصوص وقت دیتا ہے۔ ہماری موت کا وقت خدا کی طرف سے متعین ہے لیکن ہماری زندگی کے اعمال ہمارے اپنے ہاتھ میں ہیں۔اس نے ہمیں ضروری سہولیات مہیا کی ہیں۔ یہ اب ہم پر منحصر ہے کہ زندگی اپنی بہترین صلاحیت کے ساتھ بسر کریں۔ میں یہ اطمینان رکھتا ہوں کہ جب میں خدائے بزرگ و برتر کے سامنے کھڑا ہوتا ہوں تو میں یہ بات بہت عاجزانہ کہتا ہوں کہ اپنی تمام انسانی صلاحیتوں اور کمزوریوں کے ساتھ اپنی پسندیدہ شے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

اس نے ہمیں ضروری وسائل سے نوازا ہے۔ یہ ہم میں سے ہر ایک پر منحصر ہے کہ ہم اپنی زندگیوں کو اپنی بہترین اہلیت کے مطابق گزاریں۔ مجھے اس بات کا اطمینان ہے کہ جب میں اپنے خالق حقیقی کے سامنے حاضر ہوں گا تو عاجزی کے ساتھ عرض کرسکوں گا کہ میں نے اپنی تمام تر انسانی صلاحیتوں اور کمزوریوں کے ساتھ اپنی طرف سے پوری کوشش کی۔

خاندانی پس منظر

میرا تعلق سیالکوٹ کے ایک درس و تدریس سے وابستہ خاندان سے ہے۔ میرے آبا و اجداد سری نگر کشمیر میں واقع بٹمالو کے رہنے والے تھے۔ یہ اٹھارویں صدی کی بات ہے جب وہ بہتر طرزِ زندگی کی تلاش میں ہجرت کر کے سیالکوٹ آئے تھے۔ وہ شخصیت جو ہمارے خاندان کے لیے معاشی طور پر خوشحالی لائی، میرے پڑدادا فضل دین تھے۔ ان کے تعمیرات کے کاروبار نے انہیں زمینی جائیداد کی شکل میں اپنے اثاثوں کو محفوظ کرنے کے قابل بنایا۔ بطور ایک دور اندیش انسان کے وہ اس بات کے قائل تھے کہ بہتر طرزِ زندگی کا حصول بچوں کو تعلیم دلوائے بغیر ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا انہوں نے اپنی توجہ اکلوتے بیٹے عبدالعزیز کو بہتر تعلیم دلوانے پر مرکوز کر دی۔

1884ء میں میرے دادا عبدالعزیز کلکتہ یونیورسٹی کے ابتدائی میٹرک پاس لوگوں میں سے ایک قرار پائے۔ اس وقت سیالکوٹ اور کلکتہ کے درمیان کوئی یونیورسٹی موجود نہیں تھی۔ انہوں نے تعلیم کو بطور پیشہ اپنا لیا اور برطانوی فوجی افسروں کو مشرقی زبانوں کی تعلیم دی۔

ان دنوں ہندو تمام میدانوں پر غالب تھے اور زیادہ تر بڑے عہدوں پر وہی فائز تھے۔ جب کہ مسلمان کم آمدنی والے کارندوں کے زمرے میں آتے تھے۔ حالانکہ وہ اپنے کاروبار میں مہارت اور اعلیٰ پیشہ وارانہ صلاحیتیں بھی رکھتے تھے اس لیے پڑھے لکھے مسلمانوں کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔ جب 1947ء میں ہندو مسلم فسادات ہوئے تو سیالکوٹ میں میرے دادا کی شخصیت نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آئی اور وہ امن کمیٹی کے بلا مقابلہ صدر منتخب ہوئے جبکہ ایک مشہور ہندو رہنما ڈاکٹر کشن چند سیکرٹری منتخب ہوئے۔ کمیٹی مختلف نسلوں اور مذہبی طبقوں سے وابستہ شہریوں پر مشتمل تھی۔ جناب عبدالعزیز ایک پکے باعمل مسلمان تھے، جنہوں نے اپنے پوتے پوتیوں کی قرآن پاک کی تعلیم اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ میں نے ایسا کوئی شخص نہیں دیکھا جو خدا سے اتنا ڈرتا ہو جتنا میرے دادا ڈرتے تھے۔ یہ ان کی محبت و شفقت کے ساتھ ساتھ مضبوط شخصیت کی وجہ سے

تھا کہ ہم بطور مشترکہ خاندان ان کے زیر سایہ اپنے 57 کمروں پر مشتمل آبائی گھر فضل منزل میں رہے۔ یہاں تک کہ ان کی وفات کے بعد بھی رہتے رہے۔

عام طور پر ہمارے خاندان میں تین پیشے نمایاں ہیں جن میں سول سروسز (شہری ملازمت) آرمڈ سروسز (فوج کی ملازمت) اور ایجوکیشن (تعلیم) شامل ہیں۔ میرے سب سے بڑے تایا خواجہ برکت علی ہر معیار کے اعتبار سے انتہائی ذہین آدمی تھے۔ وہ 1906ء میں بلاواسطہ ڈاک کے سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے سول سروس سے وابستہ ہوئے اور برطانوی حکومت کے دوران 1940ء میں بمبئی میں پریذیڈینسی کے پوسٹ ماسٹر جنرل کے طور پر ریٹائر ہوئے۔

انگریزوں نے انہیں خان بہادر کے لقب سے نوازا تھا۔ ان کے بڑے بیٹے خواجہ صفدر علی نے یونیورسٹی کالج لندن سے علم تاریخ میں آنرز کی ڈگری لی اور ڈبلن یونیورسٹی سے تعلیم میں ایک ڈپلومہ حاصل کیا۔ خواجہ صفدر کا بیٹا فواد یکم نومبر 1940ء کو پیدا ہوا۔ اس طرح ہمارے دادا جان کا پہلا عظیم پوتا ان کی زندگی میں ہی پیدا ہوا۔ فواد نے واشنگٹن سٹیٹ یونیورسٹی سے 1965ء میں تعمیرات میں بی ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ فواد کی والدہ لاہور کی ایک مشہور کشمیری فیملی سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ میاں کریم بخش کی پوتی اور میاں امیر الدین کی بہن ہیں، جو انجمن حمایت اسلام کے بانیوں میں سے تھے۔(1)

میرے دوسرے تایا کا تعلق درس و تدریس میں ایک استاد کی حیثیت سے تھا۔ اس زمرے میں انہوں نے افریقہ میں بھی پڑھایا۔ ان کے سب سے بڑے بیٹے خواجہ شوکت علی تھے۔ جن کا تعلق Journalism کے پیشے سے تھا۔ وہ ایک مشہور Journalist تھے اور اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کی آخری پیشہ وارانہ ذمہ داری بطور مینجنگ ایڈیٹر، جمہور اخبار سے تھی۔ ان کے دوسرے بیٹے خواجہ شفقت علی نے پاکستان ریلوے اکاؤنٹس سروسز میں مقابلے کے امتحان کے ذریعے ملازمت اختیار کی۔ وہ بطور ممبر فنانس ریلوے بورڈ ریٹائر ہوئے۔ ان کے تیسرے بیٹے خواجہ امتیاز علی بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی سے وائس چانسلر کے عہدے پر ریٹائر ہوئے۔

میرے تیسرے چچا خواجہ عبدالمجید نے محکمہ ڈاک میں ملازمت کی اور بطور انسپکٹر پوسٹ آفسز ریٹائر ہوئے۔

میرے والد خواجہ عبداللطیف نے معاشیات (Economics) میں ایم اے کی ڈگری

1۔ یاد ایام صفحہ نمبر 8 از میاں امیر الدین (اردو زبان میں)

مشہور و معروف علی گڑھ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ اسی یونیورسٹی سے انہوں نے قانون (LLB) کی ڈگری بھی حاصل کی۔ ان کا شمار سیالکوٹ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص میں تھا۔ وہ سیالکوٹ میں مقیم مسلمانوں کے لیے ایک ایسے شخص سمجھے جاتے جو غیر مسلم لوگوں کا صحیح ڈٹ کر مقابلہ کسی بھی دائرہ کار میں کرنے کے حامل تھے۔ میرے دادا کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا انڈین سول سروس میں شامل ہو۔ چنانچہ انہیں مقابلے کے امتحان کے لیے دلی لے جانے کا پروگرام بنایا۔ راستے میں لاہور میں وہ ایک رات کے لیے جناب علامہ اقبال (شاعر مشرق) کے پاس رکے وہ میرے دادا کے عزیز دوست تھے، بات چیت کے دوران میرے دادا نے دلی جانے کا مقصد بیان کیا۔ ڈاکٹر اقبال نہ مانے اور کہا ''عزیز کیا تم اپنے سپوت کو انگریزوں کا غلام بنانا چاہتے ہو''۔ اس نے قانون کی ڈگری حاصل کی ہوئی ہے۔ اسے وکالت کرنی چاہیے'' میرے دادا ڈاکٹر علامہ اقبال کی بہت عزت کرتے تھے۔ اس لیے اگلے روز سیالکوٹ واپس چلے آئے اور میرے والد کو 20 سال کی عمر میں وکالت قائم کرنے میں مدد کی اور ساتھ ساتھ انہیں سیاست میں حصہ لینے کی تلقین بھی کی۔

میرے والد 20 سال کی عمر میں سیالکوٹ کے میونسپل کمشنر کے عہدے کے لیے الیکشن میں کامیاب ہوئے۔ چنانچہ وہ پنجاب میں سب سے کم عمر میونسپل کمشنر تھے۔ وہ تقریباً 50 سال تک سیالکوٹ میونسپلٹی میں بحیثیت پریذیڈنٹ یا ایگزیکٹو آفیسر بخوبی ڈیوٹی سرانجام دیتے رہے۔ 1935ء میں سخت معاشی بحران کی وجہ سے انہیں اپنی وکالت ترک کرنا پڑی اور مرے کالج سیالکوٹ میں بطور اکنامکس کے پروفیسر کے کام کرنا شروع کر دیا۔ 1947ء میں ہندوستان کی تقسیم کے بعد کالج میں ایم اے اکنامکس کی کلاسز کا اجراء ہوا اور ان کو ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ مقرر کر دیا گیا۔

میرے تین بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ بھائیوں میں، سب سے بڑا میں ہوں۔ میرے بعد وجاہت لطیف ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے سائیکالوجی کے بعد CSS کا امتحان دیا اور پولیس سروسز آف پاکستان میں چناؤ ہوا وہ گریڈ 22 میں ایک سینئر پولیس آفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ان کے بڑے بیٹے افضل لطیف نے پالیمر سائنسز میں لندن یونیورسٹی سے BSc کی ڈگری حاصل کی اور Superior Services کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور بطور ڈی ایم جی آفیسر ملازمت میں مصروف ہے۔

میرے دو چھوٹے جڑواں بھائی سجاد اور شجاعت ہیں۔ سجاد لطیف نے ایم اے پولیٹیکل سائنس پنجاب یونیورسٹی سے کرنے کے بعد LLB کی ڈگری لاء کالج لاہور سے حاصل کی۔ Superior Services کے امتحان میں اس کا چناؤ Secretariat Service میں ہوا۔ وہ Ministry

of Economic Affairs میں ڈپٹی سیکرٹری کے عہدے پر کام کر رہا تھا، کہ اس اس کو تین سال کے لیے 3دسمبر 1990ء کو ڈیپوٹیشن پر تہران بحیثیت ڈائریکٹر Economic Co-operative Organisation (ECO) بھیج دیا گیا۔ 4دسمبر 1990ء کو آدھی رات کے کچھ دیر بعد اسے شدید دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ (اناللہ وانا الیہ راجعون)

دوسرے جڑواں بھائی شجاعت لطیف نے پاکستان آرمی میں شمولیت حاصل کی۔ 1971ء کی ہندو پاک جنگ کے دوران مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) میں حصہ لیا۔ نوے ہزار جنگی قیدیوں کے ساتھ وہ بھی اسیر ہوا۔ قید کے دوران جب اسے چند قیدیوں کے ہمراہ آگرہ سے رانچی کیمپ لے جایا جا رہا تھا تو اس نے دوران سفر چلتی ریل گاڑی سے چھلانگ لگا کر بھاگنے کی دلیرانہ کوشش کی۔

پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں بحیثیت استاد پوسٹنگ کے دوران نتھیا گلی اپنے کیڈیٹس کو لے جاتے ہوئے بس ایک گہری کھائی میں گر گئی جس سے بہت سارے مسافر مارے گئے۔ شجاعت بچ تو گیا لیکن اسے نہایت Serious زخم آئے وہ Lt-col کے عہدہ سے ریٹائر ہوا۔

میری بڑی بہن زرینہ کی شادی ہمارے تایا زاد بھائی خواجہ شفقت علی سے ہوئی۔ وہ ممبر فنانس ریلوے بورڈ کے عہدے پر ریٹائر ہوئے۔ میری چھوٹی بہن فریدہ کی شادی ارشد قریشی سے ہوئی جو میجر جنرل کے رینک پر ریٹائر ہوئے۔ میری دونوں بہنیں ہنسی خوشی اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں۔

میری والدہ کا تعلق وزیر آباد کی ایک کشمیری فیملی سے تھا۔ ان کے آباؤاجداد نے شپیاں جو سری نگر میں ایک گاؤں ہے سے ہجرت کی۔ ان کے والد عبدالکریم اپنے زمانے کے ایک مشہوری لکڑی کا کاروبار کرنے والے شخص سمجھے جاتے تھے۔ کشمیر میں وہ جنگل خریدتے۔ ان کو کاٹ کے دریائے چناب میں بہا دیا جاتا اور وزیر آباد میں لکڑی کو دریا سے نکال کر مارکیٹ میں بیچا جاتا۔

میری والدہ خدا سے ڈرنے والی خاتون تھیں انہوں نے آئے ہوئے کسی ضرورت مند شخص کو مایوس نہیں کیا۔ وہ ہر روز صبح سویرے نماز اور تلاوت قرآن کے لیے اٹھتیں۔ انہوں نے اپنی زندگی اپنے بچوں کے لیے وقف کر دی ہوئی تھی اور ان کو خدا کی طرف سے دیئے گئے عطیہ کے طور پر سمجھتیں۔ ان کا انتقال میری بانہوں میں 1980ء میں ہوا تب سے میں عدم تحفظ کا شکار ہو گیا ہوا ہوں کیونکہ ان کی دعاؤں کی بدولت خدا نے مجھے ہر قسم کی تکلیف سے محفوظ رکھا ہوا تھا۔ وہ ایک عقلمند اور دور اندیش خاتون تھیں اور وہ اپنے اور اپنے سسرالی خاندان میں عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتیں۔

یہ مختصراً میرا فیملی کا پس منظر ہے۔ ہمارے خاندان کی اگلی نسل ماشاء اللہ اچھے عہدوں پر گامزن ہے یہاں ان کا ذکر کرنا میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ ایسی فیملی جو علم اور محب وطن پاکستانی مسلم کی خصوصیات کے زیور سے آراستہ ہے۔ انہوں نے مجھے اپنے ملک کی خدمت کرنی سکھائی۔ ایک مقابلے کا جذبہ جس سے میں اپنی خاندانی روایات کو برقرار رکھ سکوں۔ میری اپنی تعلیم نے میری مدد کی جس سے کارگزاری میں مزید بہتری آئی۔ چنانچہ میں نے پاکستان آرمی جیسے عظیم ادارے میں شمولیت حاصل کی۔

یونیفارم میں تبدیلی

یہ تین اپریل 1952ء کی بات ہے جب میں ایک طویل سفر پر روانہ ہوا جس نے مجھے سخت نظم وضبط کے تحت 37 برس تک وردی میں اپنے ملک کی خدمت کے قابل بنایا۔ میں جوائنٹ سروسز پری کیڈٹ سکول (JSPCTS) کے ساتھ 7th کورس سے منسلک ہونے کے لیے گھر سے کوئٹہ بذریعہ ٹرین روانہ ہوا۔ میرے احساسات ملے جلے تھے جب میں نے اپنے والدین، بہن بھائیوں کو الوداع کہا کیونکہ میں پہلے کبھی ان سے جدا نہیں ہوا تھا۔ فضل منزل میں میرے لیے مشترکہ خاندانی نظام میں رہنے کی مسرتوں کا سلسلہ اختتام کو پہنچ چکا تھا۔ میں اب فوج کو سنجیدگی سے بطور پیشے کے اختیار کرنے کے لیے ہر لحہ تیار تھا۔

جوائنٹ سروس پری کیڈٹ سکول سی ایم ایچ کی بیرکوں کے ایک حصے میں چل رہا تھا۔ ہسپتال کے وارڈ فوجی کیڈٹوں کے لیے سونے کے کمروں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ کیڈٹوں کے سکون سے رہنے کے لیے کمروں کو سینٹرل ہیٹنگ سسٹم سے مکمل طور پر گرم رکھا جاتا تھا۔ یہ سسٹم بھاپ سے چلتا تھا۔ ایک بوائیلر پائپوں کے ایک بڑے سے جال کے ذریعے سے کمروں میں لگے ہوئے ریڈی ایٹر کو بھاپ پہنچاتا تھا۔ یہ نظام مکمل طور پر مؤثر تھا اور غیر تقسیم شدہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے دنوں سے کام کر رہا تھا۔ میرے لیے یہ ایک انوکھا تجربہ تھا۔

کیڈٹوں کی تربیت اور انتظامی امور کی انجام دہی کے لیے جے ایس پی سی ٹی ایس کو مشرقی حصے اور مغربی حصے جو تین پلاٹونوں پر مشتمل تھے، میں تقسیم کر دیا گیا تھا (بعد کے برسوں میں ان حصوں کی جگہ چار ہاؤسز نے لے لی جو بولان، گومل، خیبر اور ٹوچی تھے)۔ پلاٹونوں کا تعین نمبروں کے حساب سے کیا گیا تھا۔ مغربی حصے میں ایک دو تین اور مشرقی حصے میں چار پانچ چھ۔ میں پانچ نمبر کی پلاٹون میں تھا۔ ہماری تربیت کے دوران اس بات پر زور دیا جاتا کہ کیڈٹ فوجی زندگی اپنائیں اور ایسے طریقوں پر توجہ دی جائے جو کیڈٹوں کو معمول کی زندگی سے سنجیدہ منظم زندگی گزارنے میں

مددگار ثابت ہو سکیں۔ یہ سکول میں گزرا ہوا قدرے مشکل لیکن دلچسپ دور تھا۔ اکثر مجھے گھر کی یاد ستاتی لیکن فوج میں کمیشن حاصل کرنے کا میرا مقصد اتنا مضبوط محرک تھا جو میرے ارادے کو بدلنے نہ دیتا تھا۔

ہمارے اساتذہ انسانی زندگی کے ان پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کرتے تھے جن کا ہمارے لیے سیکھنا ضروری تھا اور جن کے باعث ہم فوج میں باعزت فوجی ساتھیوں کے طور پر رہ سکتے تھے۔ وہ ہمیں مظاہروں اور ذاتی مثالوں کے ذریعے سے بنیادی اطوار اور آداب مجلس سکھاتے۔ ہمیں یہاں تک سکھایا جاتا کہ کس طرح سے منظم فوجی دستے کے طور پر متحد ہو کر سائیکل سواری کی جاتی ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میس میں ہمارے لیے دستر خوان کے آداب کے بارے میں ایک مظاہرہ کیا گیا۔ اس کے دو حصے تھے۔ پہلے میں دکھایا گیا کہ کس طرح لوگوں کا ایک بدتہذیب گروپ ڈائننگ ہال میں بیروں سے کھانے کی مختلف چیزیں چھین کر ایک برا منظر پیش کرتا ہے۔ انہیں چلاتے ہوئے بری زبان بھی استعمال کرتے ہوئے دکھایا گیا۔ جیسے منڈی میں مچھلی فروخت کی جاتی ہے۔ سارا منظر بہت کراہت آمیز تھا۔ دوسرے حصے میں اچھے اطوار اور آداب مجلس کا صحیح عکس دکھایا گیا۔ مظاہرے کا یہ حصہ کیڈٹوں کے مقررہ وقت پر داخلی کمرے میں پہنچنے اور بامقصد گفتگو کے لیے چھوٹے گروپوں کی شکل میں مہمان خصوصی کے پاس پہنچنے سے شروع ہوا جب بٹلر نے مہمان خصوصی کو اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے تمام کیڈٹ خاموشی سے کھانے کے ہال کی طرف چل پڑے اور اپنی کرسیوں کے پیچھے تب تک کھڑے رہے جب تک کہ مہمان خصوصی اپنی سیٹ پر براجمان نہیں ہو گئے۔ کیڈٹ صرف ان ساتھیوں سے آہستگی سے گفتگو کرتے جو ان کے بالکل دائیں اور بائیں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہر کیڈٹ اس وقت تک انتظار کرتا جب تک کہ کھانا اس کے سامنے پیش نہ کیا جاتا اور وہ باقی لوگوں کے لیے زیادہ سے زیادہ کھانا چھوڑتے ہوئے اس میں سے اپنا حصہ لیتا۔ ہم نے مظاہرے کے مقصد کو بہت سراہا کیونکہ ہم سب مختلف خاندانی پس منظر سے تعلق رکھتے تھے۔ تقریباً چھ ماہ بعد پڑھائی اور پریکٹیکل ٹریننگ اختتام کو پہنچی۔ میں اپنی ٹریننگ کے کامیابی سے ختم ہونے پر بہت خوش تھا۔ تقسیم اسناد کی تقریب ایک پریڈ کی شکل میں ہوئی جس کا معائنہ نیوی کے چیف ایڈمرل چوہدری نے کیا۔ یہ ایک شاندار شو تھا۔

رخصتی کا وقت قریب آ گیا تھا۔ ہمارے کمانڈنٹ لیفٹیننٹ کرنل عابد بلگرامی (بعد ازاں میجر جنرل) اور اساتذہ نے تینوں سروسز کے کیڈٹس کو الوداع کہا۔ انٹر سروسز اتحاد کی مضبوط بنیاد رکھی جا چکی تھی۔ یہ اب ہم پر منحصر تھا کہ ہم اس کی بہتری کی رفتار کو کیسے قائم رکھتے ہیں۔ بھرپور جذبے کے

ساتھ ہم آرمی کیڈٹس نے پاکستان ایئر فورس اور نیوی کے کیڈٹوں کو دوبارہ ملنے کی یقینی امید کے ساتھ خدا حافظ کہا۔ کون جانتا تھا کہ اس کورس میں ایک چیئرمین، جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی، ایک نیوی کے چیف (چار ستاروں والے ایڈمرل)، دو لیفٹیننٹ جنرل اور پانچ میجر جنرل پس پردہ موجود تھے۔ یہ جان کر افسوس ہوا کہ کچھ کیڈٹوں کو نئے کورس کے ساتھ چھ مہینوں کی دوبارہ ٹریننگ دینے کے لیے روک لیا گیا تھا، ہم ان کے لیے صرف بہتری کی دعا کر سکتے تھے اور پھر میں پاکستان ملٹری اکیڈمی میں دو سال کی ٹریننگ کے لیے حاضر ہونے سے پہلے تین ہفتوں کی چھٹیوں پر اپنے والدین سے ملنے روانہ ہو گیا۔

پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول

پہاڑوں کے دامن میں واقع شہر ایبٹ آباد دارالحکومت اسلام آباد سے 115 کلومیٹر دور ہے۔ ایبٹ آباد شہر سے نکلیں تو اونچے اونچے چیڑ کے درختوں میں گھرا سبزہ زار میدانی علاقے میں کاکول سطح سمندر سے 4280 فٹ کی اونچائی پر واقع ہے۔ جبکہ ایبٹ آباد کی اونچائی تقریباً 4000 فٹ ہے۔ کاکول انتہائی پُرفضا مقام ہے۔ یہاں کی چمکیلی صبحیں ابر آلود شامیں اور تاروں بھری رات ہمیشہ یادوں میں ابھرتی ہیں۔ گرمیوں میں درجہ حرارت 35 ڈگری سنٹی گریڈ سے شاذ و نادر ہی بڑھتا ہو گا موسم کو مزید حُسن بخشنے کے لئے سردیوں میں کبھی کبھار برف باری گردونواح کو سفید لبادہ اوڑھا دیتی ہے۔

10 ستمبر 1952ء کو ہم پانچ ساتھی ایبٹ آباد کے لئے روانہ ہوئے جہاں ہمیں پاکستان ملٹری اکیڈمی (PMA) میں 10th Course Long میں شامل ہونا تھا، اس سے پہلے ہم چھ ماہ کی ٹریننگ JSPCTS کوئٹہ میں حاصل کر چکے تھے۔ پہلی بار فضل منزل سے نکلا تھا تو ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ اتنے پُررونق ماحول سے نکل کر ماں باپ بھائی بہنوں سے دور جاتے ہوئے تنہائی کا احساس بہت شدید تھا۔ JSPCTS کوئٹہ سکول کے ماحول میں اجنبیت تھی اور تعلیم و تربیت کی نوعیت بھی نئی۔ اس ٹریننگ کے دوران Cadets کو سپاہیانہ زندگی سے پوری طرح متعارف کروا دیا جاتا تھا۔ فوج کی سنجیدہ اور منظم زندگی کا یہ پہلا سبق تھا۔ بہت دفعہ گھر بے طرح یاد آتا اور جی چاہتا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھر کی آزاد فضا میں پھر سے سانس لوں۔ لیکن فوج میں Commission لینے کا شوق ہر کمزوری پر مستحکم رہا۔

کاکول جاتے ہوئے پہلے جیسے احساسات قطعاً نہیں تھے۔ اس کے برعکس ہم لوگ ابھی سے اپنے آپ کو آفیسر سمجھنے لگ گئے تھے۔ اکیڈمی میں پہنچ جانے کی خوشی اس قدر تھی کہ ہم لوگ یہ بھول

گئے کہ اگلے دو سال ہماری تربیت کا سخت ترین دور ہوگا۔ اکیڈمی میں یہ یک وقت سترہ مضامین پڑھنا تھے۔ ایبٹ آباد پہنچ کر ہم نے کاکول جانے کے لئے ٹیکسی میں سامان لادا اور خوشی خوشی PMA کے لئے روانہ ہوگئے۔ تین میل لمبی سڑک کے دونوں طرف چیڑ کے قدآور درخت فوجی سپاہیوں کی طرح تنے کھڑے تھے۔ سڑک تھوڑا سا ابھر کر پہاڑ کے دامن میں غائب ہوتی نظر آئی۔ پہلے سفر کا یہ منظر ابھی تک ذہن میں محفوظ ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور اکیڈمی میں آنے جانے والا تھا، اس نے گاڑی ایک کھلی جگہ روک دی جہاں پر ہم سے پہلے آنے والے ساتھیوں کے ساتھ کچھ اچھا برتاؤ نہیں ہو رہا تھا۔ ایک کمپنی سارجنٹ میجر (CSM) جو اپنی سرخ پٹی کی وجہ سے پہچانا جا رہا تھا، چیخ کر بولا ''ادھر آؤ، بیوقوفو!'' (Come here, you bloody fools) ہم لوگوں کو خیال تک نہ تھا کہ وہ ہم سے مخاطب ہے۔

''کیا تم نے میری بات نہیں سنی؟'' یہ کہہ کر وہ ہماری طرف یوں لپکا جیسے ہمیں کھا جائے گا۔ ہم لوگ گھبرا کر ٹیکسی سے اتر پڑے۔ اس نے ہمیں مزید حواس باختہ کرتے ہوئے حکم صادر فرمایا کہ جس ٹیکسی میں ہم لوگ آئے تھے پیٹ کے بل اس کے نیچے سے گذر کر دوسری طرف آئیں۔ ہماری ساری خوشی تو پہلے ہی کافور ہو چکی تھی لیکن طبیعت مزید پراگندہ ہوگئی جب اس نے کہا کہ یہ عمل دہراتے رہو جب تک کہ میں رُکنے کا حکم نہ دوں ہماری بے بسی قابل دید تھی ہمارے کپڑے بار بار زمین پر رینگ کر ٹیکسی کے نیچے سے گذرنے کی وجہ سے بڑی طرح میلے ہوگئے تھے بوکھلاہٹ اور پھر سفر اور اس کے بعد سزا کی تھکاوٹ کی وجہ سے ہم لوگ لڑکھڑانے لگ گئے تھے مگر وہ CSM ٹوس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔ ہمیں یوں محسوس ہونے لگا کہ ہم تمام عمر یہی عمل دہراتے رہیں گے اور وہ یونہی بت بنا ہمیں دیکھتا رہے گا۔ ٹیکسی ڈرائیور اس تمام عرصہ کھڑا محظوظ ہوتا رہا آخرکار وہی ہمارا نجات دہندہ ثابت ہوا۔ اس نے CSM سے آگے بڑھ کر کہا ''صاحب انہیں کہیں میرے پیسے ادا کر کے اپنا سامان اتار لیں'' CSM نے غصے سے ہمیں دیکھا اور ڈانٹ کر پھر ہماری خبر لینے پر تل گیا۔ ''تم نے ابھی تک اس کو پیسے کیوں نہیں دیئے، بہت نواب ہو گیا؟'' وغیرہ وغیرہ ہم پر بہت سخت الفاظ کی بوچھاڑ ہوتی رہی اور ہم تھکے اور گھبرائے ہوئے اپنا سامان اتارتے رہے۔ ہمارا خیال تھا کہ مصیبت ٹل گئی ہے لیکن جیسے ہی سامان ایک طرف رکھا گیا اور ٹیکسی والا چلا گیا ہم پر دوبارہ مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

یہ سب کچھ ہماری خوش آئند امیدوں کے برعکس انتہائی تکلیف دہ تھا اور صبر آزما بھی۔ خیریت گذری کہ ہمیں ایک اور طرف سے بلاوہ آ گیا جہاں ہم سے فارم وغیرہ پر دستخط کروا کر قاسم کمپنی

میں شامل کر دیا گیا۔ اتفاق سے ہم پانچوں دوستوں کو ایک ہی کمپنی مل گئی۔ کچھ ڈھارس بندھ گئی ہم کو باقی فاصلہ سامان اٹھا کر بھگایا گیا آخر کار ہم اپنے الاٹ شدہ کمروں تک پہنچ گئے۔ جن کے ساتھ باتھ روم ملحق تھے۔ رات کو چوہے دھما چوکڑی مچانے لگ گئے آواز کبھی تھم جاتی اور کبھی پھر زور وشور سے آنے لگتی۔ رفتہ رفتہ ہم اس ہنگامے کے بھی عادی ہو گئے۔ سینئر کیڈٹ ہم کو بہت رگڑا دیتے تھے۔ ایک سے اگر بچ کر نکلتے تو دوسرا دھر لیتا۔ کسی نہ کسی بہانے کبھی لان کو بغیر اجازت کراس کرنے پر اور کبھی سینئرز کے کمروں کے آگے سے گزرنے پر درگت بنا دی جاتی۔ یہ سلسلہ پڑھائی کے شروع ہونے تک جاری رہا۔ اس کے بعد بدسلوکی سے رگڑا لگنا دھیرے دھیرے کم ہو گیا۔

لیکن اس رگڑے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ہمیں حکم ماننے کی عادت ہو گئی۔ یاد رہے کہ حکم کی تعمیل کرنا، نظم وضبط قائم کرنے کا ایک اہم ستون ہے اور اسی تربیت یعنی حکم کی تعمیل کرنے کی بدولت ہی ایک سپاہی موت کے سامنے گولیوں کی بوچھاڑ میں پامردی سے ڈٹا رہتا ہے۔ سینئر کیڈٹس کی مار دھاڑ شروع دن ہی سے انا کے خاتمے، ذات کی نفی اور حکم کے آگے سر تسلیم خم کرنے کا باعث بنتی ہے جب اس بات کی سمجھ آ گئی تو ہم نے یقیناً اس کو سراہا۔ جونیئر کیڈٹس کو بدلہ لینے کا موقع بھی دیا جاتا تھا جب سینئر کیڈٹس کی پاسنگ آؤٹ پریڈ ہوتی تو آخری ہفتہ کے دو تین روز جونیئر کیڈٹ اپنے سینئر کیڈٹس کو رگڑا دیتے۔ لیکن چونکہ اس عرصہ میں اجنبیت کی دیوار گر چکی ہوتی اس لئے بدلہ لینے میں تلخی کا عنصر موجود نہیں تھا۔

یہاں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک نوعمر لڑکا جب فوج کی زندگی میں داخل ہوتا ہے تو اس کے لاشعور میں اپنے وطن سے شدید لگاؤ اور اپنے ماضی کی تاریخ پر فخر کا جذبہ موجزن ہوتا ہے۔ اس جذبے کو مزید تقویت اس وقت ملتی ہے جب اسلامی تاریخ کے نامور سپہ سالاروں کے ناموں کی مناسبت سے رکھے گئے ناموں کی کمپنیوں میں داخلہ ملتا ہے۔ خالد۔ طارق۔ قاسم اور صلاح الدین نام کی کمپنیوں کا اپنا اپنا منفرد تشخص ہوتا ہے اور اپنا رہائشی علاقہ بھی۔ ناموں کے حوالے سے پاک فوج کے زیر تربیت افسروں کا اپنی درخشاں تاریخ سے ناطہ جڑ جاتا ہے ہماری ٹریننگ میں سب سے زیادہ توجہ فرض کی ادائیگی کی تربیت اور فرض کو پہچاننے پر دی جاتی ہے۔ یہی دونوں خصوصیات ایک افسر کی تربیت اور مستقبل کی لیڈرشپ کے لئے ضروری ہیں۔

ایک دلچسپ اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ جس اکیڈمی میں، میں نے گھبرائے ہوئے انداز میں قدم رکھا تھا، کئی سالوں بعد زندگی نے مجھے اس کا کمانڈنٹ بنا دیا۔ آج جب میں ماضی میں واپس لوٹتا ہوں تو اپنی زندگی کے دونوں ادوار ساتھ ساتھ چلتے نظر آتے ہیں ایک نووارد کیڈٹ جب

اکیڈمی میں پہلا قدم رکھتا ہے اور جب وہی کیڈٹ تربیت لے کر ترقی کی منزلیں طے کرتا عملی زندگی کے تجربے سے مالا مال ہو کر میجر جنرل کے عہدے پر پہنچ کر اس اکیڈمی میں بحیثیت کمانڈنٹ وارد ہوتا ہے تو اس کے احساسات پھر کیا ہوتے ہیں موازنہ صرف میں ہی کر سکتا ہوں۔ اس نادر تجزیے کو بھی آئندہ صفحات میں اس وقت منتقل کروں گا جب داستان اس نقطۂ عروج تک پہنچے گی۔

دانتوں کے ڈاکٹر سے ہوشیار رہیں

بہر حال ذکر ہو رہا تھا ایک فوجی افسر بننے کے لئے جو تربیت دی جاتی ہے اس کی خصوصیات کا۔ غصہ ضبط کرنا اور درد کو برداشت کرنا اور نہ صرف برداشت کرنا بلکہ تاثرات پر مکمل کنٹرول بھی اسی عرصے میں فطرت کا حصہ بن جاتا ہے۔ ایک چھوٹا سا واقعہ یاد آ گیا ہے۔ کاکول میں سردی بہت پڑتی ہے۔ 25 دسمبر کا وہ دن مجھے آج پھر یاد آ گیا ہے۔ بہت برف باری ہوئی تھی ہم لوگوں نے فرصت کے لمحے برف کا آدمی بنانے میں گذارے۔ ایک دوسرے پر خوب برف کے گولے بھی برسائے۔ شاید سردی کی وجہ سے آدھی رات کے قریب میرے دانت میں شدید درد اٹھا۔ جوں جوں رات آگے بڑھ رہی تھی اسی طرح درد شدت پکڑتا جا رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے یہ رات کبھی نہیں کٹے گی۔ چونکہ میں جونیئر کیڈٹ تھا اس لئے اپنے سینئر کارپورل کو جگاتے ہوئے گھبراہٹ اور تامل محسوس کر رہا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ آدھی رات کو کارپورل کو جگانا کہیں جرم نہ تصور کیا جائے۔ اس لئے میں کمرے میں بیٹھا درد کو بہلاتا رہا اور اس کی شدت کو برداشت کرتا رہا۔ صبح ہوئی تو میں M-I-Room گیا۔ انہوں نے مجھے Dentist کے پاس بھیجنے کا بندوبست کر دیا۔ سی ایم ایچ میں ڈینٹل سرجن ایک پولش خاتون تھی۔

وہ خاتون کم اور میجر زیادہ تھیں۔ انتظار کے بعد جب میری باری آئی تو مجھے یوں لگا جیسے نجات کا لمحہ آن پہنچا ہے۔ مگر وہ میجر نما خاتون تو میرے دانت کی درد کم کرنے کے لئے کسی جلدی میں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ اپنی تکلیف کی طرف ان کی توجہ مبذول کروانے کی غرض سے میں نے اپنے کھلے منہ سے ہی دکھتے دانت کی طرف اشارہ کیا۔ جواب ملا ''ڈاکٹر تم ہو یا میں؟'' اور میرا کھلا منہ کھلا کا کھلا ہی رہ گیا۔ بہر حال دہن کی کچھ دیکھ بھال کے بعد انہوں نے جگہ سن کرنے کا ٹیکہ لگایا جس کے لئے میں ان کا آج تک شکر گزار ہوں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ فیصلہ کر لیتیں کہ دانت کو بغیر ٹیکہ لگائے ہی نکالنا ہے اور میرے درد سے قطع نظر پھر کہہ دیتیں 'ڈاکٹر تم ہو یا میں' بہر حال دانت بغیر تکلیف کے نکل گیا۔ ٹیکے کی وجہ سے یا ان کے خوف کی وجہ سے معلوم نہیں۔ سوچے ہوئے منہ کو رومال سے دبائے سی ایم ایچ ایبٹ آباد سے نکلتے ہوئے میں نے عہد کیا کہ کبھی دوبارہ یہاں نہیں

آ ؤں گا۔ لاج رہ گئی کہ پھر دوبارہ مجھے کبھی وہاں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ زندگی کا یہ دور اس قدر بھرپور رہا تھا کہ جونہی وہ دریچے کھلے ہیں یادوں کا ایک سیلاب سا امڈ پڑا ہے۔ منزل کی طرف گامزن ہونے میں جو لطف ہے وہ منزل پر پہنچ جانے میں نہیں۔ وہ جذبات، وہ ولولے، وہ جوش اور وہ باتیں لاکھ چاہیں بھی تو فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ ایک دبی ہوئی قوت کی طرح تمام عمر وہ میرے تھکے ہوئے اور اداس لمحوں کو گرماتی رہی ہیں۔

حسین سرزمین کا دورہ

میں PMA کے Club Hiking کا ممبر تھا۔ جس کے توسط سے ہمیں بہت سے خوبصورت اور تاریخی مقامات کو دیکھنے کا موقع ملا۔ جولائی 1953ء کی چھٹیوں میں کلب نے فیصلہ کیا کہ چترال اور کافرستان کی سیر کی جائے۔ چھٹیوں میں یہ فیصلہ کرنا کہ گھر کی بجائے کہیں تفریح پر جایا جائے خاصا مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ گھر کی اصل قدر گھر سے باہر جاکر ہی آتی ہے۔ لیکن چترال اور کافرستان دیکھنا بھی کم پرکشش نہ تھا۔ چونکہ فیصلہ ہم نے خود کرنا تھا سوچا کہ پھر شاید یہ موقع دوبارہ نہ ملے اس لیے کافرستان کی سیر کر ہی لی جائے۔ ہم لوگ آٹھ کیڈٹ۔ دو ملٹری انسٹرکٹر۔ تین سویلین نصاب پڑھانے والے انسٹرکٹر۔ دو عدد اردلی اور ایک خانساماں پر مشتمل ٹیم کی صورت میں اس سفر پر روانہ ہوئے۔ کھانے پینے کا کافی سازوسامان تھا۔ چلنے سے پہلے ہمیں آفیسر انچارج کیپٹن متین (بعد میں لیفٹیننٹ جنرل) نے بریف کیا۔ ہمیں بتلایا گیا کہ چترال میں ہم مہتر چترال یعنی چترال کے فرمانروا کے مہمان ہوں گے۔ ان کا نام خان سیف الرحمٰن تھا۔

ایک چھوٹی بس میں ہم نے سفر کا آغاز کیا دیر گاؤں میں پہنچتے پہنچتے رات ہو چکی تھی۔ آفیسرز نے گیسٹ ہاؤس میں اور ہم کیڈٹس نے State Levy Barracks میں رات گزاری۔ اگلے روز ہم لواری ٹاپ جو ایک پہاڑی درہ ہے اور سطح سمندر سے 10,500 فٹ کی بلندی پر واقع ہے، کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں جگہ جگہ بارش کی وجہ سے لینڈ سلائیڈز موجود تھیں۔ پہاڑ کی مٹی جب شدید بارش کے نتیجے میں ٹوٹ کر کھسکتی ہے تو راستے کی ہر چیز کو توڑتی ہوئی اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ سڑک کا جو حصہ اس کی زد میں آجائے وہ بھی توڑ پھوڑ کا شکار ہو جاتا ہے۔ مزید وہ چکنی بھی ہوتی ہے اور گیلی ہونے کی وجہ سے شدید پھسلن کا باعث بن جاتی ہے۔ ہمارا ڈرائیور پہلی پھسلن پر سے گذرتا ہوا گھبرا رہا تھا لیکن ہم اس کی ہمت بندھاتے رہے اور وہ آہستہ آہستہ رینگتا رہا۔ یہاں تک کہ ہم درے سے تین میل کے فاصلے پر پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر راستے کی مزید دشواری دیکھ کر ڈرائیور نے آگے بس لیجانے سے انکار کر دیا۔ وہ بیچارا بھی سچا تھا۔ اس کو زندگی سے

زیادہ اپنی بس عزیز تھی۔ کلب کے ساتھ لین دین کا جو معاہدہ تھا اس کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا تھا۔ اسی شش و پنج اور تگ و دو میں ہم یہاں تک تو پہنچ گئے مگر اس کو مزید آگے لے جانے کی گنجائش ہمیں نظر نہ آئی۔ ہم نے پیدل چلنے کا فیصلہ کیا۔ چترال سے جو پارٹی ہمیں لینے کے لئے آئی تھی انہوں نے اونچائی سے ہماری بس کو رکتے اور ہمیں اترتے ہوئے دیکھا۔ بل کھاتی ہوئی سڑک کے حالات انہیں بھی نظر آ رہے تھے۔ اس لئے وہ چند گھوڑے لے کر ہمارے استقبال کو نیچے تک آ گئے۔ تفریح کو ایک نیا انداز مل گیا۔ ہم لوگوں نے اپنا سامان بس میں سے اتارا، گھوڑوں پر لادا۔ آفیسرز گھوڑوں پر بیٹھ کر اور ہم کیڈٹ پیدل ان کے ساتھ چلتے ہوئے اوپر تک پہنچے۔ ڈرائیور اور بس کے عملے کو واپسی تک کے لئے وہیں ایک جھونپڑی میں چھوڑا۔ جونہی ہم چوٹی پر پہنچے تو پہاڑوں کی یخ بستہ ہوا سے دانت کٹکٹانے لگے۔ یہاں لکڑی سے تعمیر شدہ دو منزلہ کیبن میں ہمارے ٹھہرنے کا انتظام تھا...... بیٹھنے کے لئے لکڑی ہی کے بنچ تھے۔ بھوک سے برا حال تھا۔ آگ کے گرد بیٹھ کر ہم لوگ ہاتھ تاپتے رہے اور کھانے کا انتظار کرتے رہے۔ ایسے میں جب گرم گرم چائے کے ساتھ خمیرے پراٹھے اور بھنا ہوا مرغ مل جائے تو من وسلویٰ سے کم نہیں لگتا۔ ویسے بھی یہ کھانا موسم کی مطابقت سے تھا۔ ہم لوگوں کو بتلایا گیا کہ ہم اب سے شاہی مہمان ہیں۔ کھانے اور بھی کھائے لیکن اس پہلے کھانے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔

یہاں سے ہماری پارٹی دروش کے لئے روانہ ہوئی۔ کچھ راستہ ہمیں پیدل چلنا پڑا اور کچھ راستہ سامان لے جانے والے ٹرک میں سوار ہو کر طے کیا۔ جہاں پہنچ کر چترال سکاؤٹس نے ہمارا پرتپاک استقبال کیا۔ ہمارے لئے صاف بستر بچھائے گئے۔ کھانا کھاتے ہی نیند نے ہمیں یوں دبوچا جیسے پہلے کبھی سوئے ہی نہ تھے۔

یہاں سے آگے سڑکیں اچھی تھیں اس لئے باقی کا سفر آسان رہا اور ہم چترال پہنچ گئے۔ چترال میں ہمارا مہمان خانہ رہائشی ٹینٹ تھے۔ دریائے چترال کے کنارے لگے ہوئے یہ ٹینٹ اندر سے بہترین طریقے سے گرم کئے گئے تھے۔ پرفضا بھی اور پر آسائش بھی۔ اس عیاشی کا نقطہ عروج یہ اطلاع تھی کہ ہم رات کا کھانا شاہی محل میں مہتر چترال کے ساتھ کھائیں گے۔ ہمارا تجسس، انتظار اور دبی دبی خوشی دیدنی تھی۔ لکھتے ہوئے مجھے آج بھی وہ احساس گدگدا رہا ہے۔

کیپٹن متین نے ہمیں درست آداب سکھانے کے لئے فوجی انداز میں بریف کیا۔ انہوں نے بتایا کہ مہتر صاحب بھی 1948ء میں PMA میں بحیثیت کیڈٹ آئے تھے۔ لیکن وہاں کی سخت زندگی کی تاب نہ لا سکے اور بھگوڑے ہو گئے۔ انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ سزا ملی۔ چند روز کوارٹر گارڈ میں

رکھ کر اکیڈمی واپس بھیج دیا گیا۔ مگر ناز ونعم میں پلے ہوئے مہتر صاحب سزا کے باوجود دوبارہ اس زندگی میں فٹ نہ ہو سکے اور ایک بار پھر بھاگ نکلے۔ ایک بار پھر پکڑے گئے اور اکیڈمی میں دھکیلے گئے۔ مگر قسمت نے بچا لیا۔ اس دوران ان کے والد مظفر الملک انتقال کر گئے۔ چونکہ یہ سب سے بڑے بیٹے تھے اس لئے ان کے خاندان نے ولی عہد ہونے کے حوالے سے درخواست کی کہ انہیں Release کر دیا جائے۔ درخواست منظور ہو گئی اور مہتر صاحب ''جان بچی سو لاکھوں پائے'' کا اصل مفہوم پا کر واپس چترال پر حکومت کرنے کے لئے پہنچ گئے۔ ہمیں ان سے اس معاملے پر ہرگز ہرگز کسی قسم کا سوال نہ کرنے کے آرڈر مل گئے۔

وقت مقررہ پر ہم لوگ محل میں پہنچ گئے جہاں ہمیں شیشوں سے مزین ہال میں بٹھایا گیا۔ پرانی روایات کی عکاسی ساز و سامان اور در و دیوار میں عیاں تھی۔ مہتر پست قد مگر مضبوط اور توانا جسمانی ساخت کے تھے۔ شائستہ لب و لہجہ میں انہوں نے ہمیں خوش آمدید کہا اور ہماری تواضع کا پورا خیال رکھا۔ ہمارے ساتھ آئے ہوئے آفیسرز ان کے ساتھ بے تکلفی سے PMA میں گذارے ہوئے دنوں کی باتیں کرتے رہے اور ہم خاموش مگر ہمہ تن گوش رہے۔ شہر کے معززین اور پولیٹیکل ایجنٹ عزت بخش اعوان بھی مدعو تھے کھانا پر تکلف اور شاہی روایات کے شایان شان تھا۔

اگلے دن ہم پولیٹیکل ایجنٹ کے مہمان تھے۔ ہماری تفریح کے لئے گھوڑ سواری، تیراکی اور ٹینس کھیلنے کا بندوبست تھا۔ ہم تمام کیڈٹ ساتھی پہلے وادی میں گھوڑ سواری کے لئے گئے۔ پہاڑی علاقے اور سنگلاخ چٹانوں میں گھوڑا دوڑانے کا جو مزہ ہے وہ ایک شوقین اور ماہر گھوڑا سوار ہی بیان کر سکتا ہے۔ خون گرمانے کا اس سے بہتر نعم البدل مجھے نہیں معلوم۔ مطلع صاف تھا اور سورج کی چمکیلی کرنیں پہاڑوں کی شفاف ہوا کو بھی گرما رہی تھیں۔ اس کے بعد اپنے تمتماتے جسموں کو ٹھنڈا کرنے کے لئے ہم لوگ پولیٹیکل ایجنٹ کے گھر میں بنے ہوئے Swimming Pool میں نہاتے رہے۔ کچھ پانی کی ٹھنڈک میں سکون لیتے رہے اور کچھ اپنی شوخی طبع کے کرتب دکھانے کا مظاہرہ کرتے رہے۔ پولیٹیکل ایجنٹ صاحب کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ انہوں نے کھانے پر ہمیں اپنی ڈاکٹر دلہن سے بھی ملوایا دوپہر کو Polo کا ایک میچ تھا۔ جس میں چترال کے مہتر بھی حصہ لے رہے تھے۔ وہ ایک ماہر کھلاڑی تو نہیں تھے لیکن کھیل کے میدان میں ان کی موجودگی نے باقی کھلاڑیوں میں جان ڈال دی تھی۔

میچ کے بعد انہوں نے ہمارے ساتھ چائے پی۔

چترال سے ہم اگلے دن براستہ Ayun وادی کافرستان کے لئے روانہ ہوئے۔

کوہ ہندوکش کے جنوبی دامن اور پاک افغان سرحد سے وابستہ وادی کا نام کافرستان ہے۔ صدیوں سے یہ وادی نئی تہذیب اور تمدن سے بیگانہ اپنی ہی دنیا بسائے ہوئے ہے۔ کہتے ہیں سکندر اعظم فتوحات کرتا اس طرف بڑھ رہا تھا تو اس کی فوج کا کچھ حصہ ان پہاڑوں میں بھٹک کر یا بھگوڑا ہو کر علیحدہ ہو گیا اور پھر انہی خوبصورت وادیوں کا ہو کر رہ گیا۔ اس حوالے یہ لوگ یونانی نژاد کہلا سکتے ہیں۔ کافرستان کے حسین لوگ قدرت کے حسین مناظر کا پرتو دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا لباس، زبان اور مذہب سب کچھ کافر ہے۔ خدا کی اس قدر نعمتوں سے مالا مال وہ پھر بھی خدا سے بے خبر ہیں۔ یا شاید نور ہدایت کا نور بھی ان کی دنیا کے سکون کو چھیڑنا نہیں چاہتا۔ اسلام کے گہوارے پاکستان میں ہوتے ہوئے بھی ان کو اپنے مذہب، روایات اور تہذیب کو قائم رکھنے کی مکمل آزادی ہے۔

یہ سفر ہم نے زیادہ تر پیدل ہی طے کیا۔ کافرستان میں ہماری رہائش دو کمروں پر مشتمل پرائمری سکول میں تھی۔ یہ سکول گاؤں سے نکل کر باہر واقع تھا اور یہاں کی آبادی چار ہزار کے قریب تھی۔ یہاں کے لوگوں کو کیلاش نام سے پکارا جاتا ہے۔ شہر چترال سے لے کر ایون تک پہاڑ سنگلاخ اور خشک تھے لیکن جونہی ہم وادی کافرستان میں داخل ہوئے سبزہ زاروں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ ہم جوں جوں آگے بڑھتے گئے پھلدار درختوں اور لہلہاتے کھیتوں کے روح پرور نظاروں سے لطف اندوز ہوتے گئے۔ شفاف پانی کی چنچل ندیوں کے کنارے اونچے درخت سر جھکائے محو نظارہ نظر آتے تھے۔ ایک سکوت اور سکون تھا جو روح میں اترتا چلا گیا

کافرستان کے لوگوں کے مطابق ان کے آباؤ اجداد ایران اور یونان سے تھے۔ ان کی زبان فارسی، یونانی اور سنسکرت زبانوں کا امتزاج جسے 'قلاشور' کہا جاتا ہے، اس بات کی مزید گواہی دیتی ہے۔ آگ کی پوجا کرتے ہیں اور ان کی مذہبی رسوم میں جانوروں کی قربانی اور ناچنا شامل ہے۔ جنت اور دوزخ پر بھی یقین رکھتے ہیں اور کچھ نے اسلام بھی قبول کر رکھا ہے۔ لیکن بت پرستی نمایاں ہے۔

کیلاش اپنے گھر انتہائی مضبوط اور کاریگرانہ مہارت سے بناتے ہیں۔ اخروٹ کے جنگلوں سے حاصل کی گئی لکڑی، پتھر اور مٹی سے بنے ہوئے یہ گھر باہر سے قلعہ نما دکھائی دیتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے مویشیوں کو بھی اندر رہائشی علاقے میں ہی باندھتے ہیں۔

ان لوگوں کی شادی کی رسومات گاؤں کے مندر میں ادا کی جاتی ہیں۔ جہاں آگ جلائی جاتی ہے اور پھر جانور قربان کیا جاتا ہے۔

مرنے والوں کے لئے کافرستان کی رسوم ہمارے لئے تعجب انگیز تھیں۔ میت کو ایک لکڑی کے بکس میں رکھ دیا جاتا ہے اور دو روز تک مندر ہی میں رکھا جاتا ہے جہاں متوفی کے احباب اور عزیز

اس کے ساتھ رہتے ہیں۔ کھانے اور شراب کے دور چلتے رہتے ہیں اور یہ لوگ مرنے والے کے گرد گاتے اور ناچتے رہتے ہیں۔ عورت کے مرنے کی صورت میں نہ گانا گایا جاتا ہے اور نہ ناچا جاتا ہے۔ یہ تفریق کیوں؟ واللہ اعلم۔ میت کو دفنانے کی بجائے اسے قبرستان تابوت میں لے جایا جاتا اور بڑے بڑے پتھر اس پر رکھ دیئے جاتے ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد پتھر ہٹا دیئے جاتے ہیں اور ڈھکن کھول دیا جاتا ہے۔ ہم نے بہت سے انسانی ڈھانچے لکڑی کے بکس سے باہر پڑے ہوئے بھی دیکھے۔ جنہیں شاید جنگلی جانور ڈبے سے باہر گھسیٹ لیتے ہوں گے۔ لکڑی سے بنے ہوئے کچھ مجسمے بھی قبرستان میں نظر آئے اور درختوں کے ساتھ قربان کئے گئے جانوروں کے سینگ بھی گاڑے ہوئے نظر آئے۔ یہ بات ہم پر عیاں ہوگئی کہ کیلاش ناچنے اور گانے کے دلدادہ ہیں۔ اظہار تشکر ہو یا اظہار ملال دونوں کیفیات کی عکاسی ناچنے اور گانے سے کرتے ہیں۔ عمر کی قید سے بے نیاز بچے بوڑھے اور جوان سب مل کر ناچتے ہیں۔ جوان لڑکیاں اپنے چہروں پر سوکھی جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ کالے رنگ سے تل سجاتی ہیں۔ ہمارے لئے ان لڑکیوں میں سے چار پانچ نے ناچ پیش کیا۔ اپنی بانہوں کا ہالہ بنا کر یہ لڑکیاں مختلف دھنوں پر تھرکتی رہیں۔ ایک دوسرے کے کندھوں اور کمر کے گرد ہاتھ یوں پکڑ رکھے تھے جیسے زنجیر سے کسی نے انہیں جکڑ رکھا ہو۔ ہم نے سنا تھا کہ کیلاش لڑکیاں کسی سیاح یا اجنبی سے بے نیاز اپنی دنیا میں مگن رہتی تھیں۔ کوئی تصویر کھینچنا چاہتا تو خوشدلی سے مسکرا کر اجازت دے دیتیں۔ کوئی رُک کر انہیں حیرت سے تکتا رہتا تو پروا نہیں کرتی تھیں۔ مگر جب ہم نے انہیں دیکھا تو وہ گھبرائی ہوئی نظر آتی تھیں اور اجنبیوں کو دیکھ کر بھاگ جاتی تھیں۔ ہمیں خاصی حیرت ہوئی کہ یا خدا یہ کیوں؟ ہم تو محو نظارہ ہونا چاہتے تھے اور قدرت کی صناعی کے یہ حسین پیکر ایک جست لگا کر نظروں سے غائب ہوجاتے؟ استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ ہم سے پہلے کوئی لوگ یہاں آئے تھے۔ جنہوں نے اپنی حیوانی جبلت سے مغلوب ہو کر ایک کیلاش لڑکی پر دست درازی کی کوشش کی۔ گاؤں میں ہنگامہ ہوگیا اور یہ آزاد فضاؤں میں ہرنیوں کی طرح چوکڑیاں بھرنے والی معصوم لڑکیاں سہم کر سمٹ گئیں۔ ایسے درندہ صفت لوگوں پر تف کرتے اور لعنت بھیجتے ہوئے ہم نے بھرپور کوشش کی کہ اپنے کردار سے ان سادہ لوح لوگوں کے اعتماد دوبارہ بحال کریں۔ ہم نے اس وادی میں دو دن گذارے۔ قدرت نے انہیں حسن کے علاوہ دنیاوی نعمتوں سے بھی مالا مال کر رکھا تھا۔ خودرو پھلدار درخت پھلوں سے لدے پڑے تھے۔ جگہ جگہ انگور کی بیلیں پکے ہوئے انگوروں کے خوشوں کے بوجھ سے جھکی پڑی تھیں۔ اخروٹ، شہتوت، سیب اور آڑو کے ڈھیر لگے تھے جب ہم دروش کے لئے واپس روانہ ہوئے تو پیدل چلتے ہوئے راستے میں ایک کیلاش سر پر انگوروں کا

ٹوکرا لئے بیچنے کے لئے جارہا تھا۔ اس قدر رسیلے انگور دیکھ کر ہم نے سوچا کہ اپنی پیاس ان انگوروں سے بجھائی جائے۔ قیمت پوچھی تو وہ پورا ٹوکرا سات روپے میں بیچنے کو تیار تھا اور نہ صرف بیچنے کو تیار تھا بلکہ اس بات پر بھی راضی ہوگیا کہ وہ ٹوکرا سر پر اٹھائے ہمارے ساتھ چلتا رہے گا اور ہم انگور لے لے کر کھاتے رہیں گے۔ جب تک کہ اس کا سودا ختم نہیں ہوا وہ ہمارے ساتھ چلتا رہا۔ جب انگور ختم ہوئے تو وہ وہاں سے واپس اپنے گاؤں لوٹا۔ مگر ہماری منزل ابھی دور تھی۔ جہاں پر ہم لوگ بس سے اترے تھے وہاں تک پہنچنے سے پہلے اندھیرا ہوگیا۔ ہمیں ایک رات اور باہر کیمپ کرنا پڑا اگلے دن جب بس تک پہنچے تو وہاں پر بس کا عملہ ہمیں دیکھ کر یقیناً خوش نظر آ رہا تھا۔ پہاڑوں میں تنہائی بھی وہاں کی شفاف ہواؤں کی طرح زیادہ ہی واضح ہو کر محسوس ہوتی ہے۔ سناٹا اس قدر ہوتا ہے کہ میلوں دور سے آنے والی گاڑی کے انجن کی گڑگڑاہٹ صاف سنائی دیتی ہے۔ ایک پہاڑی کوے کی بھرائی ہوئی کیں کیں کا جواب میلوں دور سے مل جاتا ہے۔ مطلع صاف تھا اور سڑک بھی خشک ہو چکی تھی۔ کسی مزید پھسلن پر سے گزرے بغیر ہم لوگ انہی پرانی راہوں پر سے پلٹ آئے۔

جب ہم اکیڈمی میں واپس پہنچے تو جمعہ کا دن تھا اور چھٹیاں ختم ہونے میں ابھی دو روز باقی تھے۔ ہم نے غنیمت جانا اور پہلی بس پکڑ کر سیدھے اپنے گھر والوں سے ملنے دوڑے۔ ایک رات اپنے والدین اور بھائی بہنوں کے ملنے میں گزاری اور سیر کی تفصیل مرچ مصالحے سمیت چٹخارے لے لے کر انہیں سنائی اور بھائی بہنوں کو خوب خوب جلایا۔ والدہ شفقت سے مسکراتی رہیں اور والد قہقہے لگاتے رہے۔ اتوار کو ہم لوگ اکیڈمی میں لوٹ چکے تھے اور تازہ دم ہو کر دوبارہ کام کے لئے خود کو کمر بستہ محسوس کر رہے تھے۔

آخری مقابلہ

ہمارے لئے باکسنگ لازمی تھی ہر کیڈٹ کو کم از کم دو مرتبہ رنگ میں ضرور اترنا پڑتا تھا۔ کیپٹن ڈاکٹر بصیر اس معاملے میں کسی کیڈٹ کو Medical Grounds پر رعایت دینے کو تیار نہیں ہوتے تھے باکسنگ کے معاملے میں ان پر ہر قسم کی بہانہ سازی بے اثر ثابت ہوتی تھی۔

جونیئر کیڈٹس کے لئے جب باکسنگ کا دور شروع ہوا تو ہر کیڈٹ اپنے مد مقابل کو دو مکوں کی مار سمجھ رہا تھا یعنی طاقت کا مظاہرہ کرنے اور اپنے آپ کو منوانے کا بہترین موقع نظر آ رہا تھا۔ ہمارے سامنے ایک ساتھی کی خوب پٹائی ہوئی۔ اس کے مد مقابل نے بے دریغ مکے برسائے اور بیچارے کی ناک سے بری طرح خون پھوٹ پڑا۔ کیڈٹ کو فوراً ہسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹر نے اسے فوری آپریشن کی ہدایت کی کیونکہ اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ کر ٹیڑھی ہوگئی تھی۔ ہمارا بیچارہ

ساتھی آپریشن سے گھبرا رہا تھا اور دوسری طرف اسے یہ فکر تھی کہ ہسپتال میں داخل ہونے سے وہ پڑھائی میں بھی بہت پیچھے رہ جائے گا۔ اپنے ٹیڑھے ناک سمیت وہ ٹریننگ لینے میں مصروف رہا اور ہم دل ہی دل میں اس کو داد بھی دیتے رہے۔ Upper Term شروع ہوگیا اور ایک بار پھر باکسنگ رِنگ میں جانے کی نوبت آن پہنچی۔

وہ ہمارا بیچارہ بہادر ساتھی اپنی ٹیڑھی ناک کو لے کر ڈاکٹر بصیر کے پاس پہنچا اور درخواست کی کہ کم از کم اب کی بار تو اسے باکسنگ رِنگ میں نہ بھیجا جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے صاف انکار کر دیا اور انتہائی سنگدلی سے نو، نو، نو کہتے رہے۔ اب تو ہمیں وہ ساتھی واقعی تہ دل سے بیچارہ لگ رہا تھا۔ ''مرتا کیا نہ کرتا'' وہ باکسنگ کے لئے تیار ہوگیا اس سے پہلے بہت سارے رنگ میں گئے جو جیت گیا وہ مسکرا کر ہاتھ ہلاتا رہا اور جو ہار گیا وہ منہ لٹکا کر دستانے اتارتا رہا۔ کچھ کو تو سٹریچر پر ڈال کر لیجانا پڑا۔ بہرحال جب اس کی باری آئی تو اس نے انتہائی بے جگری سے مدمقابل کو لتاڑا اور اپنی پچھلی شکست اور مار کا پورا بدلہ لینے کی کوشش کی۔ لیکن جیت اس کا مقدر نہ بنی۔ دوبارہ اس کی ناک پر مکہ پڑا اور وہ بھی اس قدر شدید کہ ایک بار پھر خون ابل پڑا۔ اسے ہسپتال لیجانا پڑا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا اور مسکرانے لگا۔ بیچارے زخمی کیڈٹ کا کندھا تھپتھپا کر کہنے لگا۔ ''بہت اچھا کیا بیٹے اس بار مکا تم نے دوسری طرف سے کھایا ہے۔ ہڈی تو ٹوٹ گئی ہے مگر تمہاری ناک سیدھی ہوگئی ہے۔''

یہ جنٹلمین کیڈٹ لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہونے والا راجہ سروپ ہے۔

افسر کے رتبے تک رسائی

اکیڈمی میں دو سال جو کبھی لامتناہی محسوس ہوتے تھے بھرپور انداز میں یوں گذر گئے کہ احساس تک نہ ہوا۔ فیلڈ ٹریننگ میں سخت جسمانی مشقت کرنی پڑتی۔ لیکن اکثر و بیشتر جب ٹریننگ کے لئے جنگ کا سماں باندھا جاتا تو کیڈٹس کی بدحواسیاں اور انسٹرکٹرز کی ڈانٹ اور تنبیہ دلچسپی کا سامان پیدا کرتی رہتی۔ میں اپنی بہترین تربیت کے لئے پلاٹون کمانڈر کیپٹن شمیم وائیں (بعد میں لیفٹیننٹ کرنل) اور کیپٹن فضل حق (بعد ازاں لیفٹیننٹ جنرل) کا بے حد ممنون ہوں جنہوں نے ہمیشہ بروقت ہدایت اور رہنمائی کی اور مجھے اس قابل بنایا کہ میں پاکستان آرمی میں شامل ہوکر ملک و قوم کی خدمت کرسکوں۔

18- ستمبر 1954ء میری زندگی میں تکمیل آرزو کا وہ تاریخی دن تھا جس دن میرا فوج میں کمیشنڈ آفیسر بننے کا خواب پورا ہوگیا۔ روایت کے مطابق کامیاب ہونے والے کیڈٹس نے ایک شاندار پریڈ میں حصہ لیا۔ فخر سے تنی گردنیں لئے Blue Petrol پہنے ہم قدم سے قدم ملاتے پریڈ کرتے

ہوئے معززین جن میں کیڈٹس کے والدین، عزیز و اقارب وفور جذبات سے مغلوب خوشی سے تمتماتے چہرے لئے ہمیں دیکھ رہے تھے، کے سامنے سے گزرے اور پھر مہمان خصوصی گورنر جنرل غلام محمد نے ہماری سلامی لی۔ گورنر جنرل نے ہمارے سمارٹ سلوٹ کا جواب اسی گرمجوشی اور جذبے کے ساتھ دیا۔ اس کے بعد پاکستان ملٹری اکیڈمی کے بینڈ کی دھن پر Slow March کرتے ہوئے ہم لوگ سٹیج کے دونوں اطراف پر بنی ہوئی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے حاضرین کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اب ہم سیکنڈ لیفٹیننٹ بن چکے تھے۔ ایک عجیب طمانیت اور فتح کا سا احساس تھا جو منزل آشنا ہونے کے بعد ہی محسوس کیا جا سکتا ہے اور منزل بھی وہ جو اعصاب شکن محنت کے بعد حاصل کی جائے۔

اکیڈمی کی ایک اور روایت تھی کہ Badges of Rank ہم لوگ اس وقت تک نہیں پہن سکتے تھے جب تک ہم ملٹری اکیڈمی سے دس میل دور نہ جا چکے ہوں۔ یاد رہے کہ ملٹری میں روایات بھی قانون کی طرح واضح اور غیر لچکدار ہوتی ہیں۔ شاید سپاہیانہ زندگی میں مجاہدہ اسی سختی اور پابندی کا نام ہے بہرحال اس روایت کی بھی ایک تاریخ ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ مسٹر Duffield ہمارا سارجنٹ میجر تھا جس کا تعلق انگلستان کے (British Cold Stream Guards) کی رجمنٹ سے تھا۔ یہ شخص اپنی ترش مزاجی اور سخت دلی کی وجہ سے کیڈٹس کے لئے ایک ڈراؤنے خواب کی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ Duffield کو اجازت تھی کہ وہ کیڈٹ کی کسی بھی غلطی کی بھاری سے بھاری سزا دے سکتے تھے۔ کسی نے پریڈ میں سستی دکھائی تو اسے کوارٹر گارڈ میں بھیجنے کے بھی مجاز تھے۔ کیڈٹس کی بھاری اکثریت میں وہ ناپسندیدہ شخص قرار دیئے جا چکے تھے۔

ہمارا ایک کیڈٹ ساتھی Duffield کے مسلسل جبر اور تشدد کا شکار رہا تھا۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ جب وہ سیکنڈ لیفٹیننٹ کا Rank لگائے گا تو سب سے پہلے Duffield کی جی بھر کر خبر لے گا اور اپنے پر کئے گئے ہر ظلم کا حساب لے گا۔ جب گریجویشن پریڈ ختم ہوئی تو وہ کیڈٹ سیدھا اپنے کمرے میں گیا۔ جلدی جلدی سیکنڈ لیفٹیننٹ کی وردی پہنی اور سڑک پر آ کر کھڑا ہو گیا تاکہ Duffield سے مڈبھیڑ ہو سکے۔ تھوڑی دیر کے بعد Duffield وہاں سے گذرا۔ اس نے اس نئے افسر کو دیکھا مسکرا کر حال پوچھا مگر سلیوٹ نہیں کیا اور چلنے لگا تو کیڈٹ نے اسے غصہ سے رکنے کو کہا۔ بہت رعب کے ساتھ Duffield کی ڈیوٹی سے غفلت برتنے پر سرزنش شروع کر دی۔ Duffield نے موقع کی نزاکت کو بھانپ کر برجستہ جواب دیا۔ ''سر! آپ نے یونیفارم پر Rank کا صحیح استعمال نہیں کیا'' آپ جب تک اکیڈمی سے دس میل دور نہیں چلے جاتے یہ

Rank استعمال نہیں کر سکتے'' کیڈٹ کھسیانا ہو گیا۔ اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن بدلہ لینے کی آگ کیونکر بجھتی۔ اس نے اکیڈمی سے نکل کر دس میل کا سفر طے کیا، واپس آیا اور پھر سیدھا Duffield کے دفتر پہنچ گیا۔ Duffield نے اسے دیکھا۔ اپنی کرسی سے فوراً اٹھا اور کھڑاک سے ایک سلیوٹ جڑ دیا۔ اب کیڈٹ کے لئے مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔

PMA کی ایک اور روایت تھی۔ گریجویشن مکمل کرنے والے میرٹ لسٹ کے مطابق پہلے دس کیڈٹ اپنی مرضی کی رجمنٹ کا انتخاب کر سکتے تھے۔ میں ساتویں نمبر پر تھا۔ اس لئے میں نے اپنی مرضی سے 5/13 فرنٹیئر فورس رائفلز کا انتخاب کیا۔ Armoured Infantry کی ایک رجمنٹ ہے۔ جس کو اب 10th Frontier Force Regiment کہا جاتا ہے۔ اس میں میری تقرری ہو گئی۔

ابتدائی تیاری

یہ رجمنٹ تقریباً ایک سو سال پرانی تھی۔ (پاکستان بننے کے بعد یہ پہلی رجمنٹ تھی جسے آرمڈ انفنٹری رجمنٹ بنایا گیا) اس رجمنٹ میں ایک نئے اور سیکنڈ لیفٹیننٹ کی زندگی کا نیا تربیتی دور شروع ہوگیا۔ یہاں پر زندگی ''ہر لحہ تیار'' کا عملی نمونہ تھی۔ کیپٹن کے Rank تک کے تمام افسر ہر لحہ یوں چاک و چوبند رہتے تھے جیسے وہ کسی محاذ پر صف آراء ہوں۔ رجمنٹ کا نام ''دستوری'' جس کا لفظی مطلب ہر کام دستور اور قانون کے عین مطابق کرنا یہی اس رجمنٹ کا منشور بھی تھا۔ یہاں پر جونیئر افسر صرف ''یس سر'' کہہ کر کام کرتے نظر آتے تھے۔ حکم کو خاموشی سے ماننا اور اس پر مکمل عمل درآمد کرنا اس رجمنٹ کا دستور تھا چونکہ یہاں کے تمام افسر قابلیت کے لحاظ سے اونچے درجے سے تعلق رکھتے تھے اس لئے قدرتی طور پر یہاں کے ماحول میں یگانگت، تہذیب اور ترقی کا عنصر غالب تھا۔ ہم لوگ اکٹھے رہتے۔ اکٹھے کھیلتے، اکٹھے کھانا کھاتے اور اکٹھے ہی کلب میں اپنے فرصت کے لمحے گذارتے۔ سفر کی ابتداء میں ہی اگر اچھے ہم سفر مل جائیں تو سفر چاہے کتنا بھی کٹھن ہو، خوشگوار ماحول میں سہل ہو جاتا ہے۔

آفیسرز میس میں شامیں گپ شپ میں گذر جاتیں۔ میس جدید طرز کا تھا۔ ہم لوگ بھی indoor کھیل کھیلتے اور کبھی لائبریری سے کوئی رسالہ یا کتاب اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرتے رہتے۔ آفیسرز میں ایک دلچسپ عادت تھی جب بھی کسی ملازم یا بیرے کو آرڈر دینے کے لئے بلاتے تو پہلے ''کوئی ہے'' ضرور کہتے۔ ایک شام ایک افسر باہر لان میں رکھی ہوئی کولڈ ڈرنک بار پر گیا۔ کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے ہوئے بار مین کی طرف دیکھا لیکن اونچی آواز سے ''کوئی ہے'' پکار دیا۔ مسکراتے ہوئے سامنے کھڑے بار مین نے اسی اونچی آواز میں جواب دیا: ''جی جناب! میں ہوں بگا خان!'' اور پھر دونوں کھلکھلا اٹھے۔

شان دار روایات

دستوری رجمنٹ نے اپنی انفرادیت اور تربیتی مہارت قائم رکھنے کے لئے چند روایات قائم کر لی تھیں جن کو آرمی کی ہائی کمان کی بھی تائید حاصل تھی اور وقتاً فوقتاً ان کی عزت افزائی بھی کی جاتی تھی۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے ایک آدھ کا ذکر کرنا لاحاصل نہ ہوگا۔ مثلاً سپاہیوں کو چاک و چوبند رکھنے کے لئے ایک پریڈ ہوتی تھی۔ جس کو ''پندرہ منٹی'' پریڈ کہا جاتا تھا۔ یہ پریڈ کسی پروگرام کے بغیر ایک بگل کے بجنے پر شروع ہوجاتی تھی۔ ہوتا یوں تھا کہ جونہی بگل بجتا ہر ایک اپنا کام چھوڑ کر جلد از جلد گروپوں میں تقسیم ہوجاتے اور دوسرا بگل بجنے تک 120 کی جگہ 140 قدم فی منٹ کی رفتار پر پریڈ کرتے۔ ''پندرہ منٹی'' پریڈ سپاہیوں کو یقیناً گرما دیتی تھی اور ان کی ذہنی تربیت بھی کردیتی تھی۔ جس کے نتیجے میں وہ تازہ دم نظر آتے تھے۔ اسی طرح کی ایک اور پریڈ تھی جس کا نام 406 انسپکشن پریڈ تھا۔ اس میں تمام کمپنیوں کو حکم ملتا کہ ان کے سپاہی کلف لگے استری شدہ یونیفارم پہنے ہوئے پیٹ کے بل زمین پر لیٹ جائیں یا ''گر جائیں'' Fall in کے حکم پر ان کے یونیفارم کا تفصیلی معائنہ ہوتا۔ ان کی رائفلوں کا چمکتا ہوا پایا جانا۔ ان کے بوٹ کے نیچے پورے تیرہ عدد کیل وغیرہ وغیرہ معائنہ کا حصہ تھے۔ صفائی کا اعلیٰ معیار رکھنے کا انعام تو کوئی نہیں تھا لیکن ہر سپاہی سے امید کی جاتی تھی کہ وہ اس معیار پر پورا اترے۔ ظاہر ہے سستی اور کاہلی کی سخت سزا ملتی۔ اس پریڈ کو ہر سپاہی کے احساس ذمہ داری کا پیمانہ بھی سمجھا جاتا۔ افسران کو بھی کمانڈنگ افسر کے سامنے اسی طرح معائنے کے لئے پیش ہونا پڑتا۔ حالانکہ یہ معائنہ کبھی کبھار ہوتا لیکن اس کی بدولت کوئی افسر بھی سستی کا متحمل ہوکر سرزنش کروانا پسند نہ کرتا اور نتیجتاً سب آفیسر سمارٹ اور چمکدار نظر آتے۔

صاحب شاہ کی یاد

کمیشن حاصل کرنے والے نئے افسران کے لئے ایک خاص ڈرل ٹریننگ کورس کرنا لازمی تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ نئے آنے والوں کو رجمنٹ کے مخصوص سانچے میں ڈھالا جاسکے۔ حالانکہ ہم لوگ PMA سے سخت ترین ڈرل کرتے چلے آرہے تھے پھر بھی اس رجمنٹ کی ڈرل ٹریننگ کرنا لازمی تھا۔ اس کی افادیت ہماری سمجھ سے بالاتر تھی جس کا اظہار ہم آپس میں بھی کرتے لیکن بے سود۔ رجمنٹ کی انفرادیت قائم رکھنے کے حوالے سے جو ورزش کا کورس ہم نے کیا اس کے انچارج حوالدار میجر صاحب شاہ تھے۔ میانوالی کے بندوخیل قبیلے سے تعلق رکھنے والے یہ حوالدار میجر انسان کم اور روبوٹ زیادہ لگتے تھے۔ ہم نے انہیں کبھی مسکراتے نہیں دیکھا۔ ان کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ اگر انہیں خود بھی سونا ہوتو اپنے کو شاید آرڈر دے کر سلاتے ہوں گے۔

بہر حال میں ان کی تہہ دل سے اس لئے عزت کرتا ہوں کہ ان میں احساس ذمہ داری اور اپنے کام سے لگن عبادت کی حد تک موجود تھی۔ انگریز ایسے لوگوں کی بدولت ہی تو ایک صدی تک اتنی بڑی سلطنت پر حکمرانی کرتے رہے تھے۔

قاضی واحد کے اعزاز میں ایک الوداعی عشائیہ

فوج میں عملی زندگی کے شروع ہوتے ہی نت نئے تجربات سے آمنا سامنا ہوتا رہا۔ میں یہ واضح طور پر محسوس کر رہا تھا کہ اب کے بعد زندگی ایک بل کھاتی پہاڑی پگڈنڈی کی طرح پر خطر اور صبر آزما ہوگی۔ میں نے اپنی رجمنٹ کو کلر کہار کے علاقے میں جوائن کیا۔ یہاں ایک بڑی Field Exercise کی تیاری ہو رہی تھی جس کا نام November Handicap تھا۔ اس قسم کی Exercise میں باقاعدہ شامل ہونے کا پہلا موقع تھا۔ خوشگوار اور ناخوشگوار بہت سے واقعات ذہن میں ابھر رہے ہیں۔ یہاں ایک بات ضرور کہتا چلوں کہ فوج میں سوشل لائف بھی بہت بھرپور ہوتی ہے۔ آپس میں بھائی چارے اور اخوت کی فضا ہوتی ہے۔

لیفٹیننٹ اکرم کے خیمے میں

ڈسپلن کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کی مدد کرنا اور کبھی کبھار ایک دوسرے کی غلطی پر پردہ ڈالنا بھی اس زندگی کا حصہ ہے۔ چکوال کے علاقے میں رجمنٹ کا چند دن قیام تھا۔ مجھے کہا گیا تھا کہ میں اور لیفٹیننٹ اکرم ایک ساتھ ٹینٹ میں رہیں گے۔ اکرم دبلا پتلا بہت ہی لمبے قد کا آفیسر تھا۔ ہم اسے Linco کہہ کر بلایا کرتے تھے کیونکہ وہ امریکہ کے پریذیڈنٹ ابراہیم لنکن سے بہت مشابہت رکھتا تھا۔ November Handicap Exercise کے شروع ہونے کا وقت آن پہنچا۔ ہم لوگوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا تھا تاکہ جنگ کا سماں بندھ سکے۔ ایکسر سائز (Exercise) کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ اصل محاذ پر لڑنے کے لئے تیار رہا جائے۔ لیفٹیننٹ اکرم نے مجھے رات کے کھانے پر بتایا کہ علی الصبح اس کی Charlie کمپنی اپنے ساز و سامان کے ساتھ کوچ کرے گی اور وہ ٹینٹ جس میں ہم دونوں رہ رہے تھے ساتھ لیجایا جائے گا۔ میں نے اس کی بات کو سنجیدگی سے نہ لیا یہ سوچتے ہوئے کہ اگر ایسا ہونا ہوتا تو کوارٹر ماسٹر مجھے ضرور بتا دیتا اور میرے لئے کوئی متبادل انتظام کر دیتا۔ رات کو جب ہم سونے کے لئے لیٹے تو اکرم نے ایک بار پھر مجھے صبح کا پروگرام دہرا کر بتایا اور سمجھایا کہ میں اپنے لئے کوئی انتظام کرلوں۔ لیکن ایک بار پھر میرا ذہن اپنے پہلے والے تجزیے سے چپکا رہا۔ صبح جب میری آنکھ کھلی تو میں کھلے آسمان تلے لیٹا

ہوا تھا اور میرے سرہانے میرا اردلی چائے کا تھرماس لئے کھڑا تھا۔ میرے اوپر سے ٹینٹ اس قدر خاموشی سے اتارا گیا کہ مجھے آج بھی حیرت ہوتی ہے کہ رات کے اندھیرے میں جن سپاہیوں کو ٹینٹ اتارنے کی ہدایت کی گئی ہوگی ان میں کس قدر نظم وضبط ہوگا کہ انہوں نے رات کے سناٹے کے باوجود اس قدر احتیاط اور خاموشی سے خیمہ اکھاڑا کہ میری نیند میں مخل تک نہ ہوئے کھلے آسمان تلے لیٹے ہوئے اپنی بیچارگی پر غصہ بھی بہت آیا لیکن ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ کو کچھ کہنے کی ہرگز اجازت نہیں تھی۔ سبق جو میں نے سیکھا وہ یہ تھا کہ اپنی مدد آپ کرنی چاہیے اور کسی دوسرے کے بھروسے پر انتظامات کو نہیں چھوڑنا چاہیے۔

امریکی گاڑیوں کو خوش آمدید

1956ء میں امریکی فوجی امداد میں رجمنٹ کے لیے نئی گاڑیاں بھیجی گئیں۔ زیادہ تر گاڑیاں کوریا سے آئیں کیونکہ کوریا کی جنگ ختم ہو چکی تھی۔ ڈرائیور گاڑیوں کو حسب ضرورت استعمال کرنے سے پہلے ان کو ابتدائی طور پر رواں کرنے کے عمل کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں مصروف ہو گئے۔

امریکی گاڑیوں کی تبدیلی کے دوران تمام عرصے میں بے حد مصروف ہو گیا۔ کیونکہ میں رجمنٹ کے لیے گاڑیوں کی دیکھ بھال کی سہولت کا نگران تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے زمانے کی برطانوی گاڑیاں تبدیل کی جا رہی تھیں۔ وہ گاڑیاں نہایت تکلیف دہ تھیں۔ ہم ان کو چمکا کر رکھتے اور وہ گاڑیوں کے احاطے میں کھڑی اچھی دکھائی دیتیں، لیکن اب وہ محض انتظامی یا فوجی سرگرمیوں کے لیے لمبے فاصلے تک سفر کرنے کے قابل نہیں تھیں۔ مجھے وہ گزرا وقت یاد آتا ہے جب رجمنٹ سے کہا گیا کہ جزوی سروسامان کے ساتھ کھوڑہ تک جانے اور پھر وہاں سے واپسی کا سفر کیا جائے۔ یہ مشق علی الصبح شروع ہوئی تھی اور ہمیں اندھیرا پھیلنے سے پہلے واپس جانا تھا۔ جونہی پرانی برطانوی گاڑیاں چلائی گئیں تو کچھ راستے میں کبھی ایک تکنیکی خرابی اور کبھی دوسری کی وجہ سے رک گئیں۔ فوجی کارواں کا راستہ جنرل ہیڈ کوارٹرز کے سامنے سے گزرتا تھا اور یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ کچھ گاڑیاں عین اس جگہ سڑک کے کنارے مصیبت کا شکار ہو گئیں۔ ڈرائیور بونٹ اوپر کر کے مکینک کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ مشق کے بعد تمام گاڑیاں رجمنٹ کے گاڑیوں کے احاطے میں لے جائی گئیں۔ جن گاڑیوں میں زیادہ بڑی خرابی تھی ان کو گھسیٹتے ہوئے وہاں لے کر گئے۔

شام کو میں مسلح بریگیڈ ہیڈ کوارٹرز کے جی ایس او۔ 111 (جنرل سٹاف آفیسر درجہ 111) کیپٹن علی امام سے رسمی ملاقات کے لیے گیا۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ کشمیر ہوٹل میں قیام پذیر تھے۔ وہ مجھے چہل قدمی کرنے کے لیے لے گئے۔ جونہی ہم سڑک پر آئے، ہماری ملاقات بریگیڈئر عتیق

الرحمان (بعد ازاں لیفٹیننٹ جنرل) سے ہوئی، وہ بھی اپنے کتے کے ساتھ چہل قدمی کر رہے تھے۔ ہم نے ان سے مصافحہ کیا۔ کیپٹن علی امام سے مخاطب ہوتے ہوئے بریگیڈیئر بولے ''آج کل کیا ہو رہا ہے! کیا کوئی مشق ہو رہی تھی؟ علی امام یہ سوچتے ہوئے کہ بریگیڈیئر ہیڈ کوارٹر کی تربیتی مشقوں کا مشاہدہ کر کے خوش ہے، کہنے لگے ''جی ہاں! 5/13 نے ایک متحرک مشق انجام دی ہے''۔ بریگیڈیئر نے مسکراتے ہوئے کہا، ''اچھا، میں سمجھا وہ کوئی سپلائی رجمنٹ ہے جس کی گاڑیاں سڑک کے کنارے تمام راستے پر بند کھڑی ہیں''۔ جنرل عتیق فوج میں اپنی اس طنزیہ ظرافت کی وجہ سے مشہور تھے۔

کمان کی تبدیلی

ایک نئے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل گل خان کی رجمنٹ میں آمد ہوئی۔ وہ اس کمانڈ میں 4/13 فرنٹیئر فورس رائفلز سے تبدیل ہو کر آئے تھے جسے اب 9th فرنٹیئر فورس رجمنٹ کہا جاتا ہے۔ عام طور کمانڈنگ آفیسر اسی شخص کو تعینات کیا جاتا ہے جس کا تعلق اس کمانڈ سے ہوتا ہے۔ ممکن ہے اس سلسلے میں جنرل ہیڈ کوارٹر کو کوئی مشکلات درپیش رہی ہوں۔ وہ ایک باعمل شخص تھے لیکن روایتی رجمینٹل طرزِ زندگی پر مکمل طور پر عمل نہیں کرتے تھے۔ وہ یہاں کے سخت اصولوں پر کاربند طرز زندگی کو کسی نہ کسی طور پر تبدیل کرنے کے ارادے سے آئے تھے۔ ایک دن ہمیں حکم ملا کہ راولپنڈی سے کھاریاں کنٹونمنٹ کی طرف چلے جائیں۔ ایک مسلح انفنٹری رجمنٹ ہونے کی حیثیت سے ہم اپنی ذاتی سواریوں کے ساتھ تیار تھے۔ ہماری اس نقل وحرکت کے منصوبے کے مطابق، یہ اندازہ لگایا گیا تھا کہ موجودہ رجمنٹ کی گاڑیوں کے ذریعے تمام ساز وسامان یہاں سے کھاریاں منتقل ہونے میں ایک ہفتہ لگے گا۔

کھاریاں کنٹونمٹ کو امریکہ کی حکومت نے اپنی فوجی امداد کے ایک حصے کے طور پر تعمیر کیا تھا۔ 1957ء کے آخر تک زیادہ تر رہائش گاہیں تعمیر ہو چکی تھیں۔ تاہم امریکی انجینئروں کو سیکورٹی برقرار رکھنے میں مشکلات درپیش تھیں۔ روزانہ وہاں چوری اور چیزیں ٹوٹنے کے واقعات سامنے آتے تھے۔ انہوں نے ابتدائی طور پر یہ منصوبہ بنایا کہ جیسے بلڈنگ مکمل ہو تو اسے فوج کے حوالے کر دیا جائے تاکہ سیکورٹی کے مسئلہ پر قابو پایا جا سکے۔ میری رجمنٹ کو حکم ملا کہ کھاریاں جا کر فوجیوں کو ملنے والی رہائش گاہوں کا کنٹرول سنبھال لیں اور انہیں مزید سیکورٹی کا عملہ بھی فراہم کریں۔ لہٰذا پلین کے مطابق ہر روز سامان سے لدے ہوئے بھاری کارگو ٹرکوں کا قافلہ رجمنٹ لائینز راولپنڈی سے کھاریاں کے لیے روانہ ہوتا اور اسی دن رات تک واپس آجاتا۔ آنے اور جانے کا وقت تقریباً

12 گھنٹے بنتا تھا۔

ہر روز ایک سامان سے لدا ہوا گاڑیوں کا قافلہ روانہ ہوتا اور شام تک واپس آجاتا تھا۔ یہ ایک مشکل عمل تھا کیونکہ گاڑیوں نے اپنی ابتدائی سفری معیاد پوری نہیں کی تھی۔ لہٰذا گاڑیوں کے ہدایتی کتابچے کے مطابق اس پر کم سامان رکھا جاتا اور ان کی رفتار 18 سے 20 میل فی گھنٹہ تک رہتی۔ معاون افسر اور تکنیکی افسران نظام اوقات سے مستثنیٰ تھے۔ میں نے رضا کارانہ طور پر ایک اور افسر کے ہمراہ قافلے کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا، میں نے ایسا اس لیے کیا کہ میں نے اس سے پہلے کھاریاں نہیں دیکھا تھا اور اس کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ ہم کھاریاں کنٹونمنٹ پہنچے تو اسے گرم، گرد آلود اور خشک پایا اور وہاں گھاس تک نظر نہیں آتی تھی۔ رہائش گاہیں انتہائی مہارت سے تعمیر کی گئی تھیں۔ میں کھاریاں کی شاندار رہائش گاہ میں رہنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ راولپنڈی کی رہائش گاہیں بہت تنگ تھیں اور بارش کے بعد ٹپکنے بھی لگتی تھیں۔

ہم واپسی پر 8:30 بجے رات راولپنڈی پہنچے تو گرمی سے تھکے ہوئے اور نڈھال تھے۔ تاہم اگلے دن میں وقت پر پریڈ میں موجود تھا۔ پریڈ کے بعد انٹیلی جنس افسر کیپٹن رضا علی نے مجھے بتایا کہ ایک دن پہلے کمانڈنگ افسر میرے بارے میں پوچھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ میں کھاریاں ان کی اجازت کے بغیر گیا ہوں۔ میرے لیے یہ صدمے کی بات تھی کیونکہ میں نے شدید گرمی میں رضا کارانہ طور پر یہ دورہ کیا تھا اور تقریباً تمام دن بے لطف اور کم رفتار سفر کرتا رہا اور اسی دن واپس بھی لوٹنا پڑا۔ میں یقینی طور پر لطف اندوز ہونے کے لیے کسی خوش کن دورے پر نہیں گیا تھا۔ کمانڈنگ افسر نے مجھے اپنے دفتر میں بلا کر کہا کہ میں بغیر اجازت یا چھٹی کے دفتر سے غائب تھا اور اگر آئندہ ایسا ہوا تو وہ میرے خلاف قانونی طریقے سے کارروائی کرے گا۔ میں وہاں سے فوری طور پر چلا گیا اور سیدھا سیکنڈ ان کمانڈ کو کمانڈنگ افسر کی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ انہوں نے وجہ پوچھی تو میں نے کہا کہ کمانڈنگ افسر کچھ غلط کہہ رہا ہے اور میں نے اس کے آگے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ مجھے پوچھ گچھ کا حق حاصل تھا لہٰذا میں نے اس سے کہا کہ مجھے اس کی قیادت میں کام کرنے کی خواہش نہیں اور فوری طور پر میرا تبادلہ کہیں اور کر دیا جائے۔ میں نے انہیں کہا کہ اگر وہ اگلے دن ایسا نہیں کر سکتے تو میں بریگیڈ کمانڈر سے ملوں گا۔

میں نے کمانڈنگ افسر کو سیلوٹ کیا اور چاق و چوبند کھڑا رہا۔ اس نے مجھے رکنے کے لیے کہا اور بولا ''صبر سے کام لو، بریگیڈ کمانڈر سے ملنے کی ضرورت نہیں''۔ اس کا لہجہ سختی سے نرمی میں بدل گیا تھا۔ اس نے کہا جاؤ اور اپنا کام کرو۔ جلد ہی مجھے سیکنڈ ان کمانڈ نے بلایا اور ایک بڑے کی طرح

بات کی اور مجھ سے کہا کہ میں سب کچھ بھول جاؤں۔

میں صرف ایک بات سوچ رہا تھا کہ کرنل گل خان نے آخر کیوں مجھے بغیر اجازت چھٹی لے کر جانے کا مجرم قرار دیا۔ اس کی مجھے ایک ہی وجہ سمجھ میں آئی کہ میں نے آرمی ایوی ایشن میں ایک پائلٹ بننے کے لیے درخواست دی تھی۔ میرے اس طرح رضا کارانہ کام کرنے کے چند دن بعد میں کرنل گل خان کے ہمراہ ٹلہ آرٹلری رینجز پر فائرنگ کی مشقوں کا معائنہ کرنے گیا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ مجھے پسند کرتے ہیں اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے مجھے رجمنٹ کے ادجوٹنیٹ کی حیثیت سے تعینات کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میں نے راستے میں انہیں بتایا کہ میں رضا کارانہ طور پر آرمی ایوی ایشن میں شامل ہونا چاہتا ہوں لیکن ابھی تک آپ نے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو میرا نام تجویز نہیں کیا۔ انہوں نے میری درخواست پر توجہ نہیں دی بلکہ یہ کہا کہ مجھے رجمنٹ میں ہی رہنا چاہیے۔ آرمی ایوی ایشن کو بھول جانا چاہیے۔ کچھ ہی دنوں بعد میں نائب افسر کے پاس پوچھنے گیا کہ کیا میری درخواست منظوری کے لیے آگے بھیج دی گئی ہے۔ مجھے یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ میری درخواست کمانڈنگ افسر کی ملتوی ڈاک والی ٹرے میں پڑی تھی۔ لہٰذا میں کمانڈنگ افسر سے ملا اور ان سے درخواست کی کہ وہ میری درخواست پر دستخط کر دیں اور اسے آگے بھجوا دیں چاہے اس پر آپ نے ''نامنظور'' کے کلمات ہی کیوں نہ لکھ دیئے ہوں۔ انہوں نے ہرگز یہ بات نہ مانی ایسا لگتا تھا کہ وہ یہ تاثر قائم کرنا چاہتے تھے کہ جیسے میں ان کی زیر قیادت کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس سارے معاملے پر مجھے بہت افسوس ہوا۔ صرف یہ ایک واقعہ تھا جس کی وجہ سے انہوں نے میرے ساتھ ایسا شدید رویہ اختیار کیا۔

کچھ عرصہ بعد مجھے جنرل ہیڈ کوارٹر لاہور سے انٹر سروسز کرکٹ ٹیم کے کھلاڑی کی حیثیت سے کرکٹ کیمپ میں شامل ہونے کے لیے بلایا گیا۔ کمانڈنگ آفیسر نے مجھے کرکٹ کیمپ میں شامل ہونے سے روکنے کی کوشش کی لیکن اوپر سے ہیڈ کوارٹر راضی نہیں ہوا۔ لہٰذا میں لاہور چلا گیا۔ اس وقت ملک میں مارشل لاء لگ گیا جس کے نتیجے میں لیفٹیننٹ کرنل گل خان کو گجرات میں مارشل لاء کے فرائض نبھانے کے لیے مقرر کر دیا گیا۔ کچھ وجوہات کی وجہ سے وہ کمانڈ سے خارج ہو گئے اور اسٹیشن ہیڈ کوارٹر راولپنڈی چلے گئے۔ بعد ازاں انہیں نوکری سے فارغ کر دیا گیا۔

جوان دستوری افسروں کا استحصال

تمام افسران جو آفیسرز میس میں رہتے تھے ہمیشہ کلب اور فلم دیکھنے اکٹھے جایا کرتے تھے۔ نئے سال کی شب کا موقع تھا اور راولپنڈی کلب ثقافتی تقریبات کے لیے اسی مناسبت سے سجایا گیا تھا۔ کلب کے ممبران کی بڑی تعداد ڈیفنس سروس کے حاضر اور ریٹائر افسران پر مشتمل تھی۔ کیپٹن

ربانی (بعد میں میجر جنرل)، جنہیں عام طور پر جارج کہا جاتا تھا، کیپٹن شاہ نواز خالد، لیفٹیننٹ اکرم، احمد کمال (بعد میں لیفٹیننٹ جنرل)، رضا علی اور میں رات 9 بجے راولپنڈی کلب کی جانب روانہ ہو گئے۔ کلب خاص طور پر سرگرمیوں سے بھرپور تھا۔ کیوں کہ اس اجتماع میں مرد اور خواتین دونوں شامل تھے۔ کچھ لوگ مشروبات پی رہے تھے، کچھ لوگ جیک پوٹ مشین کے ساتھ کھیل رہے تھے اور کچھ لوگ رقص گاہ کے گرد بیٹھے بینڈ بجنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ہر کوئی خوش لگتا تھا اور اس سے لطف اندوز ہوتا نظر آ رہا تھا۔ ایک بڑی تعداد میں اٹک آئل، یونائیٹڈ نیشن کی ایک تنظیم اور یونائیٹڈ نیشن کے ایڈ کے شعبہ سے غیر ملکیوں کی آمد نے تقریب کو پرجوش اور پر لطف بنا دیا تھا۔

بینڈ بجنا شروع ہو گیا اور رقص میں دلچسپی رکھنے والے جوڑے سٹیج کی طرف چل پڑے اور موسیقی کی دھن کے ساتھ جھومنا شروع کر دیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ لوگوں کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ ناچنے والے مشکل سے ناچ رہے تھے، ان کے صرف پاؤں حرکت کر رہے تھے۔ زیادہ تر شرکت کرنے والوں نے نئے سال کی کاغذی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ ہم انتظار کر رہے تھے کہ پرانا سال ختم ہو اور نئے سال کا آغاز ہو۔

آدھی رات کو ایک منٹ کے لیے بتیاں گل کر دی گئیں اور پھر دوبارہ روشن کر دی گئیں۔ ہم سب مجمع میں شامل ہو گئے اور ایک دوسرے کو نئے سال کی مبارک باد دینا شروع کر دی۔ اچانک ہم نے بار سے ہنگامے کی آواز سنی۔ میں کمال کے ساتھ بار کی طرف لپکا اور رضا علی کو آرمرڈ کور کے ایک لیفٹیننٹ کرنل کے ساتھ جھگڑا کرتے ہوئے دیکھا۔ رضا علی بہت غصے میں لگ رہا تھا اور کہہ رہا تھا ''آؤ میں تمہیں سبق سکھاتا ہوں''، ہم اس کی منطق کو نہیں سمجھ سکے۔ اسے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا مگر خدا کا شکر ہے کہ وہ محض ایک جھگڑا تھا اور ہاتھا پائی نہیں ہوئی۔ ان دنوں بار میں ہونے والی کسی بھی قسم کی لڑائی کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی اور لوگ اپنے غصے کو گھر تک ساتھ لے کر نہیں جاتے تھے۔ رنجش وہیں چھوڑ دی جاتی اور اگلے دن وہ دوست بن جاتے تھے۔

راولپنڈی کلب میں تقریب ختم ہو چکی تھی مگر رات ابھی تک جوان تھی لہٰذا جارج ربانی نے فوری طور پر تمام ''دستوری'' دوستوں کو اکٹھا کیا اور فیصلہ کیا کہ ڈیپارٹمینٹل کلب کی طرف چلیں۔ یہ اینگلو انڈینز کا پسندیدہ کلب تھا جو زیادہ تر راولپنڈی میں مقیم تھے۔ جارج نے بار میں سویلین سے جان پہچان بنا رکھی تھی۔ اس شریف آدمی کے پاس ایک بڑی کار تھی اور اس نے ہمیں ڈیپارٹمینٹل کلب لے جانے کی پیشکش کی جو جارج نے قبول کر لی۔ ہم سب کار میں بیٹھ گئے اور کلب کی طرف روانہ ہو گئے۔

ڈیپارٹمینٹل کلب گنجائش سے زیادہ بھرا ہوا تھا اور وہاں داخل ہونا تقریباً ناممکن تھا لیکن ہم وہاں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہمیں بھوک لگی تھی اور ہم کچھ کھانا چاہتے تھے۔ اپنی بہترین کوشش کے باوجود ہم بیرے کی توجہ حاصل نہ کر سکے کہ وہ ہمیں کچھ لا کر دے۔ بینڈ زور دار موسیقی بجا رہا تھا اور لوگ رقص سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جیسے ہی کھانے کے لیے کچھ آیا جوڑوں نے رقص چھوڑ دیا اور واپس اپنی میزوں کے گرد بیٹھ گئے۔ ایک بیرا کھانے سے بھری ہوئی ٹرے لے کر جارج کے قریب سے گزرا۔ جارج لمبے قد کا آدمی تھا اور بھاری آواز کے علاوہ مضبوط بھی تھا۔ بھوکا ہونے کی وجہ سے جارج نے موڑ میں آ کر ایک چکن پیس بیرے کی ٹرے سے اٹھا لیا۔ اس کے پیچھے ہی کیپٹن مرانڈا تھے جو اس طرح کی ناشائستہ جرأت پر جارج پر چلانے لگے۔ جارج نے اسے مذاق کے طور پر لیا اور مسکراتے ہوئے کہا ''یہ نیا سال ہے مرانڈا! کیا بات ہے؟''۔ مرانڈا تیز آواز میں چیخا اور دھینگا مشتی شروع ہو گئی۔ ہم نے کچھ اور لوگوں کے ساتھ مل کر انہیں آپس میں دست و گریبان ہونے سے روکا۔ ایک بیرا جارج کو ٹھنڈا کرنے آیا لیکن اس وقت تک جارج غصے میں تھا وہ چلایا اور بیرے کو ٹانگ مار دی۔ وہ بیرا جو جسمانی طور پر کمزور تھا، جھولنے والے دروازے سے باہر جا گرا اور بھاگ گیا، دوسرے دوستوں کے اصرار پر ہم نے کلب سے جانے کا فیصلہ کیا۔

بہت سردی تھی اور ہم بھوکے تھے لہٰذا ہم نے اس شریف آدمی کا انتظار کیا جو ہمیں کلب لے کر آیا تھا تا کہ اب ہمیں واپس میس تک لے جائے۔ جارج نے ایک مرتبہ پھر اونچی آواز میں پکارا ''تم کہاں ہو؟ ایک کونے سے پارکنگ روٹ سے جواب آیا۔'' جناب میں پیشاب کر رہا ہوں''۔ جب وہ کار کے قریب آیا تو اس پر موت جیسا خوف طاری تھا اور کچھ کہے بغیر اس نے ہمیں میس چھوڑ دیا۔ ہم نے اسے پھر کبھی نہیں دیکھا۔

خوبصورت دن

یہ عام رواج تھا جب دوست اور ساتھی طلبہ جس شہر کا تفریحی دورہ کرنے جاتے وہاں اپنے دوستوں میں سے کسی ایک کے ساتھ رہائش پذیر ہو جاتے۔ دورے کا منصوبہ بنانے سے پہلے ان کی موجودگی کے بارے میں ٹیلی فون کر کے پوچھا نہیں جاتا تھا۔ اردلیوں کو یہ تربیت دی جاتی تھی کہ وہ ایک کمرے میں مہمان کے لیے اضافی بستر کا انتظام رکھیں۔ وہ خوشیوں کے دن تھے اور ہم ایک دوسرے سے اس قدر بار بار ملنا چاہتے تھے، جس قدر ہماری جیب ہمیں اجازت دیتی تھی۔ لیفٹیننٹ سلیم فاروقی (بعد میں میجر جنرل) جی ایچ کیو ڈینٹل کلینک راولپنڈی میں بحیثیت ڈاکٹر آئے تھے، وہ سائیکل چلانے کے بہت شوقین تھے اور سائیکلوں کی قومی ریس (دوڑ) میں حصہ لیتے تھے۔ انہوں

نے پاکستان سائیکلنگ ٹیم کے ممبر کی حیثیت سے بیرون ملک دورہ بھی کیا۔ انہیں میرے ساتھ کمرے میں رہنے کو کہا گیا، جب تک کہ انہیں اپنی ذاتی رہائش نہیں مل جاتی۔ ان دنوں راولپنڈی میں رہائشی صورت حال خاصی خراب تھی اور پانی کی ترسیل کافی کم تھی۔ یونٹ کا ایک پانی کا ٹریلر میس کو پانی فراہم کرتا جس میں سے اردلی بالٹیوں میں پانی بھر کر غسل خانہ میں رکھ دیتے تھے۔

فاروقی اور میں اچھے دوست بن گئے۔ موسم سرما میں ہفتے کی ایک دوپہر، موسم ابر آلود تھا اور ہم نے کھیلنے کے لیے جانے کی بجائے اپنے کمروں میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ حتیٰ کہ ہم نے کھانا بھی اپنے کمرے میں کھایا۔ ایک دوست کی طرف سے بطور تحفہ بھیجے ہوئے سنگترے ہمارے کمرے میں موجود تھے، جو ہم نے اپنے فارغ وقت پر کھائے۔ فاروقی پہلے ہی واہ کنٹونمنٹ، جو راولپنڈی کے شمال کی طرف 20 کلومیٹر پر واقع ہے، سائیکل پر جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اگلے دن اتوار کو جو ہفتہ وار چھٹی تھی، ساری شام فاروقی مجھ سے یہ درخواست کرتا رہا کہ میں بھی دوسری سائیکل پر اس کے ساتھ چلوں۔ میرے لیے اس کی یہ پیشکش قبول کرنا ناممکن تھا کیوں کہ میرا بائیسکل چلانے کا تجربہ محض یونٹ لائن کو جانے اور واپس آنے تک محدود تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں اس کی درخواست قبول نہیں کر رہا تو اس نے اپنی باتوں سے مجھے اکسانا شروع کر دیا اور کہا کہ میں ایسی مہم جوئی سے ڈرتا ہوں جس میں جانی نقصان کا خطرہ لاحق ہو۔ میں نے پوری کوشش کی کہ اس کے بہکاوے میں نہ آؤں اور اس کی باتوں کی طرف توجہ نہ دوں۔ لیکن اس نے اپنے شائستہ انداز گفتگو سے اصرار جاری رکھا۔ آخر کار میں نے ہتھیار ڈال دیئے اور سائیکل پر واہ جانے کے لیے رضامند ہو گیا۔

اگلے دن صبح سویرے اس نے دو ریسنگ سائیکلیں نکالیں اور مجھے اپنے لیے ایک منتخب کرنے کا موقع دیا۔ لہٰذا ہم اپنی اپنی سائیکلوں پر واہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہ تیز سائیکل چلاتا تھا اور میرے لیے اتنی رفتار برقرار رکھنا مشکل تھا۔ فاروقی کو کام انجام دینے کا بڑا سلیقہ تھا۔ میں نے اسے کبھی غصے میں نہیں دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ ایک مسکراہٹ ہوتی جو اسے انتہائی خوبصورت بنا دیتی۔ آخر کار ہم واہ پہنچ گئے۔ جہاں ہم نے ایک مینا بازار دیکھا اور خوب کھایا پیا۔ میرا پورا ارادہ تھا کہ میں راولپنڈی سائیکل پر نہیں جاؤں گا اور میں نے فاروقی کو مشورہ دیا کہ ہم بس میں چلے جاتے ہیں۔ اس نے کہا کہ اگر ہماری بٹالین کے افسروں نے ایک مرتبہ بھی ہمیں بس میں سفر کرتے ہوئے دیکھ لیا تو وہ ہم پر ہنسیں گے اور مزید کہا کہ اب واپسی کا سفر سڑک کی ڈھلان کی وجہ سے آسان ہو جائے گا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مذاق کر رہا ہے اور میرے جذبے کو قائم رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنے مؤقف پر ڈٹا ہوا ہے۔ میں معمولی سا احتجاج کرتے

ہوئے سائیکل سے واپسی پر رضا مند ہوگیا۔ جب ہم آفیسرز میس پہنچے تو اس نے نرمی سے مجھے مشورہ دیا کہ ہمیں اسی طرح سائیکل چلاتے ہوئے میجر قمر الزمان سے ملاقات کرنی چاہیے، جو سیٹلا ئٹ ٹاؤن کے اے بلاک میں رہائش پذیر تھے۔ ان دنوں سیٹلا ئٹ ٹاؤن کا سفر خاص طور پر جہاں میجر قمر رہتے تھے، مری روڈ کی ایک صحرائی پٹی کو پار کرنے کے مترادف تھا۔ میں نے صاف طور پر انکار کر دیا۔ اس نے کہا ''میں پہلے ہی میجر قمر کے ساتھ وعدہ کر چکا ہوں کہ ہم ان کی طرف جائیں گے اور سہ پہر کی چائے ان کے ساتھ پئیں گے اب اگر ہم نہ گئے تو انہیں برا لگے گا۔ اس نے مزید کہا کہ کیونکہ میجر قمر ہمارے ایک شفیق ساتھی ہیں اور ان کا ہمارے ساتھ تعلق ایک بڑے بھائی کی طرح ہے لہٰذا انہیں ہمارے نہ جانے سے مایوسی ہوگی۔ میں خاموش رہا اور فاروقی کے ساتھ میجر قمر کی پانچ میل دور واقع رہائش گاہ کی طرف سائیکل چلانا شروع کر دی۔ میجر قمر نے بڑی خوشی کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔ میں نے کسی قسم کی تھکاوٹ ظاہر نہیں ہونے دی اور جسمانی طور پر مضبوط شخص ہونے کا تاثر دیتا رہا۔ اس ملاقات کا دائمی تاثر میجر قمر کی گرم جوشی اور مہمان نوازی تھی۔ آخر کار جب اندھیرا پھیل رہا تھا، ہم میس میں واپس آ گئے۔ اس کے بعد کبھی بھی فاروقی نے مجھے اپنے ساتھ سائیکل چلانے کی ترغیب نہیں دی اور نہ ہی کبھی میں فاروقی کے ساتھ سائیکل چلانے گیا۔ میں اکثر حیران ہوتا ہوں کہ میں اس مہم کو انجام دینے کے لیے تیار کیسے ہوا۔ لیکن اس کا جواب ہمیشہ مجھے یہ ملا کہ ''ایک چھوٹے افسر کی یہی زندگی ہے''۔

دستوریوں کا پارا مقابلے میں اعلیٰ کارکردگی کا ثبوت

پاکستان آرمی رائفل ایسوسی ایشن (PARA) کے باقاعدہ سالانہ مقابلے شروع ہو گئے تھے۔ اس میں تینوں سروسز کی ٹیمیں اور سول آرمڈ فورسز کے جوان جوش و جذبے کے ساتھ حصہ لینے کے لیے میدان میں آ چکے تھے۔ یہ مقابلے بریگیڈ اور پھر بعد میں ڈویژنل سطح پر منعقد کئے جاتے تھے۔ جو یونٹ ڈویژن کی سطح پر مقابلہ جیتتی وہ ملکی سطح پر (PARA) کے مقابلوں میں حصہ لینے کی اہل قرار پاتی۔ یہ مقابلے جہلم میں کلاسیفیکیشن رینجرز کے مقام پر جنرل ہیڈ کوارٹر پنجاب رجمینٹل سینٹر کے زیر اہتمام منعقد کیے جاتے تھے۔ پارا (PARA) مقابلے کی اہمیت کا اندازہ اس کی تنظیم سے لگایا جا سکتا ہے جس میں جی ایچ کیو میں ملٹری ٹریننگ برانچ کے تحت ایک پارا (PARA) سیکرٹری تعینات ہے، جو PARA سے متعلق تمام امور سرانجام دیتا تھا۔

1959ء میں بریگیڈ مقابلہ منعقد ہوا۔ پہلے ایک یا دو مقابلوں میں مرحوم میجر طغرل نے حصہ لیا لیکن بعد میں ہونے والے مقابلوں میں کیپٹن رضا علی کو ٹیم کے رکن کے طور پر بھیجا گیا۔ آغاز ہی

میں رضا نے اپنی نشانہ بازی کی مہارت کا مظاہرہ کیا انہیں چھ سو گز کے فاصلے سے اپنی بندوق سے نشانہ لگانے کا مرحلہ در پیش ہوا اور وہ مقابلے کے فاتح قرار پائے۔ رضا کو اب جہلم میں ہونے والے مقابلے میں دستوریوں کی نشانہ باز ٹیم کی تربیت کی ذمہ داری اٹھانی تھی۔ رضا اپنی ٹیم کو تربیت کے لیے جہلم کی فائرنگ رینجز پر لے گئے اور اتنی سخت تربیت کا اہتمام کیا جو عید اور چھٹیوں کے درمیان بھی جاری رہتی۔ جیسے کہ کہا جاتا ہے کہ ''محنت کا پھل میٹھا'' مقابلے کا دن آیا اور اس کا اختتام ہوا تو نتائج قابل ذکر تھے اور دستوریوں نے بشمول چاروں ہتھیار (رائفل، ایل ایم جی، سٹین گن اور پستول) کی گیارہ ٹرافیاں جیت لیں۔ ٹیم کی کارکردگی کے اعلیٰ معیار کا اندازہ فرنٹیئر کور ٹیم کی پوزیشن سے لگایا جا سکتا تھا جو گزشتہ سال سے ہمیشہ فاتح رہی تھی لیکن اب نچلی پوزیشن پر آ گئی تھی۔ اس مقام پر کرنل رحمان گل (بعد ازاں لیفٹیننٹ جنرل) نے رضا کو سی اے ایف سے وابستہ ہونے کی پیشکش کی لیکن رضا نے نرمی سے اس کی پیشکش کو یہ کہتے ہوئے مسترد کر دیا کہ ''پیشہ ور فوجی سی اے ایف سے وابستہ نہیں ہوتے''۔

فتح کا تسلسل بعد میں آنے والے سالوں میں رضا کی اور بعد میں لیفٹیننٹ نثار (بعد ازاں بریگیڈیئر) کی سرپرستی کے تحت جاری رہا۔

بحیثیت کرکٹر

میں نے ہمیشہ کھیلوں کی تمام سرگرمیوں میں بہت مستعد ہو کر حصہ لیا ہے۔ اس وقت کرکٹ میرا بنیادی کھیل تھا۔ مجھے اپنے کالج کی ٹیم کی بطور کپتان نمائندگی کرنے کا موقع ملا اور میں نے کرکٹ میچ کھیلنے کے دوران ہر طرح کی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مختلف شہروں کا دورہ کیا۔ فوج سے وابستگی کے بعد میں پی ایم اے راولپنڈی کلب کے لیے کھیلا اور بعد ازاں فوجی سطح کے انٹر سروسز کرکٹ میچ کھیلے۔ کرکٹ میں میرے پاس مرے کالج اور آرمی کلر کا اعزاز بھی ہے۔ اب مجھے ایک قومی ٹورنامنٹ میں قائداعظم ٹرافی کے لیے جو اس وقت پاکستان میں واحد اول درجے کا ٹورنامنٹ تھا، سروسز کی ٹیم کی طرف سے کھیلنے کے لیے منتخب کیا گیا۔ فائنل میں پہنچنے سے پہلے ہم نے بہت سی مشہور ٹیموں کو شکست دی تھی۔ ہم نے فائنل میچ کراچی الیون کے خلاف کھیلا، جو ہم نے تھوڑے سے سکور کے ساتھ ہارا لہٰذا ٹورنامنٹ میں دوسرے نمبر پر آنے والی ٹیم قرار پائے۔

اپنے عہدوں سے قطع نظر ہم نے اپنے باہمی تعلقات سے ٹیم کا حوصلہ بلند رکھا اور عہدوں کا فرق اپنے راستے میں نہیں آنے دیا۔ وہاں کوئی فاصلہ، یا رکاوٹ نہیں تھی۔

کھلاڑیوں میں سے ایک پی اے ایف کے سارجنٹ سٹینلے تھے، وہ ایک اچھے بلے باز اور

باؤنڈری کے بہترین فیلڈر تھے۔ ہمارے کپتان فلائٹ لیفٹیننٹ امتیاز احمد، اسے ہمیشہ باؤنڈری لائن پر کھڑا کرتے۔ ایک دن لاہور میں میچ کے اختتام پر، ڈریسنگ روم میں لباس تبدیل کرتے ہوئے سارجنٹ سٹینلے نے اپنے ایک ہی مقام پر خاص طور پر دھوپ کے سامنے کھڑے ہو کر فیلڈنگ کرنے کے خلاف کپتان سے شائستگی کے ساتھ احتجاج کیا۔ سٹینلے چاہتا تھا کہ کوئی دوسرا کھلاڑی اس کے ساتھ فیلڈنگ کی جگہ کو تبدیل کر لے۔ امتیاز نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور کہا ''کیونکہ وہ باؤنڈری لائن کے ساتھ فیلڈنگ کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے اس لیے ان حدود میں اس کی جگہ ناگزیر ہے۔ سٹینلے مطمئن نہیں ہوا اور اپنی پہلی درخواست پر اصرار کرتا رہا۔ امتیاز نے آخر کار کہا کہ وہ اسے کوئی ایسی وجہ بتائے کہ جس کی وجہ سے اس کی فیلڈنگ کی جگہ تبدیل کی جائے۔ سٹینلے نے مسکراتے ہوئے کہا'' کپتان! میری منگیتر نے مجھے کہا ہے کہ میری جلد کی رنگت سیاہ سے چاکلیٹی ہوتی جا رہی ہے جو اسے قبول نہیں ہے۔ لہٰذا مہربانی کریں اور میری شادی کے منصوبے کو خراب نہ کریں۔ امتیاز نے سٹینلے کو ایسی جگہ پر فیلڈنگ کے لیے کھڑا کیا جہاں سورج اس کی پشت پر ہوتا تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ ایسا کرنے سے بھی اس کے رنگ میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

سروسز ٹیم کی طرف سے کھیلتے ہوئے مجھے سول آرمڈ فورسز (سی اے ایف) اپنے تبادلے کے احکامات ملے۔ عام طور پر صرف رضا کارانہ طور پر جانے والے آفیسر سول آرمڈ فورس میں تعینات کیے جاتے تھے اور میں ان میں سے نہیں تھا۔ لہٰذا جب مجھے فرنٹیئر کور (ایف سی) میں تعیناتی کا حکم موصول ہوا تو میں حیران رہ گیا۔ لیکن حکم تو حکم ہے تاہم سول آرمڈ فورس کے ہیڈ کوارٹر نے اس بات کی منظوری دے دی کہ میں انہیں کرکٹ کا ٹورنامنٹ مکمل ہونے کے بعد جوائن کرلوں۔

شمالی سکاؤٹس گلگت

مجھے یاد ہے جب مجھے فرنٹیئر کور ہیڈ کوارٹر میں رپورٹ کرنا تھا۔ انسپکٹر جنرل بریگیڈیئر رحمان گل جو بعد میں لیفٹیننٹ جنرل ہوئے، نے میرا انٹرویو لیا، انہوں نے مجھے بتایا کہ ناردرن سکاؤٹس میں کچھ خرد برد ہوئی تھی جس کی تفتیش میں معاونت کے لئے انہیں کچھ بے داغ ریکارڈ رکھنے والے نوجوان افسر چاہئیں تھے جنہیں گلگت بھیجا جا سکے۔ گلگت جانے سے ہر کوئی گھبراتا تھا اور مجھے خاصی حیرت ہوئی جب بریگیڈیئر رحمان گل نے مجھے اس کام کے لئے چنا۔ رحمان گل سے کافی شناسائی تھی اور میرے نزدیک انہوں نے میرے ساتھ کوئی نیکی نہیں کی تھی۔ بہرحال اگلے تین سال مجھے گلگت میں گذارنے تھے اور مجھے کالا پانی جانے کا سا احساس ہو رہا تھا۔ پی آئی اے کا جہاز جس میں ہم سفر کر رہے تھے، Pressurized نہیں تھا۔ میرے ہمسفر گلگت کے پولیٹیکل ایجنٹ راجہ حبیب

الرحمٰن تھے۔ انہوں نے بتلایا جن دنوں موسم خراب ہوتا ہے تو جہاز کئی کئی دن تک گلگت نہیں جاتا۔ اور یہ عرصہ وہاں کے لوگوں کے لئے بہت سے مسائل پیدا کرتا ہے کیونکہ زیادہ تر اشیائے ضرورت اور ڈاک PIA کے ذریعے ہی گلگت پہنچتی تھیں۔ جہاز میں بھی ٹھیک ٹھاک سردی تھی۔ گہرے بادلوں کی وجہ سے فلائٹ ناہموار رہی۔ پائلٹ بادلوں سے نیچے رہنے کی کوشش کر رہا تھا جس کے لئے اسے اونچی پہاڑی چوٹیوں سے بچتے ہوئے وادی میں پرواز کرنا پڑ رہا تھا۔ خاصا خطرناک اور دشوار مرحلہ تھا۔ مگر پائلٹ کی پیشہ وارانہ مہارت ظاہر ہو رہی تھی۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے ذکر کرتا چلوں کہ ''نانگا پربت'' کی مشہور زمانہ چوٹی جس کی بلندی 8128 میٹر ہے اور دنیا کی بلند ترین چوٹیوں میں شمار ہوتی ہے، وہ بھی اسی پہاڑی سلسلے میں واقع ہے۔ برف سے ڈھکے ہوئے اس پہاڑ کو دیکھ کر عجیب سا احساس ہوا۔ بڑائی، اونچائی، مضبوطی اور نجانے کون کون سی صفات جن کا ذکر خود باری تعالیٰ نے کیا ہے، ابھر کر ذہن میں آ گئیں۔ دل نے گواہی دی۔ واقعی وہ ذات کس قدر بڑی ہوگی جس نے فقط ایک پہاڑ کو ہی اتنا بڑا اور زور آور بنایا ہے۔ اللہ اکبر!

بہر حال ہم گلگت پہنچ گئے۔ ایئر پورٹ پر تیز ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ پتھریلی زمین اور ٹنڈ منڈ درختوں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ میرا ذہن اس نامہربان ماحول کے لئے خاصا تیار تھا۔ لینڈنگ سٹرپ چھوٹی اور ناہموار تھی یہاں کے لوگ اپنے گردونواح کی طرح خشک اور سرد نہیں تھے ایئر پورٹ سٹاف بہت عزت سے پیش آیا۔ مجھے خیر مقدم کہنے کے لئے ناردرن سکاؤٹس کا ایک افسر بھی موجود تھا۔ سامان جیپ میں رکھا اور آفیسرز میس کی طرف روانہ ہو گئے۔ آفیسرز میس خاصا آرام دہ تھا اور میس حوالدار (سارجنٹ) جس کو عرف عام میں بجلی کہا جاتا تھا واقعی بجلی کی طرح ہر کام کو نمٹا رہا تھا۔ ڈرائنگ روم کے درمیان میں کوئلہ سٹوو جل رہا تھا۔ اس کمرے میں پہنچ کر وقتی طور پر باہر کے خزاں زدہ ماحول کا تاثر جاتا رہا۔ اگلے ساڑھے تین سال جو میں نے اس علاقے میں گزارے، میری اس بات کی تصدیق کرتے رہے کہ یہاں کے لوگ پرخلوص ہیں۔

پولو یہاں کا مخصوص کھیل ہے اور لوگ بہت شوق سے یہ کھیل دیکھتے ہیں۔ جس دن پولو کا میچ ہوتا چاروں طرف ایک گہما گہمی ہوتی پولو گراؤنڈ کے ایک طرف چبوترہ بنا ہوا تھا جو خاص مہمانوں اور افسران کے لئے مختص تھا۔ اس کے الٹی طرف ایک جگہ Drummers کے لئے مخصوص تھی ڈھول کی تھاپ اور موسیقی کا زیر و بم گھوڑوں کی کارکردگی کو واضح طور پر متاثر کرتا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جونہی موسیقی تھمتی گھوڑوں میں سستی آنی شروع ہو جاتی اور ان میں پہلا سا تناؤ اور جوش کم ہونا شروع ہو جاتا کچھ عرصہ یہ میچ دیکھنے کے بعد میرے اندر بھی اس کھیل کو کھیلنے کی تحریک

پیدا ہونا شروع ہوگئی۔ گھوڑ سواری کے شوق کا تو میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں۔ کیپٹن صادق ایک گھوڑے پر نظر آتے تھے جو میری توجہ کا مرکز بن گیا۔ یہ گھوڑا بہت مضبوط اور تیز رفتار تھا اور یقیناً اس پر بیٹھنے والا اور اس کو سنبھالنے والا بھی مضبوط انسان ہوگا۔ اس گھوڑے کا نام ہی Adjutant's Horse تھا۔ مجھے اس گھوڑے پر سواری کرنے کے شوق نے آ گھیرا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ یہ گھوڑا منہ زور اور میں نیا ہوں۔

ایک روز آرمی کے تین ڈاکٹر میجر راٹھور، کیپٹن ہمدانی، کیپٹن صدیقی اور میں گھوڑوں پر سوار ہو کر لیفٹیننٹ کرنل انیس خان جو ایجنسی سرجن تھے، سے ملنے چل نکلے ارادہ یہ تھا کہ ان کو ساتھ لے کر ہم Trail ride پر جائیں گے۔ میری آتش شوق نے مجھے مجبور کیا کہ میں اس Adjutant's Horse کو آزماؤں پیٹھ پر سوار ہو کر مجھے اپنا آپ خاصا جنگجو محسوس ہو رہا تھا۔ ایک پہاڑی ڈھلوان سے اترتے ہوئے نجانے کیا ہوا کہ گھوڑا ایک دم سرکش ہو کر بھاگ پڑا اور اپنی پوری رفتار سے دوڑنا شروع ہوگیا۔ اس کا رخ میس کی طرف تھا جہاں پر گھوڑوں کا اصطبل تھا۔ میں جتنی اس کی لگام کھینچتا وہ اتنا ہی تیز دوڑتا۔ اس کو شاید میری ناتجربہ کاری اور ناپختگی پر غصہ آ گیا تھا۔ اور مجھے بھی معلوم ہوگیا تھا کہ اب یہ قابو میں نہیں آئے گا۔ میں آنکھیں بند کر کے اس کے گلے کے ساتھ چمٹ گیا اور پھر مجھ پر وہ مقولہ صادق آ گیا کہ ہر شوق کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے.......... جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا اور میرے سرہانے دو ڈاکٹر موجود تھے۔ مجھے آنکھیں کھولتا دیکھ کر دونوں نے اطمینان کا سانس لیا مجھے اپنا سر اس قدر بھاری محسوس ہو رہا تھا کہ اس کو ہلانا دشوار تھا۔ ذرا سا ہلاتا تو کمرہ چکر کھانے لگ جاتا۔ اس سانحے کی تفصیل کچھ یوں موصول ہوئی کہ بے قابو گھوڑا میس کی دیوار پھلانگ کر اندر جانے لگا تو گیٹ پر کھڑے سنتری نے شاید اپنے بچاؤ کے لئے چھڑی لہرا دی۔ گھوڑے نے خوفزدہ ہو کر پلٹا کھایا جس سے میں جھٹکا کھا کر گرا اور میرا سر جو اس قدر بھاری محسوس ہو رہا تھا دیوار سے ٹکرایا تھا مگر چکنا چور ہونے سے بچ گیا تھا۔ بے ہوش ہونا تو لازم تھا سو وہ ہم ہوئے۔ لیکن ہوش و حواس درست ہونے کے بعد بھی مجھے دو ہفتے تک مکمل آرام میں رہنا پڑا۔ کیونکہ جان ناتواں جگہ جگہ سے چیخ گئی تھی۔ ایک سال کے بعد دوبارہ من میں موج اٹھی اپنی اس درگت کے ذکر کے بعد اپنی فتح کا ذکر بھی ضروری سمجھتا ہوں۔

میرے ڈاکٹر دوستوں کا خیال تھا کہ مجھے اپنا خوف اور حادثے کی دہشت کو ذہن سے محو کرنے کے لئے دوبارہ گھوڑ سواری کرنی چاہئے۔ ان لوگوں نے مجھے ذہنی طور پر تیار کیا اور ایک اصیل

گھوڑے پر بیٹھ کر پولو کھیلنے پر مجبور کیا۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور آہستہ آہستہ میری خود اعتمادی لوٹ کر آنے لگی۔ جو ایک سپورٹس مین کے لئے بے انتہا ضروری ہے۔ خوف کے ساتھ جینا یوں بھی میرے خیال میں ایک فوجی افسر کے شایان شان نہیں۔ میرے ذہن کی بحالی صحت اس روز مکمل ہوئی جس دن میں دوبارہ Adjutant's horse پر سوار ہوا اور پولو کھیلی۔ اس فتح جانفزا کا لطف صرف میں ہی جانتا ہوں۔ الفاظ ناکافی ہیں میں نے اس سرکش کو سرنگوں کیا اور اسے محسوس کروا دیا کہ میں اب وہ پہلے والا اناڑی نہیں بلکہ ایک مشاق کھلاڑی ہوں۔ میرے غصے نے مجھے گلگت کے بہترین پولو کھلاڑیوں کی صف میں شامل کر دیا۔

میرے اس ایکسیڈنٹ کے بعد میری پوسٹنگ ''منی مرگ'' سیکٹر میں ہوگئی جو سری نگر بارڈر سے بہت قریب ہے اور انتہائی خوبصورت جگہ ہے۔ آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع یہ علاقہ چیڑ کے درختوں سے ڈھکا ہوا ہے تیز رفتار دریا جو یہاں سے گزرتا ہے اس کا پانی شفاف اور نیلا نظر آتا ہے۔ قدرتی حسن سے مالا مال اس علاقے میں مجھے مزید تجربات کے گرانقدر خزانے ملے۔

مہمات

شمالی علاقہ کوہ پیماؤں کے لئے ایک خصوصی کشش رکھتا ہے۔ یہاں کے سنگلاخ پہاڑوں کی چوٹیوں کو سر کرنے کا جنون ہر سال کسی نہ کسی غیر ملکی مہم جوؤں کی ٹیم کو یہاں کھینچ لاتا ہے۔ خواتین کو صنف نازک کہہ کر پکارنا شاید ہم مردوں کی ہی خام خیالی ہے۔ کیونکہ حقیقتاً اگر موازنہ کیا جائے تو خواتین میں قوت برداشت اور بردباری مردوں سے کہیں زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس بات کا عملی ثبوت وہ خواتین تھیں جو کوہ پیمائی جیسے سخت ترین کام کے لئے تن تنہا نکل پڑتی تھیں۔ انہیں نہ تو اکیلے پن سے اور نہ ہی اکیلے سفر کرنے میں کوئی تامل محسوس ہوتا تھا۔ مجھے جس خاتون نے متاثر کیا وہ Elaine Hamilton تھی۔ اس امریکی خاتون سے میری ملاقات ہسپتال کے کمانڈنگ آفیسر کے گھر دوپہر کے کھانے پر ہوئی جب میں وہاں پہنچا تو سب لوگ دھوپ میں بیٹھے اس امریکی خاتون کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اندازاً تیس سال عمر کی یہ جاذب نظر خاتون موتیا رنگ کے لباس میں ملبوس تھی۔ علیک سلیک اور تعارف کے بعد میں بھی اس گروپ میں شامل ہو کر Elaine کے دلچسپ انداز بیان سے لطف اندوز ہونے لگا وہ خاصی معلومات رکھتی تھی اور سیاحت کا وسیع تجربہ تھا۔ اس نے سِکم (Sikkim) کے بادشاہ کے ہاں رہائش کا قصہ بھی سنایا۔ سِکم کے بادشاہ نے ایک امریکی نژاد خاتون سے شادی کر رکھی تھی جس کی وجہ سے Elain کا شاہی خاندان سے خاصا رابطہ رہا۔ اس نے ہمیں دھات کا بنا ''ڈورجی'' بھی دکھایا جو سِکم کے رواج کے

مطابق خوش بختی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ یہ تحفہ بادشاہ نے Elain کو دیا تھا۔

بہرحال اس خاتون کے مطابق اسے یہ شمالی علاقہ بے حد پسند تھا۔ یہاں کی تنہائی، خاموشی اور قدرتی مناظر نے اسے اسیر بنا لیا تھا اور اُس نے امریکہ سے پاکستان تک اور پھر ان پہاڑوں تک کا طویل سفر صرف اپنے شوق کی تسکین کے لئے طے کیا تھا اور مجھے احساس ہوا کہ ہم کس قدر ناشکر گذار اور ڈھیلے لوگ ہیں۔ اپنے ہی ملک کے اس بے پایاں خزانے کے متعلق نہ تو ہم جانتے ہیں اور نہ ہی جاننا چاہتے ہیں۔ جانتے ہیں تو صرف اتنا کہ یہ انتہائی پرخطر علاقہ ہے اور یہاں بے مقصد جانا قطعاً احمقانہ فعل ہے۔ اس خاتون سے میرے دوستانہ مراسم ہو گئے وہ بنیادی طور پر ایک آرٹسٹ تھی اور اس کا پیرس میں ایک آرٹ سٹوڈیو تھا۔ پاکستان میں اس کے پاکستان کے مایہ ناز آرٹسٹ گل جی کے ساتھ اچھے مراسم تھے۔ مشہور قانون دان اے کے بروہی، اسلم خٹک اور سیف اللہ جو صوبہ سرحد کے مشہور سیاسی لوگ ہیں، بھی اس کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔ بعد ازاں 1964ء میں جب میں امریکہ گیا تو میں Elain کے گھر والوں سے بھی ملا اور ایک رات ان کے گھر میں بھی رہا وہ خود تو موجود نہیں تھی کیونکہ پیرس میں تصاویر کی ایک نمائش میں اسے شریک ہونا تھا۔

سڑک پر حادثات

Elain سے ملنے کے بعد میں نے شمالی علاقہ جات کو زیادہ محسوس کیا اور اپنے گرد و نواح کو صرف سرسری نہیں بلکہ گہری اور پرتجسس نظر سے دیکھا واقعی قدرت کے حسن سے مالا مال یہ علاقے دنیا کی نظروں سے بچ کر اپنی پاکیزگی برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد مجھے یہاں سے تبدیل ہونے کے آرڈر موصول ہوئے مجھے Sector Olding میں تعینات کر دیا گیا تھا۔ یہ جگہ سکردو سے 84 میل دور تھی زیادہ سڑک لیکن کچھ راستہ گھوڑوں پر سوار ہو کر طے کرنا پڑا۔ اس سیکٹر میں مزید تنہائی تو تھی اور اپنے آپ کو مصروف رکھنا لازمی تھا۔ میں اکثر اپنے چوٹیوں پر ڈیوٹی دیتے بہادر سپاہیوں سے ملنے چلا جاتا جو سخت ترین موسم میں بھی اپنے مورچوں میں چاک و چوبند بیٹھے رہتے تھے۔ ایک جواں سال کیپٹن کے لئے یہ دور کافی صبر آزما تھا اور حادثات سے پُر بھی۔ فوجی زندگی میں ہر دم تیار اور ''یس سر'' کہنے کی تربیت مکمل ہو چکی تھی۔

ایک دن ہمارے کمانڈنگ افسر گلگت سے سکردو تشریف لائے۔ کارگل بھی اسی محاذ پر ہے۔ قیام کے دوران انہوں نے Sector Olding کا دورہ بھی کرنا تھا۔ دورہ سے ایک روز پہلے میں مع اپنے عملہ بذریعہ جیپ Olding کے لئے روانہ ہو گیا۔ میرے عملہ میں میرا ڈرائیور ابراہیم، خانساماں

مرزا اور کلرک کفایت شامل تھے۔ یہ 6 گھنٹوں کا طویل سفر تھا۔ پہاڑ کو کاٹ کر سڑک بنائی گئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے پتھروں سے بنی اس سڑک پر گاڑی کو بریک لگانا خاصا مشکل تھا کیونکہ گاڑی کے ٹائر سڑک پر جم نہیں پاتے تھے۔ ان راستوں پر چلنے والے تجربہ کار ڈرائیور خوب جانتے تھے کہ ایسی صورت میں گاڑی کو کیسے چلانا ہے۔ اس روز وہیل میں نے سنبھال لیا۔ پہاڑوں میں شام بہت جلدی ہو جاتی ہے۔ سردیوں میں دوپہر کے دو بجے ہی سورج ڈوبنا شروع ہو جاتا ہے اور ساڑھے تین بجے دن ڈھل جاتا ہے۔ ہم لوگ باغیچہ گاؤں کے قریب پہنچ رہے تھے۔ جہاں سے آگے سڑک جیپ کے قابل بھی نہیں رہتی تھی اور اس کے بعد کا سفر گھوڑوں پر کرنا تھا۔ ہمیں یہ تمام سفر ایک ہی دن میں کرنا تھا تا کہ ہم CO کے پہنچنے سے پہلے وہاں پہنچ کر ان کا استقبال کر سکیں۔

خدا جانے کیا ہوا ایک بہت ہی ٹیڑھا موڑ کاٹتے ہوئے جیپ skid کر گئی۔ میں سیٹرنگ پر قابو نہ رکھ سکا اور جیپ قلابازی کھاتی ہوئی نیچے دریا کی طرف لڑھک گئی۔ خوش قسمتی سے راستے میں ایک بڑا پتھر تھا جس کی وجہ سے وہ رک گئی مگر چھت کے بل! کچھ دیر تو مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی کہ میں کہاں ہوں اور کیوں ہوں۔ لیکن جیسے جیسے حواس واپس آئے تو میں نے اپنے آپ کو ہلا کر دیکھا۔ ہر چیز محسوس ہوئی ہاتھ پاؤں اور پھر میں نے ہلنے کی کوشش کی تو کامیابی ہوئی۔ اپنے آپ کو کھینچ کر باہر کیا تو کوئی خاص چوٹ نہیں آئی تھی۔ ڈرائیور اور خانساماں پہلے ہی باہر نکل چکے تھے۔ مگر زخمی تھے۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ اچانک خیال آیا کہ میرا کلرک کفایت کہیں نظر نہیں آیا۔ ادھر ادھر اسے آوازیں دیں مگر جواب نہ ملا۔ جیپ میں بھی نہیں تھا۔ آخر کدھر گیا۔ پھر دیکھا تو بیچارہ جیپ کے نیچے بیہوش پڑا تھا اور بیٹری کا تیزابی پانی اس کی آنکھوں پر گر رہا تھا۔ کھینچ کر تو اسے نکالا نہیں جا سکتا تھا۔ دوسرے دونوں ساتھی زخمی تھے اور جیپ کو اٹھانے میں مدد نہیں دے سکتے تھے۔ ایک دم خیال آیا کہ اگر لمبے ہینڈل کو استعمال کیا جائے تو شاید جیپ ہل سکے میں نے ہینڈل کو سامنے والے بمپر کے نیچے رکھا خدا سے مدد کی دعا کی اور پورا زور لگا کر جیب کو اٹھانے کی کوشش کی۔ جیپ اٹھ تو گئی مگر اتنی نہیں جس سے کفایت کو باہر کھینچا جا سکتا۔ میں نے ہمت نہیں ہاری ایک اور کوشش کے لئے سوچا کہ جیک سے مدد لی جائے۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ ہمت کرو میں جیپ کو اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں تم جلدی سے ایک کونے میں جیک لگا دو' ایک بار پھر اللہ کو یاد کیا مدد مانگی اور زور لگا دیا۔ جیپ اوپر کو اٹھی ڈرائیور نے جلدی سے جیک لگا دیا۔ اللہ کا شکر ادا کیا اور کفایت کو گھسیٹ کر باہر نکال لیا پھر میں دوڑ کر نیچے دریا تک گیا اور دریا کا ٹھنڈا پانی کین میں بھر کر لایا تا کہ اس سے زخمی کی آنکھوں کو دھویا جائے جو تیزابی پانی پڑنے سے دھندلا رہی تھیں۔

ٹھنڈے پانی نے اثر دکھایا اور کفایت کو سکون محسوس ہونا شروع ہوا۔ شام ہو چکی تھی اور شدید سردی سے ہم ٹھٹھر رہے تھے۔ میں نے اپنا بستر زمین پر بچھا کر کفایت کو لٹا دیا تھا اور رضائی اس کے چاروں طرف لپیٹ دی تھی۔ اس مرحلے کے حالات کو بھگت کر اب آگے کے لئے سوچنا شروع کیا تا کہ زخمیوں کے لئے امداد حاصل کی جائے۔ میں نے ڈرائیور کو ساتھ لیا اور نزدیک ترین ٹیلیفون کے کھمبے تک پہنچا تا کہ اپنے ایمرجنسی ٹیلیفون سیٹ کو اس کے ساتھ لگا کر مدد کے لئے پیغام دیا جاسکے۔ کھمبے تک پہنچ کر میں نے ڈرائیور کو اپنے کندھوں پر کھڑا کیا تا کہ وہ تار جوڑ سکے۔ اس بیچارے کا ایک ہاتھ زخمی تھا وہ صرف اپنے ایک ہاتھ کو استعمال کر رہا تھا۔ بہر حال کافی تگ و دو کے بعد وہ تاریں جوڑنے میں کامیاب تو ہوا لیکن ہمارا سیٹ خراب ہو چکا تھا کیونکہ ہم آپریٹر کی آواز سن سکتے تھے ہماری آواز ان تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ ہمیں دو آپریٹروں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جو ایک دوسرے سے ہمارے متعلق دریافت کر رہے تھے بہر حال اپنے آپ کو حالات کے حوالے کرتے ہوئے پھر خدا سے مدد کی دعا کی اور انتظار کرنے لگے کہ آخر کوئی تو ادھر سے گذرے گا مگر کب یہ معلوم نہ تھا۔ تھوڑی دیر ہی گذری ہوگی کہ ایک گھوڑا سوار آتا نظر آیا۔ میں نے بھاگ کر اسے روکا اور درخواست کی اگر وہ مجھے اپنا گھوڑا دے دے تو میں اس کو دوڑاتے ہوئے سات میل دور جو ایک ڈسپنسری تھی، وہاں پہنچ جاؤں گا اور زخمیوں کے لئے طبی امداد اور ان کو لیجانے کا بندوبست بھی کروں گا۔ لیکن اس نے معذرت کی اور کہنے لگا کہ چونکہ وہ خود اسی طرف جا رہا تھا وہ ہمارا پیغام خود ہی وہاں پہنچا دے گا۔ اسی دوران ایک گھوڑوں کا قافلہ جو رسد کا سامان لے جا رہا تھا، نظر آ گیا۔ ان کو روکا ہم باقی لوگ تو گھوڑوں پر بیٹھ کر ڈسپنسری تک پہنچ سکتے تھے مگر مسئلہ بیچارے کفایت کا تھا جسے ہلانا مشکل تھا گھوڑے پر سفر تو درکنار۔ خیر میں نے فیصلہ کر لیا اپنا اسلحہ ڈرائیور کے حوالے کیا اور خود پیدل اس قافلے کے ساتھ چل پڑا تا کہ مذکورہ مشکلات و حالات کا سدباب کر سکوں۔ ہم تقریباً ڈسپنسری کے قریب پہنچ چکے تھے کہ دور سے کسی آنے والی گاڑی کی روشنیاں ڈوبتی اور ابھرتی نظر آئیں۔ گاڑی ہمارے قریب پہنچی تو معلوم ہوا کہ یہ تو ہماری ہی جیپ تھی جسے سکردو سے ہماری مدد کے لئے روانہ کیا گیا تھا۔ ڈرائیور نے بتایا کہ اسے سکردو میں پیغام ملا تھا کہ کیپٹن صاحب کی جیپ میں کوئی فنی خرابی پیدا ہوگئی ہے اس لئے انہیں متبادل جیپ اور کھانے کی ضرورت ہے جو ان تک پہنچایا جائے۔ سو وہ حاضر ہو گیا۔

بہر حال ہمارا مقصد حل ہو گیا۔ فنی خرابی یا ایکسیڈنٹ مدد چاہئے تھی جو مل گئی اور ساتھ یہ بھی یقین ہو گیا کہ ''خدا ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔''

ہم زخمیوں تک پہنچے ان کو ساتھ لیا اور سکردو کی طرف روانہ ہو گئے۔ کفایت کی نظر بچ گئی جس کی مجھے از حد خوشی ہوئی۔ آنکھیں بہت بڑی نعمت ہیں۔

حادثات زندگی کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں اور خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا درس دیتے ہیں۔ موت سے ٹکرا کر جب زندگی کا لمس محسوس ہوتا ہے تو اس کی لذت ہی اور ہوتی ہے۔ ایک فوجی کی زندگی میں تو یہ جانفزا لمحے کئی بار آتے ہیں۔

ایک اور حادثے کا ذکر بھی ضمناً کرتا چلوں۔ جہاں سے بچ نکلنا بھی ایک معجزہ تھا۔ ہوا یوں کہ گرمیوں میں UNO کے میجر Bidgood کے ہمراہ ایک UN جیپ میں سکردو سے اولڈنگ جا رہے تھے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ بندی کی خلاف ورزی کرنے کے واقعات کو UN Observers ہی نمٹایا کرتے تھے۔ جب ہم جیپ کے لئے بنائی گئی سڑک کے اختتام کے قریب پہنچے تو یکا یک سڑک بیٹھ گئی اور جیپ قلا بازی کھاتی ہوئی نیچے دریا میں جا گری۔ دریا میں طغیانی تھی میجر Bidgood کے پاس ایک تیز دھار بڑا سا چاقو تھا۔ اس نے کمال تیزی سے جیپ کی Canvas کی چھت کو پھاڑا تا کہ ہم لوگ چھت کے ذریعے باہر آ سکیں۔ اور ہم نے تیزی سے باہر چھلانگیں لگائیں اس سے پہلے کہ پانی کا تیز ریلا ہمیں بہا کر لے جائے، اردگرد کے لوگ جو ہمیشہ مدد کے لئے تیار رہتے ہیں، سب وہاں پہنچ گئے۔ ہم بھی بچ گئے اور جیپ بھی بچ گئی جسے گاؤں والوں نے مل کر نکال لیا۔

تحت الشعور سے واقعات ابھر کر جب شعور میں لائن حاضر ہوتے ہیں تو ان کو فالو آن کروانا دو بھر ہو جاتا ہے۔ مزاح کے لمحے تو خصوصاً یاد رہ جاتے ہیں حالانکہ وہ قابل ذکر نہیں ہوتے مثلاً Bidgood کو جب بھی کوئی چیز میں نے کھانے کے لئے پیش کی تو وہ ہمیشہ سوال کرتا ''کیا خیال ہے کھانا چاہئے'' جس کا میں جواب دیتا بالکل کھانا چاہئے، تب وہ چیز کو اٹھاتا۔ ایک دن ناشتے کی میز پر صرف دو ''کچورا سیب'' پڑے تھے۔ ایک بڑا اور ایک چھوٹا۔ یہ سیب اپنی خوشبو اور ذائقے کی وجہ سے بہت پسند کئے جاتے ہیں۔ کچورا ایک گاؤں کا نام ہے۔ جہاں اس سیب کے باغات بہتات میں ہیں۔ Bidgood کو بھی یہ سیب بہت زیادہ پسند تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ ان دو سیبوں کو دیکھ رہا تھا مگر ہاتھ نہیں بڑھا رہا تھا۔ میں نے سوچا غالباً اس وقت اس کی طبیعت نہیں چاہ رہی۔ ناشتہ ختم ہو چکا تھا اور ہم میز سے اٹھنے والے تھے کہ میں نے از راہ تکلف سرسری طور پر میجر سے کہا ''سیب لیجئے'' وہ جیسے میرے اس جملے کے منتظر بیٹھے تھے۔ فوراً اپنا روایتی سوال کیا۔ ''کیا خیال ہے، لیا جائے'' میں نے بھی اپنا روایتی جواب دے ڈالا۔ ''بالکل لیا جائے'' Bidgood

نے جلدی سے بڑا سیب اٹھایا اور کہنے لگا ''ٹھیک ہے پھر میں یہ بڑا سیب لے لیتا ہوں'' اور چھوٹا سیب میرے لئے چھوڑ دیا۔

کیپٹن امیر کی نشانہ بازی

ہمارا ایک دوست کیپٹن امیر تھا۔ ایجنسی ہسپتال میں بطور ڈاکٹر متعین تھا۔ دیکھنے میں تو وہ خاصا مضبوط تھا۔ لیکن ویسے ڈھیلا ڈھالا۔ ایک شوق اسے ضرور تھا کہ جب بھی کوئی پارٹی شکار کے لئے جاتی وہ ضرور ساتھ چل پڑتا۔ ایک صبح ناردرن سکاؤٹس کے کمانڈنٹ نے جو سکردو کے دورے پر آئے ہوئے تھے، شکار کا پروگرام بنا ڈالا۔ سکردو کے پہاڑ برف سے ڈھکے ہوئے تھے اور اس سیزن میں پہاڑی پرندے بلندی سے اتر کر پہاڑوں کے دامن میں آ جاتے ہیں۔ ہم پانچ لوگ شکار پر نکلے۔ ہمارے ساتھ ڈھول بجا کر پرندوں میں کھلبلی مچانے والی پارٹی بھی تھی۔ شور سے پرندے اپنے گھونسلوں سے نکل کر سراسیمگی میں ادھر ادھر اڑنے لگ جاتے اور شکاریوں کی گولیوں کی زد میں آ جاتے۔ اڑتے پرندے کو مار گرانا ہی شکار کا اصل مزہ ہے۔ کمانڈنٹ بہت اچھے نشانہ باز تھے اور کسی بیٹھے ہوئے پرندے پر گولی ضائع نہیں کرتے تھے۔ اس دوران انہوں نے بہت سے اڑتے پرندوں کو ڈھیر کیا۔ ہم میں سے کسی نے ایک چکور نما پرندے کو جو دور برف سے ڈھکے ایک پتھر پر بیٹھا تھا، نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ نشانہ خطا گیا۔ پرندہ اپنی جگہ سے تیزی سے اڑا اور عین کیپٹن امیر کے سر کے اوپر سے گذرا جو آرام سے ڈھیلے انداز میں پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ امیر نے غیر ارادی طور پر بغیر نشانہ باندھے پرندے کو اتنا قریب دیکھ کر فائر کر دیا۔ پرندہ قلا بازی کھا کر امیر کے قدموں میں آن گرا۔ کیپٹن امیر کی فاتحانہ مسکراہٹ مجھے آج تک یاد ہے۔

میں نے اس عرصہ میں بہت کوہ پیمائی کی۔ دشوار گزار راستوں کو طے کیا۔ ایک بار تو میں نے گلگت سے سکردو تک پیدل سفر کیا اور Road Reconnaisance رپورٹ ہیڈ کوارٹر میں بھیجی اور پھر ایک بار میں نے سکردو سے استور دوسائی پلین کے راستے گھوڑے پر سفر کیا۔ آزاد کشمیر میں مظفر آباد سے کیل اور وہاں سے نکرو تک کبھی گھوڑے پر اور کبھی پیدل سفر کیا۔

آزاد کشمیر اور شمالی علاقہ میں ساڑھے تین سال ایک دلچسپ خواب کی طرح یاد ہیں۔ علاقے کا حسن، پہاڑوں سے معرکہ آرائی، موسموں سے نبرد آزمائی اور دشواریوں اور حادثوں کے چیلنج قبول کرنے کے ساتھ ساتھ جو ذہنی سکون وہاں پایا وہ دوبارہ زندگی میں نہیں ملا۔

سی جی ایس سیکرٹریٹ میں جی ایس او تھری

کھلی فضاؤں اور بلند پہاڑوں سے اتار کر مجھے جی ایچ کیو میں سی جی ایس سیکرٹریٹ میں بطور جی ایس او -III تعینات کر دیا گیا۔ تبدیلی ناگوار ضرور تھی لیکن دنیاوی طور پر یہ پوسٹنگ خاص اہمیت کی حامل تھی۔ اس وقت جنرل آغا محمد یحییٰ خان سی جی ایس تھے جو پاکستانی افواج کے سربراہ بننے کے بعد ملک میں مارشل لاء کے نفاذ کے ساتھ صدر پاکستان بھی بنے۔ بہت تیز فہم جنرل تھے اور ان میں جلد فیصلہ کرنے کی صلاحیت تھی۔ اپنی میز پر فائلیں کبھی جمع نہیں ہونے دیتے تھے اور کسی کام کو پس پشت نہیں ڈالتے تھے۔ اگر کسی فائل کے لیے انتظار کرنا بھی پڑتا تو وہ تین دن سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ جب جنرل یحییٰ کی بدلی ہوئی تو ان کی جگہ میجر جنرل ملک شیر بہادر تشریف لائے بہت ہی دھیمے مزاج کے افسر تھے۔ لب و لہجہ نرم لیکن مضبوط تھا۔ ان کے ساتھ کام کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی۔ ایک روز معلوم ہوا کہ میرا نام اس لسٹ میں موجود ہے جو ملٹری سیکرٹری کی برانچ سے issue ہوئی ہے۔ جس میں ان افسران کے نام تھے جن کو بیرون ملک کورسز کے لئے جانا تھا۔ انٹرویو کے لئے تاریخ اور وقت مقرر ہوگیا۔ سلیکشن بورڈ کے پریذیڈنٹ جنرل شیر بہادر تھے۔ اس موقع کے لئے خصوصی یونیفارم پہن کر میں سلیکشن بورڈ کے روبرو حاضر ہوگیا۔ سی جی ایس نے بورڈ کو مخاطب کر کے کہا ''حضرات! میں کیپٹن راحت کو اچھی طرح جانتا ہوں کیونکہ یہ میرے سٹاف آفیسر ہیں۔ اس لئے مجھے تو ان سے کوئی سوال نہیں پوچھنا۔ آپ نے جو کچھ پوچھنا ہے سوالات کیجئے'' سوالات پوچھے گئے اور میں جواب دیتا رہا۔ بہر حال کچھ دنوں کے بعد ہی ملٹری سیکرٹری برانچ سے خط موصول ہوا جس میں مجھے اطلاع دی گئی کہ مجھے کمپنی کمانڈرز کورس کے لئے بھیجا جا رہا ہے۔ یہ کورس امریکہ کی ایئر فورس کے ایک کورس کے ساتھ منسلک تھا۔ اور یوں میں امریکہ کے سفر پر روانہ ہوگیا۔

امریکہ اور یورپ کا دورہ

میں نے امریکہ کی سرزمین پر پہلی دفعہ قدم رکھا تھا۔ تجسس سے بھرپور ذہن لئے میں نے وہاں بہت کچھ دیکھا اور بہت کچھ سیکھا امریکہ میں لوگ کھلے ڈھلے اور بہت جلد دوست بن جاتے تھے میرا وقت بہت اچھا گزرا۔ اور بہت سے دوست بنائے۔ مجھے Sunday School میں پاکستان پر لیکچر دینے کے لئے بھی بلایا جاتا رہا جس سے مجھے مزید لوگوں سے بھی ملنے کا موقع ملا ان میں سے کوئی نہ کوئی فیملی مجھے چھٹی کا دن گزارنے کے لئے دعوت دے دیتی اور یوں یہ وقت بہت

مزے سے گزرا۔

اس دوران میں نے آرمی سے متعلق بھی بہت کچھ سیکھا ترقی یافتہ ممالک کی افواج کے کام کرنے کے طریقے کا قریب سے مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ میجر Fielder ہمارے سیکشن کا انچارج تھا۔ ہر کام میں بہت خلوص سے معاونت کرتا تھا جس کی وجہ سے میں نے جلد ہی ماحول کو اپنا لیا۔

میری ٹریننگ ختم ہوئی تو مجھے تین ماہ یورپ میں گذارنے کی چھٹی ملی۔ ایک نادر موقع تھا جس کا میں نے بھر پور فائدہ اٹھایا۔ اٹلی کے شہر Torino سے ایک عدد گاڑی خریدی اور انگلینڈ، اٹلی، فرانس، آسٹریا، جرمنی اور سوئٹیزر لینڈ کی خوب خوب سیر کی۔ ایک بار فرانس میں سے گذرتے ہوئے میں نے غلط موڑ کاٹ لیا اور Oneway راستے میں الٹی طرف چل پڑا۔ کچھ دیر تو خیریت گذری لیکن ایک پولیس افسر میرے تعاقب میں آیا اور غصے سے مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ پہلے فرانسیسی میں ڈانٹ پلائی۔ لیکن جب میرے سپاٹ چہرے کو دیکھا تو ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں وہ مجھے غلط رخ پر چلنے کی سرزنش کرتا رہا۔ مجھے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا جس کی سزا جیل بھی ہوسکتی تھی۔ موقع کی نزاکت کو بھانپ کر میں نے فوری حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا۔ گاڑی میں، میں نے اپنا ملٹری یونیفارم لٹکا رکھا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ بڑی گرمجوشی سے تھاما اور اس کے یونیفارم کی طرف اشارہ کر کے اپنے لٹکتے ہوئے یونیفارم کو چھوا اور یونیفارم دوستی کی آواز دی۔ وہ مسکرا پڑا اور مجھے صحیح سڑک پر پہنچا دیا۔

جرمن خاندان کے ساتھ ایک یادگار قیام

میں Munich (جرمنی) جا رہا تھا جہاں پر میں نے پروگرام کے مطابق چار دن گذارنے تھے۔ سہ پہر ہو چکی تھی اور Munich ابھی تیس کلومیٹر دور تھا۔ گاڑی کے ریڈیو پر مغربی موسیقی کی دھن بج رہی تھی اور سڑک تقریباً ٹریفک سے خالی۔ ایک چوراہے سے گزر رہا تھا کہ ایک میانہ قد لڑکے نے لفٹ لینے کا سگنل دیا۔ میں نے گاڑی روک لی۔ لڑکا دوڑتا ہوا گاڑی تک پہنچا اور مجھ سے پوچھا کہ کیا میں انگریزی بول سکتا ہوں۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ تاکہ وہ اندر بیٹھ سکے۔ چونکہ ہم ایک دوسرے کی بات سمجھ سکتے تھے۔ اس لئے بات چیت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کی عمر کوئی 18 اور 20 سال کے درمیان تھی اس نے بتایا کہ وہ طالب علم ہے اور سکول سے گھر جا رہا ہے۔ میونخ کے قریب پہنچے تو اس نے ایک چوراہے پر رکنے کے لئے کہا۔ یہاں سے اس کا گھر غالباً نزدیک تھا۔ اس نے دروازہ کھولا میرا شکریہ ادا کیا اور جانے کے لئے قدم باہر نکالا ہی تھا کہ جیسے کسی خیال نے اسے روک دیا۔ دروازہ بند کر کے بڑے

پرزور انداز میں مجھے اپنے گھر چلنے کی دعوت دینے لگا۔ میں نے بہت انکار کیا کہ بھیا! شام ہوا چاہتی ہے مجھے میونخ میں اپنی رہائش کے لئے ٹھکانہ بھی ڈھونڈنا ہے لیکن وہ بضد رہا کہ میں اس کے گھر چلوں اور اس کے والدین سے ملوں۔ اتنے انکار کے باوجود بھی جب وہ نہ مانا تو ہم اس کے گھر کی طرف چل نکلے۔ ایک دومنزلہ گھر کے سامنے اس نے کار رکوائی اور مجھے بتایا کہ یہ اس کا گھر ہے۔ ان دنوں یورپ میں کار کولاک کوئی نہیں لگاتا تھا اور نہ ہی کار چوری کی وارداتیں ہوتی تھیں۔ میرا تمام سامان گاڑی میں لدا ہوا تھا۔ بہرحال میں گاڑی سے نکل کر اس کے ہمراہ ہو گیا۔ ڈرائنگ روم میں مجھے بٹھا کر وہ اندر گیا تھوڑی دیر میں ہی اس کی والدہ اور والد مجھ سے ملنے کے لئے آ گئے۔ اس کی بہن بھی آئی۔ تمام اہل خانہ روانی سے انگریزی بول سکتے تھے۔ سوائے اس کے والد کے۔ میں نے جرمنی کے سفر کے دوران دیکھا کہ بہت لوگ انگریزی زبان سمجھتے تھے۔ شاید جنگ عظیم کے بعد سے امریکہ اور برطانیہ کی فوجیں جو یہاں موجود تھیں ان کی وجہ سے ایسا ہو۔ تعارف ہوا اس کے والد کا نام Partenheimer تھا اور ایک فیکٹری Pffani نامی میں سینئر ایگزیکٹو تھا۔ گھر صاف ستھرا اور معاشی آسودگی جھلک رہی تھی۔ اس کی والدہ نے چائے کے دوران میرا پروگرام معلوم کیا اور ساتھ ہی پوچھا کہ میں رہائش کہاں پر رکھوں گا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرے پاس ایک گائیڈ بک ہے جس میں سستی رہائش کے لئے پتے اور فون نمبر لکھے ہیں۔ کوئی نہ کوئی جگہ مل جائے گی۔ انہوں نے بتلایا کہ گرمیوں کے موسم میں Munich سیاحوں سے بھر جاتا ہے۔ اور رہائش تلاش کرنے میں دقت ہوتی ہے۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ فکر کی ضرورت نہیں بندوبست ہو جائے گا۔ اور جانے کے لئے اجازت مانگی۔ انہوں نے مزید اظہار تشکر کرتے ہوئے اپنے گھر سے فون کر کے جگہ تلاش کرنے کی پیش کش کی جو میں نے خوشی سے قبول کر لی کیونکہ مجھے جرمن زبان بولنا نہیں آتی تھی اور معلومات حاصل کرنے میں دشواری ہوتی تھی۔ دو تین فون کرنے کے بعد وہی ہوا جس کا انہیں اندیشہ تھا۔ ہر جگہ سیاحوں سے پر تھی۔ ہماری بات چیت کے دوران دونوں بہن بھائی کمرے سے غائب ہو چکے تھے۔ میں ان کا انتظار کرنے لگا تا کہ اجازت لوں۔ جونہی کمرے میں واپس آئے میں جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ سب لوگ مجھے روک رہے تھے لیکن مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ یونہی کسی کا مہمان بن بیٹھوں۔ جب میں نے جانے کی ضد نہ چھوڑی تو وہ لوگ خاموش ہو گئے اور مجھے گاڑی تک چھوڑنے کے لئے ساتھ چل پڑے۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ ہاتھ ملا کر جب میں گاڑی میں بیٹھا تو گاڑی میرے سامان سے خالی تھی حتیٰ کہ میرا لٹکتا ہوا یونیفارم بھی نکال لیا گیا تھا۔ میں گھبرا گیا۔ میری گھبراہٹ سے میرے میزبان بھی پریشان

ہو گئے۔ تب اس کی ماں نے مسکراتے ہوئے مجھے بتایا کہ میرا سامان کمرے میں لگا دیا گیا ہے۔ اور یہ کہ اگر کمرہ مجھے پسند نہ آیا تو پھر میں بخوشی جا سکتا ہوں۔ ان کا انداز اس قدر پرخلوص تھا کہ میں مزید انکار نہ کر سکا۔ کمرہ واقعی آرام دہ تھا اور ضرورت کی ہر چیز وہاں پر مہیا کر دی گئی تھی۔

Munich میں ان کے ساتھ چار دن بہت پرلطف گذرے۔ انہوں نے مجھے اپنی گاڑی میں جی بھر کر سیر کروائی جو میں اکیلا کبھی بھی نہ کر سکتا۔ تحفہ کے طور پر مجھے ایک لائٹر ملا۔ اس کی والدہ نے مجھے بتایا کہ میرا بیٹا سیاحت کا بہت شوقین ہے اور وہ جب سیاحت پر نکلتا ہے تو اپنا سائیکل ضرور ساتھ لے جاتا ہے۔ جب کبھی شام ہو جائے اور ٹھہرنے کی جگہ نہ ملے تو علاقے کے لوگ بہت مہمان نواز ہوتے ہیں اور وہ سیاح کو اپنے گھر ٹھہرا لیتے ہیں۔ ان لوگوں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ جب بھی ان کو کوئی سیاح ایسا ملا جس کو ٹھہرنے کی جگہ نہ مل رہی ہو تو وہ ضرور اس کی خاطر تواضع کریں گے۔

مجھے احساس ہوا کہ انسانیت کا رشتہ کس قدر مضبوط ہو سکتا ہے اگر اسے محسوس کیا جائے۔ میرا اس خاندان کے ساتھ رابطہ بذریعہ خط و کتابت کافی دیر تک رہا۔ 1965ء کی جنگ کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا یورپ سے کچھ دل اُچاٹ ہو گیا۔ وجہ کوئی ذاتی بھی نہ تھی اور نہ ہی کسی دوست کا قصور تھا۔ قصور تھا تو فوجی دل کا جو یورپین طاقتوں کی بے حسی سے چوٹ کھا گیا۔ اس واقعہ کو بہت سال بیت گئے ہیں۔ لیکن اس خاندان کی مہمان نوازی کی یاد اب تک تازہ ہے۔

دشوار لمحات

پاکستان واپسی پر میری پوسٹنگ 14 فرنٹیر فورس رجمنٹ میں ہوئی۔ یہ ایک نئی آرمرڈ انفنٹری رجمنٹ تھی جو کہ 6 آمرڈ ڈویژن کے زیر کمانڈ تھی اور کھاریاں کینٹ میں کھڑا کرنے کے لیے مقیم کیا گیا تھا۔ اس کا نظام نفری کم اور آتشیں اسلحہ زیادہ استعمال کرنا تھا۔ جب تیاری مکمل ہوگئی تو اس رجمنٹ کو جمرود فورٹ جو پشاور اور لنڈی کوتل کی سڑک پر واقع ہے بھیج دیا گیا۔ لیفٹیننٹ کرنل نصیر احمد چودھری جو بعد ازاں میجر جنرل کے عہدے تک پہنچے، میرے پہلے سی او تھے۔ بہت سخت کام لینے والے لیکن بہترین آفیسر تھے۔ یہ رجمنٹ بھی گوجرانوالہ پہنچ کر اسے دیے ہوئے علاقہ میں قیام پذیر ہوئی۔ اس وقت وہ ایک بہترین یکجا قوت بن چکی تھی۔ 1965ء کی جنگ کے وقت کمانڈ کی تبدیلی ہوچکی تھی اور اب سی او لیفٹیننٹ کرنل علی الادروس تھے جن کی کمانڈ میں 1965ء کی جنگ لڑی گئی وہ بعد ازاں برگیڈیئر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ علی بہت محنتی اور خوبصورت شخصیت کے مالک تھے۔ فوجی قیادت کے ماہر تھے ان کا تعلق 10FF سے تھا جو دستوری پلٹن کے نام سے مشہور ہے اور واقعی وہ ہر کام دستور کے مطابق کرتے تھے۔ ایک اچھے لیڈر کی مانند اپنے جونیئرز کا بہت خیال رکھتے تھے۔

بھارت کے ساتھ 1965ء کی جنگ

1965ء کی جنگ شروع ہونے سے پہلے قدرتی طور پر اعصاب ایک تناؤ اور اضطرابی کیفیت سے دوچار رہے۔ جنگ کے بغیر جنگی حالت کے لئے مسلسل تیار رہنا بہت زیادہ مشقت مانگتا ہے۔ میرا یقین ہے کہ زندگی کو جس انداز سے دیکھنا چاہو ویسی ہی نظر آتی ہے۔ فیلڈ میں بھی ہم نے دلچسپ اور اچھے لمحے تلاش کر لئے تھے۔ یہاں چند لوگوں کا ذکر کرتا چلوں کیونکہ جنگ میں ان کا ساتھ رہا۔

لیفٹیننٹ کرنل نصیر چوہدری جنگی تیاریوں کی نگرانی میں اس قدر مستعدی اور احتیاط پر یقین رکھتے تھے کہ وہ تمام دن فیلڈ میں گھومتے نظر آتے یہاں تک کہ جنگ واقعی شروع ہوئی تو ان کی جیپ اور ڈرائیور دونوں کھٹارہ بن چکے تھے اور ان کا Intelligence Officer ہر راہ گیر کو سوالات سے چھلنی کرنے میں ماہر ہو چکا تھا۔

میجر نواز جو Alpha کمپنی کو کمانڈ کر رہا تھا سارا دن محنتی کمانڈر کی طرح اپنے سپاہیوں کو Train کرتا رہتا تھا۔ لیکن جوں جوں شام ہوتی اس کی طبیعت کی نرمی ظاہر ہونے لگتی اور وہ جڑی بوٹیوں کے استعمال کے مختلف نسخے لوگوں کو بتاتا رہتا۔ وہ بہترین سپاہی تھا جس نے جنگ میں نہایت ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا اور اپنی بٹالین کے لئے بہت سے اعزاز حاصل کئے۔

میجر آفریدی بی کمپنی کا کمانڈر تھا۔ وہ آفریدی پٹھان تھا۔ مگر اس کی وسطی انڈیا کے اردو بولنے والے علاقوں میں پرورش ہوئی تھی۔ اس کو ہمیشہ شکایت رہی کہ وہ اپنے باقی ہم عصر افسروں سے تین سال پہلے ریٹائر ہو جائے گا کیونکہ بھرتی کے وقت اس کو کم عمر ظاہر کرنے کے چکر میں اس کی اصل عمر سے تین سال کم کا اندراج کروایا گیا تھا۔ بہرحال آفریدی کو اپنی زندگی کا بہترین چانس اسی جنگ میں ملا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ نشان حیدر لینے سے محروم ہو گئے۔ کیونکہ کچھ خام احکامات کی وجہ سے ان کی R.R پلاٹون صبح صبح ہندوستان کی ایک رجمنٹ جو لیگر میں قیام پذیر تھی، پر فائر نہ کھول سکی۔ انہوں نے ایک سنہری موقع ہاتھ سے گنوا دیا۔

ہمارے ساتھ سیکنڈ لیفٹیننٹ سلیم اسحاق بھی تھے جو بعد میں میجر جنرل ہوئے۔ ان کا قد چھ فٹ چار انچ تھا۔ بہت ہی سجیلا جوان تھا۔ نڈر، خطروں سے کھیل جانے والا۔ سیکھنے کو تیار۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ وہ صبح صبح ایک حوالدار یوسف کے ساتھ باکسنگ کر رہا تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ اس ہیوی ویٹ چمپئن کی آنے والے ڈویژنل چیمپئن شپ کی تیاری میں مدد کر رہا تھا۔

ایک رات بہت زبردست طوفان آیا، ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے اور اس قدر زور دار تھے کہ سلیم کا 40 پونڈ کا ٹینٹ کاغذ کی طرح ہوا میں اڑ گیا۔ میرا 180 پونڈ کا ٹینٹ بھی اپنے بھاری بانس سمیت چوکھٹ سے اکھڑ گیا۔ اس کو پکڑ رکھنے کی کوشش میں میں خود بھی ہوا میں نیم معلق ہو گیا۔ سلیم اسحاق بھاگتا ہوا میری مدد کو پہنچا۔ ہم دونوں نے خدا جانے کس جتن سے اس بھاری پتنگ کو سنبھالے رکھا اور اس کو اڑنے نہ دیا اور آخر کار مدد آن پہنچی۔

ایسے بہت سے واقعات پیش آتے رہے۔ جس سے ہم سب کے درمیان ایک ٹیم سپرٹ قائم رہی اور ہم ایک دوسرے کے کام آتے رہے۔ میں نے 1965ء کی جنگ اس رجمنٹ کے ایک

حصے کے طور پر لڑی۔ چیدہ واقعات کا یہاں ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔
24 Infantry Brigade نے ہندوستانی فوج کے حملے کو پسپا کیا اور 10/11 ستمبر 1965ء کو 9FF اور 11Cavalry نے ان کی جگہ لے لی تاکہ وہ پسرور جا کے کچھ دیر آرام لے سکیں اور اپنے وسائل کو دوبارہ منظم کر سکیں MRL Canal کے پلوں کی حفاظت 14FF کر رہی تھی۔ خطرہ تھا کہ ہندوستانی فوجی ان پلوں کو اڑانے کی کوشش کریں گے تاکہ پاکستانی افواج تک رسد نہ پہنچ سکے۔ ہندوستانی حملہ کو ناکام بنانے کے لئے 14FF کو چونڈہ جانے کا حکم ملا۔ ہندوستانی فوج نے یہاں اپنی پوری قوت جمع کر کے حملہ کیا جس کو پسپا کر دیا گیا یہ کہنا مناسب ہوگا کہ سب سے بڑی ٹینکوں کی جنگ اسی سیالکوٹ سیکٹر میں لڑی گئی۔
ہم نے دن کی روشنی میں چونڈہ کی طرف سفر شروع کیا سڑک زیادہ تر سپاہیوں اور ہر قسم کی گاڑیوں سے بھری پڑی تھی، دوطرفہ ٹریفک جاری تھی جو کسی کنٹرول کے بغیر جام ہو رہی تھی کچھ سپاہی تو خاصے پریشان نظر آ رہے تھے۔ یا شاید انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ ہندوستان کے فرسٹ آرمرڈ ڈویژن نے 9FF اور 11Cavalry کے دفاع کو پھلورا کے مقام پر کاٹ دیا تھا اور اب چونڈہ اور پسرور axis کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ان کی کوشش تھی کہ رسد کی یہ لائن کاٹ دی جائے اور سیالکوٹ جو پاکستان کا ایک بڑا شہر ہے اس پر مشرق کی جانب سے یلغار کی جا سکے۔ ہم بڑی مشکل سے اس افراتفری سے نکلے اور اندھیرا ہونے سے پہلے چونڈہ پہنچ گئے۔ رائفل کمپنیاں بھی اپنی تعیناتی کی جگہوں پر پہنچ گئی تھیں۔ کیپٹن آر۔ڈی بھٹی (بعد ازاں لیفٹیننٹ جنرل) جو اس وقت Adjutant تھے میرے ساتھ (CV) یعنی Command Vehicle میں سفر کر رہے تھے۔ ہم نے جونہی چونڈہ کا ریلوے اسٹیشن کراس کیا ہم پر ہندوستانی فضائیہ کے چار Gnat جہازوں نے حملہ کر دیا۔ جہاز اوپر سے چکر لگا کر آتے اور ہم پر راکٹ برسا کر گذر جاتے۔ ہماری خوش قسمتی کہ ان کے تمام نشانے خطا گئے اور راکٹ کھلے کھیتوں میں گرتے رہے۔ ہماری گاڑی کے ڈرائیور نے گاڑی روک دی لیکن کیپٹن بھٹی نے چلا کر اسے چلتے رہنے کا حکم دیا اور کہا کہ پوری رفتار سے چلو تاکہ فضائی حملے سے کوئی آڑ لی جا سکے۔ مگر جہاز ایک حملہ کر کے دوبارہ واپس نہ آئے وہ شاید اپنی دانست میں کام تمام کر چکے تھے۔ اس لئے واپس اپنے Base پر جاتے ہوئے دکھائی دیئے۔ یہ میرا عملی جنگ کا پہلا تجربہ تھا۔ اس اچانک حملے نے ہمیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا کیونکہ زمین پر دشمن سے آمنے سامنے کے لئے تو ہم ہمہ وقت تیار رہتے تھے لیکن آسمان سے اچانک حملہ ایک بالکل ہی مختلف تجربہ تھا۔ اب ہمیں ہندوستان کے وحشی عزائم کا پوری طرح اندازہ ہو چکا تھا اور ہم نے زیادہ محتاط اور ہوشیار رہنے کا تہیہ کیا۔ باقی

کی رات ہم اپنے دفاع کو مضبوط بنانے میں مصروف رہے۔

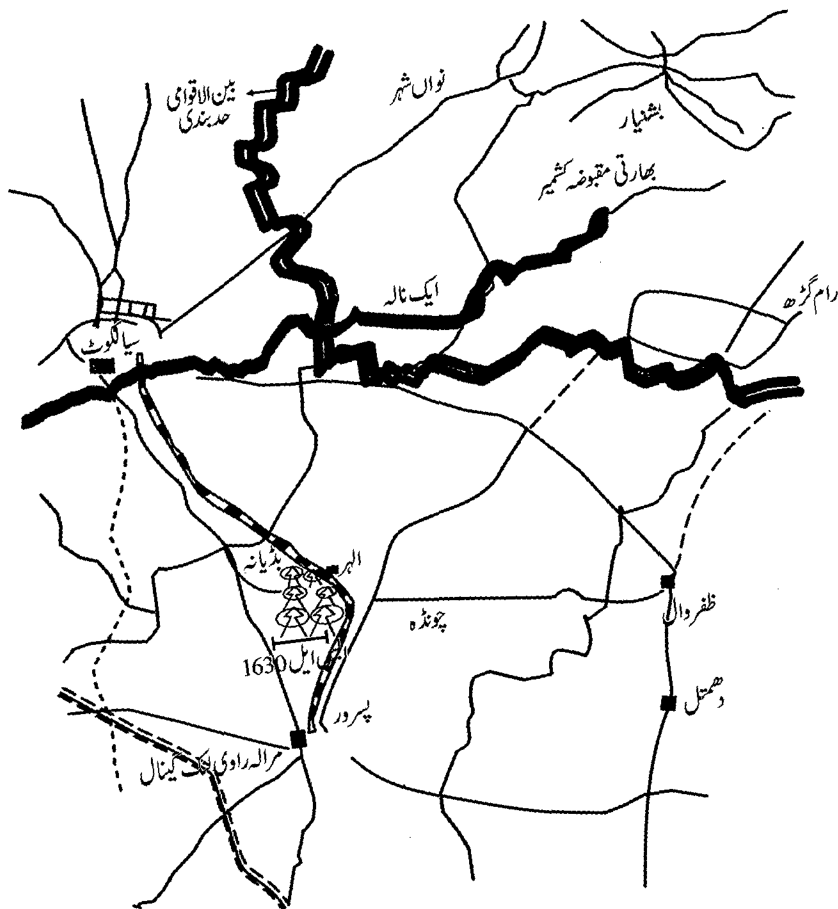
بے چارہ بھٹی تقریباً چھ روز سے مسلسل جاگ رہا تھا اس کے ذمہ ایک بہت ہی حساس ڈیوٹی تھی یعنی جو بھی آرڈر کمانڈ سے آئے اسے فوراً آگے پہنچایا جائے۔ جنگ میں مواصلات ایک بہت ہی اہم شعبہ ہوتا ہے اور جنگ میں کامیابی کا انحصار بھی اس شعبہ پر ہوتا ہے۔ ایک بھی حکم کا نہ پہنچنا نا قابل تلافی نقصان پہنچا سکتا ہے۔

12 ستمبر 1965ء کو جنگ کا ایک نقشہ بن چکا تھا۔ یعنی ہندوستان کی پیش قدمی روک دی گئی تھی یا یوں کہہ لیجئے کہ ان کو اپنی یلغار کا منہ توڑ جواب مل چکا تھا۔ صبح ساڑھے دس بجے بھٹی ایک درخت کے نیچے ستانے کے لئے لیٹا اور ساتھ ہی مسلسل رات جاگنے کی وجہ سے ایک دم اُونگھ گیا اور خراٹے لینے لگا۔ اسی دوران ہندوستان کی توپوں نے ہم پر فائر کھول دیا اب ہم پر چاروں طرف سے گولے برسنے لگے۔ ہوا میں ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ گولہ کس سمت سے آ رہا ہے اور کس سمت جا رہا ہے۔ ایک گولہ سیدھا بھٹی کی جانب جا رہا تھا جو اس قدر گہری نیند میں تھا کہ اسے ابھی تک حملے کا احساس نہیں ہوا تھا۔ خدا تعالیٰ نے انسان کے اندر بھی عجیب سسٹم فٹ کئے ہیں۔ صوبیدار میجر نذر گل نے جونہی دیکھا کہ بھٹی نے جنبش نہیں کی اور ساتھ ہی ہوا میں گولے کی سمت کا بھی اندازہ لگایا کہ یہ عین بھٹی کی جانب ہے تو اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ ایک جست لگائی اور بھٹی کو ٹانگ سے کھینچتا ہوا قریبی خندق میں اپنے ساتھ گرا لیا۔ گولہ جو پھٹا تو اس کی اُڑتی ہوئی قاتل کرچیاں چاروں طرف پھیل گئیں۔ ایک میری دائیں کلائی کو زخمی کر گئی اور اس بری طرح اندر دھنسی کہ بعد میں ڈاکٹروں نے بھی اسے نکالنے سے انکار کر دیا۔ وہ آج تک وہیں محفوظ ہے۔ بہرحال کوئی لمبا چوڑا نقصان نہیں ہوا اور ایک بار پھر ہم پر خدا کی رحمت کا سایہ رہا۔

گیارہ اور بارہ ستمبر کی درمیانی رات ہمارے لئے سب سے زیادہ پُرآشوب تھی۔ ہندوستانی فوجیں بار بار حملہ کرتیں لیکن پاکستانی سپاہی اپنی جگہ ڈٹے رہے اور ان کے حملے پسپا کرتے رہے۔ پاکستانی افواج کی اس سیسہ پلائی دیوار پر ہندوستانی پے در پے حملے بے اثر ثابت ہوتے رہے۔ ہماری آرٹلری ان پر تمام رات بغیر کسی تعطل کے گولے برساتی رہی اور ان کو مہلت ہی نہیں دی کہ وہ اپنی قوت کو یکجا کر کے کوئی بڑا حملہ کر سکیں۔ میجر غلام سرور جو بیٹری کمانڈ کر رہے تھے، نے یہ بالکل پروا نہیں کی کہ مسلسل گولہ باری کرنے سے ان کی توپوں کا کیا حشر ہوا اور نہ ہی انہوں نے کسی کو آرام لینے دیا گولے برسانا اور بار بار توپ میں گولے کو لادنا کوئی ہلکا پھلکا کام نہیں۔ یہ وہی جانتے ہیں جو کرتے ہیں۔ یا جوان کو کرتا ہوا قریب سے دیکھتے ہیں۔ میں اپنے گنرز کو سلام کے ساتھ خراج تحسین

جیسوراں پر قبضہ (1965ء کی جنگ)

سکیل 1/250,000 میٹر



جیسوراں پر قبضہ (جنگ 1965ء)

سکیل 1/50,000 گز

پیش کرتا ہوں ان کے جذبے کے لئے بھی اور ان کی تکنیکی صلاحیتوں کی وجہ سے بھی۔ ہندوستان کی طرف سے جو بھی گن فائر کرتی ہمارا جوابی فائر اس کو خاموش کر دیتا۔ یعنی ان کا نا قابل تلافی نقصان ہوجاتا، ہمارے OP آفیسر اس قدر صحیح نشاندہی کرواتے تھے کہ کوئی گولہ ضائع نہیں ہوتا تھا۔ اس تمام کارکردگی کا سہرا ان تمام گنرز کے علاوہ میجر سرور کو بھی جاتا ہے جس کی قائدانہ صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ پیشہ وارانہ تربیت بھی اس قدر جامع تھی کہ اس نے ایسے نازک مرحلے پر نہ صرف اپنے ملک کی سرحدوں کی بھرپور حفاظت کی بلکہ ان قیمتی فوجی جوانوں کی بھی جو ہمارا اثاثہ ہیں۔

جیسوراں پر دوبارہ قبضہ

اس وقت جنگ کا خاکہ کچھ ایسا تھا۔ ہندوستانی فوج نے چونڈہ، بڈیانہ سڑک کو کاٹ دیا تھا اور جیسوراں گاؤں پر جو اس سڑک کے کنارے ایک ٹیلے پر واقع تھا، قبضہ کر لیا تھا۔ اس سڑک کو ہندوستانی فوج سے آزاد کرانا بہت ضروری تھا۔ اس سڑک پر دشمن کی فوج کا صفایا کرنے کے لئے مجھے بٹالین ہیڈ کوارٹر میں کرنل علی نے 19 ستمبر کو صبح گیارہ بجے طلب کیا اور حکم دیا کہ میں اس ''ٹاسک فورس'' میں شامل ہو جاؤں جسے جیسوراں کو ہندوستانی فوج کے قبضے سے واپس لینا ہے۔ میجر محمد بختاور حسین خاں کو جو ہماری بٹالین کے سیکنڈ ان کمانڈ تھے اس ٹاسک فورس کو کمانڈ کرنے کا آرڈر ملا۔ یہ بتاتا چلوں کہ ہندوستانی حملہ آور فوج جیسوراں کو ایک قلعہ کے طور پر استعمال کر رہی تھی جہاں سے ان کے پروگرام کے مطابق بڈیانہ، جیسوراں اور پھر چونڈہ سمیت تمام علاقے کو حاصل کرنا تھا۔

بہرحال ٹاسک فورس کے ذمے اس جگہ کو دوبارہ حاصل کرنا تھا باقی احکامات ہمیں بریگیڈ کمانڈر بریگیڈئر ریاض الکریم نے دینے تھے۔ انہوں نے میجر بختاور کو اپنے جنگ کے حوالے سے بنائے گئے ہیڈ کوارٹر میں جو بڈیانہ میں واقع تھا بلایا تاکہ ان کو اس پیش قدمی اور حملے کے زاویے اور تکنیک کے بارے میں بتایا جائے۔ چونکہ یہ ایک بہت پرخطر مہم تھی اس لئے اس کو بہت احتیاط اور جوانمردی سے پایہ تکمیل تک پہنچانا لازمی تھا۔ بریگیڈئر صاحب نے ساتھ ساتھ میجر بختاور کو دنیاوی اعزاز کی بھی لالچ دے ڈالی اور کہا کہ کامیابی کی صورت میں انہیں فوراً لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی مل جائے گی۔

میجر بختاور کو غالباً اس کی ضرورت نہ تھی کیونکہ وہ ایک محب وطن آفیسر تھا اور اس کے سامنے اس دنیاوی اعزاز سے بہت بڑا ایک اعزاز تھا جس کو ''شہادت'' کہتے ہیں۔ ایک مسلمان سپاہی کے لئے ''شہادت'' کا مطلب ابدی زندگی اور بخشش ہے جو ہر دنیاوی اعزاز پر بھاری ہے۔ انہوں نے بریگیڈئر صاحب کے سامنے اپنا ''غازی یا شہید'' والا عہد دہرا دیا۔

ہمارے ذمہ جو مشن تھا اس میں جیسوراں کو دوبارہ حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ بڑیانہ سے جیسوراں جانے والی سڑک سے بھی دشمن کا صفایا کرنا تھا اور اس وقت تک اس کی حفاظت کرنی تھی جب تک ہمیں کمک نہ پہنچ جائے۔ میجر محمد بختاور حسین کے جنگی دستے میں 19th Lancers کا ایک سکاڈرن شامل تھا جس کو میجر سرور چودھری کمانڈ کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ 7th FF کی B کمپنی جس کو میجر نیازی کمانڈ کر رہے تھے اور ہماری رجمنٹ کی C کمپنی جس کو میجر بشیر کمانڈ کر رہے تھے اس ٹاسک فورس کے زیر کمان تھے ہمیں تھیٹر میں موجود تمام آرٹلری سے فائر کور ملنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ میجر بختاور نے انتہائی عجلت سے حملے کا پلان بنایا اور گروپ میں شامل باقی لوگوں کو ضروری ہدایات جاری کیں۔ حملہ اس روز یعنی 19 ستمبر کو شام 4 بجے کیا گیا۔ ہماری اطلاع کے مطابق ہندوستانی فوج کی پوری ایک انفنٹری کمپنی جیسوراں میں موجود تھی اور انہوں نے دونوں گاؤں کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ چونڈا، جیسوراں، بڑیانہ سڑک پر بھی بھاری تعداد میں دشمن کے سپاہی موجود تھے۔ گنے کی فصل کی وجہ سے کئی جگہ پر فائر کرنا بھی مشکل تھا۔ معرکہ خطرناک تھا اور حالات قابو سے باہر بھی ہو سکتے تھے۔ دشمن تعداد میں کہیں زیادہ تھا۔ اسے ہتھیاروں میں بھی برتری حاصل تھی۔ 7th FF کی کمپنی حملے کے لئے تھوڑی تاخیر سے پہنچی۔ اس لئے حملہ کے مقرر کردہ وقت میں آدھے گھنٹے کی توسیع کرنی پڑی دشمن کی بھاری گولہ باری اور گولیوں کی بوچھاڑ تلے ہم نے Start Line کو پار کیا'C' کمپنی بائیں جانب تھی اور'B' کمپنی دائیں جانب۔ ہاتھوں میں بندوقیں لئے ہمارے شیر جوان انتہائی بے جگری سے اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھنے لگے۔ گولیاں سیٹیاں بجاتی ہوئی ہمارے چاروں طرف سے گزر رہی تھیں۔ حوصلہ، جذبہ اور اعصاب کی مضبوطی کا امتحان تھا۔'اللہ اکبر' کا نعرہ لگا کر ہمارے جوانوں نے دشمن پر تابڑ توڑ حملے کئے۔ ان کی جرأت اور ہمت کے آگے دشمنوں کے تمام دفاع ریت کی دیوار کی طرح گر گئے۔ کوئی ہندوستانی ٹینک ہمیں راستے میں نظر نہ آیا۔ ہمارے ٹینکوں کی گولہ باری کا کوئی جواب نہ ملا۔ یوں لگتا تھا کہ حملے کی شدت کا اندازہ کر کے ہندوستانی فوج نے گھبراہٹ میں اپنی مشین گنز اپنی بھاگتی ہوئی فوج کو Cover دینے کے لئے نکال لی تھیں۔ ہمیں اسلحہ کے بند ڈبے گولیوں سے بھری پیٹیاں وائرلیس سٹیس اور بیٹریاں میدان میں بکھری ہوئی ملیں۔ البتہ گنے کے کھیتوں میں چھپے سپاہیوں نے مدافعت کی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستانی پلان (plan) کے مطابق گنے کے کھیتوں میں سے چھپ کر ہماری افواج پر حملہ کیا جانا تھا شاید انہیں ہمارے حملے کی اطلاع مل چکی تھی یا انہوں نے از خود خطرہ محسوس کیا تھا۔ گنے کے کھیتوں میں چھپ جانے سے تمام علاقہ خالی نظر آنے لگ گیا تھا اگر ہم احتیاط نہ

برستے تو باآسانی ان کے نرغے میں پھنس سکتے تھے۔ مگر الحمدللہ ہمارے اندازے صحیح نکلے اور حکم ملنے پر ہمارے انفنٹری کے جوانوں اور ٹینک رجمنٹ نے گنے کے کھیتوں پر لگاتار فائرنگ کی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پاکستانی افواج نے اپنی پوری طاقت سے یہاں حملہ کر دیا ہو۔ ہندوستانی افواج کے پاؤں اکھڑ گئے اور انہوں نے محسوس کر لیا کہ وہ اپنے مرکزی دفاع سے کٹے جا رہے ہیں اس لئے انہوں نے تیزی سے پسپائی شروع کر دی۔ ہم نے ہندوستان کی بھاگتی ہوئی فوجوں سے 5 بج کر 45 منٹ پر بڈیانہ، جیسوراں اور چونڈا کی سڑک واپس لے لی۔

اس فتح کے بعد قدرتی طور پر ہمیں ہندوستان کے جوابی حملے کا اندیشہ تھا جس کے لئے تیار رہنا بھی ضروری تھا۔ کمک اور دوبارہ صف بندی کی ضرورت تھی۔ سی کمپنی جو گیارہ ستمبر سے جنگی حالت میں تھی اپنا بہت سا اسلحہ استعمال کر چکی تھی جن میں ان کی زیادہ تر RR شامل تھیں۔ Anti tank دفاعی اسلحہ کی بھی اشد ضرورت تھی اور یہ اس لئے بھی انتہائی ضروری تھا کیونکہ ہمارے ٹینک رات کے وقت ایک جگہ پر اکٹھے کھڑے تھے اور یہ ایسی پوزیشن تھی جس میں دشمن کے حملے سے بہت نقصان ہوسکتا تھا سوچ بچار کے بعد ہم نے 19th Lancers سے مدد مانگی اور Task Force کمانڈر نے ان کی RR ٹروپ کو اس پوزیشن کی حفاظت پر مامور کر دیا لیکن مسئلہ ان کو ہماری پوزیشن تک پہنچنے کا تھا۔ چند تکنیکی وجوہات کی بناء پر RR کو ہماری صحیح پوزیشن معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ اس لئے مجھے حکم ملا کہ میں 19th Lancers رجمنٹ کے ہیڈ کوارٹر جا کر RR کو ساتھ لے کر آؤں اور "سی" کمپنی کو ہدایت ملی کہ جب RR جیسوراں سڑک پر پہنچیں تو وہ ان کو اس جگہ پہنچائیں جہاں پر ان کی ضرورت تھی۔ میں جیپ میں اپنے آپریٹر اور ڈرائیور لانس نائیک بہادر کو ساتھ لے کر منزل مقصود کی طرف روانہ ہوا۔ اندھیرا تقریباً پھیل چکا تھا اور صحیح سمت قائم رکھنا خاصا مشکل ہو گیا تھا اور کھلے میدان میں جہاں نہ کوئی سڑک ہو اور نہ کوئی اشارہ صحیح سمت کا تعین کرنا آنکھ مچولی کی طرح تھا راہ کو ٹٹولتے ہوئے ہم اندھیرے میں آگے بڑھتے رہے اتفاق سے 19th Lancers کے ہیڈ کوارٹر کے قریب دو جلتے ہوئے ٹینکوں نے اشارے کا کام دیا اور ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے تیزی سے وہاں پہنچ گئے اس RR دستے کی سربراہی ایک اعزازی لیفٹیننٹ کر رہا تھا اس کو صورت حال سے آگاہ کیا اور کمانڈر کے احکامات پہنچائے اس نے تعمیل کی اور ہم ان کو لے کر جیسوراں کی طرف واپس چل پڑے تھکن سے چور سارا دن میدان جنگ میں گزارنے کے بعد اندھیرے میں آنکھیں کھلی رکھنا مشکل تھا اور نظر دھوکہ دینے لگ گئی تھی۔ ہم مشرق کی جانب جیسوراں کی طرف بڑھ رہے تھے دور سے مجھے ایک آدمی نظر آیا جو ہم پر حملہ کرنے کی پوزیشن میں

بیٹھا تھا۔ میں نے RR دستے کے اعزازی لیفٹیننٹ کو کہا کہ وہ چند آدمیوں کو لے کر آہستہ آہستہ آگے جائے اور صورت حال کا اندازہ کرے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے احکامات ماننے میں ہچکچاہٹ کا اظہار کیا۔ ایک جونیئر لیڈر سے مجھے ہرگز یہ امید نہ تھی۔ میں نے خود آگے جانے کا فیصلہ کیا اور اس کو کہا کہ دائیں جانب سے مجھے کور کرے ہم رینگتے ہوئے آگے بڑھنے لگے مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ شخص اس پوزیشن میں وہیں کا وہیں جامد کیوں تھا؟ جب ہم قریب پہنچے تو آنکھوں کی خود فریبی پر ہنسی آ گئی۔ کیونکہ وہ دشمن کا سپاہی نہیں بلکہ چارہ کاٹنے والی مشین تھی۔ اعصاب کا تناؤ، اندھیرا، جنگی صورت حال اور انسانی ذہن کی اختراع ایسے بہت سے واقعات کو جنم دیتی ہے۔ ہم بڑھتے ہوئے جیسوراں پہنچ گئے۔ اندھیرے کی وجہ سے اصل پوائنٹ پر پہنچنے میں بے انتہا مشکل پیش آ رہی تھی۔ ہم کافی دیر گاڑیوں میں ادھر ادھر گھومتے رہے اور اصل جگہ تک پہنچ ہی نہ پا رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ گاڑیوں کی آواز سے ہندوستانی افواج کی طرف سے ہم پر خوب گولے برسیں گے جو کچھ دیر بعد برسنے شروع ہو گئے کیونکہ وہ زیادہ دور نہیں تھے۔ خوش قسمتی سے اس دوزخ نما گولہ باری سے بچتے چلے گئے میں نے آخری حربہ استعمال کرتے ہوئے میجر بختاور سے Radio پر خاموشی کی ہدایات توڑ کر رابطہ قائم کر لیا کیونکہ وقت کم ہوتا چلا جا رہا تھا اور اندیشہ تھا کہ کہیں ہم دشمن کے شکنجے میں نہ آ جائیں۔ تاریکی کی وجہ سے بھی کوئی ہمیں کور نہیں دے رہا تھا۔ میجر بختاور نے انتہائی ہمت کا مظاہرہ کیا اور خود آ کر ہمیں اپنے مقام تک لے گئے۔ RR رائفلوں کو ہم نے دفاعی جگہ پر متعین کر دیا۔ تمام وقت دشمن کی طرف سے بھاری گولہ باری ہوتی رہی تمام رات قیامت کا سماں تھا۔ کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لئے پراسرار سی خاموشی چھا جاتی تھی۔ مسلسل گولہ باری میں چند لمحوں کی اس خاموشی کا فائدہ اٹھا کر ہم جلدی جلدی اپنی خندقیں درست کر لیتے۔ جونہی گولہ باری شروع ہوتی ہم بھاگ کر اپنی پناہ گاہوں میں پہنچ جاتے۔ ایک ایک خندق میں کئی کئی لوگ سمائے ہوئے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے انسانوں کی ڈھیریاں لگی ہوں۔ نہ کوئی افسر تھا اور نہ کوئی سپاہی۔ زندگی کی اہمیت واضح تھی۔ ایسے میں کھانے کا ہوش کہاں ہو سکتا ہے۔ لیکن بہر حال انسانی ضروریات بھلائی بھی نہیں جا سکتیں۔ 20 ستمبر کو صبح تین بجے صوبے دار فقیر شاہ خدا جانے کس طرح گرتا پڑتا بغیر راستوں کی نشاندہی کے ہم تک کھانا لے کر پہنچا۔ ٹھنڈی دال جو دال کم اور پتھر زیادہ لگتی تھی، چمڑے جیسی روٹیوں کے ساتھ کھانے کو ملی۔ کچھ نے ان کو چبانے کی زحمت کی لیکن زیادہ تر نے اپنے راشن پر اکتفا کیا۔ کچھ نے تو صرف ارادے کی مضبوطی کا سہارا لیا۔ صبح چار بجے جب پو پھوٹ رہی تھی تو دور سے ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی جو 19th

Lancer کے ٹینکوں کی تھی ہماری مرضی کے خلاف یہ سب ٹینک ایک جگہ اکٹھے ہو گئے تھے۔ یہ پوزیشن بہت خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ اگر دشمن کو خبر ہو جاتی تو ایک ہی حملے میں سب ناکارہ ہو سکتے تھے چونکہ اب تک ہمارے پاس بھی نہیں پہنچے تھے۔ میں نے سکواڈرن کو ایک ریڈیو پیغام بھیجا اور صورت حال سے آگاہ کیا۔ تاکہ ٹینک ہم تک فوراً پہنچیں۔ لیکن وہ ہم تک پہنچنے میں متذبذب تھے کیونکہ راستے میں کچھ ٹیلے تھے جن پر گزرتے ہوئے وہ دشمن کے فائر کی زد میں آ سکتے تھے۔ بہرحال آخر میں انہوں نے فیصلہ کر لیا اور ہندوستانی افواج کو پیچھے روکے رکھنے میں ہماری مدد کے لئے آن پہنچے۔ جونہی دن کی روشنی پھیلی ہم نے دشمن کی صورت حال کا اور اپنے نقصان کا جائزہ لیا اور ساتھ ساتھ اپنے دفاع کو مضبوط کرنے کا بھی بندوبست کیا۔ دن میں ہم نے دیکھا کہ جیسوراں گاؤں مکمل طور پر خالی ہو چکا تھا ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ اور جنگ کی بربادی چاروں طرف پھیلی نظر آ رہی تھی کچھ آوارہ کتے اور چند بھٹکی ہوئی مرغیاں زندگی کے کل آثار تھے جو اس موت کی سی خاموشی کو توڑ رہے تھے۔ گھر اور دکانیں کھلی پڑی تھیں گاؤں غالباً بہت جلدی میں خالی کیا گیا تھا اس لئے ہم مزید احتیاط سے آگے بڑھ رہے تھے۔ دشمن کہیں سے بھی نکل کر ہم پر وار کر سکتا تھا۔ مگر کچھ دیر آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے ہمیں یقین ہو گیا کہ کوئی بھی ذی نفس وہاں پر موجود نہیں تھا ایک جگہ خفیہ مورچہ بہت چالاکی سے بنایا ہوا ملا۔ اوپر سے جگہ کو اس طرح بنا رکھا تھا کہ گمان بھی نہیں ہوتا تھا کہ یہاں پر مورچہ ہوگا۔ یہ مورچہ بھی جلدی اور گھبراہٹ میں خالی کیا ہوا نظر آیا کیونکہ کھانے پینے کا سامان یوں پڑا تھا جیسے ابھی کھانا جاری ہو اور کوچ کا فوری حکم مل جائے۔ چند پوریاں اور سبزیوں کی بھجیا کھانے والے کی منتظر پڑی تھی۔ ایک فوجی تھیلے میں ہالینڈ کا بنا دودھ کا ڈبہ، چائے کی پتی، اور چینی ملی۔ غالباً یہ وہ ایمرجنسی راشن تھا جو ہندوستانی سپاہیوں کے پاس ہوتا ہے۔ خطرے کے کوئی آثار نہ پا کر ہم لوگ قدرے مطمئن ہو گئے۔ چائے کے سامان کو دیکھ کر بھوک اور تھکن نے بھی سر اٹھایا سوچا کہ کیوں نہ ہمت کر کے چائے بنا لی جائے۔ سوکھی لکڑیاں چن کر ہم نے آگ جلائی اور چائے کا بندوبست کیا ایک کھلی دکان میں کھانے کے لئے بند پڑے نظر آئے۔ بھوک نے تو بغاوت کر ہی دی تھی۔ اس لئے سوچا کہ اس ایندھن کو بھی پیٹ پوجا کے لیے استعمال کیا جائے۔ دشمن سے حاصل کردہ مال غنیمت پر تو جیسے اپنا حق تھا لیکن دکان سے کچھ اٹھانے کے لئے ضمیر کی دیوار پھلانگنی پڑی۔ اپنے آپ سے وعدہ کیا کہ جب دکاندار لوٹے گا تو اسے معاوضہ دے دیں گے اور دکان سے حسب ضرورت کھانے کی اشیاء لے جا کر ہم نے اپنے بھوکے پیٹ اور تھکن سے چور اعضاء کی ضیافت کا اہتمام کیا۔ جنگ کے میدان میں بنائی گئی

یہ ہماری پہلی چائے تھی۔ یوں محسوس ہوا جیسے آسمان سے من وسلویٰ اتر آیا ہو۔ ہزاروں بار چائے پی ہوگی لیکن اس چائے کا مزہ اور سرور کبھی نہیں بھول سکتا۔ چاروں طرف سے خطرے نے گھیر رکھا تھا۔ خاموشی اور ویرانی میں کان ہر آہٹ پر پہرہ دے رہے تھے۔ کیونکہ ہر لحظہ دشمن کے پلٹ کر حملہ کرنے کا اندیشہ تھا۔ بہرحال فرض سے غافل ہوئے بغیر ہم نے چائے پی اور قریبی گنے کے کھیت سے ہمیں کچھ اسلحہ بھی ملا پہلے تو ہم اسے ہندوستانی سمجھتے رہے لیکن ذرا غور سے دیکھا تو یہ ہمارا اپنا اسلحہ تھا۔ M-I رائفلز شاید ہمارے وہ فوجی چھوڑ گئے تھے جن کو پہلے گاؤں کی حفاظت پر معمور کیا تھا۔ ہندوستانی فوج کے دباؤ تلے جب وہ پیچھے ہٹے تو اپنا اسلحہ بھی چھوڑ گئے۔ ہم نے خدا کا بے انتہا شکر ادا کیا کہ ہم دوبارہ فاتح بن کر اس جگہ پہنچ گئے تھے جہاں سے دشمنوں نے ہمیں اکھاڑ پھینکا تھا۔ اپنی سرزمین کی حفاظت کر کے ہمارے سر فخر سے بلند ہو گئے اور دل بارگاہ ایزدی میں جھک گئے۔ ہمارا جوابی حملہ بہت بروقت اور شدید تھا۔ جس کا تمام تر سہرا میجر بختاور کے سر تھا یہ شخص اس تمام آپریشن کے دوران ایک خاموش اور مضبوط چٹان کی طرح نظر آیا۔ ہم نے اس کے چہرے پر نہ تو ذمہ داری کا تناؤ دیکھا اور نہ ہی اس کے اعصاب پر سالاری کا دباؤ محسوس ہوا۔ اس کی خوداعتمادی ہم تک بھی پہنچتی رہی تجربہ اور جنگی مہارت کے ساتھ ساتھ خوش طبعی بھی اس فوجی افسر کو عطا ہوئی تھی وہ بات کرتا بھی تو انتہائی سکون کے ساتھ۔ ہمارے چوبیس گھنٹے بغیر کھائے پیئے گذر چکے تھے لیکن وہ بدستور اپنی بشاشت پر قائم تھا نہ کوئی تھکن کے آثار تھے اور نہ ہی بھوک سے اس کے ہونٹوں پر پیپڑیاں جمی تھیں وہ اپنے جوش اور جذبے سے اپنے سپاہیوں کی ہمت بڑھاتا دلیرانہ انداز میں آگے بڑھتا گیا۔ دن کے چار بج چکے تھے اور سائے ڈھلنے لگے تھے کہ ہندوستانی فوج نے جنگ کا رخ بدلنے کی آخری کوشش کی اور ہمیں جیسوراں سے نکالنے کے لئے فضائی حملہ کیا۔ جہاز ہمارے سروں پر چکر لگا رہے تھے۔ انہوں نے نشانے باندھے اور تیزی سے Napalm بم برساتے ہوئے اوپر اٹھ گئے۔ یہ بم اگر پھٹ جاتے تو جہنم کا سماں ہوتا کیونکہ اس خطرناک بم کا کام ہی آگ لگانا ہے۔ ان کی کوشش تھی کہ تمام علاقے میں آگ لگا دیں اور بھاگتے ہوئے سپاہیوں کو گولیوں سے بھون دیں۔ اس طرح علاقہ خالی کر کے وہ اپنی بری فوج کو جو اکھڑ چکی تھی دوبارہ جیسوراں میں لانا چاہتے تھے۔ لیکن ''جس کو اللہ رکھے اس کو کون چکھے'' ہم نے اس بات کی صداقت کو عملاً دیکھا۔ کوئی Napalm بم پھٹا ہی نہیں۔ حیرت سے ہم دم سادھے آگ کے شعلوں کے منتظر رہے لیکن واہ ری قدرت جو ہمیں بچا رہی تھی نہ بم پھٹے اور نہ کوئی شعلہ لپکا۔

جیسے ہی ہندوستانی جہاز دوبارہ حملے کے لئے گھوم کر پلٹے آسمان پر ہی ہماری مدد آن پہنچی۔

پاکستان ایئر فورس کے چار Sabre طیارے نجانے کہاں سے نمودار ہوئے اور ہندوستان کے جہازوں پر حملہ کر دیا وہ اس اچانک فضائی حملے کے لئے تیار نہ تھے اور بری طرح بوکھلا کر بھاگ نکلے۔ ہم اپنے جہازوں کو دشمن کے جہازوں کا تعاقب کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے کہ اچانک دشمن کا ایک طیارہ فضا میں آگ کا گولہ بن گیا اور قلا بازیاں کھاتا ہوا زمین کی طرف آ رہا ہم نے جہاز کے پائلٹ کو جہاز سے چھلانگ لگاتے ہوئے بھی دیکھا اور اس کے پیراشوٹ کو کھلتے ہوئے زمین کی طرف آتے بھی دیکھا جہاں اس کو جنگی قیدی بننا تھا اس کے باقی ساتھیوں نے دوبارہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور بھاگنے میں ہی عافیت سمجھی۔ خدا کی ذات بے نیاز ہے وہ لوگ جو طاقت کے نشے میں ہمیں آگ کے سمندر میں ڈبونے آئے تھے شرمندگی لئے بمشکل تمام اپنے اڈے پر واپس پہنچے ہوں گے۔ بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ ہمارے طیارے کسی اور مشن سے واپس لوٹ رہے تھے ان کے پاس برائے نام آتشیں اسلحہ باقی بچا ہوا تھا لیکن انہیں ہندوستانی جہاز نظر آئے انہوں نے اپنا راستہ بدلنے کی بجائے پروا کئے بغیر ان پر حملہ کر دیا۔ دشمن پر حملہ اس قدر اچانک ہوا کہ وہ سراسیمگی میں بھاگ نکلا اور ہمارے شاہین ہمارے لئے قدرت کی غیبی امداد ثابت ہوئے۔ پاکستان کی بری، فضائی اور بحری افواج کا یہی طرۂ امتیاز ہے کہ وہ کبھی ہار نہیں مانتے اور نہ ہی دشمن کی برتری سے خوفزدہ ہوتے ہیں اگر ہمارے ان جہازوں کے پائلٹ ایک لمحے کے لئے یہ سوچتے کہ ان کے پاس تو چلانے کے لئے اسلحہ ہی نہیں کیوں دشمن کو للکاریں تو جنگ کا نقشہ ہی بدل جاتا۔ ہم زمین پر لقمہ اجل بن جاتے وہ علاقہ دشمن کے قبضے میں چلا جاتا اور ہوسکتا ہے ہمارے جہاز بھی ان کے نرغے میں آ جاتے۔ بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ جذبے کے لحاظ سے ہماری افواج دنیا کی بہترین افواج ہیں۔

یہ تمام آپریشن 24 گھنٹے پر مشتمل رہا۔ لیکن اس کا ایک ایک لمحہ ہمارے لئے تجربے کا ایک ایک باب بن گیا اور ہماری سالہا سال کی تربیت کا امتحان ہوگیا۔ فرضی مشقیں حقیقت بن گئیں اور استادوں اور کتابوں کے ہر ہر لفظ کا مفہوم سمجھ میں آ گیا۔ موت کو اتنے قریب سے اور وہ بھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا کہ اس کا تمام خوف بھک سے اُڑ گیا۔ اور بہت سے زیادہ تو ثناء کرتے ہوئے خدائے ذوالجلال کے ناموں کی سمجھ آئی وہ قادر مطلق ہے۔ سب سے طاقتور ہے اور جو چاہے کرسکتا ہے۔ جب اس کی رحمت جوش میں آ جائے تو خطرات خس و خاشاک بن کر اڑ جاتے ہیں۔ سمجھ میں یہ بات بھی آ گئی کہ ہر دم اس کی ہی رحمت کو پکارنا چاہئے۔

یہ جوابی حملہ اور اس کا آپریشن ایک ماڈل بن گیا جس کی جنگی تکنیک کی بہت تعریف کی گئی۔

ہمارے نقصانات واجبی ہوئے تھے اگر خطرات کا جائزہ لیا جائے اور دیکھا جائے کہ ہم جن جن مراحل سے گذرے تھے تو اصولاً ہمارے چند ساتھیوں کو ہی زندہ نظر آنا چاہئے تھا لیکن 'C' کمپنی میں صرف ایک شہادت اور بی کمپنی میں صرف تین سپاہی زخمی ہوئے۔ ہمارے جوانوں اور افسروں کی ہمت کو بہت سراہا گیا اور ان کو کارکردگی کی مناسبت سے انعامات سے نوازا گیا۔ میجر بختاور جو اس ٹاسک فورس کے کمانڈر تھے ان کو اور مجھے ''امتیازی سند'' ملی۔ جبکہ میجر نیازی جو بی کمپنی کے کمانڈر تھے اور جن کا تعلق 7FF سے تھا ان کو ''ستارہ جرأت'' دیا گیا۔

حالانکہ اگر دیکھا جائے تو موت سے ہمکلام ہونے والے یہ جیالے افسر و سپاہی صرف اپنے وطن پر قربان ہونے کے جذبے کے تحت طوفانوں سے لڑ جاتے ہیں۔ ان کو انعام و اکرام سے کیا کام!

لیکن اگر ہمت افزائی مقصد ہے اور سند اور ستارہ پیٹھ تھپتھپانے اور مزید حوصلہ بڑھانے کے لئے ہے تو میں بہت ادب سے عرض کرنا چاہوں گا کہ اس میں پھر انعام دینے والوں کو انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔ میزان صحیح رکھنا لازمی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس ماڈل آپریشن کی کامیابی تمام تر ٹاسک فورس کمانڈر میجر بختاور جس پر میں پہلے بھی تبصرہ کر چکا ہوں، کی مرہون منت تھی۔ کمانڈر کے تدبر، جرأت، حوصلہ افزائی اور صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت کے بغیر کوئی ٹاسک فورس کامیابی حاصل نہیں کر سکتی۔

میجر بختاور ایک امتیازی سند سے کہیں زیادہ آفرین اور تحسین کے حقدار تھے۔

ملٹری اکیڈمی میں بطور استاد

کہتے ہیں زندگی شروع ایک سیدھی لکیر کی طرح ہوتی ہے مگر اختتام تک پہنچتے پہنچتے اس لکیر میں اس قدر زیر و بم آ چکے ہوتے ہیں کہ وہ ایک پہاڑی ندی سے مشابہ ہو جاتی ہے۔ بل کھاتی ہے گھومتی ہے کبھی سکڑتی ہے اور کبھی پھیلتی ہے۔

میں بھی زندگی کے دھارے میں بہتا ہوا گھوم کر ایک بار پھر وہاں آ کھڑا ہوا جہاں سے میرے قدم عملی زندگی کی طرف پہلی بار اٹھے تھے۔

65ء کی جنگ کے کچھ عرصہ بعد ہی مجھے پاکستان ملٹری اکیڈمی میں بطور انسٹرکٹر بھیج دیا گیا اس وقت میری سروس کو ساڑھے بارہ سال گذر چکے تھے اور میں کیپٹن کے عہدے تک پہنچ چکا تھا۔ میں اس پوسٹنگ کے ملنے پر بے انتہا مسرور تھا کیونکہ میری شدید خواہش تھی کہ میں ایک بار اکیڈمی میں پھر دوبارہ جاؤں۔ میری یہ تمنا حقیقت بن گئی اور میں ایک بار پھر انہی فضاؤں میں دوبارہ پہنچ گیا جو سہانی یادوں کی طرح ذہن میں چسپاں تھیں۔ وقت بھی انسان کو کس قدر بدل دیتا ہے کہاں

وہ نوعمر کیڈٹ جس کو ٹیکسی سے اترتے ہی رگڑا ملا تھا اور کہاں یہ کپتان جو پاک بھارت جنگ کی بھٹی سے گذر کر آ رہا تھا۔ جس نے تربیت کو حقیقت میں ڈھلتا دیکھا تھا۔ جس نے دشمن کو قریب سے اور اس کی نفرت اور جارحیت کو خونخوار انداز میں جیتا جاگتا دیکھا تھا۔ یہ اس جنگ کا ہی نتیجہ تھا کہ پاکستان آرمی کو مزید بڑھانے اور مضبوط کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی اس کے متعلق پلاننگ ہوئی ''War Courses'' جو کم مدت کے تھے شروع کئے گئے تاکہ فوج میں افسروں کی کمی کو پورا کیا جا سکے مجھے دوسرے War Course کی ذمہ داری سونپی گئی جس کے بعد ساتواں War Course بھی میرے حصے میں آیا۔ یہاں پر War Course کے متعلق بھی کچھ بتاتا چلوں جولڑکے اس کورس میں آئے وہ تمام کے تمام افسر نہیں بن سکتے تھے کیونکہ Leadership Quality کو اجاگر کرنے میں سب سے زیادہ زور ہوتا ہے اور ظاہر ہے یہ صفت عام نہیں۔ ہر ایک لیڈر نہیں بن سکتا کیونکہ یہ بھی ایک خداداد صلاحیت ہے۔ ہم پوری کوشش کرتے تھے اور اگر کوئی ہمارے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا تو اس کو Term دوبارہ پڑھنا پڑھتی تھی۔ چونکہ کورس کی مدت کم تھی اس لئے صرف ملٹری Subjects پڑھائے جاتے۔ بہت سخت تربیت سے گذرنا پڑتا۔ میرے پاس 33 کیڈٹ تھے جن کو تربیت کے ساتھ ساتھ اکیڈمی کی زندگی سے روشناس اور مانوس ہونے کے برابر کے مواقع فراہم کئے جاتے۔ اکیڈمی میں ہر سہولت موجود ہے یہاں تک کہ ایک سنیما جس میں ہفتے میں تین مرتبہ فلم بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔

بریگیڈیئر سلطان محمود کمانڈنٹ تھے انتہائی مشفق ایک باپ کی طرح ہر ایک کی فکر رکھنے والے انسان، کیڈٹس کا بہت خیال رکھتے تھے اور اگر کسی کو چوٹ آ جاتی تو پریشان ہو جاتے۔ ہمیں ان کی طبیعت کی اس نرمی کا تب اندازہ ہوا جب ایک کیڈٹ رسہ پکڑ کر چڑھتا ہوا پاؤں پھسلنے سے گرا اور اس کا بازو ٹوٹ گیا۔ ظاہر ہے اسے ہسپتال میں بھی داخل رہنا پڑا۔ بریگیڈیئر صاحب نے کانفرنس بلائی اور اس بات پر زور دیا کہ چونکہ کیڈٹ ہماری ذمہ داری ہوتے ہیں اس لئے ٹریننگ کے دوران اگر انہیں کوئی جسمانی نقصان پہنچے تو جواب دہ ہم لوگ ہیں۔ اس لئے کوئی ایسی ورزش یا ٹریننگ نہیں ہونی چاہئے جس میں چوٹ لگ جانے کا احتمال ہو۔ ہم لوگوں نے دبی زبان میں احتجاج کیا کہ ایسا کرنے سے ہم لوگ کیڈٹ کو صحیح طور پر جانچ نہیں پائیں گے کیونکہ جب تک مشکل منزلیں طے نہ کروائی جائیں انسان کی برداشت اور صبر کا امتحان نہیں ہو پاتا۔ باوجود ہمارے احتجاج اور اختلاف کے انہوں نے چند ایک ورزشیں اور مشقیں بند کروا دیں۔ جن میں رسہ پر چڑھنا بھی شامل تھا۔ کچھ عرصہ بعد بریگیڈیئر سلطان محمود اپنی نوکری پوری کرنے کے بعد عزت سے ریٹائر

ہو گئے اور ان کی جگہ بریگیڈئیر ابوبکر عثمان مٹھا نے لی۔ جنہوں نے بعد ازاں میجر جنرل کے عہدے تک بھی ترقی پائی قابل ذکر بات ان دونوں کمانڈروں کے مزاج میں فرق کی ہے۔ پہلے والے نے نرمی کی انتہا کرتے ہوئے رسہ کی مدد سے اوپر چڑھنا کیڈٹس کے لئے نامناسب قرار دے دیا۔ لیکن جب دوسرے والے آئے تو کایا پلٹی ہو گئی کیونکہ ان کا تعلق سپیشل سروس گروپ یعنی SSG سے تھا۔ صرف تعلق ہی نہیں بلکہ وہ اس کے بانی تھے۔ اور ایک طویل عرصہ اس کو کمانڈ کرتے رہے تھے۔ اس تعارف کے بعد ان کے مزاج کے متعلق مزید کچھ کہنا بیکار ہوگا۔ کیونکہ SSG اور سخت ترین تربیت ایک ہی لفظ کے دو معنی ہیں۔ نئے بریگیڈئیر صاحب جسمانی لحاظ سے انتہائی مضبوط چاک و چوبند اور سمارٹ تھے اور وہ یقین رکھتے تھے کہ ایک افسر کو بھی کیڈٹ کی طرح فٹ ہونا چاہئے ایک دن وہ جسمانی ورزش کی ٹریننگ دیکھنے پہنچ گئے۔ وہاں اس کورس سے متعلق تمام افسر بھی موجود تھے۔ اچانک انہوں نے اپنی جسمانی Fitness کا مظاہرہ ایک بہت ہی مشکل Exercise کے ساتھ کرنا شروع کر دیا۔ ہم لوگوں نے آج تک اپنے کسی کمانڈانٹ کو جن میں برٹش بھی شامل تھے، اس طرح کرتے نہیں دیکھا تھا۔ عمر کے اس حصے میں بیم کے ساتھ یوں لٹک کر اور پھر سانس کے ساتھ اپنے آپ کو اوپر کھینچنا کوئی آسان کام نہیں۔ ہم حیرت سے اس افسر کی جسمانی کسرت پر رشک کرتے رہے سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ انہوں نے افسروں کو بھی Exercise کرنے کو کہا جو ہمارے لئے قطعی نئی بات تھی۔ ''مرتا کیا نہ کرتا'' والی بات تھی۔ حکم ماننا ضروری تھا سو ہم نے حتی المقدور اپنی اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کیا ایک افسر بیم کے ساتھ لٹکا رہا اور اپنی جگہ سے جنبش نہ کی تو کمانڈانٹ اس کی طرف متوجہ ہوا اور ذرا سختی سے حکم دیا کہ اپنے آپ کو اوپر کھینچو۔ افسر نے معذرت کی تو کمانڈانٹ کہنے لگا اگر تم خود نہیں کرو گے تو کیڈٹس کو کیا خاک سکھاؤ گے۔ جس کے جواب میں افسر کہنے لگا ''سر یہ: ورزش تو میں نے کیڈٹ ہوتے ہوئے بھی نہیں کی تھی اب بطور افسر کیسے کروں'' اس جواب سے ماحول میں جو تناؤ پیدا ہو گیا تھا، ٹوٹ گیا، کمانڈانٹ ہنستے ہوئے اور سر ہلاتے ہوئے ٹریننگ ایریا سے چلے گئے۔ یہ آفیسر بعدازاں لیفٹیننٹ جنرل کے عہدہ پر ریٹائر ہوئے۔ اس واقعہ کے بعد جو افسران جسمانی طور پر کمزور تھے خاموشی سے جسمانی فٹنس کیلئے ورزشیں کرتے نظر آئے تا کہ دوبارہ شرمندگی سے دوچار نہ ہوں۔

بریگیڈئیر صاحب کا فلسفہ تھا کہ افسر کو ایک کیڈٹ کی طرح چاک و چوبند بھی ہونا چاہئے اور ساتھ ان کو پڑھانے کی ذمہ داری بھی اٹھانی چاہئے۔ انہوں نے افسروں کی متعدد مراعات واپس لے لیں جو ظاہر ہے افسروں کے لئے باعث پریشانی بنا۔

میری شادی

زندگی کی کٹھن منزلیں بغیر کسی غمگسار اور ساتھی کے طے کرنا اب تو ناممکن ہی لگتا ہے۔ میں بہت اطمینان اور تسکین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ خدا نے مجھے جوجیون ساتھی عطا کیا اس نے میری زندگی کو نہ صرف مکمل کیا بلکہ ہر لحاظ سے سنوارا اور اپنے خلوص اور چاہت سے اس میں مزید چاشنی بھر دی۔ میں خدائے بزرگ و برتر کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔

میں نے سٹاف کالج کوئٹہ میں داخلے کے لئے امتحان دیا جس کی تیاری میں کیپٹن زبیری نے جو بعد ازاں میجر جنرل ہوئے ، میری بہت مدد کی ۔ ان کو ملٹری ہسٹری پر بہت عبور حاصل تھا۔ جس سے میں بھی مستفید ہوا۔ ابھی سٹاف کالج میں داخلے کے نتیجہ کا انتظار تھا کہ ہمیں کسی اور گھر میں داخلہ کا پرمٹ مل گیا۔ فیصلہ سنانے سے پہلے میری والدہ نے روایتاً مجھ سے پوچھا کہ اگر میری کوئی چوائس ہے تو میں انہیں آگاہ کردوں۔ یہ سوچتے ہوئے کہ میری رائے کو میری والدہ وزن دیں گی میں نے ایک لڑکی کے بارے میں جسے میں بہت پسند کرتا تھا، اس سے شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے میری والدہ نے اس لئے انکار کر دیا کیونکہ اس لڑکی کا تعلق کشمیری خاندان سے نہیں تھا۔ میں کسی بھی حالت میں اپنی والدہ کو ناراض نہیں کرسکتا تھا۔ ویسے بھی میں نے یہ بات ٹھان رکھی تھی کہ شادی اپنے والدین کی مرضی سے کروں گا۔ آخر یہی ہماری ثقافت ہے۔ شادی صرف دو انسانوں کو ملانے کا ہی مطلب نہیں ہوتا بلکہ یہ دو خاندانوں کو اکٹھا مل کر چلنے کا پہلا قدم ہوتا ہے۔

27 نومبر 1966ء کو میری شادی عصمت سے ہوگئی ان کا تعلق لاہور کے کشمیری خاندان سے ہے اور ایس ایم یوسف صاحب کی صاحبزادی ہیں۔ 27 نومبر پہلا دن تھا کہ میں نے اپنی بیوی کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ اور گفتگو کی میں خوش تھا کہ میں نے اپنے والدین کی خواہش کا احترام کیا اور یہ خوشی بھی تھی کہ انہوں نے مجھے مایوس نہیں کیا کیونکہ میری بیوی نے میری ملازمت کے آغاز سے اختتام تک خاندان میں ہونے والی تمام سرگرمیوں کا منظم طریقے سے انتظام سنبھالنے اور شرکت کرنے میں شاندار کردار ادا کیا۔

ہمارے تین پیارے بچے عائشہ، آمنہ اور حیدر ہیں۔ عائشہ اور آمنہ دونوں کی شادی ہوچکی ہے۔ بڑی بیٹی عائشہ کی شادی بھی فوجی آفیسر طارق یوسف مرزا سے ہوئی ہے۔ طارق میرے دوست جنرل اسلم مرزا کے صاحبزادے ہیں۔ اللہ کے فضل و کرم سے ان کی ایک بیٹی ماروش اور دو بیٹے وجیہہ اور وصی ہیں ان کی پیدائش پر ٹھٹھک کر احساس ہوا کہ اب تو نانا بن گئے۔ بزرگی کا احساس ایک نئے

دور کا آغاز تھا۔ جس میں طمانیت اور ٹھہراؤ تھا۔ انسان جب سوچتا ہے کہ زندگی اب مکمل ہوگئی تو خدا ایک اور پردہ سرکا کر پوچھتا ہے کہ اب بتاؤ کیا خیال ہے؟ تو اس وقت انسان کو چاہئے کہ سر جھکا کر کہے۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ "(اے جن وانس!) تم اللہ کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔"

میرا بیٹا حیدر انجینئر بن چکا ہے اور برسرروزگار ہے۔ اپنی عملی زندگی کا نچوڑ اس تک پہنچانے کی پوری سعی کی ہے۔ میری ہدایت اس کو یہی ہے کہ "بیٹا زندگی میں پاؤں جما کر اور سر اٹھا کر چلنا" اس کی بیوی شبانہ کا تعلق خالص کشمیری خاندان سے ہے۔ ان کے دو بچے ہیں۔ نور بیٹی اور نویان بیٹا۔

آمنہ سب سے چھوٹی ہے اور بہت لاڈلی بھی۔ ہم نے شاید ذرا جلدی ہی اس کو زندگی کے بوجھ اٹھوا دیئے ہیں۔ ریٹائر ہو کر شاید انسان تھوڑا سا عدم تحفظ کا شکار ہو جاتا ہے۔ بہرحال خدا جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ آمنہ کی شادی لاہور ہی کی بزنس فیملی میں میرے دوست اصغر بیگ کے صاحبزادہ عاصم سے ہوئی اللہ تعالیٰ نے ان کو دو پیارے بیٹے دیئے ہیں۔ ایک کا نام عرش اور دوسرے کا نام اجر ہے۔ خدا کے فضل سے وہ بھی اپنے گھر میں خوش باش ہے۔

نجی زندگی کے جزیرے سے عملی زندگی کے دھارے میں اتریں تو محسوس ہوتا ہے جیسے تپتی ریت پر پاؤں پڑ رہے ہوں۔ "لوٹ! پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو"

سٹاف کالج کے لیے براستہ افغانستان سفر

سٹاف کالج کوئٹہ میں داخلے کے امتحان کا نتیجہ نکلا میں پاس ہوگیا تھا اب کوئٹہ جانا تھا۔ سوچا کہ کیوں نہ افغانستان سے شناسائی پیدا کی جائے اور بذریعہ کابل کوئٹہ پہنچا جائے۔ تجویز اچھی تھی اور ان دنوں افغان حکومت بھی مائل بہ کرم تھی۔ یعنی ہماری فوج کے افسران کو بہ آسانی ویزا مل جاتا تھا۔ اکیڈمی سے دو تین اور فیملیز بھی ہمارے ساتھ اس سفر پر روانگی کے لئے آمادہ ہوگئیں۔ یوں بھی عصمت ساتھ تھی ہم سفر اور جیون ساتھی ایک تیسری روح جس کا نام ہم نے بعد میں عائشہ رکھا بھی ہمارے درمیان تھی۔ احتیاط بالائے طاق رکھتے ہوئے ہم جوش جوانی میں اس طویل سفر پر روانہ ہوگئے۔ افغانستان کی سرحد پار کر کے جب ہم شہر جلال آباد پہنچے تو معلوم ہوا کہ کابل کو جانے والی سڑک بوجہ لینڈ سلائیڈ (Land slide) بند ہے۔ بہت مایوسی ہوئی کیونکہ ہمیں اور کسی راستے کا علم بھی نہ تھا۔ تھوڑی سی پوچھ گچھ کی تو چند افغان باشندے ہماری مایوسی بھانپ گئے انہوں نے مشورہ دیا کہ اگر ضرور ہی کابل پہنچنا ہے تو وہ راستہ اختیار کیا جائے جو سکندر اعظم نے بنایا تھا۔ یہ راستہ اب استعمال میں نہیں تھا لیکن بہرحال ایک روٹ تھا جو کابل پہنچتا تھا۔ فوج میں رہ کر مشکل کا سامنا کرنا اور دشواری سے نبرد آزما ہونا تو آ ہی جاتا ہے وہ سپاہی کیا جو معرکے میں گھٹنے ٹیک

دے۔ عصمت نے بھی اپنی حالت کے باوجود حامی بھر لی اور ہم لوگ کابل کے لئے اس غیر آباد راستے پر روانہ ہو گئے۔ اندرونی خوف کو ہم نے خوش گپیوں میں دبا رکھا تھا۔ ہم بڑھتے گئے اور منزل قریب آتی گئی مگر راستے ہی میں شام ہو گئی اور رات کے اندھیرے نے آ گھیرا۔ سنسان اور انجان راستہ رات کا اندھیرا۔ خواتین اور بچوں کا ساتھ۔ غیر ملک۔ ان تمام اندیشوں کے بوجھ سے لدے ہوئے ہم نے 60 میل لمبا یہ سفر سڑک پتھریلی اور ناہموار ہونے کی وجہ سے 10 گھنٹوں میں طے کیا۔ کابل میں ہم نے تین دن گزارے۔ ایک دن قندھار بھی گئے اور یوں ہماری افغانستان سے شناسائی زندگی کا حصہ بن گئی۔

ایک شام جنرل جو کے ساتھ

کابل میں لیفٹیننٹ جنرل یوسف پاکستان کے سفیر تھے۔ جب ہم لوگ کابل پہنچے تو ہدایات کے مطابق ہم نے اپنے پاسپورٹ پاکستانی سفارت خانے میں جمع کروا دیئے تاکہ کابل پولیس ان کی تصدیق کر سکے۔ اگلے دن جب ہم اپنے پاسپورٹ واپس لینے گئے تو ہمیں ایک عدد دعوت نامہ بھی موصول ہوا۔ جو جنرل یوسف کی طرف سے تھا۔ جنرل یوسف فوج میں جنرل 'جو' کے نام سے مشہور تھے۔ انہوں نے ہم سب کو اپنے گھر مدعو کیا تھا۔ وقت مقررہ پر جب ہم لوگ ان کے گھر پہنچے تو اور بھی بہت سے مہمانوں کو موجود پایا۔ ان سب کو بتایا گیا تھا کہ پاکستان ملٹری اکیڈمی کے چند افسران اور ان کے اہل خانہ جو کوئٹہ سٹاف کالج میں کورس کے لئے جا رہے ہیں ان کے اعزاز میں چائے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ فوج میں چونکہ (Rank) کا بہت خیال کیا جاتا ہے۔ اس لئے ہم لوگ جو کیپٹن اور میجر Rank کے تھے ان کے لئے ایک لیفٹیننٹ جنرل کی طرف سے دیئے جانے والا عصرانہ بہت اہمیت کا حامل تھا۔ اس اعزاز نے ہماری تمام تھکاوٹ دور کر دی۔ جنرل صاحب اور ان کی بیگم نے ہمیں اور ہمارے اہل خانہ کو بہت خلوص اور مہمان نوازی دی جس کے لئے ہم ان کے بہت مشکور ہوئے۔

سٹاف کالج

کابل سے ہم لوگ بذریعہ قندھار اور پھر چمن جو پاکستان کا شہر ہے، سے ہوتے ہوئے رات کے آٹھ بجے کوئٹہ پہنچے۔ سفر محفوظ تھا لیکن ہم لوگ بہت تھک چکے تھے۔ جون کا مہینہ تھا اور تمام راستہ ریتلا اور سنگلاخ تھا جس کی وجہ سے سورج کی تپش بہت زیادہ محسوس ہوئی۔ بہر حال منزل مقصود پر بخیر و عافیت پہنچ جائیں تو راستہ کی مصیبتیں بھول جاتی ہیں۔

سٹاف کالج پہنچ کر ہمیں اپنی اپنی رہائش گاہ مل گئی۔ کچھ وقت ماحول سے ہم آہنگی پیدا کرنے میں گذرا جس کے بعد Staff Course شروع ہو گیا اور ہم پڑھائی میں مصروف ہو گئے ہمارے لئے ہفتہ کی دو چھٹیوں کی بجائے ایک چھٹی کر دی گئی تھی تا کہ پڑھائی جلدی ختم ہو سکے۔ ایک سال کا کورس چھ ماہ میں پورا کرنا تھا۔ اس وجہ سے محنت زیادہ کرنی پڑی۔ کچھ غیر ملکی سٹوڈنٹس بھی ہمارے ساتھ کورس کر رہے تھے۔ جن کی وجہ سے کام کرنے میں زیادہ مزہ آیا۔ ہم سے بھی کہیں زیادہ مزہ ہمارے گھر والوں کو آیا۔ کیونکہ کیمپس میں تقریباً ہر روز کوئی نہ کوئی تقریب ہوتی تھی۔ بہت اچھی فلمیں بھی دیکھنے کو ملتی تھیں اس لئے کام کے بعد ان تمام چیزوں سے لطف اندوز ہونا خاصا بامعنی لگتا تھا، کالج کا سٹاف بہترین تھا اور کالج کی لائبریری میں پڑھنے کے لئے بے پناہ مواد تھا جس سے ہماری فیمیلیز مستفید ہوتی رہیں۔ میں اپنی بیگم کا بالخصوص مشکور ہوں کہ انہوں نے گھر بار کے تمام فرائض اپنے ذمے لے کر مجھے یکسوئی سے پڑھنے کا موقع دیا اور ساتھ ساتھ مجھے تازہ دم اور خوش بھی رکھا۔ ہماری پہلی اولاد عائشہ کی ولادت بھی کوئٹہ ہی میں ہوئی۔ 12 ستمبر 1967ء کو مجھے 'باپ' بننے کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ خدائے بزرگ و برتر کا انتہائی مشکور ہوں جس نے ہمیں ہر قسم کی نعمت سے نوازا۔

فوجی سرگرمیوں میں شمولیت

سٹاف کالج سے فارغ ہونے کے دن قریب آ چکے تھے۔نئی پوسٹنگ کا انتظار تھا لیکن پوسٹنگ خاصی غیر متوقع تھی۔ مجھے 107 انفنٹری بریگیڈ میں بطور بریگیڈ میجر (BM) پوسٹ کیا گیا تھا۔ جو جیسور (Jessore) میں موجود تھا۔ مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) کے اس شہر کو دیکھنے کے لئے دل میں کافی تجسس پیدا ہو چکا تھا۔ جو لوگ وہاں رہ چکے تھے ان کے مطابق جیسور ایک خانماں برباد قسم کی جگہ تھی۔ کلکتہ جاتے ہوئے راستے میں اس شہر کی کوئی خصوصیت نہیں تھی ماسوائے سانپوں اور چوہوں کے۔ لوگ بھاشاؤں (بانسوں کے گھر) میں رہتے تھے اور ظاہر ہے غربت عام تھی۔ ان تمام باتوں سے دل گھبرایا بھی تھا۔ لیکن ایک سوچ سہارا دے رہی تھی کہ یہ تمام باتیں جو مجھے بتلائی گئی تھیں تقریباً دس سال پرانی تھیں۔ اور مجھے امید واثق تھی کہ پچھلے دس سالوں میں کافی ترقی ہو چکی ہو گی اور نہیں تو کم از کم چوہے اور سانپ تو ختم ہو چکے ہوں گے۔

خیر چھٹی ختم ہوئی تو ہم نے بھی تیاری پکڑی اور ڈیوٹی کو لبیک کہتے ہوئے رخت سفر باندھا بال بچوں کو خدا حافظ کہا اور جہاز میں ڈھاکہ جانے کے لئے سوار ہو گئے۔ ڈھاکہ میں پرواز تبدیل کی اور جیسور پہنچ گئے۔ میجر رحمان نے مجھے ائیر پورٹ پر ریسیو کیا۔ دراصل میں ان کی جگہ پر ہی پوسٹ ہوا تھا۔ یہاں پہنچ کر میرے تمام اندیشے اور سٹاف کالج میں لوگوں کی جیسور کے متعلق بھیجی گئی تصویریں یکسر غلط ثابت ہوئیں۔ سب سے پہلے تو کنٹونمنٹ کا ماحول صاف ستھرا اور کھلا تھا۔ مکانیت بھی مناسب تھی۔ بانسوں کے گھر جن کو بھاشا کہتے تھے کہیں کہیں نظر آتے تھے اور وہ بھی آرام دہ اور ان کے مکین خوش باش لگتے تھے۔ سب سے بڑی بات سانپ اور چوہے جن کو میں نے بہت ڈھونڈا کہیں ملے نہیں۔ لوگوں کی حاشیہ آرائی اور داستان گوئی پر سر دھنتے ہوئے میں نے

گیسٹ روم میں جہاں مجھے ٹھہرایا گیا تھا سامان رکھااور اپنے بریگیڈ میں شامل ہوگیا جو اس وقت لیبوٹالا (Labutala) کے قریب فیلڈ میں تھا۔ جب Exercises ختم ہوئیں اور ہم لوگ واپس کنٹونمنٹ میں پہنچ گئے تو میں نے سوچا کہ اب اپنی بیگم اور عائشہ کو بھی اپنے پاس بلا لینا چاہئے۔ جیسور کے تو لوگ بھی بہت اچھے نکلے اور جلد ہی ہم سب لوگ اپنے اپنے گھر میں منتقل ہو گئے۔ جیسور میں ہمارا قیام بہت آرام دہ رہا۔ بہت سے دوست بنائے، کمانڈرز میں بریگیڈیئر رضوی، بشیر اور خادم راجہ (بعدازاں میجر جنرل) بہت سمجھدار اور حساس لوگ تھے اور ان میں لیڈرشپ کی تمام تر خوبیاں موجود تھیں بریگیڈیئر خادم راجہ تو انتہائی مضبوط اعصاب اور ٹھنڈے مزاج کے مالک تھے۔ میں نے انہیں مسئلے میں یا کسی بھی مرحلے پر خوفزدہ یا پریشان نہیں پایا۔ ان خصوصیات کی وجہ سے ہمارے دل میں ان کے لئے بہت عزت پیدا ہوگئی۔

یہ کہتا چلوں کہ مشرقی پاکستان کی سرزمین پر گزارے ہوئے حسین لمحات میری انمٹ یادوں کا حصہ بن چکے ہیں۔ شادی کے فوراً بعد ہم لوگ ہنی مون (Honeymoon) منانے بھی مشرقی پاکستان ہی آئے تھے۔ اس وقت میرے بہنوئی خواجہ شفقت علی اور میری ہمشیرہ زرینہ چٹا گانگ میں قیام پذیر تھے۔ ان کے بغیر مشرقی پاکستان کی سیر اتنے آرام سے ممکن نہیں تھی۔ ہم نے وہ یادگار مہینہ چٹا گانگ، کاکس بازار اور ڈھاکہ میں سیر وتفریح کرتے گزارا۔ قدرتی نظارے اس قدر مسحورکن لگے تھے کہ دل میں یہ آرزو خود بخود پیدا ہوئی ''کاش ہم لوگوں کی پوسٹنگ ہی ادھر ہوجائے'' بمشکل ایک سال کا عرصہ گزرا ہوگا کہ میری یہ تمنا پوری ہوگئی۔ کبھی کبھی دل سے اٹھی ہوئی دعا خدا زیادہ قریب ہوکر سن لیتا ہے اور اب ہمارے درمیان عائشہ بھی موجود تھی مشرقی پاکستان کا حسن دوبالا ہوکر نظر آیا۔

مشرقی پاکستان

1947ء میں جب ہندوستان پاکستان تقسیم ہوئے تو مشرقی بنگال کا صوبہ (جو لارڈ کرزن کی تقسیم بنگال کی بدولت معرض وجود میں آیا تھا) اور سلہٹ کا ضلع (جو پہلے آسام کا حصہ تھا) مشرقی پاکستان کہلانے لگا۔ انگریز مورخ چارلس پیٹر اڈونیل نے اپنی کتاب (2) میں بہت خوبصورتی سے مشرقی پاکستان کی تصویر کشی کی ہے۔ وہ لکھتا ہے ''یہ تمام علاقہ تقریباً ہر طرف سے بھارتی علاقے میں گھرا ہوا ہے۔ مغربی بنگال اور بہار اس کے مغربی سرحدوں پر واقع ہیں۔ آسام اس کے شمال اور مشرق پر ہے اور اس کے جنوب میں خلیج بنگال کا سمندر اس کے ساحل کو دھوتا ہے اور سلہٹ کے

2۔ بنگلہ دیش بائیوگرافی آف اے مسلم نیشن۔ دی سٹرگل فار بنگالی اٹانومی از چارلس پیٹر اڈونیل

پہاڑی علاقے مشترکہ سرحد ہیں۔"

تقسیم ہند کے وقت مشرقی پاکستان کی آبادی تقریباً 4 کروڑ تھی اور یہاں کے لوگ ہنرمند اور جفاکش تھے۔ مغربی پاکستان سے ایک ہزار میل دور واقع مملکت پاکستان کا یہ دوسرا بازو دشمن کی سرحدوں میں گھرا ہوا تھا۔ مسلم اکثریت کے پیش نظر یہ حد بندی صرف نظریہ پاکستان پر مکمل یقین اور ایمان کے تحت ہوئی تھی۔ مشرقی بنگال کے لوگ پاکستان کی جدوجہد میں ہراول دستے میں رہے۔ بعد میں کیا ہوا یہ ایک اندوہناک اور اشکوں سے لبریز داستان ہے۔ سقوط ڈھاکہ یعنی مشرقی پاکستان کا بنگلہ دیش بن جانا کسی بھی پاکستانی کے لئے چاہے وہ مشرقی پاکستان میں تھا یا مغربی پاکستان میں ایک سانحے سے کم نہیں۔ بھارت کے مذموم عزائم کی یہ ایک کڑی تھی جس کو ہماری کمزوریوں نے تقویت بخشی اور پاکستان اپنا ایک مضبوط عضو کھو بیٹھا۔ تاریخ گواہی دے رہی ہے کہ ہزاروں میل کا فاصلہ اور کئی سالوں کی تلخی اور دوری بھی اس بھائی چارے کی فضا کو آج تک ختم نہیں کرسکی۔ اس جذبے کو جس کا نام پاکستان تھا، حادثات نہ تو مٹا سکے ہیں اور نہ کمزور کر سکے ہیں۔

اس وقت مشرقی پاکستان پہنچنے کے لئے صرف فضائی پروازیں تھیں اور وہ بھی ہندوستان کے علاقے کے اوپر سے گذرتی تھیں یا پھر تین ہزار میل لمبا بحری سفر تھا اور وہ بھی ہندوستان کے ساحل کے ساتھ ساتھ۔ چاروں طرف یا ہندوستان یا سمندر اور یا برما کے وحشی پہاڑ۔ سرحدوں کے اندر مشرقی پاکستان ایک بڑے دریا کا Delta ہے اور اس کی اونچائی تقریباً سطح سمندر کے برابر ہی ہے۔ ذریعہ سفر سڑکوں کی بجائے دریائی شاہراہیں ہیں اور جب ان دریاؤں گنگا اور برہم پترا میں سیلاب آتا ہے تو تمام صوبہ زیر آب آجاتا ہے۔ قدرت کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے اور قدرت کا نظام زندگی کی تجدید میں ہر لحظہ مصروف نظر آتا ہے۔ مشرقی پاکستان کی آبادی چونکہ بہت زیادہ ہے اور زراعت اور ماہی گیری ہی ذریعہ معاش ہے۔ اس لئے سیلاب کا قدرتی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ زرعی اراضی کی تقویت ہوجاتی ہے اور فصل کا اگاؤ بھرپور ہوجاتا ہے۔ دوسرا فائدہ مچھلی کی صورت میں ہوتا ہے۔ سیلاب مچھلیوں کو بھی بہا کر لے آتا ہے۔ مون سون آب و ہوا اور پانی کی بہتات کی وجہ سے یہ خطہ ارضی ہمیشہ ہرا بھرا اور لہلہاتا نظر آتا ہے۔ دھان کے کھیت اور چھوٹے چھوٹے گاؤں چاروں طرف پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ "مغربی بنگال میں اپنے شمالی کونے کے علاوہ (جہاں بہت زیادہ بارش ہوتی ہے اور جس کی جغرافیائی وجوہات مختلف ہیں) پچاس اور ساٹھ انچ کے قریب بارش ہوتی ہے۔ جبکہ مشرقی بنگال کے بیشتر حصوں میں 60 اور 95 انچ کے درمیان بارش ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ بارش 100 اور 120 انچ کے درمیان جلپگوری میں ہوتی ہے جو

دریائے میگھنا کے دہانے پر واقع ہے جبکہ سطح مرتفع سیلانگ اور تری پورہ لشائی کے پہاڑوں میں بارش 50 اور 135 انچ کے درمیان ہوتی ہے۔

مشرقی پاکستان کے بڑے دریا، گنگا اور اس کی پھیلتی ہوئی دریائی شریانیں ہیں۔ کیونکہ یہ تمام علاقہ Delta ہے۔ اس لئے ہر دریا یہاں پر جال کی صورت میں پھیل جاتا ہے۔ میگھنا اور سرما سسٹم بھی ہے اور برہم پترا اور اس کی شاخیں بھی یہاں پھیلتی ہیں۔ شمالی بنگال کے دریا اور چٹاگانگ اور اس سے ملحقہ علاقوں سے تمام دریا خلیج بنگال میں گرنے سے پہلے مشرقی پاکستان کی سرزمین کو سیراب کرتے ہوئے گزرتے ہیں۔

زراعت ذریعہ معاش ہے۔ چاول، پٹ سن، روئی، چائے، تمباکو اور گنا اگایا جاتا ہے۔ جس سے بھاری زرمبادلہ کمایا جاتا ہے۔ عام طور پر یہ بھی کہا جاتا تھا کہ پاکستان کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی مشرقی پاکستان ہے(3)۔ پٹ سن جس کو سنہری دھاگہ بھی کہاجاتا تھا اس میں مشرقی پاکستان یکتا تھا اور سب سے زیادہ زرمبادلہ اسی سے کمایا جاتا تھا۔ اس تمام زرعی پیداوار میں سے 20 فیصد مغربی پاکستان میں کھپایا جاتا تھا اور باقی برآمد کیا جاتا تھا۔

بنگالی لوگ موسیقی کے دلدادہ اور فائن آرٹس کے شوقین ہیں۔ قدرت نے انہیں حساس طبیعت اور لطیف ذہن عطا کئے ہیں۔ بنگالی لب ولہجہ نرم اور بنگالی زبان میں مٹھاس ہے۔ یہ زبان سنسکرت سے ماخوذ ہے۔ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے علاقائی خدوخال میں بہت تضاد ہے۔ مختلف المزاج یہ دونوں حصے اپنے اپنے مزاج اور علاقائی تشخص کی بھینٹ چڑھ گئے۔ دشمنوں نے خوب خوب بھڑکایا اور قدرت کی عنایات کو آلہ تفریق بنا ڈالا۔

قدرتی وسائل کی فراوانی ہونے کے باوجود مشرقی پاکستان میں غربت اور استحصال بدرجہ اتم موجود تھا بھی اور ہے بھی۔ لیکن ملک دشمن عناصر اور مفاد پرست طبقہ نے عوام الناس میں یہ تاثر پھیلانا شروع کر دیا کہ مغربی پاکستان ان کو لوٹ کر کھا رہا ہے۔ ایک گھٹا ہوا تناؤ محسوس ہونے لگ گیا۔ بھائی بھائی آپس میں اجنبیت محسوس کرنے لگ گئے۔ شکایات کے انبار لگنے شروع ہو گئے جن میں سرفہرست یہ احساس تھا کہ مغربی پاکستان بھی وہی خودغرضی اور بے انصافی کی پالیسیاں اپنانے لگ گیا ہے جو تقسیم ہند سے پہلے ہندوؤں نے اپنا رکھی تھیں اور جن کی وجہ سے ہی ایک علیحدہ مملکت یعنی پاکستان کا تصور ابھرا اور پھر یہ نعرہ ہندوستان کے طول وعرض میں گونج اٹھا۔ برطانوی اخبار ''ٹائمز آف لندن'' 24 جون 1963ء میں ایک مضمون جس کا عنوان (The Widenng Gap

3۔ انڈیا اور پاکستان۔ اے جنرل اینڈ ریجنل جیوگرافی۔ او ایچ کے سپائٹ صفحہ 526

in Pakistan) ''پاکستان میں بڑھتے ہوئے فاصلے'' میں لکھا گیا تھا یا یوں کہہ لیجئے کہ پیشین گوئی کی گئی تھی کہ ''اگر اس صورت حال (یعنی مشرقی پاکستان میں بڑھتی ہوئی تلخی اور مغربی پاکستان میں موجود بے حسی اور خود غرضی) کا سدباب نہ کیا گیا تو وہ دن دور نہیں جب مشرقی پاکستان میں ایک ایسی تحریک جنم لے گی جو مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے علیحدہ کرنے کا موجب بنے گی۔ کچھ سیاستدان اس تحریک کا باقاعدہ آغاز کر چکے ہیں اور محسوس کر رہے ہیں کہ اس تحریک کے زور پکڑنے کا وقت قریب آ گیا ہے۔ اب ان کا نعرہ ہوگا: ''مشرقی پاکستان مشرقی بنگالیوں کیلئے''۔(4)

پاکستان میں اس کے دونوں بازوؤں کا غیر قدرتی تناسب اس خطرناک صورت حال کا موجب تھا۔ مگر اس وقت جذبے حاوی تھے اور بھائی چارے کی فضا عام تھی جس میں بانٹ کر کھانے میں عار محسوس نہیں ہوتی تھی۔ کاش یہی فضا قائم رہتی اور پاکستان مضبوط تر ہوتا جاتا۔ لیکن ان لوگوں کو چین کہاں تھا جو پاکستان کو تسلیم کرنے کو تیار ہی نہیں تھے۔ قائداعظمؒ کے دوقومی نظریے کو جھٹلانا اور اس کو ناکام ثابت کرنا ان لوگوں کی اولین ترجیح تھی۔ ہندو مہاشے وجود پاکستان کو اپنی سیاسی شکست تصور کرتے ہیں جو یقیناً ہے بھی۔ مگر شکست سے پیدا شدہ تلملاہٹ کا علاج تو فقط وجود پاکستان کو خدانخواستہ نیست و نابود کرنے میں ہے۔ ہم پاکستانی یہ بھول کر نجانے کیا کیا غلطیاں کر بیٹھے ہیں اور آج بھی کر رہے ہیں۔ نیویارک ٹائمز کے مشہور مضمون نگار Schonberg نے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں موجود قدرتی تضاد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ''دونوں کی زبان مختلف ہے مشرقی پاکستان میں بنگالی بولی جاتی ہے جبکہ مغربی پاکستان میں اور بہت زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو سرکاری زبان ہے۔ دونوں بازوؤں کے لوگوں کی خوراک مختلف ہے۔ مشرقی پاکستان میں چاول اور مچھلی عام خوراک ہے۔ جبکہ مغربی پاکستان میں لوگ گندم کی روٹی اور گوشت کھاتے ہیں۔ دونوں کی ثقافت میں فرق ہے۔ مغربی پاکستان کے لوگ جفاکش ہیں۔ فوج اور نظام حکومت چلانے کی صلاحیت رکھتے ہیں جبکہ مشرقی پاکستان کے لوگ موسیقی کے دلدادہ اور سست رو ہیں مگر آتشیں مزاج ہیں۔ سیاست اور ادب سے دلچسپی عام ہے۔''(5)

مذہب کے بل بوتے پر ایک قوم بن جانے والے یہ لوگ اب ان تضادات کا شکار ہونے لگے۔ سیاسی طور پر تو ''ایک مذہب'' کا نعرہ کارگر تھا لیکن ایک مذہب ایک ملک بنانے کے لئے ناکافی ثابت ہوا۔ حالانکہ اسلام میں جس معاشرہ کا ذکر ہے اس میں علاقائی، لسانی اور جغرافیائی حدیں،

4۔ ٹائمز آف لندن 24 جون 1963ء

5۔ بنگلہ دیش بائیوگرافی آف اے مسلم۔ دی سٹرگل فار بنگالی اٹانومی از: اوڈونل

بندشیں موجود نہیں، ''مسلمان بھائی بھائی ہیں'' کا جو سبق نبی کریم ﷺ نے ہمیں سکھایا ان ہی تفرقات و تضادات سے پیدا ہونے والی رنجشوں کا سدباب ہے۔ فرقہ واریت، رنگ نسل اور علاقائی سرحدوں کو پار کر کے جب لوگ ملتے ہیں تو وسعت قلب اور وسعت فکر ونظر پیدا ہوتی ہے۔ دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ پاکستانی قوم اپنے اس امتحان میں پورا نہ اتر سکی اور اپنے اس اعزاز کو برقرار نہ رکھ سکی۔ دنیا میں اس وقت بیشتر نمونے یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ اسلام کی صحیح تعلیمات سے بہرہ ور ہونے کی بجائے نام نہاد مسلمان قومیں اسلامی تعلیمات کو ہدف تنقید اور تضحیک بنانے کی ذمہ دار ہیں۔ ابھی تک عالم اسلام کی اقوام ایک متحدہ محاذ قائم نہیں کر سکیں۔ یہود و نصاریٰ اپنی ریشہ دوانیوں سے بارہا مسلمان ممالک کو آپس میں لڑوا چکے ہیں۔ خلیج کی جنگ میں اسلامی عرب ممالک کے تیل کے ذخائر کا جس طرح زیاں ہوا مسلمانوں کے لئے عبرت کا مقام ہونا چاہئے۔ لیکن حیرت ہے کہ ایسا ہوا نہیں۔ بہرحال بات پاکستان کے دولخت ہونے تک پہنچ رہی ہے اس اشک آلود داستان کا نقطہ آغاز 1966ء میں شیخ مجیب الرحمان کے چھ نکاتی پروگرام سے ہوا۔ یہ چھ نکات شیخ مجیب نے لاہور میں ہونے والی اپنی عوامی لیگ کے متحدہ اجلاس میں پیش کئے۔ یہ نکات مشرقی پاکستان کے لئے خودمختاری کی عکاسی کرتے تھے ان میں سیاست اور معیشت سے متعلق پروگرام تھے۔ جس میں مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان کے انتظامی کنٹرول سے باہر کرنا تھا۔ اس ایجنڈا کو پیش کر کے شیخ مجیب نے پاکستان کو دولخت کرنے کے بیج باقاعدہ طور پر بو دیئے۔ نتیجتاً ذہنی انتشار نے جنم لیا اور نفرتیں اور دوریاں بڑھتی گئیں۔ شیخ مجیب نے ان نکات کو حکومت کی مخالفت میں خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ بنگالی قومیت کو پیدا کیا جس کا نظریہ پاکستان سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں تھا۔

شیخ مجیب کے چھ نکات

a آئین میں پارلیمانی نظام کی بالادستی جس میں اسمبلیاں سب سے اہم ہوں۔

b فیڈرل گورنمنٹ یعنی مرکز کے پاس صرف فوج اور امور خارجہ ہونے چاہئیں۔

c دونوں بازوؤں کی علیحدہ علیحدہ کرنسی ہونی چاہئے جو بہ آسانی تبدیل ہو سکے یا ایک کرنسی سارے ملک میں نافذ ہونی چاہئے۔

d مرکز کا ٹیکسوں میں کوئی حصہ نہیں ہونا چاہئے۔

e دونوں حصوں کے لئے زرمبادلہ کا علیحدہ علیحدہ اکاؤنٹ ہونا چاہئے۔

f مشرقی پاکستان کے لئے ایک خصوصی پیراملٹری فوج کا قیام۔

شیخ مجیب نے ان نکات کو اپنی سیاسی تقاریر کا مرکزی نکتہ بنالیا ہر جگہ عوامی رابطے میں ان کو استعمال کیا اور خوب پذیرائی حاصل کی۔ حکومتی سطح پر بھی انہی نکات کو پیش کیا۔ صدر ایوب خان نے اس Manifesto پر شدید ردعمل کا اظہار کیا اور شیخ مجیب کو امن و امان کے لئے خطرہ اور ملکی سالمیت کا دشمن قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ شیخ مجیب یہ چھ نکات پیش کر کے ملک کو دو حصوں میں بانٹنے کے مرتکب ہو رہے ہیں کیونکہ عملاً ان کا اطلاق ایک خودمختار ریاست قائم کرنا تھا۔

مغربی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمان اس وقت متعارف ہوئے جب ان کو اگرتلہ سازش کیس میں 35 اور لوگوں سمیت ملوث پایا گیا۔ ان پر الزام تھا کہ 1968ء میں انہوں نے بھارت کے ساتھ ساز باز کر کے ایک فوجی بغاوت پیدا کرنے کی کوشش کی جس کے تحت فوج کے اسلحہ کے ذخائر کو قابو کر کے مغربی پاکستان کی افواج کو بے بس کرنا تھا اور فوجی چھاؤنیوں کو اپنے تابع کرنا تھا۔ تنقید کرنے والوں نے اس کیس کو ایک سیاسی چال کہا جو صدر ایوب خان نے مجیب الرحمٰن کو پھنسانے کے لئے چلی تھی۔ بغاوت کیس میں سزائے موت بھی ہوسکتی ہے۔ یہ کیس ایوب خان کے آخری دنوں میں بری طرح فیل ہوگیا اور ان کے لئے باعث شرمندگی بنا اور ان کو قاتل جمہوریت جیسے القابات سے نوازا گیا۔

شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ چند لمحات

میں اس وقت مشرقی پاکستان ہی میں متعین تھا۔ مقدمہ کے دوران شیخ مجیب کو ڈھاکہ کنٹونمنٹ میں زیرحراست رکھا گیا تھا۔ ہمیں ڈھاکہ کے ڈویژنل ہیڈکوارٹر سے اطلاع دی گئی کہ شیخ مجیب کو اپنی بیمار والدہ سے ملنے ٹنگی پورہ ضلع فرید پور لایا جا رہا ہے۔ چونکہ شیخ مجیب کو پیرول Parole پر بھیجا جا رہا تھا اس لئے ان کی حفاظت اور خبرداری کے لئے ہمیں اطلاع کی گئی اور ایک چھوٹے Steamer کے انتظام کے لئے بھی کہا گیا جس میں انہیں اپنی والدہ سے ملنے جانا تھا۔ پروگرام کے مطابق ان کو ایک Amphibious یعنی پانی پر اترنے والے Aircraft سے کھلنا (Khulna) کی بندرگاہ پر اترنا تھا جہاں سے بذریعہ Steamer ان کو ٹنگی پورہ جانا تھا۔ اس تمام عمل میں شیخ کی حفاظت کی تمام تر ذمہ داری ہمارے بریگیڈ پر تھی۔ ہدایات تھیں کہ یہ تمام کام رات کے اندھیرے میں سرانجام پائے اور لوگوں کو اس کی خبر نہ ہو۔ خدشہ تھا کہ چونکہ شیخ مجیب الرحمان عوامی لیڈر بن چکے تھے اس لئے انہیں رہا کروانے کے لئے عوام کے ردعمل کو بعید از قیاس نہیں سمجھا جاسکتا۔ کھلنا کی بندرگاہ پر ڈویژنل ہیڈکوارٹر کی طرف سے ہدایات کے مطابق فوجی

جوان موجود تھے اور سخت سیکورٹی کا انتظام تھا۔ ہمیں اس فوجی دستے کو شیخ مجیب الرحمان کے ساتھ ان کی والدہ کے گاؤں تک بھی ساتھ لے جانا تھا۔ اس لئے ایک بڑے Steamer کی ضرورت تھی جس کا بہرحال انتظام کر لیا گیا۔

ہماری 9 بلوچ رجمنٹ کی ایک کمپنی جس کی قیادت میجر کیانی (بعد میں بریگیڈیئر) کر رہے تھے، کے ذمے شیخ مجیب کی حفاظت سے متعلق تمام اقدامات کی نگرانی تھی۔ اس کمپنی کو پہلے بندرگاہ پر متعین کیا گیا تا کہ تمام حفاظتی اقدامات پایہ تکمیل تک پہنچائے جائیں۔ بعدازاں اس کمپنی کو شیخ مجیب الرحمان کے حفاظتی دستے کے طور پر ان کے ساتھ جانا تھا اور اس کے بعد اس تمام گاؤں کی ناکہ بندی کرنی تھی تا کہ کوئی شرپسند عناصر وہاں جا کر ہنگامہ برپا نہ کر سکیں۔ دوسرے دن دوپہر کو شیخ مجیب کو واپس ڈھاکہ پہنچانا تھا جس کی ذمہ داری میجر قدرت کی تھی جو جیسور گریژن میں انٹیلی جنس آفیسر تھا۔ بہرحال شیخ مجیب کی آمد سے متعلق انتظامات مکمل ہو گئے اور مقررہ وقت پر ان کا Amphibious جہاز جائے مقررہ پر پہنچ گیا۔ ان کے ساتھ میجر رحمان تھے۔ جہاز پانی پر اترا تھا اس لئے میجر قدرت ایک چھوٹی لانچ میں انہیں لینے کے لئے جہاز تک گئے۔ پانی پر جہاز کا اترنا عام لوگوں کے لئے ظاہر ہے اچنبھے کی بات تھی۔ اس لئے کافی لوگ جہاز کو پانی پر اترتا دیکھ کر وہاں جمع ہو گئے اردگرد کے مزدور لوگ بھی اس منظر کو دیکھنے کے لئے اپنا کام چھوڑ کر متوجہ ہو گئے۔ انہیں یہ خبر ہی نہیں تھی کہ اس جہاز میں کون ہے۔ شیخ مجیب الرحمان جہاز سے باہر آئے اور موٹر لانچ میں بیٹھنے سے پہلے انہوں نے گھوم کر لوگوں کی طرف ہاتھ ہلایا۔ کچھ تماشائیوں نے واپس ہاتھ ہلا دیا لیکن غالباً وہ جان نہ سکے کہ یہ کون ہے۔ اگر انہیں علم ہو جاتا تو یقیناً وہاں بہت نعرہ بازی ہوتی جس سے غیر متوقع صورت حال بھی پیدا ہو سکتی تھی۔ لیکن چونکہ فاصلہ زیادہ تھا اس لئے شیخ مجیب کو پہچانا نہ جا سکا۔ ان کو پھرتی سے دوسری کشتی میں بٹھایا گیا اور تیزی سے اس چھوٹے سٹیمر کی طرف لایا گیا جہاں سے میری ڈیوٹی شروع ہونی تھی۔ میں نے انہیں Steamer میں خیر مقدم کیا۔

میں فوجی وردی کی بجائے سادہ کپڑوں میں ملبوس تھا۔ کیونکہ مجھے ہدایات تھیں کہ میں اپنی شناخت نہ ہونے دوں۔ جب میں نے شیخ مجیب کو پہلی بار قریب سے دیکھا تو مجھے ان کی شخصیت نے بہت متاثر کیا۔ ان کا قد لمبا اور جسم توانا تھا۔ کالی گھنی مونچھیں تھیں اور وہ لگاتار پائپ پی رہے تھے۔ ان کا انداز بیاں سحر انگیز اور جوشیلا تھا۔ میں نے ان کی تقریریں سن رکھی تھیں۔ لیکن ٹھہرا ہوا لب و لہجہ سننے کا پہلا اتفاق تھا۔ ان کی تقریروں نے ہی بنگالی قوم کو اکسایا تھا اور ان کے موثر انداز بیان نے ان کے چھ نکات کو ہر خاص و عام کی زبان تک پہنچا دیا تھا۔

ہم نے انہیں سفر کی تمام سہولتیں بہم پہنچائیں اور کھانے پینے کا خاطر خواہ انتظام رکھا۔ بہت ہوشیار اور مردم شناس انسان تھے۔ کچھ دیر ہی میں انہوں نے اندازہ لگا لیا کہ میرا تعلق فوج سے ہے۔ لیکن کچھ کہا نہیں۔ اور ہم سے برملا گفتگو جاری رکھی۔

شیخ مجیب کا شخصی خاکہ کچھ یوں ہے کہ ان کا تعلق ایک چھوٹے سے گاؤں سے تھا۔ 1920ء ٹنگی پورہ میں پیدا ہونے والا یہ شخص بین الاقوامی شہرت کو پہنچا۔ اس وقت ان کی عمر قریباً پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔ عوامی لیگ کے بانیوں میں سے تھے۔ جو 1949ء میں وجود میں آئی تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں تعلیم میں کمزور لیکن تنظیمی کاموں میں تیز قرار پائے تھے۔ ان کی یہی صلاحیت ان کو ایک کامیاب سیاستدان بنا گئی۔ عوامی لیگ کی بنیاد رکھنے کے بعد اگلے بیس سال انہوں نے اس کی تنظیم اور ترسیل میں صرف کئے۔

شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنی زندگی کے یہ بیس سال 1949ء سے لے کر 1969ء تک عوامی لیگ کی نذر کئے۔ جن میں سے 10 سال جیل میں گزرے کیونکہ ان پر الزام تھا کہ وہ کمیونسٹ ہیں اور انتشار اور نقص امن کے مرتکب ہیں۔ اس دوران انہوں نے عوامی لیگ کو خوب منظم کیا اور اپنی تنظیمی خوبیوں کو بروئے کار لائے۔ بنگالی زبان میں تقریر بہت عمدہ کرتے تھے اور جذبات ابھارنے میں ماہر تھے جس کا باقاعدہ استعمال اُنہوں نے بنگلہ دیش کے نعرے میں کیا۔

تاریخ پاکستان کے اس اہم موڑ پر مجھے اس شخص کے ساتھ تبادلہ خیال کا موقع ملا جس نے پاکستان کے نقشے کو ہی بدل دیا۔ میں نے حالانکہ اپنے آپ کو سویلین ظاہر کیا تھا مگر وہ سمجھ چکا تھا کہ میرا تعلق فوج سے ہے۔ بظاہر وہ مجھ سے بہت شائستگی سے پیش آتا رہا اور میری ہر بات کا جواب بھی دیتا رہا اور اپنی حراست اور اگرتلہ کیس کو زیر بحث بھی لاتا رہا۔ جب میں نے اس سازش کیس کی وجہ جاننے کی کوشش کی تو شیخ مجیب الرحمٰن نے اس کیس میں ملوث ہونے کی قطعی تردید کی۔ کہنے لگے کہ میں کسی بھی غیر جمہوری انداز فکر پر یقین نہیں رکھتا اور اس سازش کیس سے میرا ہرگز کوئی تعلق نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں مشرقی پاکستان کے لئے خودمختاری چاہتا ہوں''

دوران گفتگو ہم ان کے چھ نکات بھی زیر بحث لائے وہ انگریزی بول رہے تھے اور بڑے واضح انداز میں اپنا موقف بیان کر رہے تھے۔ کہنے لگے:

''میرے چھ نکات کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہم مغربی پاکستان کے ساتھ اپنا ناطہ توڑنا چاہتے ہیں۔ اور مشرقی پاکستان کو ایک علیحدہ مملکت بنانا چاہتے ہیں۔ ہم تو صرف صوبائی خودمختاری چاہتے ہیں جس کے تحت پاکستان کے دونوں بازو اپنے اپنے وسائل اپنے لوگوں کے لئے استعمال کریں اور مرکز کے

تحت صرف دفاع، خارجی امور اور امور رسل ورسائل ہوں' انہوں نے بارہا Cabinet Mission 1946ء کا ذکر کیا۔ جس میں ایک Indian Federation کا ذکر تھا۔ اور جس کا پلان بھی یہی تھا اس پلان کو آل انڈیا نیشنل کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے تسلیم کیا تھا۔ شیخ مجیب کے مطابق پاکستان کے پاس بھی یہی ایک حل موجود تھا۔ مشرقی پاکستان کے استحصال اور ان کے قدرتی وسائل کا مغربی پاکستان میں استحصال کا بھی انہوں نے بار بار ذکر کیا۔ ان کی باتوں میں تلخی تھی اور وہ اس خام خیالی کا بھی سد باب کرنا چاہتے تھے جس کے تحت بقول ان کے یہ کہا جاتا تھا کہ بنگالی لوگ اپنے امور خود منظم کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ میں نے ان کی اس بات کی پرزور تردید کی کیونکہ یہ ایک خود ساختہ بحث سے کم نہ تھی۔

بہرحال یہ تاریخی سفر مجھے بہت کچھ سکھا گیا اور میں نے اپنے کانوں سے سنا اور آنکھوں سے پاکستان کے دولخت ہونے کی کہانی کو دیکھا۔ شیخ مجیب کی باتوں سے نکلا ہوا زہر پھیلتا گیا اور نفرتوں کی خلیج بڑھتی ہی گئی۔

اگرتلہ سازش کیس

پہلی جنوری 1968ء کو حکومت نے ایک انتہائی سنسنی خیز انکشاف کیا۔ جس میں بتایا گیا کہ مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن نے پوری قوم کے خلاف ایک سازش تیار کی ہے۔ ان کے ساتھ 35 اور لوگوں کے نام تھے جن کا تعلق فوج اور سول سروس سے تھا۔ ان پر الزام تھا کہ بھارت کی مدد سے یہ لوگ ایک مسلح بغاوت کی تیاری کر رہے ہیں۔ ان تمام لوگوں کو حراست میں لے لیا گیا اور 19 جون 1968ء کو ڈھاکہ کنٹونمنٹ میں ان پر باقاعدہ مقدمے کا آغاز ہوا۔ یہ مقدمہ کھلی کچہری میں لگا۔ جس میں عوام کی باقاعدہ شمولیت تھی۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کو حالات کی نزاکت کا احساس کچھ دیر سے ہوا۔ پہلے تو انہوں نے مشرقی پاکستان کی خودمختاری کے نعرے کو ڈنڈوں اور لاٹھیوں سے روکنا چاہا لیکن جب ان کے یہ تمام حربے ناکام ثابت ہوئے تو مشرقی پاکستان کے تمام بڑے شہروں میں کرفیو نافذ ہوتا رہا مگر عوام کا ریلا بار بار کرفیو آرڈر توڑتا رہا جس سے انتظامیہ بے حال اور بے بس نظر آئی۔ جس پر ایوب خان نے ''ہاتھ ہلکا'' رکھنے کی ہدایت کی اور ایک گول میز کانفرنس کی تجویز پیش کی۔ جس میں تمام سیاسی پارٹیوں کو شامل کر کے ایک قابل عمل حل تلاش کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ 22 فروری 1969ء کو شیخ مجیب کو رہا کر دیا گیا۔ لیکن حالات پھر بھی قابو میں نہ آئے۔ پشاور سے لے کر چٹا

گانگ تک لوگ ایوب خان سے متنفر نظر آنے لگے۔ بھرپور پبلک ریلیوں میں ایوب خان کو ڈکٹیٹر اور جمہوریت کے قاتل جیسے القابات سے نوازا جانے لگا، تلخی کے اس اٹھتے ہوئے ریلے کو حکومت روکنے میں ناکام ہوتی چلی گئی۔ جگہ جگہ مار دھاڑ اور توڑ پھوڑ شروع ہوگئی اور ملک نفرتوں کی آگ میں جلنے لگا، ایوب نے جب دیکھا کہ حالات قابو سے باہر ہونے لگے ہیں تو انہوں نے مستعفی ہونے کا فیصلہ کیا اور حکومت کی باگ ڈور اپنے ایک معتمد ساتھی جنرل آغا محمد یحییٰ خان جو چیف آف آرمی سٹاف تھے، کے سپرد کردی۔ ایوب خان کا یہ فیصلہ بھی جمہوری اقدار کے خلاف تھا۔ کیونکہ آئین کے مطابق صدر کے مستعفی ہونے کی صورت میں قومی اسمبلی کے سپیکر کو یہ ذمہ داری سونپی جاتی ہے۔ سپیکر چونکہ بنگالی تھا اس لئے ظاہر ہے ایوب خان یہ فیصلہ نہ کر سکے۔ سیاسی دباؤ بڑھتا گیا اور بالآخر شیخ مجیب الرحمٰن کو رہا کرنا پڑا۔ ان چند کمزور اور بے وقت فیصلوں نے ملک کا مقدر بدل دیا۔ شیخ مجیب نے اس کیس کو 'اسلام آباد سازش کیس' کہنا شروع کر دیا، جس کے تحت ان کی جمہوری پیش رفت روکنے کی کوشش کی گئی تھی (6)۔ ان کا راستہ روکنے سے حکومت نے ان کے راستے کھول دیئے اور پھر وہ کچھ ہوا جس کو آج بھی سوچ کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ قائداعظمؒ نے اپنی سیاسی بصیرت اور حکمت عملی سے جو ملک حاصل کیا تھا وہ سیاسی ناعاقبت اندیشی کی نذر ہوگیا۔ شخصی اقتدار کی ہوس اور دوام کی کوشش نے ملک کو ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا جہاں سے آگے قدم ملا کر چلنا ناممکن ہوگیا۔

جنرل یحییٰ خان کی آمد

25 مارچ 1969ء کو جنرل محمد یحییٰ خان نے بحیثیت صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر حلف اٹھایا۔ انہوں نے آتے ہی سب سے پہلے 1962ء کے آئین کو کالعدم کیا اور اسے غیر موثر قرار دے دیا اور تمام سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگادی۔ مرکزی اور صوبائی Cabinets کو ختم کر کے قومی اور صوبائی اسمبلیاں توڑ دیں۔ صدر یحییٰ خان نے اعلان کیا کہ ان کی سب سے پہلی ترجیح عوام کی جان و مال کی حفاظت ہے اور ملک میں امن وامان کی بحالی ہے۔ جس کے بعد ملک کو دوبارہ جمہوریت کی راہ پر گامزن کیا جاسکے گا۔

ہمارے بریگیڈ کمانڈر کو ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا گیا اور میرا کام کئی گنا بڑھ گیا، مشرقی پاکستان میں صورت حال مزید بگڑتی گئی اور لوگ شیخ مجیب کے چھ نکات کے متعلق اس قدر جذباتی ہوگئے کہ عقل کی کوئی بات ان تک پہنچانا ناممکن ہوگیا۔ خیر اس وقت فوجی مداخلت سے یہ بہتری ہوئی کہ حالات قابو میں آنا شروع ہوگئے اور ایک میانہ روی کی صورت پیدا ہوتی نظر آنے لگی۔

6۔ ڈان۔ کراچی 24 فروری 1969ء

مغربی پاکستان کے خلاف نفرتوں کے بیج بوئے جا چکے تھے۔ پنجابی جیسا کہ مغربی پاکستان کے لوگوں کو کہا جاتا تھا اب بنگالیوں کے بھائی نہ تھے۔ اب دونوں پاکستانی قوم نہیں تھے بلکہ ایک نئی 'بنگالی قوم' اور 'بنگلہ دیش' کا نعرہ عام تھا۔ اس قومی المیے کو 'ٹائمز' کے ایک نامہ نگار نے یوں بیان کیا ہے:

''ایک طرف تو 7 کروڑ بنگالی جو ایک علیحدہ مملکت کے قیام کی طرف بڑھ رہے ہیں، چاہتے ہیں کہ الیکشن ایسی بنیادوں پر ہو جس کے تحت علاقے میں حکومتی نظام بدل جائے۔ آبادی کے لحاظ سے مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان پر بھاری اکثریت سے برتری حاصل تھی جو کبھی بھی تبدیل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس طرح مشرقی پاکستان ہمیشہ ہی مغربی پاکستان پر حکمران رہتا۔ کیونکہ یہاں کی آبادی کم تھی مگر ترقی کے لحاظ سے وہ مشرقی پاکستان سے کہیں آگے تھا۔ اصل طاقت یعنی فوج اور سول سروس جس میں پنجاب کی اکثریت تھی۔ اس بات پر بضد تھے کہ الیکشن سیٹوں کے برابر تقسیم کے تحت ہونے چاہئیں، بنگالی قوم پرست اس نظام کی بھرپور مخالفت کر رہے تھے۔ ان کا موقف تھا کہ آبادی کے تناسب سے ایک آدمی ایک ووٹ کے تحت الیکشن ہونے چاہئیں اس سے ان کو اسمبلی میں برتری حاصل ہوتی تھی۔ اس لئے الیکشن اس طرح ہونے چاہئیں، مشرقی پاکستان میں ایک اور بات کو ہوا دی گئی تھی وہ یہ کہ مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان کو ایک کالونی کی طرح سمجھ رہا ہے۔ اور اس کا باقاعدہ استحصال کر رہا ہے یہ بات عمومی طور پر بے معنی نظر آتی ہے کیونکہ کہیں بھی یہ چیز عملاً نظر نہیں آ رہی۔ اور یہ نعرہ حقیقت سے ہٹ کر جذبات پر مبنی ہے۔ یہ بات بھی سننے میں آئی ہے کہ گول میز کانفرنس کے دوران جنرل یحیٰی نے شیخ مجیب سے رابطہ قائم کیا تھا اور ایک متناسب لائحہ عمل اختیار کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا تھا''۔

تاریخی حوالہ سے بنگال کے لوگ صدیوں سے استحصال کا شکار تھے اور ان کو ہر طرح کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑتی تھی۔ سراج الدولہ کی شکست سے لے کر قیام پاکستان تک بنگالی لوگ انگریزوں کی نفرت کا نشانہ بنتے رہے اس لئے انگریز راج سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے بنگال ہمیشہ پیش پیش رہا۔ تحریک آزادی میں بنگالیوں کی کوششوں اور قربانیوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان بنانے کے لئے 97 فیصد بنگالیوں نے اس کے حق میں ووٹ ڈالا تھا۔ لیکن حالات کی یا قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اسی 97 فیصد نے پاکستان سے علیحدہ ہو کر بنگلہ دیش بنانے کا ووٹ بھی دیا۔

بہر حال اس دوران میرے ٹرانسفر کے آرڈر آ گئے اور مجھے کھاریاں بھیج دیا گیا جہاں مجھے 14FF رجمنٹ کو جوائن کرنا تھا۔

سپاہیانہ زندگی کے مزے

جی۔ایچ۔کیو سلیکشن بورڈ میں تمام میجر کے rank کے لوگوں کے کیس زیرغور تھے۔فوج میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے کے لئے کارکردگی کی بہت زیادہ جانچ پڑتال ہوتی ہے اور اس میں آرمی چیف کے ساتھ تمام شعبوں کے متعلق شخصیات خصوصی دلچسپی لیتی ہیں۔ بورڈ نے فیصلے سنا دئے۔اورترقی پانے والے افسران کی فہرست مرتب ہوگئی۔ میں سمر کیمپ Summer Camp سے ٹریننگ کر کے واپس لوٹا تھا کہ مجھے میرے جنرل آفیسر کمانڈنگ (GOC) میجر جنرل بشیر نے ترقی پانے کی خوشخبری سنائی میری یونٹ کے تمام ساتھیوں نے اس خوشی میں مجھے مبارک باد دی اور دستور کے مطابق میرے آنے پر بینڈ بجایا گیا۔ اب دوبارہ میری ٹرانسفر 10th فرنٹیئر فورس رجمنٹ 10FF میں ہوگئی یہ میری وہ رجمنٹ تھی جس میں میں نے بحیثیت افسر ذمہ دارانہ آنکھ کھولی تھی یعنی جب میں پاکستان ملٹری اکیڈمی سے فارغ التحصیل ہوا تو میری پہلی پوسٹنگ اسی رجمنٹ میں ہوئی تھی۔

دستوریوں کی قیادت

ستمبر ۱۹۷۰ء میں میں نے کمانڈ سنبھالی جبکہ یونٹ تین ماہ کے لیے موسم سرما کی مشترکہ تربیت کے لیے باہر جانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ رجمنٹ ایک صدی پرانی تھی۔ اسے دستوری کا نام دیا گیا تھا جس کا مطلب ہے ”وہ جو قانون کی مکمل پاسداری کرتے ہیں۔“

یہ آرمرڈ انفنٹری رجمنٹ تھی جسے بڑی فوجی نقل وحرکت میں استعمال کرنا مقصود تھا۔ آرمر کا ساتھ دینے کے لیے رجمنٹ میں آرمر پرسنل کیریر (اے پی سی) شامل تھے۔

بہت خوب وجے

یہ واقعہ میری رجمنٹ کے ایک آفیسر نے مجھے سنایا۔ رجمنٹ کے بریگیڈ کمانڈر تربیت کے

معیار کا اندازہ لگانے کی خاطر رجمنٹ میں اکثر آیا کرتے تھے۔ تربیت والے علاقہ میں وہ رائفل بردار جوان کے پاس جاتے اور اوندھی حالت میں جوان کے سامنے لیٹ جاتے جو نشانہ کی مشق میں مشغول ہوتے۔ کمانڈر نشانہ وال ڈسک کو اوپر اٹھاتے اور جوان کو نشانہ لینے کے لیے حکم دیتے۔ اس طرح وہ جوان کی نشانے کی مہارت کا اندازہ لگاتے۔ ایک جوان کے بعد دوسرے جوان تک باری باری کمانڈر جایا کرتے۔ تربیت کے علاقہ سے فارغ ہوکر وہ تمام افسران کو چائے کے کمرہ میں جمع کر کے ایک خیالی جنگی صورت حال کی تصویر کشی کرتے۔ وہ کچھ اس طرح ایک خطہ کے متعلق اطلاعات فراہم کرنا شروع کرتے۔''حاضرین خیال کیجئے ایک سڑک شمال سے جنوب کی طرف جا رہی ہے۔ خیال کیجئے کہ میل نمبر 10 پر ایک ندی سڑک کو کاٹ رہی ہے۔ خیال کیجئے سڑک کے دائیں طرف ایک ٹیلہ ہے۔ خیال کیجئے کہ ٹیلہ کے بائیں سمت ایک جوہڑ ہے''اس طرح وہ پوری جنگی صورت کو مفروضہ کی بنیاد پر پیش کرتے۔ اس وقت تک جب وہ پوری تصویر کشی کر لیتے۔ افسران ان کے مفروضوں پر بنائی گئی تصویر بھول جاتے، کیونکہ انہیں نوٹس لینے کی اجازت نہ تھی۔ اور انہیں اپنی یادداشت کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ اکثر اس صورت حال میں ان کے جوابات میں غلطیاں ہو جاتیں۔ اس اثناء میں چائے سے تواضع جاری رہتی۔ اور کمانڈر غلط جوابات دینے پر افسران کو جھڑکیاں دیتے رہتے۔ رجمنٹ کی طرف سے خاطر مدارات سے لطف اندوز ہونے کے بعد کمانڈنگ آفیسر بریگیڈ کمانڈر کو اس کی سٹاف کار تک خدا حافظ کہنے کے لئے لے جاتے۔

بریگیڈ کمانڈر رجمنٹ میں اس قسم کے دورے اکثر کرتے رہتے بالآخر میجر آغا وجاہت جن کو پیار سے وجے کہا جاتا تھا، مایوس ہو گئے۔ کیونکہ کمانڈنگ آفیسر کی موجودگی میں وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ایک روز بریگیڈ کمانڈر تشریف لائے لیکن کمانڈنگ آفیسر یونٹ سے باہر گئے ہوئے تھے۔ اس روز میجر وجاہت نے پہلے تو تربیت کے علاقہ میں اور پھر چائے کے کمرہ تک بریگیڈ کمانڈر کا ساتھ دیا۔ معمول کے مطابق خیالی جنگی تصویر کشی کی گئی۔ جس کا انحصار مفروضات پر تھا۔ ایک مرتبہ پھر کمانڈر نے افسران کو جھڑکیاں دیں۔ کہ ان کے جوابات غلط تھے۔ اس دفعہ میجر وجاہت نے تواضع کا بندوبست نہیں کیا تھا۔ آخر کار کمانڈر نے رخصت ہونے کا ارادہ کیا۔ میجر وجاہت کمانڈر کو ان کی کار تک لے کر گئے۔ میجر وجاہت نے نہایت چستی سے کمانڈر کو سلامی دی۔ اور ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:''جناب عالی! آپ بھی تصور کیجئے کہ آپ نے آج ہمارے ساتھ چائے پی۔''

قیادت کا پہلا روز

کمانڈ میں میرا پہلا روز جذبات اور چیلنجوں سے بھرا تھا۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا امن اور جنگ کے متعلق احکامات کا مطالعہ کر رہا تھا کہ صوبیدار میجر رزاق اندر آیا اور رپورٹ کی کہ کیپٹن اقبال اور صوبیدار فضل الرحمٰن کے درمیان نہایت تلخ بات چیت کا تبادلہ ہوا ہے۔ اس کے چلے جانے کے فوراً بعد سیکنڈ ان کمانڈ نے مجھے بتلایا کہ صوبیدار نے کیپٹن اقبال کے ساتھ نازیبا الفاظ استعمال کئے ہیں۔ میں نے اس سے کہا کہ تحقیق کر کے مجھے بتلائیں کہ کون قصوروار ہے؟ وہ چلا گیا تو میں نے سنٹر کمانڈنٹ فرنٹیئر فورس سنٹر ایبٹ آباد بریگیڈیئر اعجاز محمود جو ٹونی کے نام سے مشہور تھے، کے لیے کال بک کروائی۔ خوش قسمتی سے مجھے ٹیلی فون کال مل گئی۔ سیکنڈ اِن کمانڈ کے اپنی تحقیق کے مکمل کرنے سے قبل میری بات چیت ہوگئی۔ میں نے سنٹر کمانڈنٹ کو مطلع کیا کہ ڈسپلن کا ایک کیس یونٹ میں میری کمانڈ کے پہلے ہی روز پیش آیا ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ اگر اس صوبیدار کو قصوروار ٹھہرایا گیا تو اسے یونٹ سے باہر تعینات کر دیا جائے۔ سنٹر کمانڈنٹ نے مجھ سے اتفاق کیا اور مزید کہا کہ صوبیدار کو فوراً سنٹر رپورٹ کرنے کے لیے بھیج دیا جائے۔

تحقیقات سے معلوم ہوا کہ دونوں طرف قصوروار ہیں۔ رجمنٹ کی روایات کے مطابق سینئر ہی درست قرار دیا جاتا تھا۔ اگر جونیئر یہ خیال کرے کہ اس کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے تو اسے تحریری طور پر اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کے ازالہ کی خاطر درخواست دینی چاہیے۔ صوبیدار بہت عمدہ فٹ بال کا کھلاڑی تھا۔ اسے کھو دینے کا مطلب رجمنٹ کی فٹ بال ٹیم کے جذبات کو مجروح کرنے کے مترادف تھا۔ کھلاڑی ہر روز پیدا نہیں ہوتے۔ انہیں ڈھونڈنا اور تربیت دینا پڑتا ہے۔ اب ہمارے سامنے یونٹ کے ایک کھلاڑی کے خلاف نظم وضبط کا مسئلہ تھا میں نے سوچا کہ اسے یونٹ میں رکھنے کے فیصلے کو بعض افراد نادرست خیال کریں گے۔ لہٰذا میں نے سیکنڈ ان کمانڈ کو کہا کہ صوبیدار کو فوراً سنٹر بھجوا دیا جائے۔ وہ رخصت ہوگیا لیکن فوراً صوبیدار میجر کے ہمراہ واپس آیا اور اس نے کہا کہ صوبیدار متعلقہ آفیسر سے معافی مانگنے کے لیے تیار ہے۔ اس نے مزید کہا کہ صوبیدار فٹ بال کا ایک اچھا کھلاڑی ہے۔ اور ٹیم میں اس کی موجودگی لازمی ہے جو آنے والے مقابلوں میں چیمپئن شپ جیتنے کے لیے ضروری ہوگی۔ میں نے اتفاق نہ کیا اور اپنے فیصلہ پر قائم رہا۔ اس کا اثر کمان پر ہوا لیکن اس کے بعد مجھے یونٹ میں پورا وقت کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ مجھے پتہ تھا کہ یہ فیصلہ کڑوی گولی نگلنے کے مترادف ہے۔ لیکن فٹ بال میں جیت کی خاطر یونٹ میں نظم وضبط کو قربان کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ ہمارا پیشہ سب سے اول اور کوئی دوسری شے اس کے بعد

آتی ہے۔ مجھے اسے کھو دینے کا افسوس تھا۔ لیکن ایسا ہوتا ہی ہے۔

انتخابات 1970ء

1970ء قومی انتخابات کی تیاری اور انعقاد کا سال تھا۔ میری یونٹ کو مظفر گڑھ، کوٹ ادو اور لیہ میں انتخابات کی نگرانی کا ذمہ دار بنایا گیا۔ انتخابات سکون سے اور منصفانہ منعقد کروائے گئے۔ پیپلز پارٹی مغربی پاکستان میں واحد اکثریتی جماعت کے طور پر ابھری۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی پارٹی مشرقی پاکستان میں نہ صرف سب سے آگے تھی بلکہ وہ واحد اکثریتی جماعت کے طور پر ابھری۔ اب سیاسی تنازعہ شروع ہو گیا۔ جنرل یحییٰ خان اکثریتی جماعت کے لیڈر کو حکومت سازی کی دعوت دینے میں ناکام رہے۔ نتیجتاً مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی شروع ہو گئی اور اب بنگلہ دیش کا آزاد ریاست کی حیثیت سے قیام ناگزیر نظر آنے لگا اس مقصد کی خاطر عوامی لیگ کو بھارتی افواج کی مدد حاصل ہو گئی۔ بھارتی افواج نے بین الاقوامی سرحد کو روند ڈالا اور فوجی طاقت کے سہارے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا۔ جس کے باعث دونوں ممالک میں جنگ چھڑ گئی۔

بھارت سے جنگ 1971ء

میری یونٹ فرسٹ آرمرڈ ڈویژن کا حصہ تھی۔ ہم اپنی توجہ راوی اور ستلج کے درمیان مرکوز کر رہے تھے۔ آرمرڈ ڈویژن جنگ کے لیے تیاری کر رہا تھا۔ لیکن عملی منصوبہ بندی کو انتہائی خفیہ رکھا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ یونٹ کمانڈروں کو بھی ان کے عملی علاقہ کا علم نہ تھا۔ بریگیڈ کمانڈر بریگیڈیئر ارشد محمود (اے ایم جے) برابر کے بے خبر تھے۔ یا کم از کم ہمیں یہی تاثر ملا۔ اگرچہ بے شک ہم تیاری کی حالت میں تھے۔ لیکن ہمیں اپنے صحیح مشن کا علم نہ تھا۔ آخر کار ہمیں صرف اجتماعی علاقہ کی طرف بڑھنے کا حکم ملا۔ ہم نے رجمنٹ کا کچھ حصہ ریلوے کے ذریعے اور کچھ حصہ سڑک کے راستہ لے جانے کی تجویز بنائی۔ میجر محمد علی سڑک کے راستہ جانے والی پارٹی کے انچارج تھے۔ اور وہ اجتماع کے علاقہ میں تجویز کے مطابق پہنچ گئے۔ ٹرین پارٹی میں اے پی سی اور دوسری یونٹوں کی بھاری گاڑیاں شامل تھیں۔ میری رجمنٹ پورے گروپ کی انچارج تھی جو میجر ادیب کی کمانڈ میں تھی۔ میں نے ریلوے پارٹی کے ہمراہ سفر کرنا تھا۔ ۵۰ بور کی خودکار براؤننگ رائفل اے پی سی پر ہر دم تیار تھی تاکہ اگر بھارتی ایئر فورس ٹرین پر حملہ کرنے کی کوشش کرے تو ان پر فائر کیا جائے۔

آرمرڈ ڈویژن کی حرکت میں ناگہانی یا اچانک صورت پیدا کرنے کے لیے ٹرین کے ذریعے سفر کو دو راتوں پر مشتمل رکھا گیا تھا۔ ہم نے تین بجے صبح پہلے توقف کے لیے قیام کرنا تھا۔ تمام

اے پی سی اور آرٹلری کو نیچے اتار لینا تھا۔ دن کے دوران انہیں ادھر ادھر بکھرے رہنا تھا۔ اور پھر تاریکی کے بعد پھر سے گاڑی پر چڑھایا جانا تھا اور اجتماع کے علاقہ میں ملنے کے لیے سڑک والی پارٹی سے ملنا تھا۔ اگلے روز علی الصبح ہمیں سرحد سے جارحانہ حملہ کرنا تھا۔

ایک المیہ

ہم نے کوٹلہ جنڈارام ریلوے سٹیشن پر رات کی تاریکی میں ٹرین پر اسلحہ لادنا شروع کیا۔ منزل مقصود پر سامان کو آسانی سے اتارنے کی خاطر ریلوے ڈبوں کو نئے سرے سے درست کرنا پڑا۔ مکمل تاریکی کے باعث پورا عمل بغیر روشنیوں کے تکمیل پا رہا تھا۔ صرف ریلوے انجنوں کی آوازوں کو ہی سنا جا سکتا تھا جو اِدھر سے اُدھر شنٹنگ کرتے پھر رہے تھے۔ یہ رات کی تاریکی میں نظم وضبط کا مکمل مظاہرہ تھا۔ ابھی کام جاری تھا کہ ہم نے پچھلی جانب سے ایک ٹرین کو اپنی طرف آتے سنا۔ یہ کسی کے ذہن میں نہ آیا کہ ٹرین ایک خوفناک حادثہ کرنے والی ہے۔ پھر ہمیں Control Movement کی صلاحیت پر یقین تھا۔ اب تک بہت سی بوگیاں تجویز کے مطابق درست کی جا چکی تھیں۔ اچانک ہم نے خوفناک دھماکہ کی آواز سنی جو اس امر کا ثبوت تھا کہ بڑی لائن پر ٹکر ہو چکی ہے۔ ہم بھاگ کر اس جگہ کی جانب گئے۔ کیونکہ انجنوں کی آمدورفت بند ہو چکی تھی۔ گارڈ کا کمرہ مکمل طور پر تباہ ہو چکا تھا۔ اور زخمی امداد کے لیے چیخ و پکار کر رہے تھے۔ میجر ادیب اور لیفٹیننٹ فہیم جو گارڈ کے ڈبہ سے شنٹنگ کے عمل کی نگرانی کر رہے تھے، ان کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ تاریک رات میں بیٹریوں کے سہارے ہم انہیں ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیفٹیننٹ فہیم شدید زخمی تھا اور بے ہوش پڑا تھا۔ اور میجر ادیب گاڑی کے نیچے آ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا۔ یہ قیامت خیز المیہ تھا۔ ہم غصہ سے بپھر رہے تھے اور غم میں ڈوبے تھے۔ لیکن وقت ضائع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور رجمنٹ نے قریب ترین میڈیکل یونٹ تک زخمیوں کو پہنچانے کا بندوبست کیا۔

کیا یہ کوئی سبوتاژ تھا یا حادثہ؟ کس نے سٹیشن پر آرٹلری یونٹ کو لے جانے والی گاڑی کے پیچھے ایک اور گاڑی کی آمد کی اجازت دی جبکہ ہم پہلے ہی وہاں موجود تھے؟ بعد ازاں معلوم ہوا کہ آرٹلری یونٹ نے سامان لادنے کے بعد رخصت ہو جانے کے متعلق خود ہی رپورٹ دی تھی۔ کسی سٹیشن ماسٹر نے پڑتال کئے بغیر مین لائن پر آرٹلری ٹرین کی روانگی کا حکم دے دیا۔ قیمتی زندگیوں کے ضیاع کے علاوہ اس واقعہ نے بکتر بند فورس کے جارحانہ اقدام میں رکاوٹ پیدا کر دی۔ گاڑیوں کی حرکت کو کنٹرول کرنے والی تنظیم سے ایک ناقابل معافی جرم کا ارتکاب ہوا۔

ہمیں احکامات موصول ہوئے۔ سامان اتارنے اور ادھر ادھر پھیلانے کے لیے کہا گیا۔ نیز مزید احکامات کے لیے انتظار کرنے کی ہدایت کی گئی۔ اگلے روز ہم نے کسووال کے قبرستان میں میجر ادیب کی نعش کو بطور امانت عارضی طور پر دفن کر دیا۔

میجر ادیب کا تعلق گلگت ایجنسی میں نگر سے تھا۔ وہ ایک خوبصورت نوجوان اور سپاہیانہ جذبے سے بھرا ہوا تھا۔ اجتماع والے علاقہ میں قیام کے دوران وہ ہمیشہ کہا کرتا ''جناب! میرا خیال ہے بھارت سے ہماری جنگ ہوگی۔'' وہ اپنے آدمیوں کا اچھا لیڈر اور خود کو وقف کرنے والا سپاہی تھا۔ ہر وہ ذمہ داری جو اسے دی گئی، اس کو اس نے نبھایا۔ اس کے آدمی روتے تھے۔ ہم سب ایک ساتھی اور فوجی بھائی کو کھونے پر افسردہ تھے۔ جس نے ذمہ داریاں برضا ورغبت قبول کیں۔ اور کبھی ناراضگی کا اظہار نہ کیا۔ اس نے کبھی شکوہ نہ کیا۔ اور ہمیشہ زندگی کے مثبت پہلو پر نظر رکھی۔ بعد ازاں کسووال ریلوے سٹیشن کا نام تبدیل کر کے ادیب شہید ریلوے سٹیشن رکھا گیا۔ اس کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس نے اپنے ملک کی حفاظت کے لیے جان کا نذرانہ پیش کر دیا۔

اس اثناء میں مین لائن صاف کر دی گئی۔ اگلے روز ہمیں احکامات موصول ہوئے۔ ٹرین پارٹی کو حرکت کرنے کے لیے کہا گیا۔ دوبارہ تاریکی کے بعد سامان کو لادنے کے لیے حکم دیا گیا۔ یونٹ کا حوصلہ بلند رکھنے کے لیے ہم نڈر ہو گئے۔ احتیاط کرتے ہوئے ہم نے ساڑھے چار بجے بعد دوپہر سامان لادنا شروع کیا۔ تمام طیارہ شکن وسائل ہر اے پی سی پر آسمان کی طرف منہ کئے ہوئے منتظر تھے کہ کوئی بھارتی طیارہ ادھر نمودار ہو تو اس پر فائر کھول دیا جائے۔ سپاہیوں نے جنگی جذبہ کو پھر سے حاصل کر لیا تھا۔ میجر ادیب نے جان قربان کر کے سپاہیوں میں تازہ روح پھونک دی تھی۔ جب ٹرین کو لاد دیا گیا۔ تو ہم نے ''سب تیار'' کا برقی پیغام بھیجا۔ اور حرکت کے لیے انتظار کرنے لگے۔ حرکت کے لیے کنٹرول کو سخت کر دیا گیا تھا۔ لیکن اس کی بھاری قیمت چکانا پڑی۔ اچانک ہمیں احکامات موصول ہوئے کہ صدر پاکستان جنرل آغا یحییٰ خان کا قوم سے خطاب سننے کے لیے ریڈیو کو کھولیں۔ صدر نے ہکلاتے ہوئے قوم کو بتلایا کہ اس نے بھارت کی جنگ بندی کی تجویز کو منظور کر لیا ہے۔ وہ ٹوٹے انسان کی مانند سنائی دے رہے تھے۔ جنگ رک گئی اور ہمیں سامان اتارنے کا حکم ملا۔ اور یہ بھی بتایا گیا کہ ہم متعلقہ اجتماع والے علاقہ میں لوٹ جائیں۔

مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈالنا اور مغربی پاکستان میں جنگ بندی تمام افواج کے لیے ایک خوفناک تجربہ تھا۔ جی او سی میجر جنرل جہاں زیب نے رجمنٹ کا دورہ کیا اور میں نے انہیں برابر کا دل برداشتہ پایا۔

16 دسمبر کو فوج پر اداسی چھا گئی۔ اور ہر طرف افسردگی پھیل گئی۔ ہر آنکھ سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ہر دل لہو رو رہا تھا موت کے چھ روز بعد ۲۲ دسمبر کو میجر ادیب کا جسد خاکی قبر سے نکالا گیا۔ اب بھی اس سے کثرت کے ساتھ خون بہہ رہا تھا۔ اور خون تازہ معلوم ہوتا تھا۔ اسے بذریعہ ہوائی جہاز گلگت لے جایا گیا اور وہاں سے نگر جہاں اسے سپرد خاک کر دیا گیا۔ سوگوار خاندان کی حالت ناقابل بیان تھی۔ وہ دائمی غم میں ڈوبے نظر آتے تھے۔ لیکن میجر ادیب اپنے لیے تاریخ کا ایک باب لکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

رجمنٹ کو اوکاڑہ جانے کا حکم ملا۔ بھارت کے ساتھ جنگ بندی کے باوجود ہم نے اب بھی فوج کو حالت جنگ میں رکھا ہوا تھا۔ غیر متوقع طور پر مجھے تبدیلی کے احکامات موصول ہوئے۔ ان احکامات کے مطابق مجھے 12 ڈویژن مری میں بطور GSO-1 Operation کا چارج لینا تھا۔ لیکن میں اپنی رجمنٹ کی کمانڈ چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ جنگ کا خطرہ ختم نہیں ہوا تھا۔ میں ابھی اسی سوچ میں تھا کہ مجھے ڈویژن ہیڈکوارٹرز سے پیغام موصول ہوا کہ وہ جی ایچ کیو سے میری تبدیلی کی منسوخی کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ جی ایچ کیو نے میجر جنرل ضیاء الحق کی عرضداشت سے معذرت کر لی۔ جی او سی نے ملٹری سیکرٹری کو جی ایچ کیو میں ایک مرتبہ پھر ذاتی پیغام ارسال کیا اور کہا کہ وہ اپنے اگلے دورہ میں جی ایچ کیو میں ذاتی طور پر اس کیس پر گفتگو کرنا چاہیں گے۔ جب جی او سی واپس لوٹے تو مجھے اطلاع دی گئی کہ ان کی عرضداشت قبول نہیں کی گئی۔ چند روز کے بعد مجھے اور احکامات موصول ہوئے جن سے میرے پچھلے تبدیلی کے احکامات منسوخ کر دیئے گئے۔ اب مجھے اٹھارویں ڈویژن میں بطور GSO-1 Operation تعینات کیا گیا۔ رجمنٹ کو چھوڑنا محال تھا جبکہ وہ ابھی میدان میں تھے۔ یہ آخری موقع تھا کہ میں اپنی رجمنٹ کی کمانڈ کرتا۔ میں افسردہ دل کے ساتھ اٹھارویں ڈویژن میں شمولیت کے لیے چل پڑا جو ابھی تک جنگی حالت میں تھا۔ یہ صحرا میں مقیم تھا اور اس کا ہیڈکوارٹر صادق آباد میں تھا۔

ریگستان میں ایک خوشگوار پڑاؤ

18 ڈویژن کے جی او سی نے صادق آباد جانے کے لیے میرے لیے سرکاری سواری کو ملتان بھیج دیا۔ میں اپنے لیے تیار کئے گئے خیمہ میں جلد رہائش پذیر ہو گیا۔ ہیڈکوارٹر میں جب میں نے ادھر ادھر دیکھا تو میرا پہلا تاثر افسوس ناک تھا۔ خیموں کو کھودے گئے گڑھوں کے اوپر صرف سایہ کے لیے لگایا گیا تھا۔ زمین نرم اور ریتلی تھی۔ دفتروں کے لیے بنائے گئے گڑھوں کی دیواروں سے

مسلسل مٹی گرتی تھی۔ جس سے اندرونی صورت بے حد گندی نظر آتی۔ چنانچہ میں نے کرسی اور میز کو درخت کے سایہ تلے بچھانے کا فیصلہ کیا۔ یہ میرا دفتر ہوگا۔ تاوقتیکہ رہائشی حالات کو جی او سی کے احکامات کے تحت بہتر نہ بنایا جائے۔

وزارت خزانہ کے ماہرین کے ساتھ کشمکش

افواج کے لیے ایک مسلسل مسئلہ بھارت کی جانب سرحد کی نگرانی تھی۔ کیونکہ اس سمت سے تیز ہوائیں پاؤڈر کی مانند ریت کو اڑاتی تھیں۔ ڈیوٹی پہ گارڈ کے فرائض سنبھالنے والے سپاہیوں کے لیے آنکھوں کو مسلسل کھلا رکھنا محال تھا۔ ہوا دس بجے کے قریب شروع ہو جاتی اور آہستہ آہستہ یہ ریت کے طوفان میں تبدیل ہو جاتی۔ اور بالآخر چار بجے شام تھم جاتی۔ جی او سی کی بڑی خواہش تھی کہ فوجیوں کو ہواؤں سے بچاؤ والے چشمے مہیا کئے جائیں۔ لیکن وزارت دفاع کا محکمہ مالیات اتفاق نہیں کرتا تھا۔ لہٰذا جی او سی نے انہیں اٹھارہ ڈویژن کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔ خزانہ کے کارندے آئے اور ان کے آرام کا ہر لحاظ سے انتظام کیا گیا۔ دن کے وقت ان کے لیے سرحد کے دورے کا بندوبست کیا گیا۔ ہوا شروع ہوئی اور اتنی تیز ہوئی کہ ہمارے مہمانوں کے لیے بھی آنکھیں کھلی رکھنا محال ہو گیا۔ سرحد پر انہیں جگہ جگہ حالات سے آگاہ کیا جاتا رہا۔ شام کو جب وہ واپس کیمپ پہنچے تو دھوپ والے چشمے ۱۸ ڈویژن کی ضرورت کے طور پر جاری کر دیئے گئے۔

بین الاقوامی سرحدوں کی بحالی

حکومتی سطح پر فوجوں کی واپسی اور بین الاقوامی سرحدوں کی بحالی کے عمل کو شروع کرنے کی ہدایت موصول ہو چکی تھیں۔ جنگ کے دوران بھارتیوں نے کچھ علاقہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اب انہیں اس کو خالی کرنا تھا۔ جنرل ہیڈ کوارٹرز نے احکامات دیئے کہ اس سلسلہ میں ہمارے مخالف بھارتی کمانڈر سے بات چیت کی جائے۔ اس کام کے لئے جی او سی نے بریگیڈیئر افتخار کو نامزد کیا اور مجھے ان کی امداد کے لیے مقرر کیا گیا۔

ہم نے بھارتی ٹیم سے ریگستان کے درمیان میں مسیت واری بھٹ جو سرحد پر واقع ہے، کے مقام پر ملاقات کی۔ بھارتی ٹیم دو افسران پر مشتمل تھی۔ جن میں سے ایک کرنل تھا جو ان کا لیڈر تھا۔ دونوں اطراف نے گفت وشنید کی اور افواج کی واپسی کے طریقے طے کئے۔ اجلاس کے خاتمہ سے قبل بریگیڈیئر افتخار نے تجویز پیش کی کہ ریگستان میں علاقہ کی مشکل صورت کے پیش نظر عین ممکن ہے کہ سپاہی غیر ارادی طور پر بین الاقوامی سرحد کو عبور کر لیں۔ ایسے بھٹکے ہوئے سپاہیوں کو

ان کی اصلی طرف کو واپس کرایا جائے اور یہ رعایت صرف پہلے اڑتالیس گھنٹوں پر محیط ہونی چاہیے۔ یہ ایک پختہ خیال تھا جس سے بھارتی ٹیم متفق نہ ہوئی۔ انہوں نے اپنے متعلق یقین کا اظہار کیا جس سے وہ بتلانا چاہتے تھے کہ اس علاقہ کے متعلق ان کا علم پورا پورا ہے۔ اور اس طرح بھارتی فوجی کا بھٹک کر پاکستان کی سمت کی طرف چلے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ایک عملی مسئلہ تھا اور افتخار درست انداز میں فکر مند تھا۔

قسمت کا کرشمہ دیکھئے کہ واپسی کے روز بھارتی فوجی سرحد پر ٹیلیفون کی تاریں لپیٹ رہے تھے کہ ان کا ایک ہرکارہ (ڈی آر) ۱۳۳ اے کے بٹالین کے علاقہ میں گھس آیا۔ جہاں جنرل عظمت بخش اعوان فوجوں کی واپسی کی تجاویز پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ ڈی آر سے تحقیق کی گئی۔ اور اس سے عمدہ سلوک کیا گیا۔ اسے کھانا کھلایا گیا بعد ازاں اس کی تلاشی لی گئی اور سوالات کئے گئے۔ اس سے بعض حساس قسم کے کاغذات برآمد ہوئے جن سے ناپید اطلاعات کو جوڑنے میں ہمیں مدد ملی۔ اور لڑائی کے مرکز کو دریافت کر لیا۔ فلیگ میٹنگ کے بعد ڈی آر کو واپس کر دیا گیا۔

فوجوں کی واپسی سے ایک رات قبل بارش ہوگئی۔ اور ریت بیٹھ گئی۔ اگلے روز بھارتی ان کے زیر تسلط علاقہ سے واپس ہونا شروع ہو گئے۔ انہوں نے اپنے دفاع کی صورت کو ختم نہ کیا۔ جس کے سبب ان کی پوری پوری دفاعی منصوبہ بندی ظاہر ہو گئی۔ خندقیں رم کی خالی بوتلوں سے بھری پڑی تھیں۔

جب علاقہ کو آمد و رفت کے لیے کھول دیا گیا۔ تو ایک شتر سوار بارودی سرنگ سے ٹکرا کر اڑ گیا۔ ہم نے بھارتی ٹیم سے بارودی سرنگوں والے علاقہ کے نقشہ کا تقاضا کیا تا کہ مزید حادثہ نہ ہو۔ لیکن بھارتیوں نے افتخار کو یقین دلایا کہ ان کے زیر تسلط علاقہ بارودی سرنگوں سے پاک کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد جی او سی نے بھارتیوں کے زیر تسلط علاقہ کو بارودی سرنگوں سے پاک کرنے کا حکم دیا۔ بٹالین کے ڈویژنل انجینئر نے یہ خدمت سر انجام دی اور بلاشبہ عمدگی سے کام کیا۔

جنرل اعوان بطور باپ

ہر چھ ہفتوں کے بعد ہم سب کی مانند جنرل اعوان اپنے خاندان کو ملنے کی خاطر کراچی جایا کرتے۔ ہر دفعہ کراچی رخصت ہونے سے قبل وہ اپنے بال کٹوایا کرتے۔ ایک دفعہ وہ کراچی چلے گئے۔ لیکن انہوں نے بال نہ کٹوائے۔ یہ معاملہ ہمارے لیے تذبذب کا باعث بن گیا۔ اور ہم اس تبدیلی کے اسباب جاننے کے لیے بے تاب ہو گئے۔ چند دنوں کے بعد وہ نہایت ہی سمارٹ

بالوں کے ساتھ فیلڈ کیمپ میں واپس آئے اور ہماری ملاقات آفیسرز میس میں رات کے کھانے پر ہوئی۔ آفیسرز میس میں جنرل اعوان کے ہمارے ساتھ بے حد دوستانہ مراسم تھے۔ کھانا لگنے کے وقفہ میں ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے کہ ہم میں سے ایک نے کہا کہ آپ پچھلی مرتبہ بال کٹوائے بغیر ہی کراچی تشریف لے گئے۔ وہ مسکرا دیئے اور جیسا کہ وہ مزاحیہ تو تھے ہی۔ انہوں نے کہا ''اس کا کوئی مقصد تھا'' انہوں نے مزید کہا کہ پچھلی مرتبہ جب وہ گھر گئے تو انہوں نے دیکھا کہ ان کا بیٹا اسد لمبے بال رکھے ہوئے ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ ان کا بیٹا عمر کے اس حصہ میں پہنچ چکا ہے کہ اسے بال کٹوانے کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ مسئلہ کا کوئی مناسب حل اگلی مرتبہ ڈھونڈھا جائے۔ بعد دوپہر جب تمام گھر والے چائے کے لیے لاؤنج میں بیٹھے تھے تو جنرل اعوان نے تجویز پیش کی '' اسد! تمہارا کیا خیال ہے۔ میں اور تم دونوں کو بال کٹوانے کی ضرورت ہے؟ میں کامیاب ہو گیا اور ہم دونوں حجام کی دکان پر گئے اور بال کٹوائے بیسویں صدی میں نوجوان بیٹے کے مسئلہ کو حل کرنے کا کیا نفیس طریقہ ہے۔

میدان جنگ میں زندگی بڑی پرکشش تھی۔ جنرل اعوان نے افواج کی جنگ کے لیے ان تھک تربیت کا اہتمام جاری رکھا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے بے شمار مشقوں کا انتظام کیا۔ جس میں مطالعہ کے پیریڈ شامل تھے۔ جہاں بھی فوجی ہوتے وہ اس جگہ کا دورہ کرتے۔ جنہیں پورے ریگستان میں پھیلا کر رکھا گیا تھا۔ انہوں نے افواج کی بہتری کے مسائل سے کبھی آنکھیں بند نہ کیں۔ انہوں نے پانی مہیا کرنے کی بے حد کوشش کی۔ قسمت نے ان کا ساتھ دیا اور ان کی کوششیں بارآور ثابت ہوئیں۔ اور میٹھے پانی کو دو جگہ سے نکال لیا گیا وہاں فوراً ٹیوب ویل نصب کر دیئے گئے۔ اور اس طرح ریگستان میں پانی کا مسئلہ حل ہو گیا۔

ایک سال اور چار ماہ کا یہ عرصہ یادگار تھا۔ جہاں ان افسران کے ساتھ وقت گزارا کرنل بشیر، لیفٹیننٹ کرنلز مسعود اور ضیاء، میجرز اظہر، نیامت اور رحمان اور بہت سے دیگر افسران جنہوں نے ساتھیوں کی طرح وقت گزارا۔ انہوں نے میدان جنگ میں ایک منجھے ہوئے سپاہی کی مانند اپنی پیشہ ورانہ مہارت کا مظاہرہ کیا۔ نیک نامی کا سہرا ان کے لیڈر کو پہنچتا ہے۔ جنرل ہر ایک کو مستعد رکھتے۔ لیکن کسی کو دباؤ تلے نہ رکھتے۔ اس اثنا میں ۱۹۷۳۔ ۱۹۷۴ کے لیے نیشنل ڈیفنس کالج میں آرمڈ فورسز وار کورس میں شمولیت کرنے والے نامزد افسران کی فہرست موصول ہوئی۔ جس میں میرا نام بھی شامل تھا۔

نیشنل ڈیفنس کالج

جب مجھے یہ اطلاع موصول ہوئی تو میرے لیے بہت بڑا دن تھا۔ مجھے کثیر تعداد میں ٹیلی فون آئے جن میں اس کورس کے لیے نامزدگی پر مبارک باد دی گئی تھی۔ کیونکہ مستقبل میں مزید ترقی کی خاطر فوج میں کیریئر سولجر کے لیے یہ بے حد ضروری ہے اس نامزدگی سے ظاہر ہوتا تھا کہ مستقبل میں ترقی کے لیے میری ملازمت کا ریکارڈ موافق ہے۔ آفیسر کی مستقبل میں ترقی کا انحصار کورس میں اس کے حاصل کردہ نتائج پر ہوتا ہے۔

مقررہ تاریخ پر میں ۱۸ ڈویژن کے ہیڈ کوارٹر سے راولپنڈی کے لیے روانہ ہوا۔ کورس کی نوعیت تحقیقی پراجیکٹ کی تھی۔ اسے آزادانہ مطالعہ کے لیے بنایا گیا تھا۔ جس کے بعد دیئے گئے موضوع کا تعارف کروانا ہوتا تھا۔ جس کا واسطہ فوجی تاریخ کے مختلف پہلوؤں اور ملک کے اندر موجود معاشی وسائل کے ساتھ تھا۔ مجھے اس کورس کا بڑا لطف آیا۔ اگرچہ کالج کی انتظامیہ نے ہمیں بے حد مصروف رکھا۔ کورس کے اختتام پر ہمیں پیپر پیش کرنا تھا جس میں ایک باب تھا ''پاکستان کی دفاعی قوت اپنے ہمسایوں افغانستان، ایران اور انڈیا سے تعلقات کی روشنی میں''

روزمرہ کے کاموں میں کبھی کبھی ایسے واقعات سے خلل پڑ جاتا ہے۔ جن کا سپاہی کی زندگی کے مزاحیہ پہلو سے تعلق ہوتا ہے۔ اس قسم کا دلچسپ واقعہ دوہری مشق کے دوران پیش آیا۔ جس کا عنوان تھا ''آخری معرکہ''۔ میں پاکستان آرمی سنڈیکیٹ کا حصہ تھا۔ انجینئر اِن چیف کی تقرری لیفٹیننٹ کرنل خورشید غیاث کو دی گئی۔ (جن کو پیار سے ''گائی'' کہتے تھے)۔

یہ اتوار کا روز تھا اور ہمارے کمانڈنٹ میجر جنرل نصیر احمد چوہدری ایبٹ آباد ''پفر'' کی کانفرنس (پنجاب اریگولر فرنٹیر فورس) میں شمولیت کی غرض سے چلے گئے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ واپسی کے بعد وہ ہمارے پاس نقشہ کی مشق کے کمرہ میں نہیں آئیں گے۔ لیکن انہوں نے قبل دوپہر دورہ کر کے ہمیں حیران کر دیا۔

بعض وجوہات کے پیش نظر انہوں نے ایبٹ آباد سے سیدھے نیشنل ڈیفنس کالج راولپنڈی تشریف لانے کا فیصلہ کیا۔ تاکہ اس مشق کا جائزہ لیا جا سکے۔ یہ مشق تقریباً دو ہفتے جاری رہی جس میں سٹاف کا کام بہتات سے ہوا چنانچہ جس روز وہ پہنچے ہم قدرے تھکے ماندے تھے۔ کمانڈنٹ نے اپنی آمد کے فوراً بعد پاکستان آرمی وار روم میں کمانڈر ان چیف (C-In-C) کو منصوبہ بندی کی وضاحت کے لیے کہا۔ سی ان سی نے نقشہ کی مدد سے منصوبہ کی وضاحت کی۔ جب اس نے انجینئر کے منصوبہ کی وضاحت شروع کی تو کمانڈنٹ نے کہا انجینئر ان چیف بذات خود اپنے منصوبہ کی

وضاحت کریں۔ ہم لیفٹیننٹ کرنل خورشید غیاث کو ڈھونڈنے لگے۔ لیکن اس کا کہیں پتہ نہیں چلا۔ اچانک ہم نے سروس بوٹ کا جوڑا میز کے نیچے دیکھ لیا۔ قریب ہی لیفٹیننٹ کرنل خورشید غیاث گہری نیند میں پائے گئے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ کمرۂ جنگ میں کیا ہو رہا ہے۔ لیفٹیننٹ کرنل خورشید غیاث کسی وقت بھی سو سکتے تھے۔ وہ کہیں بھی اور جب بھی چاہتے سو سکتے تھے۔ ان کو جگایا گیا۔ انہوں نے معذرت کا اظہار کیا اور بغیر کسی توقف کے پاکستانی فوج کے انجینئرنگ ان چیف کی تجویز کی وضاحت شروع کر دی۔

چین کا دورہ

جب کورس ختم ہونے کے قریب تھا ہمیں بیرونی ممالک میں لے جانے کے لیے پروگرام بنایا گیا۔ تاکہ ہم دوسری افواج کو دیکھ سکیں۔ میں اس سنڈیکیٹ کا رکن تھا جو اے ایف ڈبلیو سی اور این ڈی سی کے طلباء پر مشتمل تھا۔ ہمیں چین کا دورہ کرنا تھا۔

اکتوبر 1962ء کی بھارت چین جنگ کے اسباب کا میں بغور مطالعہ کرتا رہا تھا۔ بجلی کی سرعت کے ساتھ چینی افواج نے ہمالیہ کے پہاڑوں میں بھارتی دفاع کو تہس نہس کر دیا تھا۔ اس وقت سے لے کر اب تک میں اس عظیم قوم کو دیکھنا چاہتا تھا۔ جس نے ایسے بہادر فوجیوں کو پیدا کیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میری خواہش صرف خواب تک ہی رہ جائے گی اور جس کے پورا ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ لیکن اب وہ خواب ایک حقیقت تھا۔

میں اپنے گروپ کے ہمراہ اپریل ۱۹۷۴ء میں پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز پر بیجنگ کے لیے روانہ ہو گیا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ میں اب خود ملاحظہ کروں گا کہ چینیوں نے کس طرح اپنے آپ کو ناقابل تسخیر لڑاکا قوت میں منظم کیا۔ ہمارے دورہ کے دوران ہمیں لباس کی ایک فیکٹری دکھانے کے لیے لے جایا گیا۔ ہم ابھی فیکٹری دیکھ رہے تھے کہ سائرن بجنا شروع ہو گئے۔ اچانک تمام مزدور اس عمارت سے باہر نکل آئے ہمیں بھی باہر نکلنے کے لیے کہا گیا۔ جہاں ہمارے لیے چند کرسیاں بچھائی گئی تھیں۔ اب دیکھنا یقین کرنے کے برابر تھا۔ وہی مزدور جن میں مرد اور خواتین دونوں شامل تھے اور جو ابھی ابھی کپڑا سینے کی مشینیں چلا رہے تھے وہ وردی میں نمودار ہو گئے۔ اور اپنی 35 ایم ایم طیارہ شکن توپوں کو چلانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اب وہ فیکٹری پر کسی ممکنہ حملہ سے بچاؤ کر رہے تھے۔

پیدل اور بکتر بند یونٹوں کا دورہ کرنے کے علاوہ ہم نے فائرنگ رینج پر ان کا نشانہ بازی میں

مہارت کا مظاہرہ دیکھا۔ چٹانوں کے اندر ہم نے ان کے بکتر بند ڈویژن کو غاروں کے ایک وسیع جال کے اندر ایٹمی حملہ سے بچاؤ کی خاطر چھپا ہوا پایا۔ ان غاروں کے اندر رہائشی اور مرمت کے انتظامات پورے ڈویژن کے لیے بنائے گئے تھے۔ لوہے کے دروازوں کے سوا باہر سے کوئی اور شے نظر نہیں آ رہی تھی۔ ان پر ماحول کے مطابق پینٹ کر دیا گیا تھا۔ سکیورٹی سخت تھی۔ غاریں کشادہ تھیں اور ان کے اندر تمام ٹینک آسانی سے آ سکتے تھے۔ ٹینک چلانے والوں کے لیے سونے کا بندوبست اور دیگر تمام انتظامی اور مرمت کی سہولیات کا بندوبست کیا گیا تھا۔ روشنی کا انتظام عمدہ تھا۔ یہ کسی بھی ایٹمی حملہ کا مقابلہ کرنے کی خاطر انتظامات کئے گئے تھے۔ ہمیں ایک پیدل ڈویژن بھی دکھایا گیا جس کی خوراک کی تمام ضروریات کا انتظام اپنی مدد آپ کے تحت غلہ اور گوشت پیدا کر کے کیا جاتا تھا۔

ایک کمیون کا دورہ بے حد فکر انگیز تھا۔ ہر خام شے ریاست کی طرف سے پیدا کی جاتی۔ لوگ سیاسی رہنماؤں کی ہدایات کے مطابق عمل کرتے۔ ہر شے ریاست کی ملکیت تھی۔ اور لوگوں کو زندگی گزارنے کے لیے کم از کم معاوضہ دیا جاتا۔ ہمیں خاندانوں کی رہائش دکھلائی گئی۔ یہ دو چھوٹے کمروں، سونے کا کمرہ اور ایک سیاسیات کا مطالعہ کرنے والا نیز ایک کچن پر مشتمل تھی۔ ہر کمرہ میں کم روشنی والا صرف ایک ہی بلب لگانے کی اجازت دی گئی تھی۔ آبادی کو بڑھنے سے روکنے کے لیے ہر خاوند اور بیوی کو الگ الگ شہروں میں رہنا پڑتا۔ اور وہ جدا جدا کیمپوں میں کام کرتے۔ آمدورفت کے تمام ذرائع سوائے ذاتی بائیسکل کے ریاست کی ملکیت تھے۔

غیر ملکیوں کی خرید کے لیے فرینڈ شپ سٹورز بنائے گئے تھے۔ کوئی بھی چینی یہاں سے کوئی بھی شے نہیں خرید سکتا تھا۔ اسی طرح کوئی غیر ملکی نجی منڈیوں سے کوئی شے نہیں خرید سکتا تھا۔ جب کبھی ہم باہر نکلتے تو اپنے رہنما کے ساتھ باہر جاتے۔ ہم کسی جگہ اکیلے نہیں جا سکتے تھے۔ فرینڈ شپ سٹور کے اندر کام کرنے والا عملہ کافی حد تک رواں انگریزی زبان میں بات چیت کر لیتا۔ لیکن سٹور سے باہر اگر ان سے ملاقات ہو جاتی تو نہ تو وہ ہمیں پہچانتے اور نہ ہی چینی زبان کے علاوہ ہم سے بات چیت کرتے ہوٹل والا سٹاف بھی اسی حکمت عملی پر چلتا۔ وہ ہوٹل میں مسکرا کر ملتے مگر باہر نہیں۔

1982ء میں دوسری مرتبہ میں چین گیا۔ میرے دو دوروں کے درمیان آٹھ سال کے عرصہ میں یہ بند معاشرہ کھل گیا تھا۔ کثیر تعداد میں غیر ملکیوں کو آزادانہ طور پر ادھر ادھر گھومتے پھرتے دیکھا جا سکتا تھا۔ ٹریفک کے جمگھٹے اب ایک نئی چیز تھی۔ اب چینی شہری ہیڈ فون پہنے نظر آئے۔ اور کیسٹ پلیئر کمر میں باندھے کچھ سنتے نظر آئے باب ۱۶ میں چین کے متعلق میں نے مزید تفصیلات

لکھی ہیں۔

کورس کے اختتام پر ہم نے اپنا فائنل پیپر پاکستانی فوج کی کمان کے سامنے پیش کیا۔ اب پھر سے نئی تعیناتی کا وقت آن پہنچا تھا۔ میری ۱۵ انفنٹری ڈویژن میں کرنل سٹاف کے طور پر سیالکوٹ میں تقرری ہوگئی۔ میری ترقی اور تعیناتی سے ظاہر ہوگیا کہ کورس میں میری کارکردگی بہت اچھی رہی تھی۔

ستاروں کی تلاش

میجر جنرل کمال متین پندرہ انفینٹری ڈویژن کے جی او سی تھے۔بطور کرنل سٹاف میرا کام ڈویژن کے اندر تمام سٹاف کام کو منظم کرنا اور جی او سی کے احکامات کے لیے جائزہ لینا تھا۔علاوہ ازیں تربیت عمل اور ڈویژن کی انتظامیہ کے لیے جی او سی کو امداد فراہم کرنا تھا۔ڈویژن میں بطور کرنل سٹاف میں نے جی او سی کے ساتھ اپنے کام کو بے حد پرلطف پایا۔ہیڈ کوارٹرز میں میرے ساتھ کام کرنے والے تمام ساتھیوں کو اپنے اپنے میدان میں بے حد کامیاب اور کاموں کے لیے وقف پایا۔تمام بریگیڈ کمانڈرز اعلیٰ پیشہ ور سپاہی تھے۔نیز وہ افراد کے عمدہ رہنما تھے۔میرے لیے یہ قیام یادگار ہے اور میں اپنی اس تعیناتی کی یادداشتوں کو اپنے ذہن میں تازہ پاتا ہوں۔اس عرصہ میں بہت سی وار گیمز کا انعقاد کیا گیا۔اس کے ساتھ افواج کی مشقیں شامل تھیں۔یہ مشقیں کور ہیڈ کوارٹرز کے ساتھ مل کر تجویز کی گئیں یا ہم نے بریگیڈوں کے ساتھ مل کر تیار کیں۔ہر صورت میں بے حد تحقیق سے کام لیا گیا۔تاکہ میدان جنگ میں زیادہ سے زیادہ مہارت حاصل ہو سکے۔تربیت میں جارحانہ اور دفاعی اعمال پر توجہ دی گئی۔جی او سی محنت پسند فرد تھے اور اپنی زیر کمانڈ ہر شخص کو ہر وقت چاک و چوبند دیکھنا پسند کرتے تھے۔

جنرل آفیسر کمانڈنگ کی ناگواری

جنرل آفیسر کمانڈنگ لڑائی کی تدبیر کرتا ہے اپنے فوجیوں کی تربیت اور بطور لیڈر عملی اقدام کے ذریعے اپنی کمان میں جوش پیدا کرتا ہے۔اگر جنرل ہیڈ کوارٹر دستگیری کرے تو مطلوبہ اثر بوقت ضرورت حاصل کیا جا سکتا ہے۔اگر پرنسپل سٹاف آفیسر (پی ایس او) فیلڈ کمانڈر سے زیادہ طاقتور ہو جائے تو پھر جی او سی میں ایک ادارہ کی صورت میں کٹاؤ ظاہر ہونا شروع ہو جاتا ہے۔کرنل سٹاف کی حیثیت سے روزمرہ کے کام نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں جنرل متین کی جوشیلی لیڈر شپ

کی خوبیوں کا اندازہ کر سکا۔ ان میں دن اور رات اپنی کمانڈ کو تربیت دینے کی اہلیت تھی۔ اور انہیں تیاری کی بلند ترین سطح تک لے جانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ لیکن جب ملٹری سیکرٹری (ایم ایس) برانچ سے واسطہ پڑا تو وہ بے بس نظر آئے۔ چنانچہ ایک کیپٹن کی ۱۵ ڈویژن میں تعیناتی کے مسئلہ نے راز کھول دیا۔

فیلڈ انٹیلی جنس یونٹ (ایف آئی یو) ۱۵ ڈویژن کو ایک کیپٹن کی ضرورت تھی۔ کام کی زیادتی کے باعث صرف ایک ہی آفیسر میجر اعجاز کے لئے کام کو نپٹانا مشکل تھا۔ چنانچہ جی او سی میجر جنرل متین نے ایک ڈیمی آفیشل چھٹی کے ذریعے ملٹری سیکرٹری (ایم ایس) میجر جنرل چشتی سے سفارش کی کہ ایف آئی یو کے لیے موجودہ خالی جگہ پر کیپٹن کی تعیناتی کی جائے۔ فوری جواب موصول ہوا۔ جس پر ایم ایس برانچ کے جونیئر آفیسر نے دستخط کئے تھے اور جس میں کہا گیا تھا کہ مناسب آفیسر دستیاب نہیں ہے۔ چند ہفتوں کے بعد ایم ایس برانچ نے ۱۵ ڈویژن کے ہیڈکوارٹر کے لیے انٹیلی جنس برانچ میں کیپٹن کی تعیناتی کر دی۔ جی او سی نے دوبارہ ایم ایس کو لکھا اور سفارش کی کہ اس آفیسر کو ایف آئی یو میں مقرر کیا جائے۔ کیونکہ ۱۵ ڈویژن ہیڈکوارٹر کی انٹیلی جنس برانچ میں کام کا حجم موجودہ سٹاف کے لیے قابل انتظام ہے۔ ایم ایس برانچ نے دوبارہ معذرت کر دی اور لکھا ''ملازمت کی وجوہات کے باعث مذکورہ آفیسر کو تعینات نہیں کیا جا سکتا'' جب جی او سی نے یہ چٹھی پڑھی تو وہ مسکرا دیئے۔ ان کی مسکراہٹ بڑی اہم تھی۔ وقت گزرتا گیا اور میں نے جی او سی کے اختیار کو تیزی سے گھٹتے دیکھا۔ بعدازاں یہ بات ظاہر ہوگئی۔ جب جی ایچ کیو نے ایم ایس برانچ میں مشاورتی سیل متعارف کروایا۔ جس سے کوئی بھی آفیسر بالواسطہ جی ایچ کیو سے اپنی ملازمت کے مستقبل کے متعلق مشورہ کر سکتا تھا۔ اور اس طرح کمانڈ کے طریقہ پر عمل خطرے میں پڑ گیا۔ اور اس طرح افسران نے جی ایچ کیو کی طرف اپنی مشکلات کا ازالہ کروانے کے لیے دیکھنا شروع کر دیا۔ تبدیلی اور تعیناتی کے مسائل میں قانونی کمانڈ چینل کو ترک کر دیا گیا۔ اس طرح فیلڈ کمانڈر کے مقابلے میں سٹاف کی مضبوطی کے بیج بو دیئے گئے۔ مجھے تقریباً ایک سال بعد ترقی دے دی گئی۔ اور انفنٹری بریگیڈ کی کمان کے لیے میرا تقرر کر دیا گیا۔

البدر بریگیڈ کی کمان

15 ڈویژن کے زیرنگرانی مجھے ۱۱۳ انفنٹری بریگیڈ کو تیار کرنا تھا۔ بریگیڈ ہیڈکوارٹرز کے لئے جگہ اور تین انفنٹری یونٹس جو کم تعداد پر مبنی تھیں ۱۵ ڈویژن کی جانب سے مجھے مہیا کی گئیں۔ میری

خوش بختی تھی کہ مجھے لیفٹیننٹ کرنلز مسعود، اجمل اور عزیز خٹک جیسے کمانڈنگ آفیسرز ملے جنہوں نے اپنی انتھک کوششوں سے متعلقہ بٹالینوں کو مکمل طاقت بنا دیا۔ بریگیڈ کو نام ''البدر'' اس لئے دیا گیا تاکہ ہمیں اسلام کی وہ لڑائی ہر دم یاد رہے جو 624AD میں مدینہ کے قریب بدر کے مقام پر لڑی گئی جس میں صرف ۳۱۳ مسلمانوں نے اللہ کے دشمنوں کو جو تعداد میں کہیں زیادہ تھے اور ہتھیار میں بہتر تھے، شکست دی۔

بریگیڈ تیار ہو جانے کے بعد ہم نے جنگ کے لیے بریگیڈ کی تربیت پر توجہ دی۔ ٹرانسپورٹ اور ہتھیاروں کی بے حد کمی تھی جو میرے بریگیڈ سٹاف افسران نے ہر طریقہ استعمال کر کے پورا کرنے کی کوشش کی۔ جب بریگیڈ مکمل طور پر تیار ہو گیا تو ہمیں ۳۷ انفنٹری ڈویژن کے ماتحت جو گوجرانوالہ میں مقیم تھا کر دیا گیا۔ میجر جنرل شفیق احمد جو کہ انجینئر کور سے تعلق رکھتے تھے، فوج میں بہترین کمانڈر پہچانے جاتے تھے اب میرے نئے جی۔او۔سی تھے انہوں نے سگنل مشقیں کروائیں۔ تاکہ مختلف سطحوں پر تجویز اور ابلاغ دہی میں تجربہ حاصل ہو جائے۔

عراق میں تقرری کے لیے انتخاب

ایک روز جب مجھے عراق میں دو سال کے لیے تقرری کی خاطر تیاری کرنے کی ہدایت کی گئی تو میں بے حد مسرور تھا۔ اس تقرری سے قبل پیش خیمہ کے طور پر مجھے راولپنڈی میں جا کر چند ہفتوں کے لیے عربی زبان کے کورس میں حاضر ہونے کی ہدایت کی گئی۔ کورس کے دوران میں اور دوسرے منتخب افسران نے عراق کے دورہ کے لیے اپنے آپ کو تیار کیا۔ کورس کی تکمیل کے بعد ہم اپنی ڈیوٹی والی جگہوں پر لوٹ گئے۔ ہمیں ہدایت ملی کہ ہم اگلے حکم کا انتظار کریں۔ بہرحال اس سے پیشتر کہ ہم میں سے کوئی آفیسر سفر پر جاتا، حکومت عراق نے پاکستان سے افسروں کے لیے استدعا منسوخ کر دی۔ اس خبر سے میری بے حد دل شکنی ہوئی۔ میں مستقبل میں معقول مالی منفعت سے متعلق سوچ رہا تھا۔ تاکہ اپنے خاندان کے ہمراہ دنیا کے چند ترقی یافتہ ممالک کا سفر اختیار کیا جا سکے۔ میرے خوابوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ بہت سے لوگوں نے ہم سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ لیکن کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ میری بیگم نے باندھا ہوا سامان پھر سے کھول دیا۔ اور ایک مرتبہ پھر ہم اپنے روزمرہ کے کام میں مصروف ہو گئے۔

اگرچہ عراق جانے کے لیے میں نے اپنے خاندان کے ہمراہ تمام تیاریاں کر رکھی تھیں۔ لیکن میں نے اپنے ذاتی سامان کو فروخت نہ کیا۔ منتخب شدہ افسران میں سے ایک بریگیڈیئر نے تمام پر بازی

لے کر کچھ مزید اقدامات کر ڈالے۔ اس نے گھر کا سامان جس میں اس کی ذاتی کار بھی شامل تھی، کم قیمت پر بیچ ڈالا۔ اسے یقین تھا کہ عراق سے واپسی پر اس کے پاس کافی روپیہ پیسہ ہوگا۔ جس سے اپنی ضروریات خرید سکے گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ بغیر کار وہ اپنی سرکاری رہائش گاہ میں اپنے خاندان کے ساتھ مقیم تھا۔ حکومت عراق کی جانب سے پاکستان سے افسران بھیجنے کا انکار ہو چکا تھا۔ اب ہر افسر بہت مشکل میں تھا۔ فوج اس کی مالی مشکلات کا ازالہ نہیں کر سکتی تھی۔ گھر کا ساز و سامان فروخت کر کے حاصل شدہ روپیہ پیسہ سے بھی کار نہیں خریدی جا سکتی تھی۔ ہم سب صرف ہمدردی کا اظہار ہی کر سکتے تھے۔ بعد ازاں چند ایام گزرنے کے بعد میں نے سنا کہ مذکورہ بریگیڈیئر کو بیرون ملک میں تعینات کر دیا گیا۔ جیسا کہ ہم نے سنا وہی بریگیڈیئر ایک فوجی تقریب میں موجود تھا جس میں چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیاء الحق بھی آئے تھے، وہ جنرل کے سامنے گئے۔ اور اپنی مالی مشکلات کو بیان کیا اور جس میں اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ وہ وہاں سے اس وقت تک نہ ہٹا جب تک کہ جنرل نے بیرونی تقرری کا وعدہ نہ کر لیا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اسے اچھا معاوضہ مل گیا۔

دریں اثنا فوج میں نئی تبدیلیاں لائی گئیں۔ اخراجات کو کم کرنے کے لئے کچھ یونٹس کو Suspended Animation میں رکھ دیا گیا اور مجھے ٹرانسفر آرڈر موصول ہوئے جس میں کہا گیا تھا کہ مجھے بطور ڈائریکٹر پرسنل سروسز اور پرووسٹ مارشل ہیڈ کوارٹر راولپنڈی رپورٹ کرنا تھا۔

ڈائریکٹر پرسنل سروسز اور پرووسٹ مارشل

جنرل ہیڈ کوارٹر میں میری دو سال تک تعیناتی کا عرصہ بے حد مصروف اور تیزی سے بھرپور تھا۔ اس میں مختلف نوعیت کی مصروفیات تھیں جو ایک ہی دفعہ وقوع پذیر ہوئیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ جنرل ضیاء الحق نے تھوڑا ہی عرصہ قبل چیف آف دی آرمی سٹاف کی ذمہ داریاں سنبھالی تھیں اور وہ مختلف پراجیکٹوں پر تھوڑے ہی عرصہ میں فیصلہ اور عمل کے متمنی تھے۔ میں بالواسطہ طور پر پراجیکٹوں میں شامل تھا۔ میں ان میں سے چند ایک کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں:

فوج میں نظم و ضبط میری اہم ذمہ داری تھی۔ اس حکمت عملی کا اظہار پرسنل سروسز ڈائریکٹوریٹ نے ایڈ جوٹنٹ جنرل (اے جی) اور چیف آف دی آرمی سٹاف (سی او اے ایس) کی مناسب منظوری سے جاری کیا تھا۔ لیکن کمانڈرز کو اس پر عمل کروانے کا ذمہ دار بنایا گیا تھا۔ بعض اوقات فوج میں نظم و ضبط کی صورت حال بے حد قابل افسوس تھی۔ لیکن اکثر حالات میں صورت حال تسلی بخش تھی جب فوج میں اضافہ ہوتا ہے تو نظم و ضبط میں خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس موقع پر

ایسی صورت حال پیدا نہ ہوئی۔ کیونکہ کمانڈروں نے مناسب اقدامات کئے۔ جس کے نتیجہ کے طور پر نظم و ضبط کی صورت حال تسلی بخش رہی۔

میجر جنرل محمد ریاض خان ایڈ جوٹنٹ جنرل تھے جو بلا شبہ ایک قابل آفیسر تھے۔ بیشک وہ نظم و ضبط کو چاہنے والے تھے۔ لیکن وہ انسانی جذبوں کی بھی قدر کرتے تھے۔ ایڈ جوٹنٹ جنرل کی حیثیت میں وہ چاہتے تھے کہ تمام ڈائریکٹر کسی بھی کیس کو ان تک بھجواتے ہوئے مکمل ریکارڈ کو ارسال کریں۔ جس کے ساتھ کیس شروع کرنے والے کی تمہید شامل ہو۔ ایسا کرنے سے ان کا مقصد ہر سطح پر سٹاف افسران کے ذہنوں کا مطالعہ کرنا تھا۔ اور ساتھ ہی یہ کہ وہ کیس کے فیصلہ میں انصاف کر سکیں۔ میں ان کی سوچ سے اتفاق نہیں کرتا تھا۔ میں صرف کیسوں پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا۔ اور وہ باتیں نہ بھیجتا جنہیں شروع کرنے والے سیکشن اور سٹاف افسران کے ایک طویل سلسلے نے کیس کے متعلق تحریر کیا تھا۔

ایک مرتبہ ڈائریکٹروں کی کانفرنس میں جنرل ریاض نے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا کہ کیسوں کے بھجوانے کے سلسلہ میں ان کی ہدایات پر عمل نہیں کیا جاتا۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر واضح طور پر اپنے احکامات کو دہرایا۔ میں نے اس وقت اپنے اندازِ فکر کو درست ثابت کرنے کے لیے وقت کو موزوں نہ سمجھا۔ چنانچہ میں نے کانفرنس کے بعد ان سے ملاقات کا وقت مانگا۔ کانفرنس کے بعد میں جلد ہی ان کے دفتر میں گیا۔ اور میں نے وضاحت کی کہ میں کس لیے عام فائلیں جن پر ماتحت عملہ کی سفارشات ہوتی ہیں، ان کو نہیں بھیجتا۔ میں نے انہیں بتلایا کہ بعض اوقات میں اپنے سٹاف افسران کے متعلق بڑے سخت قسم کے نوٹ تحریر کرتا ہوں جو صرف میرے کہنے کے لیے ہوتے ہیں اور کسی دوسرے پر ان کو افشا نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے انہیں بتلایا کہ بعض اوقات ڈرافٹ بڑا بھدا ہوتا ہے۔ اس میں ہجوں کی غلطیاں ہوتی ہیں۔ اور کیس کی نوعیت بھی مصنوعی نظر آتی ہے۔ حوالہ جات میں مناسبت نہیں ہوتی۔ میں نے انہیں بتلایا کہ اگر وہ میرے تحریر کردہ ریمارکس کو بطور اے جی پڑھیں گے تو وہ اس آفیسر کی کارکردگی کے متعلق تاثر ضرور قائم کریں گے جس سے آفیسر کی سالانہ خفیہ رپورٹ پر اثر پڑ سکتا ہے۔ میں نے انہیں بتلایا کہ یہ میرا فرض ہے کہ میں اپنے سٹاف کی تربیت کروں چنانچہ سال کے اختتام پر میں ان کی قابلیت کو پرکھنے کے لیے موزوں شخص ہوں گا۔ جنرل نے از راہِ نوازش میرے ساتھ اتفاق کیا۔ اور آئندہ میرے کام کرنے کے انداز کو تبدیل کرنے کے لیے کبھی نہ کہا۔

وردی کی تبدیلی

ملٹری یونیفارموں کا اسٹائل ڈی پی ایس اور پی ایم کے لیے حکمت عملی کی سطح پر طے کرنے کے لیے ایک اور موضوع تھا۔ فوج کے پاس عام اور رسمی مواقع کے لیے ایک ہی یونیفارم تھا جسے عام طور پر کیموفلاج یونیفارم کہتے تھے۔ اس کے دو حصے تھے بوشرٹ کو جالی دار کپڑے میں بنایا جاتا اور بعد ازاں کیموفلاج رنگوں میں ڈبویا جاتا اور پتلون کو خاکی ڈرل سے بنایا جاتا۔ میڈل کراس بیلٹ اور پیک کیمپ پہن کر یہ رسمی لباس بن جاتا۔ اس لباس میں کوئی خامی نہیں تھی سوائے اس کے کہ بوشرٹ کو بار بار دھونے کے باعث اس کا رنگ پھیکا ہو جاتا جو فوجی پریڈ کرتے وقت بھدے نظر آتے۔ یہ ان کی یونیفارم میں رنگوں کے تفاوت کے باعث ہوتا تھا۔ جن کوئی یونیفارم ملتی ان کی یونیفارم کے رنگ چمکدار ہوتے۔ اور بار بار دھلنے والے یونیفارموں کے رنگ پھیکے پھیکے ہوتے۔ نیز پرانی یونیفارم ریگستانی علاقوں کے لیے مناسب تھی۔ کیونکہ وہ ماحول سے مناسبت رکھتی تھی۔ بہرحال ہریالی والے علاقہ کے ساتھ یہ مناسب نہ تھی۔ لہٰذا سی او اے ایس نے خاکی یونیفارم پھر سے اپنانے کا حکم دیا۔ میجر جنرل اسلام اللہ خان ڈائریکٹر انسپکٹریٹ آف ٹیکنیکل ڈویلپمنٹ (ڈی آئی ٹی ڈی) اور مجھے یہ کام بطور پراجیکٹ تفویض کیا گیا۔ کپڑے اور یونیفارموں کو سی او اے ایس سے منظور کروانا تھا۔ اور پھر آئندہ فارمیشن کمانڈروں کی کانفرنس میں فارمیشن کمانڈروں کے سامنے اس کا مظاہرہ کرانا تھا۔

وقت کم اور کام بہت زیادہ تھا۔ مشہور اسماعیل اینڈ سنز آرمی ٹیلرز کے مالک مسٹر ابراہیم نے اتفاق کرلیا کہ وہ نمونہ کے یونیفارم تیار کروائیں گے۔ کپڑا ڈی آئی ٹی ڈی سے حاصل کیا جائے گا۔ جنرل اسلام اللہ ٹیکسٹائل فیکٹریوں کو رضامند کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ مختلف النوع کپڑے تیار کریں گے۔ جن سے یونیفارم بنائی جائے گی۔ مسٹر ابراہیم مشہور اسماعیل اینڈ سنز کے مالک تھے نے نمونے کی کئی یونیفارم بنانے میں تیزی سے کام کیا۔ یہ نہ صرف فوجیوں کے لیے تھیں۔ بلکہ لیڈی ڈاکٹر اور آرمڈ فورسز نرسنگ کور کے لیے بھی تھیں۔ نمونوں کو بالآخر فارمیشن کمانڈروں نے منظور کر لیا۔ بظاہر یہ معاملہ سادہ نظر آیا۔ لیکن جنرل اسلام اللہ کے لیے یہ کام بہت بڑا تھا۔ آخر کار فوج میں خاکی کو نارمل لباس مان لیا گیا۔ اور کیموفلاج کو آہستہ آہستہ فوجی وردی سے نکال دیا گیا۔

ایک بادشاہ کے لیے فوجی دستے کی سلامی

سعودی عرب کے شاہ خالد نے پاکستان میں سرکاری دورہ پر تشریف لانا تھا۔ وزیراعظم

ذوالفقار علی بھٹو نے سی او اے ایس کو ہدایات دیں کہ شاہ کو ان کے شایانِ شان انٹر سروسز گارڈ آف آنر راولپنڈی میں آمد اور کراچی سے روانگی پر پیش کیا جائے۔ اس میں زمینی، ہوائی اور بحری افواج پر مشتمل برابر کے تین دستے ہوں۔ بطور ڈی پی ایس اور پی ایم تمام انتظامات دیکھنے کے لیے مجھے کہا گیا۔ اگر چہ فوجی تقریب کے تمام انتظامات میرے زیر نگرانی تھے۔ مختلف فارمیشنوں کو حکمتِ عملی کی ہدایات جاری کرنے کے بعد میرا کام ختم ہو گیا لیکن عملی اقدام پر عمل جاری رہا۔ اس کیس میں افراد کا انتخاب اور فوجی دستے کو لباس بالواسطہ میری ذمہ داری قرار دی گئی۔

راولپنڈی میں چار انفنٹری رجمنٹوں پر مشتمل انفینٹری بریگیڈ مقیم تھا ان میں سے دو رسمی فرائض کے لیے مختص تھیں۔ اور ان کو گارڈ رجمنٹیں کہا جاتا تھا۔ سکیورٹی فرائض میں صدر مملکت اور وزیر اعظم کی رہائش گاہوں پر گارڈ کے فرائض اور رسمی فرائض شامل تھے۔ جن میں گارڈ آف آنر بھی شامل تھی ان رجمنٹوں کو جی ایچ کیو سے منظوری لے کر کسی دوسری جگہ استعمال کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا مجھے گارڈ رجمنٹوں تک میں انتخاب کے لیے اپنے آپ کو محدود رکھنا پڑا۔ لیکن گارڈ آف آنر کے لئے مجھے ایسے سپاہیوں کی ضرورت تھی جن کا قد کم از کم چھ فٹ بلند ہو۔

سی او اے ایس نے خواہش کا اظہار کیا کہ فوج کا دستہ گنتی میں دوگنا ہونا چاہیے۔ یہ معمول کی گنتی سے ہٹ کر تھا۔ لیکن اس پر عمل کرنا تھا۔ میں نے اے جی سے اس معاملہ پر تبادلہ خیال کیا کہ مجھے مطلوبہ افراد میسر نہیں آ رہے۔ اور تجویز پیش کی کہ کور کمانڈرز حتمی انتخاب کے لیے ہر فارمیشن سے چند افراد کو نامزد کریں۔ اس پر اتفاق کیا گیا۔ لہٰذا ہر کور کو بذریعہ سگنل پیغام ارسال کیا گیا۔ نتیجہ اچھا نہ تھا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ لہٰذا سی او اے ایس نے تمام کور کمانڈروں کو تحریری ہدایت روانہ کی کہ بریگیڈیئر راحت لطیف کوروں کا دورہ کریں گے اور ایسے افراد کا چناؤ کریں گے جو گارڈ رجمنٹ کے ساتھ منسلک رہیں گے جب تک شاہ خالد ملک سے روانہ نہ ہو جائیں۔ ماہ رمضان میں میں نے دورہ کیا اور مطلوبہ تعداد کا انتخاب کیا۔ دریں اثنا بہت سے یونیفارم جن میں سر کے لیے ٹوپیاں شامل تھیں سی او اے ایس کو پیش کی گئیں۔ جس میں سے ایک سٹائل کو پسند کر لیا گیا۔ آخر کار شاہ خالد کی آمد پر راولپنڈی اور روانگی پر کراچی میں گارڈ آف آنر پیش کیا گیا۔ گارڈ آف آنر کی ترکیب عام اور مروجہ طریقے سے جدا تھی۔ لیکن سی او اے ایس اور وزیر اعظم کی خواہش کے عین مطابق تھی۔ گارڈ آف آنر بڑی عمدگی سے پیش کیا گیا اور اس کی تعریف کی گئی۔

بذریعہ سڑک فوج کا حج دستہ

حج ہر سال مسلمانوں کے لیے مکہ میں حرم کعبہ کی زیارت کا نام ہے۔ سی او اے ایس نے حج

کے لیے ایک فوجی دستہ براستہ سڑک سعودی عرب بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ایڈ جوٹنٹ جنرل کے توسط سے اس کام کی تیاری مجھے سونپی گئی۔ دستہ کی روانگی سے قبل بہت سی تیاریاں لازم تھیں۔ اس دستہ کو متعدد بیرونی ممالک سے گزرنا نیز ویزا اور رہائش کے مسائل کو راستہ میں حل کرنا تھا۔ مناسب سواری اور انتظامی امداد کے علاوہ طبی سہولیات کا بندوبست بھی کرنا تھا۔ دستہ کو سعودی عرب میں حج کے لیے وقت پر پہنچنا تھا۔

سی او اے ایس نے تمام ممالک کے فوجی سربراہوں کو خطوط ارسال کئے۔ جن میں سے دستہ نے گزرنا تھا اور راہداری کی سہولیات کے لیے کہا۔ حج کے دستہ میں مسافر بسیں، دستہ کے کمانڈر کے لیے جیپ اور انتظامی سہولت کے لیے ٹرک شامل کئے گئے تھے اس دستہ کو ہر لحاظ سے خودکفیل بنانے کی غرض سے طبی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ایک ایمبولینس گاڑی بھی شامل کی گئی تھی۔ افراد کا انتخاب اور دائیں ہاتھ گاڑی چلانے کی ڈرائیوروں کو مشق کروائی گئی۔ کیونکہ پاکستان میں بائیں ہاتھ گاڑی چلانے کا رواج ہے۔ نہ صرف ڈرائیوروں کو تربیت دینے کی ضرورت تھی۔ بلکہ انتظامی امور کی خاطر مختص کئے گئے ٹرکوں کو بھی بین الاقوامی معیاروں کے مطابق ڈھالنے کی ضرورت تھی۔ مفتی (شہری) لباس کو بنانے میں نوردین اینڈ سنز نے وقت کی کمی کے باوجود بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ مالی اخراجات کا اندازہ بغیر نفع اور نقصان کی بنیاد کو سامنے رکھ کر لگایا گیا۔

میں اس پراجیکٹ پر ڈائریکٹوریٹ میں اپنے ساتھیوں کی امداد سے چل نکلا۔ میرے ڈپٹی کرنل وزیر ملک نے ان تھک محنت کی تاکہ دستہ مقررہ تاریخ پر سفر پر روانہ ہو جائے۔ جبکہ ہر شے طے شدہ تجویز کے مطابق چل رہی تھی۔ ہم افغانستان سے گزرنے کی خاطر ویزے کے حصول کے لیے اٹک گئے۔ وقت گھٹتا جا رہا تھا۔ بریگیڈیئر افضل ڈائریکٹر ملٹری انٹیلی جنس ہماری مدد کو پہنچے۔ ہم ۷۴-۱۹۷۳ میں اکٹھے نیشنل ڈیفنس کالج میں طالب علم تھے اور ہمارے دوستانہ مراسم بے حد اچھے تھے۔

روانگی سے دو روز قبل میں اور افضل افغانستان کے ملٹری اتاشی کو اسلام آباد ملنے کی غرض سے اس کی رہائش گاہ پر گئے۔ ہم نے اس کی خاطر مدارت سے بہت لطف اٹھایا۔ اس نے اپنی حکومت سے رفع موانع کو دور کرنے کا وعدہ کیا۔ میں نے پاسپورٹ ان کے ہاں چھوڑ دیئے۔ اگلے روز ویزے سٹمپ ہو چکے تھے۔ لہٰذا دستہ وقت مقررہ پر روانہ ہوا۔ خدا کے فضل سے حج دستہ نے سعودی عرب کا واپسی سفر مکمل کیا۔ حج کی سعادت حاصل کی۔ ڈی پی ایس اور پی ایم کی حیثیت سے میری دو سالہ خدمات کو سراہتے ہوئے حکومت پاکستان نے مجھے تمغہ بسالت سے نوازا۔ ایوارڈ میں نقدی یا ساڑھے بارہ ایکڑ زرعی زمین کا تحفہ شامل تھا۔ میں نے زمین حاصل کر لی۔ جس کے

لیے میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں۔

سعودی عرب کے لیے وفد

مارشل لاء کی حکومت اندرون ملک اور سعودی عرب میں مستقبل کے حاجیوں کے حالات کو سنوارنے کے لیے بڑی مشتاق تھی۔ موجودہ غیر تسلی بخش حالات کی ذمہ دار وزارت مذہبی امور تھی۔ سعودی عرب میں حالات کے سبب بڑی شکایات پیدا ہو رہی تھیں۔ وزارت مذہبی امور ہر حاجی کو سعودی عرب کے لیے ہوائی اور بحری واپسی سفر نیز سعودی عرب میں مکہ اور مدینہ کے سفر، ان کی رہائش اور سعودی عرب میں حاجیوں کے ہر گروہ کے لیے معلم (سعودی گائیڈ) کا انتظام کرنے کے لیے فرد حساب دیتی تھی۔ خوراک کے انتظام کے لیے فرد خود ذمہ دار ہوتا۔ حاجیوں کو منظور شدہ زرمبادلہ دیا جاتا۔

ایک روز مجھے میجر جنرل ریاض نے بلایا اور کہا کہ اگلے تین روز میں سعودی عرب جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تمہیں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے وفد کا رکن نامزد کیا ہے۔ مجھے باقی کی تفصیلات سیکرٹری وزارت مذہبی امور سے حاصل کرنا تھیں۔ جب میں دفتر واپس پہنچا تو مجھے متعلقہ وزارت کے سیکرٹری مسٹر تجمل ہاشمی کا فون آیا۔ انہوں نے کہا کہ ''ہم پرسوں کراچی جا رہے ہیں جہاں سے ہم سعودی عرب کے لیے روانہ ہوں گے۔'' انہوں نے بتلایا کہ وفد کا تیسرا رکن مسٹر ابن الحسن مشیر مالیات بھی ہمارے ساتھ جائے گا۔ انہوں نے اسی روز بعد دوپہر وزارت سے میرا پاسپورٹ منگوا لیا۔ اگلے روز مجھے میرا پاسپورٹ مع سعودی عرب کے لیے ویزا مل گیا۔ جس کے ہمراہ میرا ہوائی ٹکٹ اور زرمبادلہ موجود تھے۔ میرے دونوں ساتھی مسٹر ہاشمی اور ابن الحسن ہوائی اڈے پر موجود تھے۔ ہم کراچی پہنچے جہاں ہمارے لیے گورنمنٹ گیسٹ ہاؤس میں اقامت کے لیے انتظامات کئے گئے تھے۔

اگلی شام ہم نے جدہ جانے کے لیے چار گھنٹے کے سفر کا آغاز کیا۔ جب ہم جدہ کے قریب پہنچے۔ تو ہم نے دور سے ہی روشنیوں کے شہر کا نظارہ کیا۔ جدہ کے ہوائی اڈہ پر ہمارا استقبال سفارتخانہ کے عملہ، دفاعی اتاشی اور ڈائریکٹر حج نے کیا۔ ہمیں وی آئی پی کا استقبال دیا گیا۔ اور حج ڈائریکٹوریٹ کی جانب سے حاصل کی گئی ایک نجی اقامت گاہ کی طرف چل پڑے انتظامات آرام دہ تھے۔ لیکن پانی کا مسئلہ تھا۔

اگلے روز ہم نے احرام باندھا اور عمرہ کرنے مکہ چلے گئے۔ عمرہ کی رسومات مکہ کی عظیم مسجد میں

تقریباً ایک گھنٹہ میں ادا ہو جاتی ہیں (7)، ہم اپنا اسباب بھی مکہ لے گئے جہاں ہم نے اپنا مستقر بنانا تھا جو کام ہمیں سی۔ ایم ایل اے کی جانب سے دیا گیا اور جس کی وضاحت مسٹر ہاشمی نے کی۔ اس کے پیش نظر حج کے دوران سعودی عرب میں حاجیوں کی رہائشی صورت حال میں سدھار پیدا کرنا تھا۔

حج کا موسم پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ اس سے ہمیں موقع میسر آیا کہ شروع سے لے کر جب حاجی جہازوں کے ذریعے یا بحری سفر سے جدہ آتے ہیں اور وہاں سے سڑک کے راستہ مکہ اور مدینہ جاتے ہیں، ان کے تمام حالات سامنے دیکھیں نیز ان کی رہائش کی صورت کو بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ ہم حاجیوں کے ایک گروہ سے ملے جو بحری راستہ سے سعودی عرب پہنچے تھے۔ حاجیوں کے لیے ایک صاف ستھرا ٹرمینل مہیا کیا گیا تھا۔ تمام لازمی عملہ ڈیوٹی پر موجود تھا جن میں سعودی افسران بھی شامل تھے۔ تمام حاجی مخصوص جگہ پر ٹھہرائے گئے۔ اور ڈائریکٹوریٹ کے سٹاف نے کاغذات کی جانچ پڑتال شروع کر دی۔ نیز ان کے مزید سفر کے انتظامات پر لگ گئے۔ سعودی اہل کاروں کا پاکستانی حاجیوں کی جانب رویہ تحکمانہ تھا اور وہ حج ڈائریکٹوریٹ کے اہلکاروں کی بات کو نہیں سنتے تھے۔ اگر سعودی اہلکار اپنی جگہ کو چھوڑنا چاہتا یا تفریح کرنا چاہتا تو وہ تمام کام چھوڑ دیتا۔ اور اس امر کی قطعاً پروا نہ کرتا کہ کتنے افراد حج کے لیے داخلہ کے منتظر ہیں۔ پاکستانی حج ڈائریکٹوریٹ کے اہلکار محض بے بس تھے اور وہ انہیں اپنی ڈیوٹی پر حاضر رہنے اور بقیہ افراد کے کاغذات کی جانچ پڑتال کے خاتمہ تک موجود رہنے کے لیے نہیں کہہ سکتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ سب سے بڑی رکاوٹ زبان کا مسئلہ تھا۔ پاکستانی اہلکار عربی میں بات چیت نہیں کر سکتے تھے اور سعودی اہلکار انگریزی میں بات چیت نہیں کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ غیر ضروری دیر میں نکلتا۔ ہم حاجیوں کی مدد نہیں کر سکتے تھے جو سعودی اہلکاروں کے مزاجوں کے رحم و کرم پر تھے۔ بعد ازاں ہم نے یہی نکتہ سعودی وزیر مذہبی امور کے سامنے پیش کیا جب ہم نے ان سے ان کے دفتر میں ملاقات کی۔ کاغذات کی پڑتال کے بعد حاجی بسوں پر سوار ہو کر مکہ کی جانب روانہ ہوئے۔ حاجیوں نے قیام کی جگہ کو خالی کیا تو یہ پھلوں کے چھلکوں انڈوں کے خول اور بچی کھچی خوراک جو وہ اپنے ذاتی سامان میں لے کر آئے تھے چھوڑ گئے۔ ایک صاف ستھری جگہ کو اس طرح گندا اور غلیظ دیکھنا بے حد شرمندگی کا باعث بنا۔ بعض حاجیوں نے گندگی کو زمین پر گرا دیا تھا۔ انہوں نے گندگی کے لیے مخصوص ڈبے کی پروانہ کی جو انہی کی خاطر وہاں رکھے گئے تھے۔ صفائی کے نکتہ نظر سے ہم

7۔ دی کنسائز انسائیکلوپیڈیا آف اسلام صفحہ نمبر 410 از سائرل گلیسی

نے اپنے ہی لوگوں سے کوئی اچھا تاثر قائم نہ کیا۔ ساتھ ہی ساتھ بعض سعودی اہلکاروں کی جانب سے غیر ہمدردانہ رویہ قابل مذمت تھا۔

مکہ میں پاکستانیوں کے لیے چند اقامت گاہیں دکھلائی گئیں۔ وہاں رہائش کی صورت کو دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا۔ 16x12 فٹ کے ایک کمرہ میں تقریباً تیس افراد کو ٹھہرایا گیا تھا۔ جس میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھے۔ وہ اسی کمرہ میں کھانا پکاتے۔ سب لوگوں کے لیے ایک ہی لیٹرین تھی۔ حاجیوں نے پانی کی کمی اور رہائش کی تنگی کی شکایت کی۔ ان کے ''معلمین'' بھی اکثر و بیشتر غیر حاضر رہتے۔ جبکہ انہوں نے رہائش اور سفر کے کل اخراجات حاجیوں سے پہلے ہی وصول کر لیے تھے۔ یہ سعودی قانون ہے کہ ہر حاجی کو کسی نہ کسی معلم کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔ کیونکہ اُس کے بغیر وہ حج رسومات ادا نہیں کر سکتے تھے اس کے علاوہ زبان کا بھی مسئلہ تھا شاید ہی کسی حاجی کو عربی آتی ہو۔ حالات جیسے بھی تھے ہر ایک کو انہیں برداشت کرنا پڑتا ہر ایک بشمول ڈائریکٹوریٹ کا عملہ بے بس تھے۔ جو کچھ ہمیں تجربہ ہوا ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ حاجیوں کے ہر گروہ کے ہمراہ ایک مترجم ہونا چاہیے اور حاجیوں کی آرام گاہ اسی وقت بہتر ہو سکتی ہے اگر وہ تھوڑے سے اخراجات مزید برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔

ایرانیوں کے انتظامات بہترین تھے۔ حکومت ایران کا وفد حج سے پہلے سعودی عرب میں حاجیوں کی رہائش کے انتظامات کر لیتا۔ واپس جا کر حکومت ایران ہر ایک حاجی کو انفرادی طور پر رہائش مخصوص کرتی ہے اور سعودی عرب میں سفارت خانہ کو لسٹ بھیج دیتی ہے۔ جب ان کے حاجی پہنچتے ہیں۔ لسٹ کے مطابق ان کو رہائش میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اور اس طرح کوئی افراتفری دیکھنے میں نہیں آتی۔

اسی طرح ہم مدینہ منورہ گئے اور ہم نے اپنی حکومت کی جانب سے مہیا کردہ صحت کے انتظامات کو ملاحظہ کیا۔ نرسنگ سٹاف اور ادویات کے متعلق عام شکایت پائی گئی۔ آرمی میڈیکل ٹیم پہلے ہی مکہ پہنچ چکی تھی۔ اور انہوں نے پاکستان ہاؤس میں ہسپتال بنا لیا تھا۔ کرنل ڈاکٹر برکی آفیسر انچارج تھے۔ وہ مرد اور خواتین پر مشتمل خود کفیل میڈیکل ٹیم تھی۔ عمدہ طور پر منظم جنہوں نے اپنی شہرت کو قائم رکھا اور فرائض کو پورا کیا۔ انہوں نے دوسرے ملکوں کے مریضوں کا بھی علاج کیا اور اس طرح پاکستانی فوج کے اس شعبہ کو ہر دل عزیز بنانے میں کامیاب ہوئے۔

ہم سعودی عرب میں تقریباً ایک ہفتہ مقیم رہے اور ہم خوش قسمت تھے کہ ہم نے تمام انتظامات اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ کیونکہ حج کا موسم آن پہنچا تھا اور کثیر تعداد میں حاجی آنا شروع ہو گئے

تھے ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ بہتری کی بہت گنجائش تھی۔ پاکستان میں کافی کام کی ضرورت تھی اور وزارت مذہبی امور کو انتظامات کو نئے سرے سے بہتر بنانا تھا۔

اب ہم جدہ ایئرپورٹ پر پہنچ چکے تھے اور جہاز کی روانگی کے انتظار میں تھے کہ ابن الحسن نے مجھ سے پوچھا:

''بریگیڈئر صاحب! آپ نے کیا دعا مانگی''؟

میں نے جواب دیا کہ خیر کی دعا۔ اپنے بچوں کے لیے، بہن بھائیوں کے لیے، عزیزوں کے لیے، دوستوں کے لیے وغیرہ وغیرہ

اب مجھ سے رہا نہ گیا تو میں نے بھی ابن الحسن سے سوال کیا کہ بھائی آپ نے کیا دعا مانگی؟

انہوں نے کہا: سچ بتادوں۔ میں نے تو صرف یہ دعا مانگی کہ اللہ تعالیٰ مجھے جب بھی اس سرزمین پر لے کر آئیں ایک وفد کی صورت میں لائیں ورنہ یہاں پر کسی کی عزت نہیں کی جاتی''۔

مشترکہ فلم سازی کے لیے ٹاسک فورس کمانڈر

مسٹر بھٹو کی حکومت میں یوسف بچ وزیراعظم کے مشیر تھے۔ نیشنل فلم ڈویلپمنٹ کارپوریشن (نیف ڈیک) بالواسطہ طور پر ان کے اختیار میں تھی۔ وزیراعظم کی منظوری سے اس نے پاکستان میں ایک مشترکہ فلم بنانے کا تہیہ کیا۔ اس کا خیال یوگوسلاویہ کی اجارہ داری کو توڑنا تھا۔ جہاں عام طور پر دوسری جنگ عظیم پر فلمیں بنائی جاتی تھیں۔ یوگوسلاویہ کی فلمی صنعت ایسا اس لیے کرتی تھی کیونکہ اس ملک نے اس وقت کے ہتھیاروں اور سامان کو سنبھال کر رکھا تھا۔ پاکستانی فوج بھی ایسے ہی سامان سے ایک عرصہ تک لیس رہی ہے۔ اور اب بھی کسی نہ کسی صورت میں یہ سازوسامان اس کے پاس موجود تھا۔ اس لیے پاکستان میں اس قسم کی فیچر فلم بنانا ممکنات میں تھا۔ بیرونی ممالک کے سرمایہ کاروں کو دوسری جنگ عظیم کے سلسلہ کی فلم بنانا ممکن اور فائدہ مند نظر آیا۔ اس طرح معاشی لحاظ سے بھی ملک کو فائدہ ہوتا۔ یہ خیال اچھوتا تھا۔ چنانچہ نیف ڈک نے برطانیہ کی 'اوپن روڈ فلمز لمیٹڈ' سے بات چیت کی اور اس نے مشترکہ طور پر ایک فلم بنام Force Ten from Navarone کا مطالعہ کرنے اور قابل عمل بنانے پر اتفاق کرلیا۔ چونکہ یہ ایک جنگی فلم تھی اور اس میں جنگی ہتھیاروں کا استعمال اور دفاعی تنصیبات کا دورہ درکار تھا اس لیے انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ کسی حاضر سروس فوجی آفیسر کی خدمات مہیا کی جائیں۔ مسٹر بچ نے وزیراعظم کی منظوری سے چیف آف آرمی سٹاف سے درخواست کی کہ ایک بریگیڈیئر کے عہدہ کے سینئر فوجی

آفیسر کی تقرری کی جائے جو اس ٹیم کے ہمراہ پاکستان میں پراجیکٹ کے مطالعہ اور قابل عمل ہونے تک موجود رہے۔ سی او اے ایس نے اس کام کے لیے مجھے نامزد کیا اور مرحوم لیفٹیننٹ کرنل صدیق سالک اور میجر اعجاز بٹ کو میری مدد کے لیے مقرر کیا۔ یہ دونوں افسران میرے لیے بے حد مددگار ثابت ہوئے اور انہوں نے انتظامی امور کے لیے برطانوی فلم پروڈیوسرز اور نیفیڈیک کی مشترکہ ٹیم کے پروگرام مرتب کئے۔ نویں دن کے خاتمہ پر جب ٹیم نے اپنی پسند کے علاقہ کا دورہ ختم کیا تو اس نے پوری صدق دلی کے ساتھ مشترکہ طور پر فلم کو پاکستان میں فوج کے تعاون سے بنانے پر اتفاق کر لیا۔

پروڈیوسر مسٹر انگر نے مجھے بتلایا کہ پاکستان میں یہ فلم بنا کر وہ کثیر رقم بچا سکیں گے کیونکہ یوگوسلاویہ مناسب ہتھیاروں کی اپنی پسند کی رقم کا مطالبہ کرے گا۔ لہٰذا فلم کی پروڈکشن کے میدان میں بیرونی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کی خاطر اس منصوبہ کو کامیاب اختتام پر پہنچانا ہوگا۔ مسٹر پچ کو فلم پروڈیوسر نے یہ بھی بتلایا کہ میرا ان کے ساتھ فلم مکمل ہونے تک ٹاسک فورس کی حیثیت سے کام کرنا اس امر کی لازمی شرط ہے۔ ورنہ نیف ڈک کے ساتھ مشترک طور پر اکیلے فلم کے آغاز کے لیے وہ رضامند نہ تھے۔ بعض وجوہات کے لیے برطانوی فلم پروڈیوسر نیف ڈک کی طرف پسندیدہ نظر نہ رکھتے تھے نو روز تک ہم نے فلم کے قابل عمل ہونے کا مشترکہ مطالعہ کیا میں نے بھی محسوس کیا کہ نیف ڈک اہلکار لاتعلق تھے اور وہ کام پر جانے کی بجائے دن کو زیادہ نیند کرنا پسند کرتے تھے۔

مسٹر پچ نے دوبارہ سی او اے ایس کو تحریری گزارش کی کہ میرا ٹیم کے ہمراہ رہنا پراجیکٹ کے خاتمہ تک ضروری بنایا جائے۔ چنانچہ ٹاسک فورس ہیڈ کوارٹر بنایا گیا اور مجھے اس کا کمانڈر نامزد کر دیا گیا۔ مجھے سی او اے ایس نے فوج سے اپنی پسند کے سٹاف افسران کے نام دینے کو کہا میں نے لیفٹیننٹ کرنل نیامت (آرٹلری) اور میجر عزیز (فرنٹیئر فورس) کو اپنے سٹاف پر مقرر کرانے کی گزارش کی۔ مسٹر پچ نے چند سویلین ڈپٹی سیکرٹری کے عہدہ کے ہیڈ کوارٹر ٹاسک فورس میں مقرر کروائے۔ ایک کسٹمز اور دوسرا فنانس سے تھا۔ نیفڈک میں سے بھی ایک آفیسر بطور مشیر دیا گیا۔ اس پراجیکٹ کے لیے فنڈز دیئے گئے اور اسلام آباد میں کرایہ پر لئے بنگلہ میں کام شروع کر دیا گیا۔

مسٹر انگر کے خیال میں فلم سٹوڈیوز اور نیفڈک کا سامان تسلی بخش نہیں تھا اس نے اس پراجیکٹ کے لیے مکمل یونٹ درآمد کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک مشترکہ اجلاس میں مطلوبہ سامان کسٹمز کے ذریعے نکلوانے کے طریقوں پر غور کیا گیا۔ مطلوبہ جگہ تک لے جانا بھی ٹاسک فورس کی ذمہ داری تھی۔ اس پراجیکٹ کے انتظامی امور کی تمام تفاصیل جن میں فائیو سٹار ہوٹل میں رہائش، ٹرانسپورٹ، خوراک،

یونیفارم اور دیگر اشیاء کا حصول شامل تھا، ٹاسک فورس کی ذمہ داری تھی۔ ماک گاڑیاں اور ٹینک کی سپلائی پاک فوج کی ذمہ داری تھی۔ جو کہ راولپنڈی میں ۵۰۲ بیس ورک شاپ نے بنانے تھے۔ مسٹر انگر نے جب ماک گاڑیوں کی تصاویر دیکھیں تو اس کو اطمینان ہوگیا۔ فلم کا آغاز مارچ ۱۹۷۷ء اور اختتام تین ماہ کے اندر ہونا تھا۔

ٹاسک فورس ہیڈ کوارٹر قائم کر دیا گیا۔ اور وہ پراجیکٹ پر مستعدی سے کام کرنے کے لیے تیار تھا، کہ جس طرح کہ مسٹر انگر کو اندیشہ تھا۔ پاکستان میں سیاسی ماحول نے خطرناک رخ اختیار کرلیا۔ متحدہ سیاسی اپوزیشن نے پاکستان قومی اتحاد (پی این اے) کے نام سے نیا سیاسی اتحاد قائم کرلیا اور ۱۹۷۷ء کے قومی انتخابات کے نتائج کے خلاف ہنگامہ کھڑا کر دیا اور کہا کہ انتخابات میں دھاندلی کی گئی ہے۔ اس شورش نے خطرناک رُخ اختیار کرلیا۔ سیاسی عدم استحکام پہلے ہی فلم پروڈیوسر کے دلوں میں وسوسے پیدا کر رہا تھا۔ چنانچہ اب تو وہ مزید بے یقینی کا شکار ہو گئے۔ انہوں نے پہلے ہی یوگوسلاویہ میں فلم بنانے کا فیصلہ کیا تھا لیکن ایک مشترکہ منصوبے کے طور پر انہوں نے پاکستان کے ساتھ گفت وشنید کی۔ وہ فلم کے لیے مقامات اور پروڈکشن کے لیے مقابلتاً کم اخراجات پر خوش تھے۔ اب اگر وہ یوگوسلاویہ کی طرف پھر جاتے ہیں۔ تو وقت اور رقم کا ضیاع ہوگا۔ لہٰذا انہوں نے پراجیکٹ کے آغاز میں تاخیر کا فیصلہ کیا۔ تاآنکہ بے یقینی کے بادل چھٹ جائیں۔ لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ پاکستان میں سیاسی زندگی نے خطرناک حد تک بے یقینی کا رُخ اختیار کر لیا۔ نہ صرف غیر ملکی بلکہ اندرونی سرمایہ کاروں نے بھی غیر محفوظ محسوس کرنا شروع کر دیا۔ ابتداً انہوں نے غیر معینہ عرصے کے لیے پراجیکٹ میں تاخیر کی اور بالآخر اسے ختم کر کے یوگوسلاویہ کو لوٹ گئے اور وہاں فلم بنالی۔ بعد ازاں جب ملک میں مارشل لاء کا اعلان کیا گیا تو نیفڈک میں حالات کی بدانتظامیوں کا جائزہ لینے کے لیے انکوائری کی خاطر مجھے نامزد کیا گیا۔

نیفڈک کے معاملات کی تفتیش

ایک روز مجھے نوٹیفیکیشن مراسلہ بتاریخ ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۷ء سی ایم ایل اے کے سیکرٹریٹ سے موصول ہوا جس میں مجھے تفتیشی عدالت کا صدر مقرر کیا گیا جس میں نیفڈک کے معاملات کی چھان بین کرنا تھا۔ نیفڈک حکومتی امداد سے چلنے والا ایک آزاد ادارہ تھا جو فلموں اور فلموں کے متعلق خام مواد سے واسطہ رکھتا تھا۔ اسے خام مواد کی درآمد میں مکمل اجارہ داری حاصل تھی۔ نیز خام درآمد شدہ فلمیں نیفڈک کے ذریعے سنسر بورڈ کو درآمد کنندگان بھیجتے۔ بدلے میں نیفڈک ہر چیز پر کمیشن کا

حساب لگا کر مالی معاوضہ کے طور پر فائدہ حاصل کرتا۔ اسی طرح نیفڈک انگریزی فلموں کو بلاواسطہ غیر ملکی تقسیم کنندگان سے درآمد کرتا۔

سی ایم ایل اے سیکریٹیریٹ نے یہ انکوائری اس لیے مجھے سونپی کیونکہ جیسا کہ میں نے گزشتہ اوراق میں بیان کیا کہ میں نے مجوزہ فلم ''فورس ٹین فرام نیوارون'' ممکن العمل ہونے کے مرحلہ کے دوران نیفڈک کے ساتھ کام کیا تھا۔ عدالت کے دوسرے افراد ڈاکٹر ایس مسعود علی وزارت کلچر کے ڈپٹی سیکرٹری اور مسٹر ایس ٹی رحمٰن جائنٹ ڈائریکٹر کمرشل آڈٹ تھے۔ لیفٹیننٹ کرنل نیامت کو بطور شریک رکن ہمارے ساتھ لگایا گیا۔ کمیٹی نے اپنے کام کا آغاز ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو کیا اور ۳۱ دسمبر ۱۹۷۷ء کو اسے مکمل کر لیا۔ انکوائری کے دوران نیفڈک کے بہت سے افسران کا انٹرویو لیا گیا اور ان کے بیانات قلمبند کئے گئے۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز کے بعض ارکان کا بھی انٹرویو لیا گیا اور ان کے بیانات قلمبند کئے گئے اور ان پر دستخط کرائے گئے۔ فلمی صنعت کے نجی شعبہ کے متعدد اراکین رضاکارانہ طور پر انکوائری کمیٹی کے سامنے پیش ہوئے ان کے خیالات اور رائے کو مناسب مقام دیا گیا۔ انکوائری میں تفویض کردہ شرائط کی روشنی میں کمیٹی نے کارپوریشن کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جو حکومت کی جانب سے دیئے گئے چارٹر کے مطابق اسے قومی فلمی پالیسی کے مقاصد کے حصول کی خاطر دیا گیا تھا۔ کمیٹی نے اپنی سفارشات میں نیفڈک کی کارکردگی جس میں انتظامی اور مالی امور شامل تھے، کے علاوہ اس کی سرگرمیوں کے دوسرے وسیع تر امور کو بھی شامل کیا۔ بالآخر مخصوص متفقہ سفارشات مرتب کی گئیں۔ جس میں پراجیکٹ اور سرگرمیوں کے دوسرے حصے شامل تھے۔ اسے سی ایم ایل اے سیکرٹریٹ کو روانہ کر دیا گیا۔

سی ایم ایل اے سیکرٹریٹ نے وزارت کلچر کی رائے دریافت کی۔ بعد ازاں فیصلہ کیا گیا کہ وزارت کلچر کے سیکرٹری کابینہ کو اس کے اگلے اجلاس میں تفتیش کی تفصیلات پیش کریں گے۔ میں اور انکوائری کمیٹی کے دوسرے اراکین اس فیصلے کے پیچھے حکمت کو نہ سمجھ سکے۔ چونکہ نیفڈک کے معاملات وزارت کلچر کے زیر اثر تھے۔ وہ دلچسپی لینے والی پارٹی اور نیفڈک کی مانند متاثرہ پارٹی تھی۔ علاوہ ازیں وزارت کلچر کے سیکرٹری بطور گواہ انکوائری کے رُوبرو پیش ہو چکے تھے۔ لہٰذا اسے سی ایم ایل اے اور ان کے کابینہ کے سامنے انکوائری کو پیش کرنا مناسب نہ تھا چونکہ ہم نے انکوائری کی تھی لہٰذا میں یا انکوائری کمیٹی کا کوئی رکن اس انکوائری کو پیش کرنے کا زیادہ اہل تھا۔

کابینہ کے اجلاس کے روز سیکرٹری اور میں سی ایم ایل اے سیکرٹریٹ میں انتظار کرتے رہے تاآنکہ ہمیں طلب کیا گیا۔ سیکرٹری اور میں ایک دوسرے کے قریب بیٹھے۔ انکوائری کمیٹی کی

سفارشات کا مطالعہ کرنے کی بجائے وزارت کلچر کے سیکرٹری نے کہا کہ وہ سفارشات کی روشنی میں نیفڈک کو اپنے طریق کار کا تعین کرنے کو کہیں گے۔ دس منٹ کے اندر اندر سی ایم ایل اے نے سیکرٹری سے اتفاق کیا۔ جب میں نے انکوائری کمیٹی کے دوسرے اراکین کے ساتھ اس ڈرامہ کا ذکر کیا تو وہ بھی حیرت زدہ ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوا کہ سی ایم ایل اے سیکرٹریٹ میں نیفڈک ترجیحات میں زیادہ اہم نہ تھا۔ انکوائری کے دوران معلوم ہوا کہ نیفڈک جس کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ وہ خود کفیل ادارہ ہے۔ اب بڑے خسارے میں چل رہا تھا اور جس کی مدد کے لیے ہر سال کی ابتداء میں ایک خطیر رقم کو قلمزد کرنا پڑتا تھا۔ کوئی حساب کتاب موجود نہ تھا افسران بغیر خوف وخطر دندناتے پھر رہے تھے۔

ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ نیفڈک میں نہ صرف بورڈ آف ڈائریکٹرز کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ بلکہ بے حد اہم افراد پر مشتمل تھی۔ مرحوم جمیل نشتر جو نیشنل بنک آف پاکستان کے صدر تھے انہوں نے اپنے بیان میں کہا ''نیفڈک بہت سی پبلک سیکٹر کمپنیوں کی مانند چھوٹی سی انجمن ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس میں بے حد اہم افراد کی ایک بڑی تعداد موجود ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ وزیر اعظم کا سپیشل اسسٹنٹ اس کا چیئرمین ہے۔''(8)

انکوائری کمیٹی نے زبانی اور تحریری شہادتوں پر غور کر کے اپنی سفارشات مرتب کیں۔ اس میں نجی سیکٹر سے تعلق رکھنے والے افراد کی رضا کارانہ شہادتیں شامل تھیں جو کسی نہ کسی صورت میں نیفڈک سے تعلق رکھتے تھے۔ مجھے حکومت کی جانب سے انکوائری کمیٹی کی سفارشات پر بعد ازاں کسی اقدام پر حسد نہیں ہے۔ لیکن میں اسے غیر اخلاقی اقدام قرار دیتا ہوں کہ مینجنگ ڈائریکٹر خواجہ شاہد حسن کو جسے بہت سی وجوہات کی بناء پر ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا تھا، ۱۹۸۹ء میں صرف حکومت کی تبدیلی کے سبب بحال کر دیا گیا۔ اس نوعیت کے اقدام سے تو اداروں کی ماہیت ہی تباہ ہو جاتی ہے افراد کی مرضی روزمرہ کا دستور بن جاتا ہے۔ اس سے بددیانت افراد کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ جو بددیانتی کو عادت بنا لیتے ہیں۔ اور خود کو حالات کے ہاتھوں گرفتار ہونے کا بہانہ بناتے ہیں میرٹ کسی بھی صورت انتخاب کے لیے پیمانہ نہیں رہ جاتا۔ ایوب خاں نے کئی کو نکال دیا تو یحییٰ خان نے انہیں بحال کر دیا۔ اس طرح یحییٰ خان نے ملازمت سے سبکدوش کرنے کے لیے ایک طویل فہرست تیار کر ڈالی۔ بھٹو، ضیا اور بے نظیر سب نے ایسا ہی کیا ہے۔ ہر مرتبہ بددیانت افراد کی فہرست گزشتہ کے مقابلہ میں طویل ہو گئی۔ جنہیں ملازمت سے برطرف کرنا تھا۔ ساتھ ہی

8۔ بورڈ آف انکوائری کے روبرو دیئے گئے بیانات

ساتھ برطرف افراد اپنی نوکریوں پر لوٹتے رہے۔ اور انہیں مالی بقایا جات ملتے رہے انہیں ساتھ ہی ملازمت میں فضلیت ملتی رہی۔ بالآخر نقصان کس کا ہوا؟ یقیناً صرف ملک کا!

انکوائریاں صرف تصنیع اوقات کی خاطر نہ کی جائیں۔ جب حکومت کے اہلکاروں کے لیے قدم اٹھایا جائے تو برطرفی کے لیے شہادتیں ہونی چاہئیں۔

خزانے پر بوجھ کے عوض ہمیں ایسے افراد پر رحم کرنے کا حق نہیں ہے کسی بھی قسم کا رحم کرنے کے لیے رحم دل افراد کو اپنی دولت کے ضیاع کی طرف دیکھنا چاہیے۔ رحم دلی کا راستہ اپنا کر ہماری حکومتوں نے یکے بعد دیگرے معاشرہ کو رشوت خور بنا دیا ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ رشوت خوری نے قانونی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اور وہ ہماری زندگی کی اسلوب کا حصہ بن چکی ہے۔ انکوائری کمیٹی کو کہا گیا کہ وہ نیفڈک کی مالی سرگرمیوں پر کابینہ کو رپورٹ پیش کئے جانے تک اپنا اختیار قائم رکھے۔ بظاہر ایسا وزارت کلچر کے لیے پسندیدہ امر نہ تھا۔ ہم نے سرمایہ کے ضیاع کی اجازت نہ دی۔ ٹاسک فورس ''نیوارون'' کے اثاثوں کو نیفڈک میں بھیج دیا گیا۔ حکومت کی اجازت سے گاڑیوں کو ٹینڈروں کے ذریعے بیچ دیا گیا۔ مسٹر جمال خان جو نیفڈک کے مشیر مالیات تھے، کو مینجنگ ڈائریکٹر کا اضافی چارج دیا گیا۔ وہ بے حد مددگار ثابت ہوا۔ اور انہی کی وجہ سے کمیٹی نے باعزت طور پر اپنا کام پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ ہم نے جمال خان کو فرائض کی لگن رکھنے والا پایا اور انہوں نے نیفڈک کے مفادات کی حفاظت کی۔

میں نیفڈک کے یہ فرائض سرانجام دیتا رہا۔ اس کے علاوہ بطور ڈی پی ایس اور پی ایم کام کرتا رہا۔ یہ سب کچھ صرف لائق اور سنجیدہ ساتھیوں کی مدد کے سبب ہوسکا۔ میں بطور خاص ڈاکٹر مسعود، مسٹر رحمان لیفٹیننٹ کرنل نیامت (بعد ازاں بریگیڈیئر) کا شکر گزار ہوں۔ جنہوں نے مکمل تعاون اور لامحدود امداد فراہم کی۔ جس کے بغیر جو کام میرے سپرد کیا گیا، اسے پایہ تکمیل تک پہنچانا ناممکن تھا۔ میں اپنے پرسنل اسسٹنٹ صوبیدار اللہ داد کا شکریہ ادا کرنے کا خواہشمند ہوں جس نے اپنے ذاتی آرام سے قطع نظر کمیٹی کے لیے ٹائپنگ کا کام کیا اللہ داد صاحب کی فرائض سے لگن اور وفاداری کو بے مثال قرار دیا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ میں نے ابتداً ذکر کیا۔ اضافی فرائض کی ادائیگی کے سبب مجھے بعد دوپہر تک بھی دفتر میں قیام کرنا پڑتا۔ لیکن سکوائش کھیلنا میں کبھی نہیں بھولا۔ اس کھیل نے ملازمت کے دوران تمام وقت مجھے چاق و چوبند رکھا۔ اس کھیل کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ دن رات کے کسی بھی وقت اسے کھیلا جا سکتا ہے۔ میں کرنل رحمان کا شکر گزار ہوں جو سکوائش کھیلنے کے لئے مجھے ہمیشہ تیار ملتے۔

کسی زمانے میں وہ فوج میں سکوائش نمبر ۲ کھلاڑی بن گئے۔ اس کھیل نے مجھے ہمیشہ مطمئن رکھا اور مجھے اپنے اعصاب پر قابو رکھنے کے اہل بنایا۔

عراقی وفد

پاکستان میں عراقی سفارتخانہ کے ذریعے ہتھیاروں کی سمگلنگ کے پکڑے جانے کے بعد عراق سے ہمارے تعلقات مخاصمانہ تھے اور ان میں سرد مہری پائی جاتی تھی۔ بہرحال اب دونوں ممالک تعلقات کی بہتری کے لیے سعی کر رہے تھے۔ ۱۹۷۶ء میں میجر جنرل اسماعیل کی سربراہی میں ایک فوجی وفد عراق سے سرکاری دورہ پر آیا۔ پاکستان کی حکومت اس وفد کو شایان شان طریقہ سے خوش آمدید کہنا چاہتی تھی۔ پاکستان میں ان کے قیام کے دوران مجھے ان کے لیے رابطہ آفیسر اور رہبر مقرر کیا گیا۔ سی او اے ایس نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا اور مناسب ہدایات دیں اور بتلایا کہ یہ وفد کس قدر اہمیت رکھتا تھا اور وضاحت کی کہ ہمارے لئے عراقیوں کو جیتنا کتنا لازمی تھا۔ تاکہ دونوں ممالک میں غلط فہمیوں کو دور کیا جا سکے۔

میری اعانت کے لیے مجھے دو افسران دیئے گئے۔ لیفٹیننٹ کرنل مجید جو سی او اے ایس کے سٹاف پر تھا اور میجر غفور بطور مترجم جو جی ایچ کیو کے دینی ڈائریکٹریٹ میں تھا۔ دونوں افسران نے اپنے فرائض کی بجا آوری لگن سے کی۔ اور وفد کے ساتھ پورا عرصہ نہایت اعلیٰ رویہ کا مظاہرہ کیا۔

عراقی وفد انٹر سروسز کے افسران پر مشتمل تھا۔ ان میں سے بعض انگریزی زبان میں بات چیت کر لیتے تھے۔ لیکن دوسروں کے ساتھ اپنے مترجم کے ذریعے گفتگو کرنا پڑتی۔ میجر جنرل اسماعیل خوبرو اور دراز قد آفیسر تھا۔ وہ انگریزی زبان میں روانی سے گفتگو کرنے کی اہلیت رکھتا تھا لیکن مترجم کے ذریعے عربی میں گفتگو کرنے کو ترجیح دیتا۔ وہ بے حد خوش مزاج انسان تھا۔ جو ہماری پہلی ملاقات میں بے حد سنجیدہ اور قواعد و دستور کا پابند نظر آیا۔ لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ جب ہم ایک دوسرے کو زیادہ جاننے لگے تو وہ کافی پر مزاح شخص نکلا۔ وہ دونوں ممالک کی افواج میں قریبی تعلقات کا حامی نظر آیا۔ فطرتاً وہ حساس تھا۔ لاہور میں قیام کے دوران ہمارے لیے رہائش کا بندوبست انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ جسے اب پرل کانٹی نینٹل کہتے ہیں۔ لاہور کے بعد ہم نے کراچی جانا تھا۔ کراچی کے لیے طیارہ لیٹ ہو گیا۔ اس میں کوئی تکنیکی خامی نکل آئی۔ ہم نے ہوٹل کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور ہوٹل کی انتظار گاہ میں چلے گئے۔ سٹیشن ہیڈ کوارٹر کی زیر نگرانی سامان ایئر پورٹ روانہ کر دیا گیا۔ میں نے اپنے اسسٹنٹ کرنل مجید کو بتلایا کہ وہ وفد

کے ہمراہ ایئر پورٹ پر جائیں اور میں انہیں وہاں مل جاؤں گا۔ جب میں ایئر پورٹ پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وفد بڑے آرام سے وی آئی پی لاؤنج میں قیام پذیر تھا۔ میں جنرل اسماعیل کے پاس گیا اور انہیں خوش وخرم نہ پایا۔ اسے پھر سے خوش دیکھنے میں مجھے وقت لگا۔ کرنل مجید نے مجھے بعد ازاں بتلایا کہ جنرل کو میرے بغیر ہوٹل چھوڑ کر ایئر پورٹ جانے پر ناراضگی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں نے جنرل اسماعیل کو بے حد خوش باش انسان پایا۔ وہ اپنے وعدوں کا پکا اور بے حد مخلص انسان نکلا۔ وہ دونوں اطراف سے آزادانہ افسران کے تبادلے کے حق میں تھا تا کہ اس طرح آپس کے تعلقات بڑھیں اور استوار ہوں۔ ہم دونوں اس بات پر متفق تھے کہ وفود کے کثرت سے تبادلے سے ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ جب عراقی وفد کراچی سے روانہ ہوا تو انہوں نے پاکستانی افواج کی بے حد تعریف کی۔ وہ جو اپنی آمد کے وقت بے حد سنجیدہ نظر آتے تھے، اب رخصت ہوتے وقت خوش وخرم نظر آ رہے تھے۔ پاکستانی افواج کے لیے ان کی محبت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ میری درخواست پر جنرل اسماعیل نے پاکستان میں ایک روز مزید قیام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ قیام میں توسیع بیرونی وفود کم ہی کرتے ہیں۔ سی او اے ایس بے حد مسرور تھا۔ اور یوں انہوں نے میری اور میری ٹیم کی بے حد تعریف کی۔

اس اثنا میں ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو ملک میں مارشل لاء کا اعلان کر دیا گیا اور جنرل ضیاء نے بطور سی ایم ایل اے ملک میں عنان اقتدار سنبھال لی۔ اب یہاں سے ملک کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوا۔

(عام انتخابات 1977ء

(قبل از مارشل لاء سیاسی حالات)

متعدد مصنفین نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے لہٰذا میں نے چند ضروری عوامل تک ہی اپنے آپ کو محدود رکھنے کا فیصلہ کیا کئی ماہ سے پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت عام انتخابات کے لیے تیاری کر رہی تھی۔ تجزیہ نگاروں کے خیال میں زرعی اصلاحات کا نئے سرے سے جائزہ اور زرعی ٹیکس کے نفاذ کو عام انتخابات منعقد کروانے کا پیش خیمہ سمجھا جا رہا تھا۔ ۵ جنوری ۱۹۷۷ء کو زرعی ٹیکس آرڈیننس کے قومی اسمبلی میں پاس ہو جانے کے بعد حکومت نے اعلان کیا کہ وہ ۷ مارچ اور ۱۰ مارچ کو قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے بالترتیب انتخابات کروائے گی۔ سیاسی مبصرین کا خیال تھا کہ منقسم مخالفت کے نتیجہ میں پاکستان پیپلز پارٹی انتخابات ۱۹۷۰ء کی مانند کلیتاً چھا جائے گی۔

وہ سیاسی رہنما جو مسٹر بھٹو کی حکومت کی ایک یا دوسرے سبب سے مخالفت کر رہے تھے، سیاسی تجزیہ کاروں کے اخذ کردہ نتائج سے پریشان تھے۔ انہوں نے یکجا ہو کر انتخابات کے لیے متحدہ محاذ پاکستان نیشنل الائنس (پی این اے) ترتیب دیا۔ اس قسم کے اتحاد کی ضرورت پر زور دینے کا سبب انہوں نے ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں اپنی شکست کو قرار دیا جبکہ اپوزیشن جدوجہد میں منقسم تھی۔ آخر کار 11 جنوری 1977ء کو پی این اے کو تشکیل دیا گیا۔ جس میں حسب ذیل سیاسی جماعتوں نے تعاون کیا:

پاکستان مسلم لیگ

تحریک استقلال

جماعت اسلامی

جمعیت العلماء اسلام

جمعیت علماء پاکستان
نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی
پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی
خاکسار تحریک
آزاد کشمیر مسلم کانفرنس

پاکستان قومی اتحاد نے اپنا منشور جاری کیا۔ جس میں یہ کہا گیا کہ وہ نظام اسلام کا اجراء کرے گی اور نتیجتاً عصمت فروشی، شراب خانوں اور سود کے لین دین پر پابندی لگائے گی۔ انہوں نے یہ وعدہ بھی کیا کہ قومیائی گئی صنعتوں کو ان کے اصل مالکوں کو واپس کر دیا جائے گا۔ منشور پر دستخط کرنے والوں میں حسب ذیل رہنما شامل تھے:

مولانا مفتی محمود
مولانا ابوالاعلیٰ مودودی
پیر پگاڑا
ایئر مارشل اصغر خان
نواب زادہ نصر اللہ خان ......اور
مولانا شاہ احمد نورانی

ملک کے کئی دوسرے مشہور رہنماؤں اور دانش وروں نے اس کی حمایت کی۔ انتخابات کے انعقاد کی تاریخ کے اعلان سے قبل پیپلز پارٹی نے زرعی اصلاحات میں چند اضافے اور تبدیلیاں کیں جسے اس کی حکومت نے ۱۹۷۲ء میں جاری کیا نیز زرعی ٹیکس کی وصولی کے لیے قانون پاس کیا۔ عام انتخابات میں زرعی اصلاحات کے مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر پی این اے نے بھی بعض انقلابی اصلاحات کا اعلان کیا۔ پی این اے نے اپنے منشور میں اعلان کیا کہ زمین کا غیر حاضر مالک نظام مملکت اسلام کے اصولوں کے خلاف ہے۔ لہٰذا متحدہ محاذ اقتدار میں آنے کے بعد اسے ختم کر دے گا اور زمین اصل کاشتکاروں کے حوالے کر دے گا۔ پی این اے نے ہل، کو اپنا انتخابی نشان قرار دیا۔ اس اعلان کا مقصد پی این اے کے نزدیک بغیر زمین کے کاشت کاروں کو اپنی جانب مبذول کروانا تھا۔ جہاں کہیں بھی پی این اے کے رہنما جاتے کاشتکار ہل اپنے کندھوں پر اٹھا کر ان کا استقبال کرتے۔

اپنی تحریک کی مقبولیت کے پیش نظر پی این اے کے رہنماؤں کو یقین تھا کہ انتخابات میں وہ

اکثریت سے چھا جائیں گے۔ انہوں نے حکومت کی اندرونی اور بیرونی کمزوریوں کی نشان دہی کی۔ عام جلسوں پر پابندیوں کے ہٹائے جانے کے بعد انتخابی اجتماعات میں پی این اے کے رہنماؤں نے حکومت کے خلاف عوام کی شکایات کا چرچا کیا۔ مسٹر بھٹو نے پی این اے کی حکمت عملی کا مقابلہ کرنے کی خاطر ملک بھر میں جلسوں کا آغاز کیا۔ جس نے ۱۹۷۰ء کی انتخابی مہم کی یاد تازہ کر دی ان جلسوں نے مسٹر بھٹو کو باور کروایا کہ عام انتخابات میں ان کی پارٹی متحدہ محاذ کو کچل کر رکھ دے گی۔

قومی اسمبلی کے انتخابات کے نتائج حکومت کی توقعات کے مطابق نکلے۔ قومی اسمبلی کی کل ۲۰۰ سیٹوں سے پی پی پی نے ۱۵۵ سیٹیں جیت لیں۔ متحدہ محاذ صرف ۳۵ سیٹیں جیت سکا۔ متحدہ محاذ نے حکمران جماعت پر انتخابات میں وسیع پیمانے پر دھاندلی کا الزام عائد کیا۔ احتجاجاً صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات جو ۱۰ مارچ ۱۹۷۷ء کو منعقد ہونا قرار پائے تھے، ان کا بائیکاٹ کر دیا۔ انہوں نے انتخابات کے نتائج منسوخ کرنے اور چیف الیکشن کمشنر اور وزیراعظم کے ہٹائے جانے کا مطالبہ کیا۔

اپنے مطالبات کی حمایت میں متحدہ محاذ نے حکومت کے خلاف عوامی تحریک کا آغاز کر دیا۔ ۱۱ مارچ ۱۹۷۷ء کو ملک گیر ہڑتال کر دی جو کامیاب ثابت ہوئی۔ شورشوں نے پنجاب اور سندھ کو ہلا کر رکھ دیا۔ چوٹی کے متحدہ محاذ کے رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اب متحدہ محاذ نے پاکستان میں نظام مصطفیٰ کے نفاذ کا مطالبہ کر دیا۔

حکومت نے الزام لگایا کہ متحدہ محاذ کو بیرونی امداد مل رہی ہے۔ حکومت اس امر کا اندازہ لگانے میں ناکام رہی کہ اس کی بعض حکمت عملیوں کو معاشرہ کے بعض طبقات ناپسند کرتے تھے۔ اور اس سبب سے متحدہ محاذ کی تحریک ان عناصر کی امداد کو اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب ہوئی۔ بعض علماء نے فتوے جاری کئے کہ سوشلزم جو حکومت کی بعض حکمت عملیوں کی بنیاد تھا، دراصل لادینیت ہے۔ اور اس کو رائج کرنے کا مقصد ملک کو اُس کے اسلامی تشخص سے محروم کرنا ہے۔ ہمارے معاشرہ کے نیم تعلیم یافتہ افراد پر اس کا اثر ہوا۔

مسٹر بھٹو نے ۱۷ ۔اپریل کو پریس کانفرنس کے ذریعے اس کا جواب دیا۔ اسلامی شرعی کونسل کو پھر سے ترتیب دیا گیا۔ شراب نوشی اور گھوڑ دوڑ پر پابندی لگا دی گئی۔ نائٹ کلبیں بند کر دی گئیں۔ دفعہ ۱۴۴ اٹھائی گئی جس کے ذریعے چار سے زائد افراد کے ایک جگہ جمع ہونے پر پابندی تھی۔ پریس اینڈ پبلی کیشن آرڈر جس نے پریس کا گلا گھونٹ رکھا تھا ختم کر دیا گیا۔ بھٹو نے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات دوبارہ کروانے کا اعلان کیا اس نے اعلان کیا کہ اگر حزب اختلاف ان

انتخابات کو جیت گئی تو وہ قومی اسمبلی کا انتخاب دوبارہ کروانے کا حکم دیں گے۔

تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کی خاطر متحدہ محاذ کے حامیوں نے حکومت کے لیے نظم و ضبط کا مسئلہ پیدا کرنے کے لیے اپنی جان کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کیا۔ ملک کے بڑے شہروں میں امن و امان قائم کرنے کے لیے حکومت نے فوج کو طلب کر لیا۔ اس اثنا میں مسٹر بھٹو نے متحدہ محاذ کے رہنماؤں سے مسئلہ کے حل کے لیے بات چیت کی اور کچھ متبادل تجاویز پیش کیں۔ لیکن متحدہ محاذ نے اپنے تین مطالبات پر کسی قسم کی سودے بازی کرنے سے انکار کر دیا۔ حکومت ان مطالبات کو تسلیم نہ کرنے پر مصر رہی۔ چنانچہ گفت وشنید میں تعطل پیدا ہو گیا۔ یو اے ای (متحدہ عرب امارات) کے شیخ زید بن سلطان النہیان اور سعودی عرب کے شاہ خالد کے سفیروں کی کوششوں کے سبب حالات میں قدرے نرمی ظاہر ہوئی۔ ۵ مئی ۱۹۷۷ء کو متحدہ محاذ نے ۳۲ مطالبات کی ایک فہرست جاری کی جس میں آخری شق میں مسٹر بھٹو سے مستعفی ہونے کو کہا گیا۔ متحدہ محاذ کے رہنماؤں نے حکومت کے ساتھ مزید بات چیت سے انکار کر دیا۔

پاکستان میں سعودی عرب کے سفیر شیخ ریاض الخطیب متواتر کوششوں کے باعث دونوں اطراف کو بات چیت کے لیے یکجا کرنے میں کامیاب ہو گئے اور یوں تعطل ختم کر دیا۔ ۱۵ جون ۱۹۷۷ء کو دونوں اطراف نے ایک فارمولا پر اتفاق کر لیا۔ جس کے نتیجہ میں وہ ایک ذیلی کمیٹی بنانے پر متفق ہو گئے۔ جو ایک تفصیلی ڈرافٹ تیار کرے گی اور جسے دونوں اطراف منظور کریں گی۔ متحدہ محاذ کے تمام مطالبات تسلیم کر لئے گئے۔ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔ چنانچہ وہ بعض دوست عرب ممالک کے دورہ پر روانہ ہو گئے۔ دوستانہ علامت کے اظہار کے طور پر متحدہ محاذ نے بھی اپنی تحریک ملتوی کر دی۔ جبکہ حکومت کی طرف سے نظر بند تمام قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔

بہرحال اس طرح حالات کی پیش رفت فوجی طبقوں کے لئے لمحہ فکریہ تھی۔ متحدہ محاذ نے گلی کوچوں میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا تھا۔ اب اس قسم کی افواہیں سننے میں آئیں کہ انہوں نے فوجی کمانڈروں (9) کو مسٹر بھٹو کی حکومت کی اعانت سے باز رکھنے کی سعی کی۔ لوگوں کی کسی قسم کی مراعات سے تشفی نہ ہوئی اور ۲۱ اپریل ۱۹۷۷ء کو مسٹر بھٹو نے لاہور، کراچی، حیدرآباد اور بعد ازاں ملتان میں مارشل لاء لگا دیا۔ اس اثنا میں لاہور ہائی کورٹ میں رٹ درخواست دائر کر دی گئی۔ جس میں مارشل لاء لگانے کو چیلنج کر دیا گیا۔ ۲ جون ۱۹۷۷ء لاہور ہائی کورٹ نے اعلان کیا

9۔ بعض کا خیال ہے کہ متحدہ محاذ کے رہنما مارشل لاء سے ماقبل کے دور میں جرنیلوں سے ملتے رہے ہیں۔
(Betrayal of Another Kind مصنفہ لیفٹیننٹ جنرل چشتی ص ۱۷)

کہ مارشل لاء کا لگانا غیر آئینی ہے۔ وفاقی حکومت نے اس فیصلہ کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کر دی اور درخواست کی کہ لاہور ہائی کورٹ کے احکامات ملتوی کئے جائیں۔ سپریم کورٹ نے درخواست کی سماعت کے لئے ٦ جون کی تاریخ مقرر کی مگر لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے کو ملتوی کرنے کا حکم جاری نہ کیا۔ ٧ جون ١٩٧٧ء کو وفاقی حکومت نے رضا کارانہ طور پر مارشل لاء اٹھالیا۔

فوج پر اعصاب شکن اثرات

فوج کو لاہور میں امن وامان قائم کرنے کے لیے بلایا گیا تھا۔ جہاں بے حد کشیدگی پائی جاتی تھی۔فوج کا مورال عوام کی بعض حرکتوں کی وجہ سے نیچے چلا گیا۔ کیونکہ اس صورتحال میں افواج کو طعنے دیئے جا رہے تھے(10)۔حکومت نے نئے سرے سے انتخابات کا فارمولا مرتب کیا۔لیکن وہ

10۔ (الف) بعض حلقوں نے شہری انتظامیہ کی مدد کرنے پر فوج پر نکتہ چینی کی۔ ہم نے اس نکتہ چینی کو برداشت کیا۔ کیونکہ اسے گزرنے والے لمحات سے تعبیر کیا گیا۔ میں اس امید پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ پیپلز پارٹی اور متحدہ محاذ میں سمجھوتہ کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ ایک دوسرے پر بداعتمادی اور ایمان کا فقدان اس کے اسباب تھے۔ (ضیاء کا پاکستان مصنفہ آر۔ جی۔ ساہنی ص ٨)

(ب) اسی شام جنرل ضیاء نے مجھے بتایا کہ وہ لاہور میں جنرل اقبال کے ہیڈ کوارٹر میں تقریب میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ ہم ١٠۔ اپریل کی صبح لاہور پہنچے۔ اور سیدھے ایئرپورٹ سے کور ہیڈ کوارٹر پہنچے۔ جنرل اقبال ہمارے ساتھ تھے۔ انہوں نے اپنی کور کے علاقہ میں موجود سیاسی حالات کا جائزہ پیش کیا۔ انہوں نے تفصیل سے تینوں بریگیڈیئروں کے طرز عمل کو بیان کیا۔ جن کے یونٹ سول انتظامیہ کی امداد کو بھیجے گئے تھے۔ ان تینوں کا تعلق ایک ہی ڈویژن سے تھا انہوں نے شورش کرنے والی بھیڑ پر فائرنگ کے اثرات بیان کئے۔ اور اسمبلی ہال کے قریب پیش آنے والے واقعہ کا بھی ذکر کیا۔ میجر جنرل آغا ذوالفقار ان بریگیڈیئروں کے انچارج تھے۔ (Betrayal of Another Kind مصنفہ لیفٹیننٹ جنرل فیض علی چشتی۔ص ٤٤)

(ج) کیا ہماری فوج اس قدر نکمی ہوگئی ہے کہ یہ ٢٥ گز کے کم نشانہ پر بھی نہتے شہریوں کو نہیں مار سکتی؟ مسٹر بھٹو نے سوال کیا۔ جنرل چشتی نے جواب میں کہا" جناب! ملتان میں ٤٢ گولیاں برسائی گئیں۔ اور صرف دو افراد کو نشانہ لگا۔ باقی ٤٠ گولیاں کہاں گئیں؟ انارکلی لاہور میں ٤٣ گولیاں برسائی گئیں۔صرف دو کو نشانہ لگا۔ باقی گولیاں کہاں گئیں۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ نشانہ موثر ہونے کی خاطر نہیں لگایا گیا۔

یہاں پر موجود تمام جرنیل آپ کے ساتھ ہیں۔لیکن جو اصل میں نشانہ لگاتے ہیں۔ این سی او یا سپاہی جو حقیقتاً گولی چلاتے ہیں وہ آپ کے ساتھ نہیں ہیں۔ یعنی یہ کہ فوج بظاہر احکام مان رہی ہے۔لیکن اصل میں ایسا نہیں ہے۔ یہ احکامات کو ماننے سے انکار کے مترادف ہے۔ یہ ڈسپلن میں فروگزاشت ہے۔ یہ فوج میں دراڑ کو ثابت کرتا ہے۔ یہ فوج ہے جو ملک کو سالم رکھتی ہے۔ جب اس فوج کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ انڈیا پاکستان کو روند ڈالے گا۔ لہٰذا مہربانی کر کے فوج کو تباہ نہ کریں۔ تین بریگیڈیئروں نے پہلے ہی دھماکا کر ڈالا ہے۔ اب چھوٹے رینک دھماکہ کر رہے ہیں۔ لہٰذا دوبارہ انتخاب کے متعلق سوچیں۔ آپ پھر بھی جیت جائیں گے۔ مہربانی کر کے فوج (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اسے متحدہ محاذ کی رسمی رضا مندی نہ دلا سکی۔

متحدہ محاذ میں یہ خیال پختہ ہو گیا کہ حکومت اس مسئلہ پر طوالت کی راہ اپنا رہی ہے۔ حکومت کے نمائندوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ مسٹر بھٹو کے بیرونی دورہ سے واپسی پر ہی اس فارمولا پر عمل کیا جائے گا۔ بہر حال مسٹر بھٹو کی واپسی پر دونوں اطراف سے بات چیت کا آغاز ہوا گفت و شنید کے بعد پہلی اور دوسری جولائی کو اعلان کیا گیا کہ انتخابی طریق کار پر سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ لیکن چند ہی گھنٹوں کے بعد متحدہ محاذ نے اس سے انکار کر دیا۔ اور بات چیت کو جاری رکھنے کی غرض سے مزید دس نکات اٹھائے۔ مسٹر بھٹو نے ۴ جولائی کی پریس کانفرنس میں نئے دس نکات پر بات چیت کرنے کو تسلیم کر لیا۔ اور اعلان کیا کہ حزب اختلاف اگر منظور کرے تو ہم کل سمجھوتہ پر دستخط کرنے کے لیے آ جائیں گے۔ گولیوں کے ذریعے امن و امان کا قیام ان مسائل کا حل نہیں۔ جن کے لیے سیاسی مذاکرات درکار ہوتے ہیں۔ ان حالات میں فوج کے بعض سینئر اہلکاروں (11) نے اس امر کا نوٹس لیا کہ حکومت اور حزب اختلاف دونوں جانب سے حل کو لٹکائے رکھنا نادرست ہے اور اس صورت میں فرائض کی انجام دہی سے اپنی علیحدگی کا مطالبہ کیا۔

بریگیڈیئر محمد اشرف ۱۰۳ بریگیڈ کے کمانڈر تھے۔ انہیں مئی ۱۹۷۷ء کے لیے اندرونی سیکورٹی (آئی ایس) کی ذمہ داری سونپی گئی۔ ۹ مئی ۱۹۷۷ء کو انہوں نے موجودہ حالات میں آئی ایس کے فرائض انجام دینے سے معذوری کا اظہار کیا اور کہا کہ فوج کی ملازمت میں امن و امان کا ٹھونسنا نامناسب نظر آتا ہے۔ اور اس سے صرف اپنے ہم وطنوں کی غیر ضروری طور پر ہلاکت کا نتیجہ برآمد ہو گا۔ اس نے کہا کہ فوج کی غیر جانبداری کی حیثیت پر برا اثر پڑا ہے۔ اور لوگوں کو غلط پراپیگنڈے نے گمراہ کیا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ اپنے آپ کو اتنا قابل اور پرامید نہیں سمجھتا کہ جو فرائض اس کے سپرد کئے گئے ہیں، ان کو احسن انداز میں نبھا سکے۔ اس نے اپنے فرائض کی ادائیگی کو ایک روز کے لیے بھی جاری رکھنے سے انکار کر دیا۔

بریگیڈیئر نیاز احمد نے بھی سیکٹر ہیڈ کوارٹر میں اندرونی سیکورٹی کے فرائض سر انجام دینے سے

بقیہ صفحہ گزشتہ: میں دراڑیں نہ پڑنے دیں (Betrayal of Another Kind مصنفہ فیض علی چستی ص ۵۷)

(د) اس دراڑ کا اظہار پہلے ہی تین بریگیڈیئروں کے استعفیٰ دینے سے ہو گیا۔ فوج نے فیصلہ کیا کہ جو کچھ عوام کے مفاد میں ہے۔ اور جو کچھ فوج کے لیے بحیثیت ادارہ مفید ہے، کیا جائے مسٹر بھٹو کو ایک گولی بھی چلائے بغیر الگ کر دیا گیا۔ (Betrayal of Another Kind مصنفہ جنرل چشتی ص ۶۶ ـ ۶۷)

11۔ فوج کے تین بریگیڈیئروں نے پہلے ہی استعفیٰ دے دیئے (Betrayal of Another Kind مصنفہ فیض علی چشتی ص ۵۱)

معذوری کا اظہار کیا۔ اسے کمانڈ سے الگ کر دیا گیا۔ انہوں نے بریگیڈیئر اشرف سے مل کر سیکٹر ہیڈ کوارٹر میں دوسرے افسران کے روبرو اپنے فیصلے کی سچائی کی وکالت کرنے کی کوشش کی۔

بریگیڈیئر سعید محمد کو دو آرٹلری رجمنٹوں (۲۶ فیلڈ رجمنٹ اور ۵ فیلڈ رجمنٹ) کا ۲۲ اپریل ۱۹۷۷ء کو انچارج بنایا گیا تاکہ وہ شہری انتظامیہ کی امداد کر سکیں۔ ۲۶ اپریل ۱۹۷۷ء کو ۴ کور کے کمانڈر اور جی او سی نے ۲۶ فیلڈ رجمنٹ کا دورہ کیا۔ کمانڈنگ آفیسر کی بریفنگ سے ظاہر ہوا کہ بریگیڈ کمانڈر نے اس رجمنٹ کو جو کام سپرد کیا، اس کا قابل عمل ہونا ممکن نہیں جب اس طرف اشارہ کیا گیا تو بریگیڈیئر نے اپنے منصوبہ کا دفاع کیا۔ ۴ کور اور دسویں ڈویژن کے کمانڈروں نے منصوبہ کی بعض خامیوں کا ذکر کیا۔ لیکن بریگیڈیئر بضد رہا کہ اس کا منصوبہ درست ہے بالآخر اس نے کہا ''اگر آپ میرے منصوبہ کو ناقابل عمل سمجھتے ہیں تو بہتر ہوگا کہ آپ خود آگے آئیں اور میرے سیکٹر میں حالات پر قابو پانے کے لیے کام کریں میں اس سے بہتر نہیں کر سکتا۔''

بریگیڈیئر اشتیاق علی خان کو ۱۰ مئی ۱۹۷۷ء کو شہری انتظامیہ کی مدد کرنے کے لیے احکامات دیئے گئے۔ اگلے روز اس نے ایک ماہ کی رخصت کی درخواست دے دی اور ساتھ ہی اس کے ہمراہ دوسری درخواست میں فوج سے سبکدوشی کے لیے التجا کی گئی۔ جو اسباب بیان کئے گئے وہ بھی اس کے اس نظریہ کے گرد گھومتے نظر آئے کہ موجودہ سیاسی کش مکش میں فوج کو درست طور پر استعمال میں نہیں لایا گیا۔

ملک میں امن و امان کے مسائل نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔ ہر جگہ سکیورٹی ناپید تھی۔ عام طور پر لوگ شام کے بعد گھروں میں ہی رہتے۔ راولپنڈی میں پشاور روڈ جہاں ہر قسم کی ٹریفک موجود ہوتی، ویران تھی اور کبھی کبھار کوئی گاڑی سڑک پر نظر آتی۔ کسی نامعلوم خطرہ کی آمد کو محسوس کیا جا رہا تھا۔ ۲ جولائی ۱۹۷۷ء سے مارشل لاء کے انعقاد تک بہت سے لوگوں نے مشاہدہ کیا کہ آسمان پر سرخی کے نمودار ہونے سے ایسے لگتا ہے جیسا کہ طوفان جمع ہو رہا ہے اور قیامت نمودار ہونے والی ہے۔

فوج سیاسی مذاکرات کے عمل کو ناکام ہوتا دیکھ رہی تھی۔ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ماہ جون میں جنرل چشتی کے گھر میں ایک خفیہ منصوبہ بنام 'آپریشن فیئر پلے'(12) تیار کیا گیا۔ جس پر عمل چار

12۔ (الف) جون کے آخری ہفتہ میں میں نے فیصلہ کیا کہ مسٹر بھٹو کی حکومت کو ختم کیا جائے ''آپریشن فیئر پلے'' کا منصوبہ میری رہائش گاہ میں تیار کیا گیا۔ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ ''آپریشن فیئر پلے'' کے لیے تاریخ اور وقت کا تعین سی او اے ایس کریں۔ یہ ہم نے اپنے تک محدود رکھا۔ یہاں تک کہ سی جی ایس کو بھی نہ بتایا۔ میرے سٹاف افسران کو بھی علم نہ تھا۔ (Betrayal of Another Kind مصنفہ لیفٹیننٹ جنرل چشتی ص ۷۱)

اور پانچ جولائی کی رات کے دوران ہوا۔ مسٹر بھٹو کو معزول کر دیا گیا۔

5 جولائی ۱۹۷۷ء کی شب کو ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ اور لوگوں نے ہر جگہ سکھ کا سانس لیا(13)۔ دکانداروں، خوانچہ فروشوں، غریب اور امیر غرض یہ کہ اکثریت نے مسرت کا اظہار کیا۔ جنرل ضیاء الحق نے بطور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر(14) پاکستان میں اقتدار کو سنبھال لیا۔ کسی جگہ سے احتجاج نہ ہوا اور کوئی گولی نہ چلی۔ یہ پرامن انتقال اقتدار تھا۔ کیونکہ لوگ ایسا ہی چاہتے تھے۔

مارشل لاء کی رات

۴ جولائی ۱۹۷۷ء کو میں تھک چکا تھا اور مجھے کام کے غلبہ کے سبب بے خوابی کا عارضہ تھا مجھے ڈاکٹر نے رات کے وقت سکون آور کیپسول نگلنے کو کہا تا کہ میں کچھ آرام کر سکوں۔ نصف شب کے قریب میری خوشدامن نے مجھے جگایا میجر جنرل کے ایم عارف کی طرف سے اہم فون کال ہے۔ جو اس وقت جی ایچ کیو میں ملٹری سیکرٹری (ایم ایس) تھے۔ اگر چہ میری خوشدامن نے بتلایا کہ میں سویا ہوں پھر بھی انہوں نے کہا کہ مجھے ہر صورت جگایا جائے۔ جب میں نے فون اٹھایا تو انہوں نے کہا "فوراً سیدھے میرے دفتر پہنچو اور یونیفارم میں آؤ" میں سمجھ گیا کہ مارشل لاء کا نفاذ ہو گیا ہے۔ پچھلے چند روز سے اندرونی صورت حال اس قدر خراب ہو چکی تھی کہ مسٹر بھٹو کے ہاتھ سے کنٹرول نکلا جا رہا تھا یہاں تک کہ اس کی پارٹی پر بھی اس کا اختیار نہیں رہا تھا۔ نہ ہی اس کی پارٹی کے افراد کا اپنے اپنے حلقہ انتخاب میں اثر ورسوخ رہا تھا۔ متحدہ محاذ طاقتور ہو چکا تھا اور مسٹر بھٹو کے اقتدار کے ایام بظاہر گنے چنے رہ گئے تھے۔

میں نے اپنی سرکاری گاڑی کو طلب کیا اور ملٹری سیکرٹری کے دفتر میں پہنچا۔ جی ایچ کیو خاموش تھا۔ صرف حفاظتی روشنیاں جل رہی تھیں۔ عام طور پر دن کے دوران نظر آنے والی بھاگ دوڑ ناپید تھی۔ یہ ایک تاریک رات تھی۔ باہر کے کسی شخص کو معلوم نہ تھا کہ جی ایچ کیو میں کیا ہو رہا ہے۔ چند فوجی سٹاف کاریں اور جیپیں کار پارک میں کھڑی تھیں۔ چند ڈرائیور اُونگھ رہے تھے۔ غالباً انہیں بھی معلوم نہیں تھا کہ کیا کچھ ہو رہا ہے۔ جب میں ملٹری سیکرٹری کے دفتر میں داخل ہو رہا تھا میں نے سی او

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

(ب) ضیاء کا پاکستان مصنفہ آر جی ساہنی ص ۸

13۔ مارشل لاء کے نفاذ پر حلوہ پکایا گیا اور پورے ملک میں تقسیم کیا گیا۔ اطمینان کا احساس پیدا ہوا اور یوم نجات منایا گیا (Betrayal of Another Kind مصنفہ جنرل چشتی ص ۱۷)

14۔ مارننگ نیوز راولپنڈی 6 جولائی 1977ء

اے ایس اور میجر جنرل ریاض ایڈ جوٹنٹ (جنرل) (اے جی) جنرل کو نکلتے دیکھا۔ میں نے سلام کیا تو سی او اے ایس نے کہا کہ اے جی مجھے بریف کریں گے۔ لہٰذا میں اور اے جی اجلاس میں چلے گئے۔ ہم دونوں کو وزیراعظم کی قیام گاہ سے مسٹر بھٹو کو حفاظت سے جنرل ہیڈ کوارٹر لانے کا کام سونپا گیا ہمیں ساتھ اس امر کا یقین کرنا تھا کہ اس کام کے لیے طاقت کے استعمال سے گریز کیا جائے۔

میرے زیر کمانڈ ۳۲ ملٹری پولیس (ایم پی) واحد یونٹ تھی اور اسے میجر ندیم کمانڈ کر رہے تھے۔ بقیہ ایم پی کی تمام یونٹیں فارمشینوں کے کنٹرول میں تھیں اور پرووسٹ مارشل کو صرف ٹیکنیکل کنٹرول حاصل تھا۔ میں ۳۲ ایم پی کو بوقت ضرورت استعمال کر سکتا تھا۔ لیکن دوسری ایم پی یونٹوں کو استعمال کرنے سے قبل فارمشینوں سے اجازت لینا لازمی تھی (15)۔

جناب بھٹو سے ملاقات کا منصوبہ

میں نے میجر ندیم سے اس کے دفتر میں ملاقات کی اور اپنے منصوبے پر بات چیت کی ہمیں صرف اور صرف مسٹر بھٹو کو جنرل ہیڈ کوارٹر تک پہنچانا تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ جنرل ریاض مسٹر بھٹو کو ان کی رہائش گاہ پر ملیں گے اور اطلاع دیں گے کہ ملک میں مارشل لاء کا نفاذ ہو چکا ہے۔ اور فوج نے اقتدار سنبھال لیا ہے۔ اور جنرل ضیاء الحق نے بطور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اقتدار سنبھال لیا ہے۔ اور پھر مسٹر بھٹو سے التماس کی جائے گی کہ وہ ان کے ہمراہ جنرل ہیڈ کوارٹر تشریف لے چلیں۔ بظاہر یہ سب کچھ بہت سادہ نظر آ رہا تھا لیکن وزیراعظم ہاؤس پر ۶ بلوچ رجمنٹ کا سخت پہرہ تھا۔ میجر جنرل امتیاز علی جو وزیراعظم کے ملٹری سیکرٹری تھے، ان کا تعلق اسی رجمنٹ سے تھا۔ اس کے علاوہ فیڈرل سیکورٹی فورس اور پولیس بھی تھی۔ یہ تینوں عناصر وزیراعظم یا اس کے ملٹری سیکرٹری کے احکام پر ہمارے خلاف ہتھیار بخوبی استعمال کر سکتے تھے۔ ان تمام امکانات کو سامنے رکھ کر ہم نے منصوبے کا آغاز کیا۔ جس میں صرف مسٹر بھٹو کو حفاظت سے لے جانا تھا۔ ہم نے یہ سب کچھ ذہن میں رکھ کر متعدد افراد ساتھ نہ لیے جس سے سکیورٹی گارڈز کی جانب سے مسلح مزاحمت کو کچلنے کا اندیشہ ہو سکتا تھا۔ جب میں نے مسلح مزاحمت کی طرف اشارہ کیا تو ایڈ جوٹنٹ جنرل نے جواب دیا کہ اگر مزاحمت ہوئی تو جنرل چشتی کی کمان تلے ۱۰ کور اس کا جواب دے گی۔ میں نے پھر کہا کہ اگر مسٹر بھٹو نے ذاتی طور پر مزاحمت کی تو کیا ہوگا؟ تو اے جی نے جواب دیا کہ

15۔ بریگیڈیئر راحت لطیف اپنی تبدیلی کے وقت جی ایچ کیو میں میجر جنرل اختر عبدالرحمان ایجوٹنٹ جنرل کے ماتحت پاکستان افواج کے پرووسٹ مارشل تھے۔ ان کے ماتحت تمام ملٹری پولیس تھی۔ (Betrayal of Another Kind مصنفہ لیفٹیننٹ جنرل چشتی ص ۹۵) جنرل چشتی نے غلط بیانی کی ہے۔

ہم موقع کی مناسبت سے اس کا فیصلہ کریں گے۔

اب مجھ پر یہ بات واضح تھی کہ ہمیں صرف مسٹر بھٹو کو جنرل ہیڈ کوارٹر تک اپنی محافظت میں لے جانا تھا۔ اور تمام حالات میں طاقت کے استعمال سے گریز کرنا تھا بجز اس کے کہ مسٹر بھٹو کی زندگی کو خطرہ درپیش ہو۔ لہٰذا میں نے افراد کو تین حصوں میں بانٹا۔ ایڈ جوئنٹ جنرل، میں اور ملٹری پولیس کے دو افراد سب سے اگلی والی جیپ میں ہوں گے جو اپنے ذاتی ہتھیاروں سے مسلح ہوں گے۔ دوسری جیپ میں ۳۲ ایم پی کے کمانڈنگ آفیسر میجر ندیم ہوں گے۔ اور تیسری جیپ میں جونیئر کمشنڈ آفیسر مع دو ملٹری پولیس کے افراد ہوں گے۔ ایم پی کے افراد مناسب طور پر مسلح ہوں گے۔ ہتھیار نکلوائے گئے اور محافظین کو جنرل ہیڈ کوارٹرز کی طرف سے مزید احکامات تک تیار رہنے کا حکم دے دیا گیا۔ میں خود جنرل ہیڈ کوارٹر اگلے احکامات لینے کے لئے چلا آیا۔ یہ بے حد تشویشناک لمحات تھے۔ ہم خاموش تھے اور آنے والے واقعات سے بے خبر۔ میرے ذہن میں بہت کچھ آ رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ اگر منصوبہ ناکام ہو گیا تو کیا ہوگا۔ اگر مسٹر بھٹو نے مزاحمت کی یا اس کے محافظین نے فائر کھول دیا تو بہت سی زندگیوں کا ضیاع ہوگا۔ میجر جنرل ریاض مطمئن اور طبعی حالت میں تھے۔ رات کے بقیہ حصہ کے لیے ہم سی او اے ایس کے پرائیویٹ سیکرٹری بریگیڈیئر خاور لطیف بٹ کے پاس رہے۔ سی او اے ایس سیکرٹریٹ سرگرمیوں سے معمور تھا۔ لیکن کسی قسم کی غیر ضروری حرکت دیکھنے میں نہ آ رہی تھی۔ لاء سیکرٹری اور سیکرٹری اطلاعات (16) کو ان کے گھروں سے جنرل ضیاء الحق کو ملنے کے لیے محافظین کی معیت میں لایا گیا۔

وہ گھبرائے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ انہیں چائے کی پیالی پیش کی گئی۔ اور جلد ہی انہوں نے جان لیا کہ وہ محفوظ ہیں۔ اور تشویش کا کوئی سبب نہیں۔ انہوں نے فوراً اپنے گھروں کو فون پر اطلاع دی کہ ہر طرح خیریت تھی۔

جنرل ضیاء نے فیصلہ کیا کہ وہ مسٹر بھٹو سے بات (17) کریں گے اور انہیں حالات سے آگاہ

16۔ جب آپریشن فیئر پلے اختتام پذیر ہوا تو میں جنرل ہیڈ کوارٹرز میں جنرل ضیاء کو رپورٹ کرنے کے لیے گیا۔ میں وہاں مسعود نبی نور وفاقی سیکرٹری اطلاعات و براڈ کاسٹنگ کو ملا انہیں گھر سے طلب کیا گیا تھا تا کہ نیوز بلیٹن لکھیں جسے ریڈیو پر نشر کیا جائے۔ (Betrayal of Another Kind مصنفہ لیفٹیننٹ جنرل چشتی ص ۷۵)

17۔ اس اثنا میں سبز سرکٹ پر فون کی گھنٹی بجی۔ اور جنرل ضیاء نے فون اٹھا لیا۔ لائن پر مسٹر بھٹو تھے۔ انہوں نے جنرل ضیاء کو کہا کہ کیا ہو رہا ہے؟ جنرل ضیاء نے ان کو بتلایا کہ انہوں نے اختیارات سنبھال لیے ہیں اور یہ کہ مسٹر بھٹو اب وزیر اعظم نہیں رہے۔ فوراً بغیر کسی توقف اور بغیر کسی تشویش یا شک کے اگلا سوال آیا۔ اس کے لیے کیا احکامات ہیں؟ جنرل ضیاء نے انہیں بتایا کہ بہت جلد ایک جرنیل کی محافظت میں وہ مری جائیں گے۔ (Betrayal of Another Kind مصنفہ جنرل لیفٹیننٹ جنرل چشتی ص ۷۳)

کریں گے کہ انہوں نے ملک کا اختیار سنبھال لیا ہے۔ اور وہ ان سے تعاون کریں۔ انہوں نے یہ بھی بتلایا کہ تمام سیاسی رہنماؤں کو زیر حراست لے لیا گیا ہے۔ تا کہ مارشل لاء حکومت سازگار حالات پیدا کر سکے۔ جس میں عام انتخابات کا انعقاد کروایا جا سکے۔ جیسا کہ بعد میں بتلایا گیا کہ مسٹر بھٹو کلیتاً حیرت زدہ ہو گئے۔ ایک زیرک انسان کی مانند اس نے مزاحمت نہ کی۔ اور سی ایم ایل اے کے احکامات کے مطابق تعاون کیا۔

میں نے پہلے ذکر کیا ہے کہ ۶ بلوچ رجمنٹ وزیراعظم ہاؤس پر سلامتی کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ وزیراعظم کے ملٹری سیکرٹری اس یونٹ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اس بناء کے سبب انہیں بہت سے مالی فوائد دیئے گئے تھے۔ اس یونٹ نے کسی قسم کی مزاحمت نہ کی۔ لہٰذا مسٹر بھٹو کو جنرل ہیڈ کوارٹر تک محافظت میں لے جانے کا منصوبہ ترک کر دیا گیا۔ اور اس کی بجائے ان کے ملٹری سیکرٹری میجر جنرل امتیاز کو جی ایچ کیو (18) میں طلب کر لیا گیا۔

میجر جنرل امتیاز علی نے ذاتی طور پر مسٹر بھٹو اور ان کی فیملی کی مری روانگی کے انتظامات کے متعلق بریف کیا۔ انہیں مری کے گورنمنٹ ہاؤس میں قیام کرنا تھا۔ وزیراعظم کے لیے مجاز تمام سہولتیں ان کو مہیا کی گئیں بعض ذاتی (19) وجوہات کے سبب سی ایم ایل اے نے مسٹر بھٹو کو اسی روز دوپہر کے بجائے (20) بعد سہ پہر رخصت ہونے کی اجازت دے دی۔ جب 5 جولائی 1977ء کو دن کے وقت مسلح افواج نے ملک کی قیادت سنبھالی تو اس وقت سابق وزیراعظم (21)

18۔ انہوں نے فون لگایا اور آپریٹر کو کہا کہ میجر جنرل امتیاز سے ان کی بات کروائیں۔ اس وقت تک فون کام کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد آپریٹر نے مسٹر بھٹو کو بتایا کہ ان کے گھر سے پتہ چلا ہے کہ وہ پہلے ہی جی ایچ کیو کے لیے روانہ ہو چکے ہیں۔ (وزیراعظم بھٹو کے آخری ایام مصنفہ کوثر نیازی ص ۲۳۲)

19۔ جنرل ضیاء نے مسٹر بھٹو کو بتلایا کہ ایک جرنیل ان کو مری تک معاونت کریں گے۔ لیکن ان کی فیملی وزیراعظم ہاؤس میں رہے گی۔ جہاں سے انہیں صبح لاڑکانہ بھیج دیا جائے گا۔ مسٹر بھٹو نے جنرل ضیاء سے کہا کہ کیا وہ آج کی رات وزیراعظم ہاؤس میں قیام کر سکتے ہیں؟ کیونکہ ان کے بچے آج کی رات ان کے پاس پہنچے ہیں۔ اور وہ صبح سویرے چلے جائیں گے۔ جنرل ضیاء نے بغیر کسی توقف کے کہا کہ وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ (Betrayal of Another Kind مصنفہ جنرل چشتی ص ۷۳)

20۔ جنرل ضیاء دل سے انتخابات کروانا چاہتے تھے اور اسی طرح ہم اور کور کمانڈرز بھی۔ مسٹر بھٹو کو پوری پوری عزت اور احترام دیا گیا۔ انہیں ۵ جولائی ۱۹۷۷ کو دن کے دوران مری لے جایا گیا۔ وہاں میجر جنرل اختر عبدالرحمان خان نے استقبال کیا اور ایک خط (ڈی او نمبر ۵/۸/۲۱۴ پی اے بتاریخ ۷ جولائی ۱۹۷۷ء) مجھے تحریر کیا کہ جیسا کہ چاہا گیا میں نے مری کے گورنمنٹ ہاؤس میں مسٹر بھٹو کا استقبال کیا۔ مسٹر بھٹو تھکے ماندے اور ٹوٹے پھوٹے بوجھل آنکھوں میں نظر آئے۔ (Betrayal of Another Kind مصنفہ جنرل چشتی ص ۷۴)

21۔ جنرل ضیاء نے بعض سیاسی رہنماؤں کے نام دیئے۔ اس کے ساتھ بعض سرکاری اہلکاروں کے نام (اگلے صفحہ پر)

ذوالفقار علی بھٹو اور ان کی کابینہ کے کچھ ساتھی اور پی این اے کے اعلیٰ رہنماؤں کو عارضی طور پر حفاظتی تحویل میں لے لیا گیا۔

۵ جولائی کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے قوم سے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر خطاب کیا۔ اس نے کہا ''میں مکمل طور پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ نہ تو میرے کوئی سیاسی عزائم ہیں اور نہ ہی فوج کو اس کے پیشہ سے بدراہ کیا جائے گا'' مجھے سیاسی رہنماؤں کے پیدا کردہ خلا کو پُر کرنے کے لیے آنا پڑا'' میں نے اس چیلنج کو ایک سچے مسلمان سپاہی کی مانند قبول کیا ہے۔'' انہوں نے کہا ان کا واحد مقصد آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کا انعقاد ہے۔ اور انہیں امید ہے کہ تمام سیاسی جماعتیں ان کے ساتھ تعاون کریں گی۔ انتقال اختیارات انتخاب کے بعد منتخب نمائندوں کو سپرد کر دیئے جائیں گے، وہ حلفی شہادت دینا چاہتے ہیں کہ وہ اس شیڈول سے ذرہ بھر نہیں پھریں گے۔ آگے تین ماہ کی مدت ان کی پوری توجہ انتخابات (22) کے انعقاد پر مرکوز رہے گی۔ اور وہ تمام طاقت اور توانائیاں بطور سی ایم ایل اے کسی اور طرف مبذول نہیں کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ ملک میں محاذ آرائی اور عوامی جوش و خروش کے باعث پیدا شدہ تشویشناک صورت حال کو ٹھنڈا ہونے کے لیے کچھ وقت درکار ہوگا۔ اسی سبب فوری طور پر تمام سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ بہر حال سیاسی سرگرمیاں انتخابات سے قبل شروع ہو جائیں گی انہوں نے کہا کہ شہری انتظامیہ کی امداد کے لیے بعض اطراف سے افواج پاکستان کو نکتہ چینی کا نشانہ بنایا گیا۔'' اس نکتہ چینی کو یہ سمجھ کر برداشت کیا کہ یہ گزرنے والا وقفہ ہے۔ میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان پیپلز پارٹی اور متحدہ محاذ کے درمیان بداعتمادی اور باہمی بدعہدی کے باعث صلح و صفائی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ملک کو افراتفری اور مزید انتشار سے

(بقیہ گزشتہ)

تھے۔ انہیں حفاظتی نگرانی میں لینا تھا۔ یہ تمام بریگیڈیئر امتیاز وڑائچ کو عمل کے لیے بھیج دیئے گئے۔ میں اس وقت بریگیڈ ہیڈ کوارٹرز میں موجود تھا جب بریگیڈیئر امتیاز وڑائچ نے ڈی ٹیچ منٹ کمانڈروں کو یہ احکامات دیئے۔

(Betrayal of Another Kind مصنفہ جنرل چشتی ص ۷۵)

22۔ مسٹر بھٹو کے ساتھ ایم ایس اور اے ڈی سیز کا سوال بعد ازاں ایم ایل اے کے اجلاس میں زیر غور آیا۔ اور عمومی رائے یہ تھی کہ ان سہولتوں کو واپس لے لیا جائے۔ جنرل ضیاء نے ان کے جاری رہنے کا حکم دیا اور دلیل دی کہ چونکہ یہ موجودہ قوانین کے تحت دو ہفتے کے لیے منظور کیا گیا تھا۔ انہیں بتلایا گیا کہ عمومی حالات میں قوانین کے تحت ایسا ہوتا ہے لیکن آپریشن فیئر پلے کے سبب یہ قوانین زائل ہو گئے۔ جنرل ضیاء نے اتفاق کیا۔ اگلے اجلاس میں ہم ایم ایل اے جنرل ضیاء کو یہ سہولیات واپس لینے کے لیے مجبور کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ سہولتیں مسٹر بھٹو کو دو ہفتہ کے لیے میسر رہیں۔ اگر جنرل ضیاء کی نیت انتخابات کروانے کی نہ ہوتی۔ وہ پہلے ہی روز سے یہ سہولیات واپس لے لیتے۔

(Betrayal of Another Kind مصنفہ جنرل چشتی ص ۷۴)

بچانے کی خاطر فوج کو اقدامات کرنے پڑے ہیں(23)۔

پاکستان میں لوگ عموماً تبدیلی کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ اچھی ہو یا بری اسے جلد آنا چاہیے۔ جب مارشل لاء کا نفاذ ہوا تو سکھ کا سانس لیا گیا۔ پھر لوگوں نے سرگوشیاں شروع کر دیں کہ اب ملٹری کی حکومت کب تبدیل ہو گی۔ بالآخر فوج کے خلاف ناپسندیدہ احساسات کا آغاز ہو گیا۔ جب ملک میں سیاسی حکومت آتی ہے تو لوگ ملک میں مارشل لاء کی باتیں شروع کر دیتے ہیں یہ ہماری تاریخ ہے۔ اور گزشتہ غلطیوں سے کچھ سبق سیکھنے کی بجائے ہم وہی انداز اپنا رہے ہیں۔

انتخابات کا اعلان اور التواء

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی جانب سے قومی انتخابات کا اعلان کر دیا گیا۔ جسٹس مولوی مشتاق حسین کو چیف الیکشن کمشنر مقرر کیا گیا۔ الیکشن کمیشن نے اس امر کی ضرورت کو محسوس کیا کہ افواج پاکستان کے افراد کو بذریعہ ڈاک رائے دہی کے حق سے نوازا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ پیغام رسانی کا وسیع نظام اور اسے قائم رکھنے کے لیے افرادی قوت کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ وہ فوراً انتخابات کے نتائج کو جمع کرے اور یکجا کرنے کے اقدام کرے ان انتظامات کو مکمل کرنا کثیر افراد کی امداد کے بغیر ممکن نہ تھا۔ اس فوجی امداد کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے جی۔ ایچ۔ کیو کی طرف سے الیکشن کمیشن کے انتظامی پینل پر نامزد کر دیا گیا۔ یہ کام مجھے اپنے ڈی پی ایس اور پی ایم کے فرائض کے علاوہ سرانجام دینا تھا۔ میں نے اس کام کے لئے اپنے ڈائریکٹوریٹ سے افرادی قوت کو استعمال کیا اور پی ایس ڈائریکٹوریٹ کے اندر ایک فوجی انتخابی سیل نے کام کرنا شروع کر دیا۔ جب ہمیں چیف الیکشن کمیشن کی طرف سے عرضداشتیں موصول ہونی شروع ہوئیں۔ تو ان پر عمل کرنے سے قبل میں ایڈجوٹنٹ جنرل اور چیف آف جنرل سٹاف کو مطلع کر دیا کرتا۔

سگنل ان چیف کے مشورہ سے پیغام رسانی کے ایک وسیع منصوبہ کو مرتب کیا گیا۔ اور چیف آف جنرل سٹاف میجر جنرل عباسی کی منظوری کے بعد چیف الیکشن کمشنر کے سامنے پیش کیا گیا اور

23۔ ملک کو بچانے کی غرض سے اور اس افراتفری سے مزید انتشار میں اُلجھنے سے محفوظ رکھنے کے لیے فوج کو اقدامات کرنے پڑے۔ جن کے سبب مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت اختتام کو پہنچی۔ (مارننگ نیوز جولائی ۶، ۱۹۷۱ء ص ۱) جنرل ضیاء نے کہا تھا کہ افواج پاکستان نے اس سے قبل مداخلت نہیں کی تھی۔ اگرچہ مشکل اوقات میں مواقع تھے اور ہم ثابت کرنا چاہتے تھے کہ سیاسی مسائل کے حل سیاسی انداز میں ہونے چاہیے۔ لیکن جب سیاسی مذاکرات ناکام ہو گئے جو بے حد طویل تھے تو مداخلت کرنا پڑی۔ لیکن اس مداخلت کو محدود مقصد کے لیے قرار دیا گیا اور شیڈول کے مطابق مقاصد کے حصول کا فیصلہ کیا گیا۔ (مارننگ نیوز اگست ۱۳، ۱۹۷۷ء)

انہوں نے بھی اس کی منظوری دے دی۔

ڈاک کے ذریعے فوج کے افراد کے لیے ووٹ کی ترسیل کے انتظامات کو الیکشن کمیشن نے ایک کتابچہ میں مرتب کیا اور ڈائریکٹوریٹ میں ہم نے اسے آخری شکل دی اگرچہ الیکشن کمیشن نے تمام انتظامات مکمل کر لیے لیکن انتخابات بدقسمتی سے ملتوی کر دیئے گئے۔

ایک اہم ذمہ داری

اب میں ضلع راولپنڈی کے سب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے اپنے نہایت ہی اہم اور نازک فرض کی طرف آتا ہوں جس کا تعلق مسٹر بھٹو کی راولپنڈی جیل میں حراست اور اسیری سے ہے دراصل قومی اہمیت کے اس واقعہ میں میری شمولیت نے ہی مجھے اس کتاب کے یہ صفحات تحریر کرنے کے لیے تحریک دی۔ میرا اس واقعہ سے اپنی سرکاری حیثیت میں تعلق تھا۔ میرا ضمیر بالکل مطمئن ہے کہ میں نے نہایت ہی ایمانداری اور قانون کے دائرہ میں رہ کر اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے کام کیا۔ میں نے اس عظیم واقعہ میں اپنی سرکاری حیثیت میں تمام حالات کو ایمانداری اور وضاحت سے بیان کیا ہے۔ میں فیصلہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑتا ہوں۔ جو ہر چیز کو دیکھتا ہے اور جانتا ہے۔ یہ قدرتی امر ہے کہ ایسے سنگین لمحات میں کرداروں کے بیانات کی سچائی اور درستگی کو پرکھے بغیر کچھ بھی کہا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات وہ لوگ جو خود قصور وار ہوتے ہیں ایسے وقت میں یہ سوچ کر کہ لوگوں کے پاس وقت اور ارادہ نہیں ہوگا کہ وہ سچائی کو دریافت کریں، دوسروں پر الزام تراشی شروع کر دیتے ہیں۔ اب جبکہ دھول بیٹھ چکی ہے۔ اور درمیانی عرصہ میں بہت سا وقت گزر چکا ہے لوگ ان بڑے واقعات پر نظر ڈال سکیں گے۔ اور زیادہ غیر جانبداری اور بغیر طرف داری سے کام لے سکیں گے۔

ایک سو گیارہ انفنٹری بریگیڈ کی قیادت

میں اپنے ڈائریکٹوریٹ میں کانفرنس میں مصروف تھا کہ میجر جنرل بخاری جو جی ایچ کیو میں ملٹری سیکرٹری کے عہدے پر فائز تھے، نے ٹیلیفون پر بتایا کہ میں ایک سو گیارہ انفنٹری بریگیڈ گروپ کی اگلے دو دن کے اندر کمانڈ سنبھال لوں۔ اس مختصر اطلاع پر اقدام کرنا بے حد مشکل تھا۔ جب میں نے جنرل بخاری کو اس امر کی وضاحت پیش کی تو انہوں نے اتفاق نہ کیا۔ حکم تو حکم ہوتا ہے۔ اگر جی ایچ کیو ایسا چاہے کہ دوسری جگہ جانے سے قبل چارج کو مناسب انداز میں چھوڑنا ضروری نہیں تو کوئی سوال کرنے کی میری کیا جرأت تھی۔ میں نے اپنے ڈپٹی کرنل وزیر ملک کو اپنی ذمہ داریاں تفویض

کر کے بریگیڈیئر ممتاز ملک کے پاس جو پرانے دوست تھے 111 بریگیڈ ہیڈ کوارٹر رپورٹ کر دی۔ کمانڈ کے فرائض کے علاوہ وہ راولپنڈی ضلع کے سب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی تھے۔ مارشل لاء فرائض کے لیے ان کا الگ دفتر تھا جو ٹیلی فون اور ٹیلی گراف دفتر میں واقع تھا جہاں ان کے بریگیڈ کا عملہ مکمل طور پر مارشل لاء کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ میں نے بریگیڈیئر ممتاز سے اس فوری تعیناتی کے لیے پوچھا۔لیکن انہوں نے لاعلمی ظاہر کی۔ انہیں فرنٹیئر فورس رجمنٹل سنٹر ایبٹ آباد کی کمانڈ سنبھالنے کے لیے جانا تھا۔ بریگیڈیئر ممتاز نے بریگیڈ کے عملی اور تربیتی معاملات کے متعلق مجھے سات روز بریف کیا۔ نیز مارشل لاء کے فرائض سے آگاہ کیا۔جس میں راولپنڈی جیل کے لیے سکیورٹی انتظامات بھی شامل تھے جہاں مسٹر بھٹو سپریم کورٹ آف پاکستان میں زیر سماعت اپیل کے دوران نظر بند تھے۔ سپریم کورٹ میں لاہور ہائی کورٹ کی جانب سے سزائے موت دیئے جانے کے بعد مسٹر بھٹو کی اپیل زیر سماعت تھی۔ چنانچہ میں نے بریگیڈ کی کمانڈ سنبھال لی۔لیکن بریگیڈیئر ممتاز لیفٹیننٹ جنرل چشتی جو کور کمانڈر تھے، کی بیرون ملک سے واپسی تک ہیڈ کوارٹرز میں مقیم رہے۔

جیل میں موجود تمام سکیورٹی انتظامات جو مسٹر بھٹو کے لیے کئے گئے تھے نہایت احتیاط سے تیار کئے گئے تھے۔ اور ۲۷ پنجاب رجمنٹ بہت ذمہ داری سے یہ کام سرانجام دے رہی تھی۔ چنانچہ کوئی ایسی صورت پیدا نہ ہوئی کہ سکیورٹی کے ان انتظامات کو مزید سخت کیا جائے یا ان میں کسی قسم کا اضافہ کیا جائے۔لیکن جب بھی مسٹر بھٹو کی زندگی کو یا ان کی سکیورٹی کے خطرات میں اضافہ ہونے لگتا تو مناسب منصوبہ بندی فوراً کر دی جاتی۔

میں نے اپنے کام کا پروگرام کچھ اس طرح بنایا کہ صبح کے اوقات حسبِ سابق بریگیڈ گروپ میں آپریشن، تربیت اور انتظامی امور کی طرف توجہ دیتا اور دوپہر کے کھانے کے بعد میں اپنی توجہ ایس ایم ایل اے کے ہیڈ کوارٹر میں کام کی طرف دیتا تاکہ کمانڈ اور مارشل لاء کے کام میں کسی قسم کی ملاوٹ نہ ہو۔ میں کسی بھی فوری توجہ طلب اور ان جانے واقعہ سے نپٹنے کے لیے اپنے شیڈول کو ڈھال سکتا تھا۔ ان انتظامات نے مجھ پر کافی بوجھ ڈالا لیکن یہ انتظام کامیابی سے چلا۔ اپنے لیے صرف ایک ہی وقفہ ۵ بجے تا ۶ بجے تک نکال سکا۔ جب میں لیفٹیننٹ کرنل رحمان کے ساتھ سکوائش کھیلتا۔

کور کمانڈر کا استقبال

ایک روز بریگیڈیئر ممتاز نے مجھے بتلایا کہ جنرل چشتی بیرونی ممالک کے دورہ سے واپس پہنچ رہے

ہیں۔ چنانچہ انہوں نے تجویز کیا کہ ہم دونوں اسلام آباد ہوائی اڈہ پر ان کا استقبال کریں۔ میں نے ان سے کہا کہ ہم کس حیثیت سے ان کا استقبال کریں؟ انہوں نے کہا ''کہ راولپنڈی میں صرف ایک ہی فارمیشن کمانڈ رہے۔ لہٰذا مناسب ہوگا کہ ہم بھی ان کا استقبال کریں۔'' اگرچہ یہ پروٹوکول میں فرائض کا حصہ نہ تھا۔ میں پھر بھی ممتاز ملک کی تجویز پر رضا مند ہو گیا۔

بریگیڈیئر ممتاز ملک کے جنرل چشتی کے ساتھ اچھے مراسم تھے۔ بریفنگ کے دوران انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کور کمانڈر کو مارشل لاء کے معاملات کے متعلق اطلاعات دیتے رہتے تھے جب ضروری ہوتا ان سے ہدایات حاصل کرتے تھے۔ ان اسباب کے باعث جنرل چشتی کے دفتر تک ان کی آزادانہ رسائی تھی۔ بہرحال میں اس منطق کے پیچھے دلائل نہ سمجھ سکا۔ کیونکہ جنرل چشتی مارشل لاء کی کمانڈ میں شامل نہ تھے۔ میں نے ممتاز کی باتوں کو غور سے سنا اور خاموش رہا میرے سامنے دو راستے تھے۔ ایک تو اس راستہ پر چلنا جس پر ممتاز چل رہا تھا اس کا فائدہ یہ تھا کہ اس طرح کور کمانڈر میرے ساتھ خوش رہتے۔ کیونکہ انہیں مارشل لاء کی انتظامیہ کے متعلق اطلاعات موصول ہوتی رہتیں۔ اگرچہ یہ ڈیوٹی ان کے فرائض میں شامل نہ تھی۔ لیکن پھر بھی جنرل چشتی کو بے حد پسند تھی۔ اس کا نقصان یہ تھا کہ مارشل لاء کے احکامات کی زنجیر جنرل چشتی سے ہدایات موصول ہونے کے سبب متاثر ہو سکتی تھی۔ اس طرح میں دوہری کمانڈ کے بھنور میں پھنس جاتا۔ ایک مارشل لاء کے کمانڈ کا واسطہ اور دوسرے کور کمانڈر کی جانب سے بلاواسطہ احکامات۔ میرے لئے دوسرا راستہ یہ تھا کہ میں دونوں کمانڈ کو علیحدہ رکھوں اور ایک کمانڈ کے آرڈرز یا فرائض کو دوسرے کمانڈ کے ساتھ دخل اندازی نہ کرنے دوں۔ میں نے دوسرا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا جو بعد ازاں بدقسمتی سے مجھے معلوم ہوا کہ جنرل چشتی کو ناگوار گزرا۔

غروب آفتاب کے بعد رات گئے میں اور ممتاز جنرل چشتی کے استقبال کے لیے ہوائی اڈہ گئے۔ جہاز کی آمد کا اعلان ہوا تو ہم دونوں دوسرے سول اور فوجی اہلکاروں کے ہمراہ جنرل کے استقبال کی خاطر آگے بڑھے۔ جہاز کا دروازہ کھلا تو جنرل چشتی اپنی بیوی کے ہمراہ جہاز کے ساتھ لگائی گئی سیڑھیوں سے نیچے اترے۔ پروٹوکول کے مطابق قطار میں کھڑے افسران نے ان کا خیر مقدم کیا۔ چونکہ ہم سرکاری استقبال کرنے والوں کا حصہ نہ تھے۔ اس لئے ہم قطار کے آخر میں کھڑے ہو گئے۔ مجھے دیکھ کر جنرل چشتی بظاہر خوش تھے۔ شاید انہوں نے سوچا کہ میں پرووسٹ مارشل کی حیثیت سے انہیں خوش آمدید کہنے کے لیے آیا ہوں۔ انتظار گاہ کی طرف بڑھتے ہوئے انہوں نے ممتاز ملک سے امن و امان کی عام صورت حال کے متعلق دریافت کیا۔ ممتاز نے یہ کہتے

ہوئے کہ ہر طرح سے خیر و عافیت ہے۔ یہ انکشاف کیا کہ انہوں نے بریگیڈ کی کمانڈ مجھے سونپ دی ہے۔ اس لمحہ سے لے کر آگے تک جنرل چشتی سنجیدہ ہو گئے اور مجھ سے بات نہ کی۔ وی آئی پی لاؤنج میں کچھ دیر جنرل چشتی صحافیوں کے سوالات کے جواب دینے میں مصروف رہے۔

وی آئی پی لاؤنج سے نکلتے ہوئے جنرل چشتی نے ممتاز سے کہا کہ بریگیڈ کی کمانڈ تا حکم ثانی مجھے نہ دی جائے۔ اس کے جواب میں بریگیڈیئر نے کہا کہ وہ پہلے ہی چارج چھوڑ چکے ہیں۔ آنکھوں کی چمک اور آواز میں ناراضگی سے جنرل چشتی نے بریگیڈیئر کو کہا کہ تاحکم ثانی کوئی قدم نہ اٹھایا جائے۔ بہرحال میں نے پہلے ہی کمانڈ سنبھال لی تھی اور مارشل لاء کے فرائض سنبھال لئے تھے۔ اور ممتاز نے فرنٹیئر فورس رجمینٹل سنٹر کی کمانڈ کے احکامات وصول کر لئے تھے۔ اب انہیں بریگیڈ ہیڈکوارٹر میں انتظار کرنا تھا۔ تاآنکہ کور ہیڈکوارٹر کی جانب سے روانگی کی اجازت نہ مل جائے۔ ہم دونوں کے لیے ایسا ایذا رسانی کا باعث تھا۔ لیکن دوستی کے ناطے ہم نے اس کی چنداں پروا نہ کی۔ اوپر کیا ہوا ہمیں کچھ نہیں بتلایا گیا۔ اگلے دو تین روز میں بریگیڈیئر ممتاز کو کور ہیڈکوارٹر کی جانب سے کلیر کر دیا گیا اور وہ ایبٹ آباد روانہ ہو گئے۔

میرا مارشل لاء کا تجربہ

جنرل یحییٰ خان کے مارشل لاء کے دوران مجھے خصوصی فوجی عدالتوں کو چلانے کا تجربہ ہو چکا تھا۔ جس وقت میں ملتان میں دسویں فرنٹیئر فورس رجمنٹ کا کمانڈنگ افسر تھا تو مجھے محکمہ خاندانی منصوبہ بندی کے ایک آفیسر کے مقدمہ کی سماعت کا موقع ملا جو رشوت لیتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔

وہ قصوروار ثابت ہوا تو اسے اس بنا پر سزا دے دی گئی۔ جب سزا سنائی گئی تو مجرم کو پسینہ آنے لگا۔ اور جہاں وہ کھڑا تھا زمین پر گر پڑا اسے پانی کا گلاس دیا گیا۔ اور تھوڑے وقفہ کے بعد اسے جیل بھیج دیا گیا۔ لیکن مجھے مارشل لاء کے انتظامات کا کوئی تجربہ نہ تھا۔

بظاہر اس نئی صورت حال میں میں بڑا محتاط تھا اور مجھے مارشل لاء انتظامی امور کو سیکھنا تھا۔ میں یہاں ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے ضلعی افسران کی ایک بے حد عمدہ ٹیم میسر آئی جو میرے ساتھ کام کرتی تھی۔ یہ انہی کی دل و جان سے کی گئی محنت کا نتیجہ تھا کہ میں نے لازمی امور توقع سے کہیں کم عرصہ میں سیکھ لیے۔ مناسب ہوگا کہ میں اپنی ٹیم کے افراد میں سے چند ایک کا ذکر کروں:

سعید مہدی راولپنڈی کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ ان کا اخلاق، رویہ، قوت فیصلہ اور زندگی گزارنے

کا انداز ایک آفیسر کے شایان شان تھا۔ وہ واقعی عاقل انسان تھے۔ جن کی نصیحتیں ہمیشہ کار آمد ثابت ہوئیں۔

جہانزیب برکی سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ اور ایک خدا ترس آفیسر تھے جو عوام کے ساتھ درست طور پر پیش آتے۔ وہ ملازمت کے لیے وقف تھے۔ وہ ہمیشہ پولیس والوں کو رات کی ڈیوٹی کے دوران اچانک ذاتی طور پر چیک کرتے وہ اپنے ماتحت کام کرنے والوں کے مفادات کا خیال رکھتے۔ لیکن ساتھ ساتھ ان سے پیش آنے میں سخت رویہ کا مظاہرہ کرتے۔

راجہ محمود سپرنٹنڈنٹ پولیس سپیشل برانچ تھے۔ وہ بھی خدا ترس انسان تھے۔ وہ اپنے سابقہ تجربات کی ان گنت کہانیاں سناتے۔ اس سے ہمارا سفر دلچسپ طریقہ سے گزر جاتا۔ ان کا کام انٹیلی جنس کا حصول تھا۔ وہ اپنے فرائض کی روشنی میں بے شمار چیزوں پر توجہ رکھتے۔

ایف آئی ملک ڈویژنل کمشنر تھے۔ میرا ان کے ساتھ سرکاری رابطہ قلیل تھا۔ میں نے مشاہدہ کیا کہ اگر چہ وہ بول چال میں نرم خو انسان دکھائی دیتے تھے۔ لیکن اپنے رویہ میں سخت گیر تھے۔ پیشہ وارانہ طور پر وہ ایک قابل انسان تھے۔

اصغر ملک ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس تھے۔ جن سے بالواسطہ طور پر میرا سرکاری رابطہ کم ہوتا تھا۔ میں نے انہیں ایک دانا انسان پایا جو مسائل کے حل میں درست اقدامات اٹھاتے تھے۔

راولپنڈی میں سب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے پہلے روز تین بجے سہ پہر میرے سٹاف آفیسر کیپٹن بھٹی نے مجھے اطلاع دی کہ بہت سے لوگ مجھ سے ملاقات کے منتظر ہیں۔ میں نے دریافت کیا کہ لوگوں کی شکایات کی نوعیت کیا ہے۔ اس نے کہا کہ لوگ خود اپنی شکایات بیان کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ لوگ میرے روزمرہ کے کام کے اختتام تک انتظار کریں۔ زیادہ تر ڈاک لمبی لمبی شکایات پر مشتمل تھی۔ جن کے ہمراہ فراہم کردہ ثبوت تھے۔ کام ختم کرنے کے بعد میں نے مارشل لاء کے کام کی طرف توجہ دی۔ پہلی ہی شکایت کا مطالعہ کرتے ہوئے میں نے ایک عورت کو چیختے ہوئے سنا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ وہ صبح سے یہاں انتظار کر رہی ہے۔ وہ کئی روز سے اس دفتر میں آ رہی ہے۔ لیکن کسی نے اس کی بات نہیں سنی۔ میں نے اسے سٹاف آفیسر کے پاس بھیج دیا تاکہ اس کی شکایت سنے۔ پھر میں نے سٹاف آفیسر کو کہا کہ مجھے ملنے کے خواہشمند افراد کو اندر لائیں۔ شکایت کرنے والا شخص ایک عمر رسیدہ فرد تھا۔ جس کے ہمراہ اس کے دو بیٹے تھے۔ میں نے بوڑھے شخص کو کہا کہ وہ اپنا مسئلہ بیان کرے۔ اس نے مشکل سے اپنا بیان شروع کیا تھا کہ ایک نوجوان نے دخل دیتے ہوئے وضاحت کرنی شروع کی مجھے اس کو خاموش رہنے کے لیے کہنا

پڑا۔ تا کہ شکایت کنندہ اپنا بیان جاری رکھ سکے۔ شکایت کنندہ نے درخواست کی کہ اس کے دو ساتھیوں میں سے ایک کو اس کی طرف سے بیان جاری رکھنے کی اجازت دیں۔ میں نے اس کی عرضداشت کو منظور کر لیا۔ یہ قصہ جائیداد کی تقسیم کا مسئلہ تھا۔ مجھ سے ملنے والا اگلا شخص ادھیڑ عمر کا ایک مرد تھا۔ جس کے ہمراہ تین ساتھی تھے۔ یہ مسئلہ بھی پہلے کی مانند بیان کیا گیا۔ اگر چہ میں نے کہا کہ صرف شکایت کنندہ ہی بیان کرے۔ لیکن آنے والے ساتھی تشریح کرتے رہے۔ اس کا تعلق ایک ناکام شادی سے تھا۔ والدین اپنی بیٹی کو اپنے خاوند کے ہمراہ جانے کے لیے اجازت دینے پر تیار نہ تھے۔ اس کے بعد والے کیس میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت اپنے بیٹے کے ہمراہ سامنے آئی۔ یہاں بھی شکایت کنندہ سے اس کے ساتھ آنے والے ساتھی کیس کے متعلق بولتے رہے۔ یہاں ان کے ہمسایوں سے جھگڑے کا مسئلہ تھا۔

ہر روز اس طرح برہم کرنے والی شکایات میرے سامنے پیش کی جاتی رہیں میں نے سوچا کہ شکایت اگر درست ہو تو شکایت کنندہ کو خود پیش کرنی چاہیے۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ شکایت کرنے والے افراد مجھے شخصی طور پر ملیں اور ان کے ہمراہ کوئی دوسرا فرد نہیں ہونا چاہیے۔ اس سے حالات درست ہونے میں مدد ملی۔ یہ صاف ستھری انتظامی صورت تھی۔ ایس ایم ایل اے کا دفتر اب مچھلی منڈی کی مانند لوگوں کی بھیڑ جمع ہونے سے بچ گیا۔ اس نئے طریق کار سے میں معاملات کو جلد نپٹانے میں کامیاب ہو گیا۔

ایک نئی اختراع جسے میں نے اپنایا وہ یہ تھی کہ میں نے شکایات سیل بنایا۔ اس کے لیے کسی اضافی سٹاف کی ضرورت نہ تھی۔ اپنے دونوں افسران میں سے میجر شبیر کو اس کا انچارج بنا دیا اور لیگل برانچ کے ایک پولیس انسپکٹر کو شبیر کی مدد کے لیے تعینات کر دیا گیا۔ وہ ہر درخواست کو نمبر دیتے اور شکایات والے رجسٹر میں اس کی مختصر روئیداد تحریر کرتے۔ سیل اپنی سفارشات بھی دیتا جسے روئیداد سے قبل دیباچہ کے طور پر لکھا جاتا ہر روز وہ شکایات پیش کرتے۔ جسے شکایات والے رجسٹر میں درج کیا جاتا۔ اور میں فیصلہ کرتا۔ جب روئیداد ناکافی ہوتی۔ میں اصل شکایت کو مکمل طور پر پڑھتا۔ اور پھر میں فیصلہ کو شکایات رجسٹر میں لکھ دیتا۔ جس پر میرا اعملہ عمل درآمد کرواتا۔ اپنی ہفتہ وار کانفرنسوں میں اپنے سٹاف کے سامنے میں اپنے فیصلوں کا جائزہ لیتا۔ تا کہ ہر معاملہ میں پیش رفت کو دیکھ سکوں۔ اس لیے کوئی مسئلہ بھی بے توجہی کا شکار نہ ہوتا۔ بعینہٖ اسی طرح میں نے بحیثیت ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سرگودھا میں بھی کام سرانجام دیا۔

عام طور پر معاملات کی نوعیت گھریلو انداز کی ہوتی۔ اکثر واقعات میں شکایات سیل دونوں

جانب کے افراد کو طلب کرتا اور تنازعہ کو خوش اسلوبی سے طے کروا دیتا۔ اور اس طرح سول عدالتوں کے اخراجات اور مصائب سے بچت ہو جاتی۔ سنجیدہ معاملات مثلاً قتل، اغوا اور دوسروں کی جائیداد پر زبردستی قبضہ جیسے تنازعات کی مکمل طور پر چھان بین کی جاتی۔ اور اس کے بعد فوجی عدالت میں سماعت کا حکم صادر کیا جاتا۔ گھریلو تنازعات کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ کیونکہ مارشل لاء عدالتوں میں منصفانہ کم خرچ اور جلد فیصلہ صادر کیا جاتا۔ جب سی ایم ایل اے نے فوجی عدالتوں میں نجی تنازعات کی کم از کم مداخلت کا حکم صادر فرمایا۔ اور یہ کہ انہیں سول عدالتوں کو سماعت کے لیے بھیجا جائے۔ عوام نے اسے ناپسند کیا اور مارشل لاء حکام کے سامنے آنسوؤں اور سسکیوں کے ساتھ اس حکم کے خلاف عرضداشتیں دیں۔ لیکن بدقسمتی سے کسی نے کچھ نہ سنا۔ کیونکہ حکم حکم ہی ہوتا ہے۔

سخت گیر جرنیل

ایک روز میں کور کمانڈر کی جانب سے ٹیلی فون موصول ہونے پر حیرت زدہ رہ گیا۔ میں نے ''حیرت زدہ'' کا لفظ اس لئے استعمال کیا ہے۔ کیونکہ انہوں نے اس سے قبل مجھے کبھی فون نہ کیا تھا۔ جب کور کمانڈر سے بات کا آغاز ہوا تو ان کی آواز میں ناراضگی تھی اور انہوں نے بے حد درشتی سے کلام کیا۔

''میں نے واہ فیکٹری کی سمت مسافروں سے بھری ہوئی چند گاڑیاں سیاہ جھنڈے لہراتے تیز رفتاری سے گزرتے دیکھی ہیں۔ یہ سب کچھ کیا ہے؟ میں امن و امان کی بگڑتی ہوئی صورت کو ہرگز اس طرح دیکھنا پسند نہیں کرتا'' انہوں نے کہا۔ میں نے جواباً کہا ''ہاں جناب! میں نے بھی اُن گاڑیوں کو دیکھا مگر اُن میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی پھر بھی میں اِسے چیک کر لیتا ہوں۔''

چونکہ برکی ایک موثر پولیس کمانڈر تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ان مسافر گاڑیوں کے بارے میں یقیناً جانتے ہوں گے۔ اور انہیں معلوم ہوگا یہ گاڑیاں امن و امان کا کس طرح مسئلہ کھڑا کر سکتی ہیں۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ یہ گاڑیاں مسافروں کو گولڑہ شریف لے جا رہی تھیں۔ تاکہ مسافر ایک بزرگ کے سالانہ عُرس کی تقریبات میں شمولیت کر سکیں۔ میں نے بعد میں کور کمانڈر کو مطلع کر دیا۔ جنہوں نے صرف کہا 'بہت خوب'

ایک دوسرے معاملہ میں کور ہیڈ کوارٹر نے ایک سو گیارہ انفنٹری بریگیڈ گروپ کے آفیسر کے خلاف انضباطی کارروائی کے لیے کہا۔ میرے پیشرو بریگیڈیئر ممتاز ملک نے پہلے ہی کور ہیڈ کوارٹر کو مطلع کر دیا تھا کہ مذکورہ آفیسر کے خلاف کسی انضباطی کارروائی کی ضرورت نہیں۔ کور ہیڈ کوارٹر کی

سوچ کے مطابق اس معاملہ کا تصفیہ بریگیڈیئر ممتاز ملک کی کمانڈ کے وقت میں نہ ہوا۔ یہ امر تاسف انگیز ہے کہ یہ معاملہ مجھے بھیج دیا گیا۔ میں نے کور ہیڈ کوارٹر کو مطلع کیا کہ تمام معاملہ بریگیڈیئر ممتاز ملک کے دور میں ظہور پذیر ہوا اور انہوں نے مذکورہ آفیسر کو بے گناہ پایا۔ چنانچہ یہ بے انصافی ہوگی کہ میں نئے سرے سے متعلقہ آفیسر سے نپٹوں۔ خاص طور پر جبکہ میں حقائق نہیں جانتا۔ چنانچہ میں نے تجویز پیش کی کہ یا تو اس معاملہ کو سرے سے ختم کرایا جائے۔ یا پھر کور کمانڈر اپنے قانونی اختیارات کو کام میں لا کر متعلقہ آفیسر کے خلاف انضباطی کارروائی کریں۔ مجھے فی الفور جواب موصول ہوا جس میں مجھے ہدایت کی گئی کہ متعلقہ آفیسر کے خلاف اقدامات کریں۔ میں پھر سے نہایت نرمی کے ساتھ اپنے سابقہ جواب پر جما رہا۔

ہر سال کے آغاز پر تربیت کے واقعات کا شیڈول بنایا جاتا اور اسے شائع کیا جاتا۔ اسے اعلیٰ ہیڈ کوارٹر سے نیچے والے ہیڈ کوارٹر تک بھیجا جاتا۔ میں نے کور ہیڈ کوارٹر کی ہدایت کے مطابق اپنی بریگیڈ سگنل Exercise کا منصوبہ ۱۹۷۸ء کے موسم سرما کے مہینوں کے لیے بنایا۔ یکطرفہ تربیت چلانے کی خاطر کافی تعداد میں اعلیٰ افسران اور جونیئر کمشنڈ افسروں کو منصفین کے فرائض سونپے گئے۔ وہ غیر جانبدار افسروں پر مشتمل جماعت ہوتی ہے۔ جو پہلے سے منصوبہ بندی کی گئی تربیت کو درست طور پر چلنے کا اہتمام کرتی ہے۔ اس تربیت کا مقصد بنیادی طور پر افسروں کی منصوبہ بندی کی اہلیت کا جائزہ لینا ہوتا ہے۔ اور اس میں کمانڈ کے مختلف سطحوں کے افسروں کو شامل کیا جاتا ہے۔ بہرحال اس کام میں پیغام رسانی کی خوبی کا امتحان ہو جاتا ہے۔ اس قسم کی تربیتوں میں ہمیشہ اعلیٰ درجہ کے ہیڈ کوارٹروں کے کمانڈر مشق کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ تاکہ اپنے ماتحت کمانڈروں کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کا جائزہ لے سکیں۔ تربیت کے آغاز سے قبل کئی روز تک بے حد محنت سے کام کیا جاتا ہے۔ ڈائریکٹر کی حیثیت میں نے اس تربیت کا سوچا۔ اس کی منصوبہ بندی کی اور پھر سب کچھ تربیت کی شکل میں تحریر کیا۔ میرے بریگیڈ کے افسران نے اپنی نیندیں قربان کر کے اپنے اپنے فرائض سرانجام دیئے۔ ان میں سے ہر ایک کو میں نے پابند اور فرض شناس پایا۔

جب تربیت کا آغاز ہوا تو ایک ہی آفیسر جو کور ہیڈ کوارٹر سے تشریف لائے وہ کرنل امتیاز بھٹی تھے جو جنرل سٹاف کے کرنل تھے اگرچہ کور کمانڈر کا بریگیڈ کی مستعدی کا جائزہ لینے سے تعلق تھا۔ اس لیے انہیں ذاتی طور پر مشق کا جائزہ لینے کے لیے خود آنا چاہیے تھا۔

کور کمانڈر اپنے فارمیشن کمانڈروں کی تربیت کے ذمہ دار تھے۔ میرے لیے کسی تربیت اور تجویز کو کام میں نہ لائے۔ بریگیڈ کمانڈر کی حیثیت سے میں نے اپنے بٹالین کمانڈروں کے لیے

سگنل تربیت کا انتظام کیا۔ کور کمانڈر نے زیادہ تر سیاسی حالات میں بطور وزیر اپنے آپ کو مصروف رکھا۔ اور اپنی کمانڈ میں تربیت کو بھلا دیا۔ اس پس منظر میں کور کمانڈر میری پیشہ ورانہ صلاحیتوں کا جائزہ لینے کے لیے سالانہ خفیہ رپورٹ میں کچھ بھی تحریر کرنے کے اہل نہیں تھے۔ انہوں نے تو میرے بریگیڈ کی اہم تربیت میں تشریف لانے کی زحمت گوارا نہ کی۔

جب میری ترقی ہوئی اور مجھے 17 ڈویژن کی کمانڈ سونپی گئی تو روانگی سے قبل کور کمانڈر نے کسی ضیافت کا بندوبست نہ کیا۔ اس قسم کی ضیافت فوج میں ایک بے حد پرانی روایت ہے۔ اور اچھے سپاہی اس پر عمل کرتے ہیں۔ لیکن مجھے اس روایتی سرفرازی سے محروم رکھا گیا۔ کئی برس بعد جب میں پاکستان ملٹری اکیڈیمی کی کمانڈ کر رہا تھا تو میں نے نئے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل جہان داد ملک جو مجھے ملنے کیلئے تشریف لائے تھے، کو اس بات سے مطلع کیا۔ جنرل جہان داد ملک کو بے حد افسوس ہوا۔ اور جونہی وہ واپس راولپنڈی گئے تو انہوں نے اس ضیافت کے انتظام کے بندوبست کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ مجھے فاریشن شیلڈ پیش کی گئی۔ جو مجھے ساڑھے تین برس قبل دی جانی چاہیے تھی۔ میں نے اپنی جوابی تقریر میں افسروں اور دیگر مہمانوں کی اطلاع کی خاطر اس قصہ کو سنایا۔ میں جنرل جہاں داد کا مشکور ہوں جنہوں نے ایک اچھے سپاہی کی طرح روایات کی پاسداری کی۔

کور کمانڈر کا ایک سو گیارہ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کا دورہ

جنرل چشتی نے میرے ہیڈ کوارٹر کا سالانہ انتظامی معائنہ کیا یہ معائنہ سٹاف افسروں کے معائنہ اور آخر میں کمانڈروں کے معائنہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ کور ہیڈ کوارٹر سے سٹاف افسران ایک روز پہلے ہی آ گئے اور تفصیل کے ساتھ تمام معائنے کئے۔ دوسرے روز کور کمانڈر آ گئے۔ میں نے انہیں اپنے دفتر میں بریف کیا۔ اور بریگیڈ کے چند مسائل پیش کئے۔ وہ اپنے خیالات کے اظہار میں مہربان تھے۔ اور انہوں نے پوچھا کہ کس صورت میں میری اعانت کر سکتے ہیں۔ ان کے رویہ میں اچانک تبدیلی میرے لیے حیرت انگیز تھی۔ معلوم نہیں مسٹر بھٹو کا مقدمہ ان کے لیے تشویش ناک ثابت ہو رہا ہو یا پھر ان کا مقصد کوئی اور تھا کہ میرے ساتھ دوستانہ مراسم سنوارنے کے خواہشمند تھے۔ جیسے میں پہلے بتا چکا ہوں۔ جنرل چشتی نے پہلے تو مجھ پر دباؤ کا آغاز کیا اور نامناسب طریقے اپنا کر مجھے ڈرایا دھمکایا۔ جب میں نہ دبا تو اپنے غلط احکامات کو منوانے کی کوشش میں اب انہوں نے نرمی کا رویہ اپنایا جس کے لیے میں ان کا مشکور ہوں۔ وہ ایک گھنٹہ تک میرے دفتر میں رہے۔ دوسری مرتبہ میرے ہیڈ کوارٹر کا دورہ کرنے کا شاید ان کے پاس وقت بھی نہ تھا۔

عید جیسے مواقع پر سینئر کمانڈر کے پاس جانا ایک عام رسم ہے۔ ایسے موقع پر پہلے سے وقت لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک تو عید الفطر اور دوسرے کسی کی ترقی ہو جانے پر پیشگی اجازت نہیں لی جاتی۔ لہٰذا میں اور میری بیوی عید الفطر کے موقع پر جنرل چشتی کے گھر گئے یہ رسم ہے کہ مہمان بہت تھوڑے وقت کے لیے قیام کرتے ہیں۔ ہم سے قبل آنے والے مہمان رخصت ہو گئے۔ اور ہم پہنچ گئے۔ کور کمانڈر زیادہ تر اپنی ذات کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ یا پھر جنرل ضیاء الحق کی طرف سے عطا کردہ وزارتوں میں پائی جانے والی گندگیوں کا تذکرہ چلتا رہا۔ انہوں نے مسٹر بھٹو کے مقدمہ کی سماعت کا بھی ذکر کیا۔

فوج کو اپنے پیشہ ورانہ کام میں مصروف رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ تا آنکہ وہ مکمل طور پر مارشل لاء فرائض کی ادائیگی میں مصروف ہو جائیں۔ اس صورت میں یونٹیں تربیت کے کام میں مصروف رہتی ہیں۔ ۲۷ پنجاب اور بلوچ رجمنٹیں صرف مارشل لاء فرائض سر انجام دینے میں مصروف تھیں۔ دوسری دو رجمنٹیں تین فرنٹیئر فورس اور فرسٹ پنجاب بنیادی طور پر گارڈ رجمنٹیں تھیں۔ جنہیں رسمی تقریبات اور سیکورٹی گارڈ کے فرائض کے لیے کام میں لایا جاتا تھا۔ یہ اکثر صدر اور وزیراعظم کی سرکاری رہائش گاہوں پر متعین کی جاتی تھیں۔ لہٰذا ان دونوں کو بھی مصروف رکھنا لازمی تھا۔

کمانڈ سنبھالنے کے بعد میں نے تمام بریگیڈ کی یونٹوں کو حرکت میں آنے کا حکم دے دیا تاکہ وہ کم وقت میں فیلڈ کے نامزد علاقہ میں مورچہ سنبھال لیں۔ ان کی جگہوں کو میرے پیشرو نے سوچ سمجھ کر مقرر کیا تھا۔ ان کے رکھنے کا مقصد کسی فوجی یونٹ کی بغاوت کے خطرہ سے نپٹنا تھا۔ خاص طور پر ان میں سے کوئی اگر راولپنڈی۔ اسلام آباد کی طرف پیش قدمی کریں۔ لہٰذا اس اقدام کا مقصد ان جڑواں شہروں کی جانب جانے والے راستوں پر نگاہ رکھنا تھا۔ عوام میں افراتفری سے بچنے کے لیے میں نے یہ تربیت رات کے موقع پر منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ افواج کو اپنی جگہوں پر رکھا گیا۔ اور پھر واپسی کا حکم دیا گیا۔ تاکہ صبح سے قبل وہ اپنی بارکوں میں آ جائیں۔ یہ کلیتاً پیشہ وارانہ فائدہ کی بات تھی کہ خاص تربیت کا اہتمام کیا گیا۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ میں نیا تھا۔ اور میں جاننا چاہتا تھا کہ اندرونی خلفشار کی صورت میں کیسے کام چلے گا۔ اس تربیت کا ایک اور مقصد وائرلیس کی عدم موجودگی کا امتحان تھا۔ اور رات کے موقع پر فوج کا استعمال۔

جونہی بریگیڈ یونٹیں باہر نکلیں تو میرے گھر کے نمبر پر فون آنے شروع ہو گئے۔ میں تو گھر میں موجود نہ تھا۔ البتہ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر نے جواب دے دیا کہ بریگیڈ نائٹ ایکسرسائز میں مصروف ہے۔ مجھے پیغام ملا کہ ڈائریکٹر انٹر سروسز انٹیلی جنس سے فوراً رابطہ ٹیلی فون کریں۔ میں نے ایسا

کیا۔ استفسار ہوا کہ کیا ہو رہا ہے؟ میں نے وضاحت کی اور ڈی جی آئی ایس آئی کی تسلی ہو گئی بظاہر ایک طرح کی افراتفری تھی۔ اور یہ اس کے بعد پتہ چلا کہ ایک سو گیارہ انفنٹری بریگیڈ کے کمانڈر پر نظر رکھی جا رہی تھی۔

میری حفاظت

ایس ایم ایل اے کی حیثیت سے میں اپنی رہائش گاہ پر سیکورٹی گارڈ رکھنے کا مجاز تھا۔ اس شق کو بطور خاص ایس ایم ایل اے اور اس کے خاندان کی زندگیوں کو ملک کے وزیراعظم کے مقدمہ کی سماعت کے خطرات کے پیش نظر لاگو کیا گیا۔ یہ انتظام اس صورت میں غیر معمولی تھا۔ کیونکہ سیکورٹی گارڈ کی سہولت میجر جنرل اور اس کے اوپر درجہ کے فیلڈ کمانڈر کو مہیا کی جاتی تھی۔ میں تو حاصل کردہ رہائش گاہ میں مقیم تھا۔ جس میں گارڈ کے رہنے کے لیے انتظام نہ تھا۔ لہٰذا میں اسے مناسب نہ سمجھتا تھا کہ سیکورٹی گارڈ کو اپنی رہائش گاہ پر مقرر کروں اس لیے میں اسی گھر میں پرانے انتظامات کی طرح مقیم رہا۔ اور یہ صورت ہمیں معمول کے مطابق نظر آئی۔ ایک روز مجھے ڈی جی آئی ایس آئی میجر جنرل محمد ریاض خان کا فون آیا۔ جس میں مجھے اپنی رہائش گاہ پر سیکورٹی گارڈ متعین کرنے کے متعلق کہا گیا۔ میں نے کہا ''جناب! میں اس احتیاط کو ضروری خیال نہیں کرتا۔'' وہ بضد رہے کہ مجھے ضرور یہ احتیاط کرنی چاہیے۔ میں نے ان سے اتفاق کیا۔ لیکن اس پر عمل نہ کیا۔ چند روز بعد انہوں نے پھر سے دریافت کیا کہ میں نے اب تک کیوں سیکورٹی گارڈ کو متعین نہیں کیا۔ میں نے پھر عرض کیا کہ میں جلد بندوبست کرلوں گا۔ اس دفعہ انہوں نے مجھے کہا کہ شام کو میں اِن سے ان کے گھر پر ملاقات کروں۔ مقرر وقت پر میں جب ان سے ملاقات کے لیے گیا تو وہ باہر ہی لان میں میرا انتظار کر رہے تھے۔ ہم نے مارشل لاء فرائض کی ادائیگی کے متعلق خیالات کا تبادلہ کیا۔ پھر انہوں نے وضاحت کی کہ مجھے اور میرے خاندان کے لیے سیکورٹی میں اضافہ بے حد ضروری ہے۔ میں نے بیان کیا کہ میں پہلے ہی دو سال سے اسی گھر میں قیام پذیر ہوں۔ چونکہ ایک سو گیارہ بریگیڈ کمانڈر کی رہائش کے لیے کوئی خاص تعین نہیں کیا گیا اس لیے اس گھر کو بدلنا مناسب نہیں اور مزید گھر نہ تھا۔ اس گھر میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں گارڈ کو رکھا جا سکے۔ میں نے یہ بھی بیان کیا کہ میں اس علاقہ میں بغیر گارڈ کے کافی عرصہ سے رہ رہا ہوں اگر میں گارڈ کو رکھنا شروع کر دوں تو میرے ہمسائے اور دوسرے لوگ میرے بارے میں انوکھی باتیں کریں گے کہ میں نے اب خطرے کے احساس کو محسوس کرتے ہوئے گھر میں گارڈ کو رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں

معمول کے مطابق فرائض ادا کر رہا ہوں اور مجھے کوئی خطرہ نہیں۔ گارڈ کی تعیناتی سے میں بزدل نظر آؤں گا۔ مجھے فرائض کی ادائیگی میں یا اس کے بغیر باہر نکلنے کے سبب گارڈ کو چھوڑنا ہوگا۔ اس وقت تو میں لوگوں کی بھیڑ کے سامنے جا سکتا ہوں۔ خواہ دن کا یا رات کا کوئی بھی وقت ہو۔

ان تحفظات کے علاوہ میں نے جنرل سے کہا کہ وہ میری اور میرے بچوں کی زندگی کے متعلق کیوں اتنے متفکر تھے۔ جبکہ کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل چشتی جو بالواسطہ طور پر مجھ سے تعلق رکھتے تھے، انہوں نے ایک مرتبہ بھی مجھے تجویز نہیں دی۔ جنرل چپ ہو گئے اور پھر کہنے لگے کہ انہیں حیرت ہوئی ہے کہ انہوں نے سیکورٹی کے انتظامات کرنے کی ہدایت کیوں نہیں کی۔ بہرحال انہوں نے کہا کہ وہ اس سلسلہ میں کور کمانڈر سے بات کریں گے۔ نتیجتاً انہوں نے کہا ''اپنے سٹاف آفیسر کو کہیں کہ وہ ایک آدمی کو سادہ کپڑوں میں چوبیس گھنٹے تمہارے گھر کی نگرانی کے لیے مقرر کریں۔'' میں نے ان سے کہا کہ ''یہ بھی ممکن نہیں کیونکہ کوئی بھی غیر معمولی تبدیلی توجہ کا سبب بنے گی۔ دراصل میری اپنی ماتحت کمانڈ ہی سب سے قبل اس کے متعلق بات کرے گی۔ دوسرے گارڈ کو کس طرح بریف کیا جائے گا کہ گارڈ کا رکھنا بریگیڈیئر کے لیے کیوں ضروری ہے۔ اسے دوسروں سے چھپایا نہیں جا سکے گا۔'' انہوں نے میری مشکلات کا احساس کیا اور اس پر مزید زور نہ دیا۔

لہٰذا میں نے کبھی گارڈ کا بندوبست نہ کیا۔ یہاں تک کہ میں نے اپنے ڈرائیور کو بھی جی۔ ۳ رائفل ہر وقت رکھنے کی ہدایت نہ کی جس کے لیے میں مجاز تھا۔ نہ ہی کور کمانڈر اور نہ ہی اس کے سٹاف نے مجھے کوئی ہدایت کی کہ بڑھتے ہوئے خطرات کے پیش نظر محتاط رہیں۔ لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ جنرل ریاض نے در پردہ اپنے ہی دائرہ کار میں سے میری رہائش گاہ کی دیکھ بھال کا بندوبست کر دیا۔ لیکن اس مفروضے کو ثابت کرنے کے لیے میرے پاس کوئی شہادت نہیں۔ میرے متعلق ان کی سوچ کا یہ نتیجہ ہے کہ اس قسم کا خیال میرے ذہن میں آتا ہے۔ وہ گہری سوچ رکھنے والے انسان تھے۔ اگرچہ انہیں معلوم تھا کہ میں کسی بھی خطرے کو خاطر میں نہیں لاتا۔ انہیں میری زندگی کو خطرہ کا زیادہ احساس تھا۔ اور غالباً یہ مسٹر بھٹو کے مقدمہ کی سماعت کے باعث تھا۔ انٹر سروسز انٹیلی جنس کا سربراہ ہونے کے ناطے سے انہیں عام واقفیت رکھنے والے افراد سے زیادہ معلومات حاصل تھیں۔ میں ان کا بے حد مشکور ہوں۔

جب جنرل ریاض فوت ہو گئے تو ان کی تدفین کے لیے فوجی تقریبات کا انتظام کرنے کا مجھے اعزاز حاصل ہوا۔ میں فوجی ہیلی کاپٹر میں ان کے جسم خاکی کو ان کے آبائی گاؤں دیول لے کر گیا۔ جو مری کے قریب ہے اور ان کی قبر پر آخری بگل کے بجنے تک کھڑا رہا۔ گارڈوں نے آسمان کی

جانب اپنے ہتھیار گولی چلا کر خالی کئے۔ میں بے حد متاثر ہوا۔ مجھے ایک سینئر اور مہربان دوست کا نقصان ہوا وہ مجھے مشورہ دیتے اور راستہ دکھانے والے تھے جس سے اللہ تعالیٰ پر میرا بھروسہ بڑھتا اور اس کو تقویت حاصل ہوتی۔ ان کی وفات قومی نقصان تھا۔ وہ ایک معمولی جرنیل نہیں تھے۔ وہ بہادر اور نڈر تھے۔ انہوں نے اپنے سے بڑوں کو مناسب تعظیم سے تسلیم کیا۔ وہ ایک مثالی سپاہی تھے جن کی ایمانداری ان کی سب سے بڑی خوبی رہی۔

تجہیز وتکفین کے بعد میں اپنے ساتھی مسافروں کے ہمراہ گولف کلب مری واپس آیا۔ جہاں ہمیں گھر پہنچانے کے لیے ہیلی کاپٹر منتظر تھا۔ ہیلی کاپٹر کی سمت جانے کی بجائے مجھے کہا گیا کہ میں گولف کلب کی عمارت میں چلوں۔ جہاں کور کمانڈر اور ان کی پارٹی کے لیے دوپہر کے کھانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ میں بھی اس پارٹی میں شامل تھا۔ مجھے اس کھانے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ یہ تو غم اور دکھ کا موقع تھا۔ اور راولپنڈی تک ہیلی کاپٹر کی اڑان کے لیے فقط پندرہ منٹ درکار تھے۔ لیفٹیننٹ جنرل چشتی کو باتیں کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اس موقع پر انہوں نے یہ تذکرہ شروع کر دیا کہ پیپلز پارٹی میں کیا ہو رہا ہے۔ انہوں نے بڑے فخر سے بیان کیا کہ پیپلز پارٹی نے قتل کی فہرست میں ان کا نام سب سے اوپر رکھا ہوا ہے۔ جس کی اسے کوئی پروانہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت کرنے والا ہے۔ اس کے ساتھ انہوں نے اور بہت سی باتیں کیں۔ جو دکھ کی اس گھڑی کے باعث میرے ذہن میں نہ رہیں۔ کھانے کے فوراً بعد ہم راولپنڈی کے لیے روانہ ہو گئے۔

جس رات جنرل ریاض دل کا دورہ پڑنے کے سبب فوت ہو گئے۔ اپنے علاج کے لیے ڈاکٹر کے پاس جانے کی بجائے اپنی زندگی کے آخری لمحات بعض حساس فائلیں اور اہم کاغذات، جو ان کے پاس تھے اپنے فرزند عامر ریاض کو دیئے اور ہدایت کی کہ انہیں جنرل کے ایم عارف کے حوالے کر دے جو اس وقت چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے چیف آف سٹاف تھے۔ جس سے ظاہر ہوا کہ اپنے آخری وقت تک وہ اپنے فرائض کی بجا آوری سے واقف تھے اور انہیں احتیاط سے درست طور پر ادا کر رہے تھے۔ وہ کتنے عظیم سپاہی تھے! ان کا انتقال ایسے وقت پر ہوا جبکہ سلیکشن بورڈ کے سامنے میرا نام ترقی کے لیے پیش ہونے والا تھا۔

جنرل ریاض کی المناک وفات کے بعد جنرل اختر عبدالرحمٰن نے ڈی جی آئی ایس آئی کے اختیارات سنبھالے۔ میں نے ان کے ساتھ بطور ڈی پی ایس اور پی ایم چند بڑے خوشگوار اور یادگار لمحات گزارے تھے۔ وہ سرتاپا وفادار سپاہی تھے۔ جو اپنے سے بڑے کو صرف ایک مرتبہ بات کہتے اور کبھی جاری رکھنے پر زور نہ دیتے۔ یہ اپنی طرح کا اچھا انداز تھا۔ وہ بے حد محتاط جرنیل

تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ جنرل چشتی اور وہ اگرچہ ایک ہی دستہ (توپ خانہ) سے تعلق رکھتے تھے لیکن آپس میں دوستی نہ تھی۔ اگرچہ جنرل اختر نے کبھی مجھے اس کا واضح تاثر نہ دیا۔

سینئر کمانڈر کا یہ حق ہوتا ہے کہ وہ جونیئر کمانڈر کو کمانڈ اختیار کرنے سے قبل طلب کرے۔ جہاں اہم حکمت عملی کے معاملات کا دونوں کمانڈروں کے درمیان تبادلہ خیال کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ آنے والے کمانڈر کو اجنبیت کا احساس نہ ہونے پائے۔ چونکہ ایسا نہ ہوا تو میں نے کور COS بریگیڈیئر امتیاز وڑائچ کو کور کمانڈر سے اپنی ملاقات کے لئے کہا۔ میں نے یہ قدم اس لیے اٹھایا کہ میں اس وقت سے محسوس کر رہا تھا جب میں ہوائی اڈے پر ممتاز کے ہمراہ کور کمانڈر کے استقبال کو گیا تھا اور ان کے رویہ سے مجھے یہ تاثر ملا تھا کہ مجھے کمانڈ کا حصہ تصور نہیں کیا گیا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا میرے شکوک کو تقویت ملتی گئی۔ جنرل چشتی نے مخاصمانہ رویہ اختیار کیا۔ شاید انہوں نے میرے اندر خوف پیدا کرنے کے متعلق سوچا ہوگا۔ اگرچہ میرا ایمان ہے کہ انسان کو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کا خوف اپنے اندر رکھنا چاہیے۔ میں نے انٹرویو کی خاطر کم وبیش چھ ہفتوں تک انتظار کیا۔ پھر ان کے اے ڈی سی کیپٹن افتخار کو یاددہانی کرواتا رہا۔ غالباً کور کمانڈر اپنی وزارتی مصروفیتوں کے باعث فارغ نہیں تھے۔ اور انہوں نے اپنی کمانڈ کے اعلیٰ فرائض کو ثانوی درجہ دے دیا تھا۔ کم از کم میں نے ایک ماتحت کمانڈر کی حیثیت سے یہی محسوس کیا۔ مجھے گزشتہ باتوں کے خلاف کوئی شکایت نہیں۔ میں نے ایک سپاہی کی طرح جرنیل کا سامنا کیا۔ اور دیگر معاملات کو خداوند تعالیٰ کی عدالت کے لیے چھوڑ دیا۔ تقریباً چھ ہفتوں کے بعد مجھے ٹیلی فون ملا کہ کور کمانڈر سے ملاقات کے لیے کور ہیڈ کوارٹر پہنچوں۔

جنرل چشتی کے ساتھ انٹرویو

جب میں بریگیڈیئر امتیاز وڑائچ کے دفتر میں داخل ہوا تو وہ اپنی کرسی سے کھڑے ہو گئے اور مسکراتے ہوئے میرے ساتھ مصافحہ کیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ کور کمانڈر کے دفتر میں داخل ہوئے اور جلد ہی واپس آ گئے اور عام معاملات پر گفتگو کرنے لگے۔ کچھ وقفہ کے بعد ان کی میز پر ان کی گھنٹی بجی۔ سننے کے بعد انہوں نے مجھے کور کمانڈر کے پاس جانے کو کہا۔ میں جنرل کے دفتر کے اندر داخل ہوا۔ میں نے فوجی طریقہ سے سلام کیا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھ سے مصافحہ کیا۔ جنرل چشتی نے سرسری گفتگو شروع کی:

''ہیلو۔ کیسے ہو؟

''اچھا ہوں جناب! میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے ملاقات کا وقت دیا۔

''بیٹھیے اور مجھے بتلائیے کہ حالات کیسے ہیں''؟

میں بیٹھ گیا اور میں نے اپنی پیک کیپ نہ اتاری۔ جناب حالات تو ٹھیک ہیں میں جب سے بریگیڈ میں آیا ہوں آپ سے ملاقات کی کوشش کرتا رہا ہوں۔لیکن بدقسمتی سے آپ کی جانب سے وقت نہ مل سکا۔''

''ہاں میں بے حد مصروف ہوں (انہوں نے اپنا سر ہلایا) وزارت کا کام بہت زیادہ ہے جو مجھے بڑا مصروف رکھتا ہے اور مزید کہا ''اگر آپ بُرا نہ منائیں تو میں اپنے ساتھ بیٹھنے کے لیے بریگیڈیئر وڑائچ کو بھی بلالوں۔ جبکہ ہم بات چیت کرتے رہیں۔''

اگر چہ میں حیرت زدہ ہو گیا اور جبلی طور پر مبہوت ہو گیا کہ جنرل اپنے سٹاف آفیسر کو باقاعدہ گفتگو میں کیوں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ جبکہ وہ اپنے کمانڈر سے بات چیت کر رہے ہیں۔ میں نے فوراً کہا۔''نہیں جناب! قطعاً نہیں۔'' جنرل چشتی نے اپنے اردلی کو طلب کیا اور کہا کہ بریگیڈیئر وڑائچ کو اندر بھیجو۔ اردلی نے سیلوٹ کیا اور پیغام لے کر چلا گیا۔ وڑائچ تیزی سے اندر آئے۔ اور میرے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ اگر چہ ان کو صرف بیٹھنے کے لیے کہا گیا تھا لیکن اب ایک بھدی سی خاموشی طاری ہوگئی۔ میں فوجی آداب کے عین مطابق خاموش رہا۔ تاکہ پہلے کمانڈر بات کریں۔ وہ سوچ رہے تھے۔ پھر انہوں نے کہا''جیل میں مسٹر بھٹو کے انتظامات کی کیا صورت ہے؟''

سب ٹھیک ہے جناب! میں غیر متوقع سوال کے جواب کے لیے تیار تھا۔ انہوں نے موضوع بدل دیا۔''میں آپ کو ایک سو گیارہ انفنٹری بریگیڈ گروپ کی کمانڈ میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ یہ بڑی اہم ذمہ داری ہے۔ یہ کور کا خصوصی بریگیڈ ہے اور اسے جارحانہ اور دفاعی کام سونپے جاتے ہیں۔ لہٰذا آپ کو ان سے واقفیت پیدا کرنی چاہیے۔'' ''ہاں جناب بریگیڈیئر ممتاز سابق کمانڈر نے مجھے اس سلسلہ میں بریف کیا ہے۔

جنرل چشتی: ''کسی صورت میں بھی میں ان کاموں کے سمجھنے میں کوئی فروگزاشت تسلیم نہیں کروں گا۔''

میں: ''ہاں جناب! میں تربیتی علاقہ جات کا دورہ کرنے کا منصوبہ تیار کر رہا ہوں۔ جن کو میں نے نہیں دیکھا اور جانچ پڑتال کروں گا۔''

جنرل چشتی: ''درست ہے۔ تمہارے مارشل لاء کے فرائض بھی ہیں جنہیں کمانڈ کے فرائض کے ساتھ خلط نہیں کیا جائے گا۔''

میں: ''ہاں جناب! میں نے ان کو پہلے ہی الگ الگ کر دیا ہے۔ میں دوپہر دو بجے تک بریگیڈ کمانڈر کے طور پر کام کرتا ہوں اور دوپہر کے کھانے کے بعد میں ایس ایم ایل اے کے ہیڈکوارٹر مارشل لاء فرائض نبھانے کے لیے چلا جاتا ہوں۔'' سنجیدہ نگاہوں اور ایسی آواز سے جس سے اندرونی کرب کا اظہار ہوتا تھا، جنرل چشتی نے کہا ''میں کسی بھی لمحے بریگیڈ کی تربیت کے لیے کوئی غفلت تسلیم نہیں کروں گا۔''

میں: ''جناب! اپنی بہترین صلاحیتوں کو کام میں لاؤں گا۔''

جنرل چشتی: ''یہ درست ہے۔ لیکن میری دلچسپی اس امر میں ہوگی کہ مجھے مارشل لاء کی سمت جو کچھ ہو رہا ہے اس سے باخبر رکھا جائے۔''

مجھے پہلے ہی دیر سے منظور کی جانے والی اس ملاقات کے باعث ناراضگی تھی۔ پھر اس پر مستزاد یہ کہ انہوں نے بریگیڈیئر وڑائچ کو ہماری گفت وشنید سننے کے لیے بٹھالیا۔ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ کیا وہ بریگیڈیئر وڑائچ کو کوئی ایسی بات ریکارڈ کروانا چاہتے تھے جو میں نادانستہ طور پر غصہ کے انداز میں کہہ ڈالوں۔ یہ باتیں متواتر میرے ذہن پر چھائی ہوئی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ بریگیڈیئر وڑائچ جنرل چشتی کے آدمی ہیں۔ بہرحال حالات نے بہت بعد ثابت کیا کہ بریگیڈیئر وڑائچ کے متعلق میرے تاثرات غلط تھے۔ وہ ایک بے بسی کے عالم میں تھے۔ جب میں ان مسائل پر سوچ رہا تھا۔ جنرل چشتی نے پھر سے تنبیہ کا آغاز کر دیا۔

جنرل چشتی: ''میں کلیتاً واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ تمہاری کمانڈ میں سپاہیوں کو مارشل لاء کے کسی فرض پر خاص طور پر امن وامان کے سلسلہ میں نہیں لگایا جائے گا۔ جب تک ذاتی طور پر مجھ سے اجازت نہ لے لی جائے۔''

میں: ''درست ہے جناب! لیکن اگر آپ موجود نہ ہوئے تو کیا ہوگا؟

جنرل چشتی: ''پھر سی او ایس سے اجازت لی جائے۔''

میں: ''اگر سی او ایس موجود نہ ہوئے تو مجھے کیا کرنا ہوگا۔

جنرل چشتی: ''نہیں ہم دونوں میں سے ایک ہمیشہ موجود ہوگا۔''(24)

میں: ''درست ہے جناب! لیکن میں تجویز کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ میری کمانڈ تلے

24۔ جنرل ضیا کو توقع تھی کہ میں ۳۔ اپریل کی شام کو راولپنڈی پہنچوں گا۔ جیسا کہ وعدہ کیا گیا تھا۔ میں نے پل کا افتتاح کیا اور پھر پوما ہیلی کاپٹر میں راولپنڈی پہنچا۔ بریگیڈیئر اکرم سینئر پائلٹ تھے۔ میرے ساتھ بریگیڈیئر امتیاز وڑائچ (جنرل چشتی کے سی او ایس) دوسرے آفیسر تھے جنہوں نے ''آپریشن فیئر پلے'' سرانجام دیا۔ بعض دیگر افسران بھی ہمراہ تھے۔ میں دانستہ طور پر بریگیڈیئر امتیاز کو راولپنڈی سے باہر لے گیا۔ چونکہ وہ ''فیئر پلے'' میں شامل تھے۔ ایک دوسرے (بقیہ آگے)

افواج کو امن وامان کی صورت حال سے نپٹنے کی جب بھی ضرورت ہو ایسا کر سکوں۔ ایس ایم ایل اے کا چارج لینے سے قبل ایسا ہی ہوتا تھا۔ اگر میں آپ کی یا آپ کے چیف آف سٹاف کی اجازت لے کر ہی افواج میں کام میں لاؤں گا تو یقیناً دیر ہوگی اور حالات بگڑنے کا اندیشہ ہوسکتا ہے۔ اور ہم مطلوبہ مقاصد کے حصول میں ناکام رہیں گے۔"

جنرل چشتی: (حاکمانہ آواز میں کہا)۔ "نہیں (25) آپ کو میری ہدایات پر عمل کرنا ہوگا۔"

میں: "جناب جہاں تک مارشل لاء معاملات کا تعلق ہے میں سی ایم ایل اے ایم ایل اے اور ڈی ایم ایل اے سے احکامات حاصل کروں گا۔"

جنرل چشتی: "اگرچہ مجھے مارشل لاء فرائض سے کوئی واسطہ نہیں لیکن اپنے ضلع میں تمام اہم معاملات کے متعلق آپ مجھے مطلع کریں گے۔ بات واضح ہوگئی یا نہیں؟"

مجھے پہلے ہی رفتہ رفتہ نکتہ عروج پر لے جایا گیا تھا جبکہ جنرل چشتی نے میرے ساتھ بے عزتی والا سلوک کر کے للکارا تھا۔ پہلے تو وہ اپنے چیف آف سٹاف کو اپنے دفتر میں لے آئے اور وہ کور کمانڈر اور میرے درمیان ہونے والی بات چیت کو سنتا رہا۔ بظاہر وہ تمام باتوں کا گواہ بنایا گیا۔ اگر ایسا نہیں تھا تو پھر خدا ہی جانتا ہے کہ کور کمانڈر کے دل میں کیا تھا۔ دوسرے یہ کہ جنرل چشتی میرے ساتھ وہ تمام التفات نہیں دکھا رہے تھے۔ جو ایک سینئر کمانڈر اپنے ماتحت کمانڈروں کو دکھاتا ہے۔ ان کے انداز میں تیزی تھی جو یہ ثابت کر رہی تھی کہ وہ مجھ سے ناراض ہیں میں نے

(بقیہ گزشتہ) آفیسر بریگیڈیر اسلم شاہ جو اس وقت میرے سی او ایس تھے، میجر جنرل کے عہدہ میں ناردرن ایریا کمانڈر تھے۔ اور گلگت میں تھے۔ (Betrayal of Another Kind مصنفہ جنرل چشتی ص ۹۱)

25۔ جیل کے اندر فوج بریگیڈیئر راحت لطیف کی کمان میں تھی۔ جو ضلع راولپنڈی کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے۔ میں نے پہلے ہی کمان کی ساخت کی وضاحت کر دی ہے۔ جہاں تک اس کا واسطہ مارشل لاء فرائض سے ہے، مجھے اس سے کوئی تعلق نہیں۔ فوجی مقاصد کے لیے یہ میرے سپاہی تھے۔ اور میں انہیں استعمال کر سکتا تھا۔ لیکن مارشل لاء فرائض کے لیے یہ جنرل سوار خان کی کمان میں تھے، جو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر پنجاب تھے۔

(بھٹو، ضیاء اور میں مصنفہ لیفٹیننٹ جنرل چشتی ص ۲۲۷)

مارشل لاء معاملات میں جنرل چشتی کے متعلق کرنل رفیع نے لکھا ہے:

اگلے روز مجھے کور ہیڈ کوارٹر میں طلب کیا گیا۔ (لیفٹیننٹ کرنل رفیع میری کمان تلے تھے۔ اور لیفٹیننٹ جنرل چشتی نے کمان کے تسلسل کو توڑا جب انہوں نے اسے طلب کیا) کور کمانڈر ہمیشہ خندہ پیشانی سے مجھے ملتے۔ لیکن اس روز وہ کچھ زیادہ ہی مہربان تھے۔ انہوں نے دریافت کیا۔ جیل میں کیسے حالات ہیں۔ میں نے کہا سب اچھا ہے۔ پھر انہوں نے جنرل رفیع عالم صاحب کے متعلق دریافت کیا۔ میں نے بتلایا کہ وہ بے حد سخت ہیں اور وہ مجھے ہمیشہ چاک و چوبند رکھتے ہیں۔

(بھٹو کے آخری ایام مصنفہ کرنل رفیع ص ۷۸)

سوچنا شروع کیا۔ اگر ابتدا میں ہمارے تعلقات کا یہ انداز ہوگا تو اختتام کہاں ہوگا؟

میں نے یہ کمانڈ خود انتخاب نہیں کی تھی۔ بلکہ جنرل ہیڈ کوارٹر کے احکامات پر سنبھالی تھی۔

لہٰذا میں نے کہا: جناب! میں دو باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ پہلے تو یہ کہ بریگیڈ کمانڈر ہوں اور بریگیڈ کے فرائض کی بجا آوری میں مجھ سے کوئی لغزش نہیں ہوگی اور ٹروپس کی تربیت میں قطعاً کوتاہی نہیں کروں گا۔ اس سلسلہ میں آپ کو جواب دہ ہوں گا۔ اور کمانڈ کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے لیے مجھے آپ کی رہنمائی درکار ہوگی۔ اگر میں فرائض کی ادائیگی میں کسی طرح بھی ناکام پایا گیا تو آپ جس طرح درست خیال فرمائیں میرے خلاف کارروائی کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔

دوسرا نکتہ میرے مارشل لاء کے فرائض کے متعلق ہے۔ آپ کا ان کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں۔ کیونکہ مارشل لاء کمانڈ کی رسمی ترتیب میں آپ شامل نہیں۔ میں ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر میجر جنرل رفیع عالم کے ماتحت ہوں جو پنجاب کے ایم ایل اے جنرل سوار کے ماتحت ہیں اور وہ سی ایم ایل اے جنرل ضیاء الحق کے ماتحت ہیں۔ میں ایس ایم ایل اے کی حیثیت سے کسی بھی کام کے لیے ڈی ایم ایل اے کو جواب دہ ہوں۔ لہٰذا آپ اس سے متعلق بات چیت کی مجھ سے توقع نہ کریں اور نہ ہی میں مارشل لاء کے معاملات کے متعلق آپ کو بریف کروں گا۔ فوج کے استعمال کے لیے میرا ذہن بالکل صاف ہے۔ میں انہیں قطعاً استعمال نہیں کروں گا جب تک کہ آپ سے ذاتی طور پر اجازت نہ لوں یا پھر آپ کی غیر حاضری میں آپ کے سی او ایس اجازت نہ دے دیں۔ یہ بات میں مارشل لاء حکام کو بھی بتلا دوں گا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ کور کمانڈر کا شکریہ ادا کیا اور دفتر چھوڑنے کے لیے تیار ہوا۔

جنرل چشتی: ''چائے کی پیالی لیجئے''

میں: ''نہیں جناب! شکریہ۔ میں نے فوجی سلام کیا اور دفتر سے نکل آیا۔ میں مایوس اور پریشان تھا کیونکہ مشکلات کا ایک سمندر کور ہیڈ کوارٹر والے میرے لئے پیدا کر رہے تھے۔ اور میری کارکردگی بطور ایس ایم ایل اے متاثر کر رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ مشکل ایام آنے والے ہیں اور جنرل چشتی میری امداد کرنے والے آخری انسان ہوں گے لیکن خدا کی ذات سب سے عظیم ہے۔

میرے انٹرویو کے دوران مجھے اچھی طرح اس امر کا احساس تھا کہ جنرل چشتی میری سالانہ خفیہ رپورٹ لکھنے کا آغاز کرنے والے ہیں جو میری اگلی ترقی کے لیے بے حد اہم تھی۔ لیکن اس امر نے مجھے پریشان نہیں کیا۔ میں نے ہمیشہ راستی کو اپنایا اور نتائج کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا۔ لہٰذا میں نے یہاں بھی سچائی کو مدِنظر رکھا اور باقی سب کچھ خداوند کریم پر چھوڑ دیا۔ پرموشن بورڈ جس نے میجر جنرل

کے عہدہ پر ترقی کے لیے میرے نام پر غور کرنا تھا اس کا اجلاس اگلے سال ہونے والا تھا۔ یعنی ۱۹۷۹ء میں یہ مرحلہ آنے والا تھا۔ یہ میرا ایمان ہے کہ ترقی اور عزت افزائی صرف اس وقت ہوسکتی ہے جب خدا تعالیٰ چاہے جب عزت افزائی ہونے والی ہوتو کوئی اس کو روک نہیں سکتا۔

ایک بریگیڈیئر جو بھاری فارمیشن کی کمانڈ رکھتا ہے جیسا کہ میں تھا، کی سالانہ خفیہ رپورٹ کور کمانڈر تحریر کرتا ہے۔ چیف آف دی آرمی سٹاف اگلا رپورٹنگ آفیسر ہے۔ دونوں کو آفیسر کی کارکردگی کے متعلق اپنے خیالات کے اظہار کا حق حاصل ہے۔ میں نے اس سے قبل جنرل چشتی کے ماتحت کبھی کام نہیں کیا تھا۔ اور اب جبکہ میں نے ان کے ماتحت چھ ماہ کا عرصہ گزارا تھا، انہوں نے میری کارکردگی کے متعلق رائے کا اظہار کرنا تھا۔ دوسری طرف چیف آف دی آرمی سٹاف جنرل ضیاء تھے۔ اور جو ایسے فرد تھے جن کے ماتحت کئی حیثیتوں سے میں نے کئی دفعہ خدمات سرانجام دی تھیں۔ انہوں نے اس وقت سے مجھے اچھی طرح سے جاننا شروع کیا جب میں نے ان کی کمانڈ تلے دسویں فرنٹیئر فورس رجمنٹ کے کمانڈنگ آفیسر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔ اور بعد ازاں جنرل ہیڈ کوارٹر میں بطور ڈائریکٹر کام کیا۔ اور اب وہ میرے کام کو انفنٹری بریگیڈ گروپ کے کمانڈر کی حیثیت سے دیکھ رہے تھے۔ نیز بطور سب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر میرے کام کا اندازہ کر چکے تھے۔ مجھے معلوم نہیں ان دونوں جرنیلوں نے میرے بارے میں اپنی رپورٹوں میں کیا کچھ تحریر کیا۔ کیونکہ میری رپورٹ مجھے کبھی نہ دکھائی گئی۔

اپنی انتہائی کوششوں کے باوجود میں کور کمانڈر یا اس کے ہیڈ کوارٹر کا رویہ تبدیل نہ کر سکا۔ یوں کمانڈ کے کاموں کے متعلق دونوں کا انداز جارحانہ اور متعصب رہا۔

امن و امان

راولپنڈی میں سب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے فرائض انجام دینے کے دوران روزانہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ خیز سمجھ سے ماوراء اور ان دیکھے واقعات ظہور پذیر ہوئے۔ یہ مزدور تنظیموں، طلبہ یا پھر سیاسی پارٹی ورکرز کی طرف سے رونما ہوئے۔ ہم ان مسائل کو روزمرہ کی بنیاد پر حل کرتے رہے۔ بدقسمتی سے ہماری کاروائی ہمیشہ شر پسندوں کی کاروائی کے بعد ہوتی۔ داخلہ سیکرٹری مسٹر روداد خان کے ساتھ اجلاس کے دوران میں نے حساس اداروں کی ناکامی کی شکایت کی کہ وہ ہمیں جلوسوں کی پیشگی اطلاع نہیں دیتے۔ اور نہ ہی ہڑتالوں اور لاقانونیت کے پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کرتے ہیں۔ لوگوں کے ہجوم تشدد پر اتر آتے ہیں اور گاڑیوں کو نذر آتش کر دیتے ہیں۔ ہمیشہ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس ہی نشانہ بنتی ہے۔ ہم انتظامیہ میں ہوتے ہوئے یہ سوچتے تھے کہ لاقانونیت کو ہوا دینے والوں کا ڈرائیوروں کے ساتھ ایکا ہے۔

ہم پاکستان آرڈیننس فیکٹری واہ کے متعلق متفکر رہتے تھے جہاں فیکٹری کے علاقہ میں مزدوروں کی چالیس ہزار کی تعداد رہتی تھی۔ ان کی مزدور تنظیموں کے ساتھ بات چیت کے دوران ہم ان کو ذہن نشین کراتے کہ اگر انہوں نے کبھی پاکستان آرڈیننس فیکٹری کو آگ لگانے کی کوشش کی تو اس کے نتائج ان کے اپنے خاندان کے لیے خطرناک ہوں گے۔ میں نے ان کو بتایا "اگر تم ایسا کرو گے تو تم اپنے خاندان سمیت اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے دھماکوں میں تباہ ہو جاؤ گے۔" جب یہ حقیقت ان کے دماغ میں بیٹھ گئی تو انہوں نے تعاون کرنا شروع کر دیا۔

ڈپٹی کمشنر سعید مہدی، سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس جہانزیب برکی، سپرنٹنڈنٹ سپیشل پولیس راجہ محمود نہایت اعلیٰ سوچ کے مالک تھے۔ ہم اکثر ملاقات کرتے اور ممکنہ واقعات کے متعلق تبادلہ خیال کرتے تا کہ کوئی مشترکہ لائحہ عمل اپنایا جائے۔ ہم شاذ و نادر ہی آپس میں اختلافات کرتے۔ اور اگر کبھی کبھار ایسا اختلاف ہو بھی جاتا تو ہم اسے کبھی اپنے دائرہ سے باہر نکلنے نہ دیتے۔ ہم نے ایک ٹیم کی مانند کام کیا۔ اور یہی ہماری کامیابی کا راز تھا۔ نیز ہم میں سے ہر ایک کو دن اور رات کے کسی بھی

موقع پر ملا جا سکتا تھا۔ اور مجھے ان تینوں ساتھیوں کے ساتھ تعلق پر بے حد فخر ہے۔

پی آئی اے اور ایئر پورٹ سیکورٹی فورس کے درمیان کھلم کھلا تصادم

ایک روز بعد دوپہر میں مارشل لاء دفتر میں اپنے کام میں مصروف تھا کہ اسلام آباد میں مقیم میرے کسی جاننے والے کا فون موصول ہوا۔ اس نے مجھے اطلاع دی کہ اسلام آباد کے ہوائی اڈہ کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے گولیوں کے تبادلہ اور شور کی آواز سنی ہے۔ میں فوراً ہوائی اڈہ کی جانب روانہ ہوا۔ راستہ میں میں نے وائرلیس کے ذریعے ڈپٹی کمشنر کو مطلع کیا کہ وہ مجھے ہوائی اڈہ پر ملیں برکی پہلے ہی ایئر پورٹ کے لیے نکل چکے تھے۔ وہ مجھے ہوائی اڈہ پر ملے۔ پی آئی اے کی عمارت اور وی آئی پی لاؤنج کے درمیان ٹوٹی پھوٹی اشیا، بکھری پڑی تھیں۔ بندوقوں کے چلنے کی آواز بھی سنائی دی مجمع مشتعل تھا جو تشدد پر اتر آیا تھا اور نعرہ بازی کر رہا تھا۔ جہازوں کی اڑان متاثر ہوگئی تھی۔ تمام لاؤنجز پھنسے ہوئے مسافروں سے بھرے پڑے تھے۔ جن میں غیر ملکی مسافر بھی تھے۔ ذمہ دار پی آئی اے افسران نے ہمیں بتلایا کہ تنازعہ نے اس وقت سنگین شکل اختیار کر لی جب ہوائی اڈہ کے سیکورٹی سٹاف نے پی آئی اے کے ہوا بازوں کو سیکورٹی چیک کے راستہ سے گزرنے کے لیے کہا۔

اس وقت ایئر پورٹ سیکورٹی فورس کمانڈر بریگیڈیئر مظفر (ستارہ جرأت) وی آئی پی لاؤنج میں کراچی کیلئے اڑان کے منتظر بیٹھے تھے۔ پی آئی اے کے ہوابازوں نے اس وقت تک جہاز اڑانے سے انکار کر دیا جب تک ایئر پورٹ سیکورٹی سٹاف کو سیکورٹی فرائض سے نہ ہٹایا جائے۔ ان کے مطالبہ نے ایک مشکل صورت پیدا کر دی۔ اگر یہ پورا کر دیا جائے تو سیکورٹی فرائض کون ادا کرے گا؟

کیا یہ پولیس ہوگی یا پھر فوج؟ میں کسی صورت بھی فوج کو اس کام پر لگانا نہیں چاہتا تھا۔ اب صرف پولیس باقی رہ گئی۔ اب ہمارے سامنے یہ سوال تھا کہ سیکورٹی فورس کو کس طرح کہا جائے کہ وہ اپنی بیرکوں میں چلے جائیں۔ اگر انہوں نے انکار کر دیا اور مزاحمت کی تو؟ ان سے ہتھیار کیسے رکھوائے جائیں؟ مجھے ان تمام کے متعلق سول انتظامیہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ بات چیت کرنا تھی۔

اس تنازعہ میں دونوں فریق اپنے اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے تھے۔ پی آئی اے لیبر یونین نے ہوا بازوں کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ اس سے صورت حال اور سنجیدہ ہوگئی۔ اپنے دو ساتھیوں سعید مہدی اور برکی کی موجودگی میں میں نے تشدد پر آمادہ گروہ سے خطاب کیا جو زیادہ تر پی آئی اے ملازمین پر مشتمل تھا۔ پہلے تو میں نے انہیں اپنی طرف متوجہ کرنا تھا۔ خوش قسمتی سے انہوں

نے تعاون کیا اور جو کچھ میں کہہ رہا تھا اس کو سننا شروع کیا میں نے ان کو بتلایا کہ مسافر لاؤنجوں میں مصائب میں مبتلا ہیں جن میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ اور یہ کہ وہ غیر ملکیوں پر بے حد برا تاثر چھوڑ رہے ہیں۔ پس میں نے ان کو کہا کہ ازراہ کرم وہ اپنے اپنے کام پر لوٹ جائیں۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ مارشل لاء انتظامیہ کے تحت مشترکہ انکوائری کی جائے گی جو اگلے روز شروع ہوگی قصور کا تعین کرے گی۔ انکوائری پینل میں چار اراکین ہوں گے۔ اراکین میں پی آئی اے ایئر پورٹ منیجر، ایئر پورٹ سیکورٹی کا آفیسر انچارج، ایک مجسٹریٹ اور فوج میں سے ایک میجر۔ اس پینل کا صدر فوج کا ایک لیفٹیننٹ کرنل ہوگا۔ بھیڑ مدھم ہونا شروع ہوگئی۔ اب سب سے بڑا کام ایئر پورٹ سیکورٹی فورس سے ہتھیار رکھوانا تھا۔ ہم وی آئی پی لاؤنج میں گئے اور ہم نے بریگیڈیئر مظفر سے کہا کہ فورس سے ہتھیار رکھوائیں اور ان کو بارکوں میں بھجوائیں۔ لیکن انہوں نے نرمی کے ساتھ انکار کر دیا۔ بہرحال ہم ایئر پورٹ سیکورٹی آفیسر کے توسط سے انہیں ہٹانے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم نے انہیں بیرکوں میں بھجوا دیا۔ ان کے فرائض ایس ایس پی برکی کی نگرانی میں پولیس نے سنبھال لیے۔

اس اثنا میں ایک میجر میری معاون یونٹوں میں سے ایک کمپنی کے ہمراہ میرے پاس پہنچ گیا۔ میں نے فوج کے لیے نہیں کہا تھا۔ چنانچہ میں نے دریافت کیا کہ اسے ایسا کرنے کے لیے کس نے حکم دیا ہے۔ اس نے جواب میں کہا کہ سی ایم ایل اے کے ملٹری سیکرٹری نے اسے حکم دیا ہے۔ میں نے اس دخل اندازی کو پسند نہ کیا میں نے اس کو کہا کہ اپنی کمپنی کو واپس لے جائے اور بغیر میرے حکم کے اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔ اس اثنا میں ٹیلی فون کالز کی بھرمار شروع ہوگئی۔ یہ فون سی ایم ایل اے، ایم ایل اے اور سیکرٹری جنرل ڈیفنس کی جانب سے تھے جو صورت حال کو جاننا چاہتے تھے۔ یہ ٹیلی فون مجھے مسلسل پریشان کر رہے تھے۔ کیونکہ ہم دونوں اطراف سے بات چیت میں مصروف تھے۔ جب میں نے سی ایم ایل اے اور ایم ایل اے کو اب تک کے عمل کے متعلق تفصیلات بتائیں تو انہیں تسلی ہوگئی۔ رات گئے اسلام آباد ایئر پورٹ سے پہلی پرواز روانہ ہوئی۔ لیفٹیننٹ کرنل یعقوب مسعود کی صدارت میں ایک انکوائری پینل نے انکوائری کی۔ انہوں نے شاندار کام سرانجام دیا۔ میں نے عدالت کی سفارشات سے اتفاق کیا جنہیں میں نے ایم ایل اے کو بھجوا دیا۔ اس کے بعد ہمیں کسی مسئلے کا سامنا نہ ہوا۔ کیونکہ دونوں اطراف عدالت کی کارروائی سے مکمل طور پر متفق تھے۔

طلبہ میں بحالی اطمینان کی حکمتِ عملی

اگر معاملات کو مباحثہ میں ڈال دیا جائے تو طلبہ برادری ہمدردوں کو اپنی طرف فوراً مائل کر لیتی ہے۔نفسیاتی طور پر والدین فوراً طلبہ مسائل میں الجھنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔حکومت کے ملازم والدین اس سے مستثنٰی نہیں۔ وہ اس لیے بھی الجھ جاتے ہیں کہ ان کے بچے کسی ایک یا دوسرے ادارے میں زیر تعلیم ہوتے ہیں۔ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ آج کا طالب علم کل کا رہنما ہوتا ہے۔لہٰذا طلبہ کے خلاف جارحانہ اقدامات اپنانا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ہمیں اس امر کی پروا نہ تھی کہ وہ گڑ بڑ پیدا کرتے ہیں۔لیکن ہمیں یہ بات ناپسند تھی کہ وہ اپنی تعلیم کو قربان کر کے گڑ بڑ میں پھنس جاتے ہیں۔ سیاسی جماعتیں اپنے مفادات کے حصول کے لیے طلبہ تنظیموں کے اندر گھس جاتی ہیں۔ وہ طلبہ رہنماؤں کو کالج کی طلبہ تنظیموں میں عہدہ دار منتخب ہونے کی خاطر مالی امداد فراہم کرتی ہیں۔ ظاہراً اس قسم کے طلبہ اپنے تعلیمی مقاصد کے حصول میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ ان کا بڑا مقصد تعلیمی ادارہ کے سربراہ کو خوف زدہ کرنا ہوتا ہے۔بعض اوقات پرنسپل تک کو زدوکوب کرتے ہیں۔ وہ طلبہ کے داخلوں تک کا بندوبست سنبھال لیتے ہیں۔طلبہ تنظیمیں معنوی طور پر کالجوں اور یونیورسٹیوں پر راج کرتی ہیں۔گڑ بڑ پیدا کرنے والے تمام افراد کو 'فائر برانڈ' رہنما کا نام دیا جاتا۔ وقفوں وقفوں کے بعد وہ طلبہ کی ہڑتال کرواتے۔ کالج گراؤنڈ میں جمع ہو جاتے۔ کالج انتظامیہ کے خلاف نعرہ بازی کرتے اور سڑک پر آ جاتے۔ گاڑیوں کو نذر آتش کرتے اور جائیدادوں کو آگ لگاتے۔ان کا پہلا نشانہ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی گاڑیاں ہوتا۔ وہ نجی مسافر گاڑیوں کو بھی نہ بخشتے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا تعلق ان دو مسئلوں سے تھا۔ہم اس امر پر زور دیتے کہ طلبہ باقاعدگی سے کلاسوں میں جائیں اور سڑکوں پر آنے سے پرہیز کریں۔ وہ جائیداد کو نقصان نہ پہنچائیں اور نہ ہی ٹریفک کو روکیں۔

ہمیں یقین تھا کہ طلبہ کی اکثریت پڑھائی میں دلچسپی رکھتی ہے لیکن لاقانونی گڑ بڑ کے سبب بہت سے طلبہ اپنے تعلیمی سال میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔طلبہ تنظیموں کے رہنما سورما بن کر قانون کی پابندی کرنے والے طلبہ کو کلاسوں میں جانے سے روکتے ہیں۔ بدقسمتی سے بعض طلبہ تنظیموں کو پروفیسروں کی حمایت حاصل تھی۔ ہمارے تجزیے کے مطابق بعض پروفیسر بھی اپنے طالب علمی کے زمانہ میں ''فائر برانڈ'' طلبہ رہ چکے تھے۔محکمہ تعلیم کی بھرتی کی ناکارہ حکمت عملی کے سبب ایسے طلبہ جنھوں نے اپنے اساتذہ کی پٹائی کی تھی اب وہ خود پروفیسر بن چکے تھے۔ان میں سے بعض نے تو دھمکیوں اور تشدد کے ذریعے امتحانات کو پاس کیا۔بعض کے پاس ہتھیار تھے۔ اور بعض اس ضمن میں شہرت رکھتے تھے کہ جو کوئی ان کی مخالفت کرے گا انہی ہتھیاروں سے وہ ان کو قتل کر دیں گے۔

ان حالات کو ذہن میں رکھ کر ملک میں گرتے ہوئے تعلیمی معیار کا تجزیہ کرنا محال نہ ہوگا۔ مستقبل تاریک نظر آتا تھا۔ ہم نے اپنی ادنیٰ حیثیت میں حکومت کو مشورہ دیا کہ آئندہ کسی کو بھی استاد مقرر کرنے سے قبل طالب علمی کے زمانہ میں اس کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے۔ ''فائر برانڈ'' کسی صورت بھی محکمہ تعلیم میں بھرتی نہ کئے جائیں۔ لیکن اب مجھے معلوم نہیں کہ ہماری سفارشات کو صاحبان اختیار نے کہاں تک عملی جامہ پہنایا۔

اگلا قدم جو ہم نے اٹھایا وہ طلبہ تنظیموں اور کالج کی انتظامیہ سے تعلقات استوار کرنا تھا۔ اس پر عمل پیرا ہونے کی خاطر ڈائریکٹر کالجز اور پرنسپل صاحبان سے مشورہ کے بعد ہم نے کالجوں کا دورہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ہماری ٹیم میں ڈپٹی کمشنر، سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس، سپرنٹنڈنٹ پولیس سپیشل برانچ، ڈائریکٹر ایجوکیشن کالجز اور میں شامل تھے۔ دورہ کی تواریخ میں لچک تھی۔ ہمارے دورہ میں خواتین کے کالجز بھی شامل تھے۔

پروگرام کے مطابق ہم نے کالجز کا دورہ شروع کیا۔ کالجوں کے تدریسی عملہ اور طلبہ تنظیموں کے عہدہ داران کے ساتھ ہم نے الگ الگ اجلاس کئے۔ طلبہ کے مسائل پر بھرپور بات چیت ہوئی۔ شکایات سنی گئیں اور ان کے جوابات دیئے گئے۔ جب فوری جواب نہ دیا جا سکا تو مسئلہ درج کر لیا گیا۔ طلبہ کی شکایات اور ان پر کالج انتظامیہ کے ساتھ تبادلہ خیال کیا گیا۔ طلبہ اور تدریسی عملہ کو جب بھی ہماری ضرورت پڑی ہم نے اپنے آپ کو ان کے لیے مہیا کیا۔ اس طرح ہم نے طلبہ اور اساتذہ سے تعلقات استوار کئے۔ ہم نے ایک دوسرے کو جاننا شروع کیا اور اس طرح باہمی اعتماد بڑھنے لگا۔ یوں امن و امان کی صورت حال بہتر ہوگئی اور مظاہرے ختم ہو گئے۔

ان تمام باتوں کے باوجود ایک روز بغیر کسی اشتعال کے گارڈن کالج، سرسید کالج اور گورنمنٹ کالج برائے خواتین کے طلبہ رہنماؤں نے کلاسوں کے بائیکاٹ کے لیے طلبہ کو مجبور کیا۔ جلد ہی وہ سڑکوں پر آ گئے۔ حکومت کے خلاف نعرہ بازی شروع کر دی اور پھر تشدد پر اتر آئے۔ گارڈن کالج کے طلبہ نے پتھروں کی بارش شروع کر دی، گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی بس کو آگ لگا دی اور انسداد رشوت ستانی کے محکمہ کے فرنیچر اور ریکارڈ کو نذر آتش کر دیا۔ گورنمنٹ کالج برائے خواتین کی طالبات کالج کے دروازہ کے باہر جمع ہوگئیں۔ حکومت کے خلاف نعرے لگائے اور پاس ہی کھڑی پولیس پر پتھر پھینکنے شروع کر دیئے۔

اس کارروائی کے دوران انہوں نے پولیس کی ایک گاڑی کو نقصان پہنچایا۔ پولیس نے چالیس سے پچاس تک طلبہ کو زیر حراست لے لیا۔ باقی کے بھاگ گئے۔ پکڑے گئے طلبہ میں ان کے

رہنما بھی تھے۔ ہمیں ان کا یہ انداز پسند نہ آیا۔ دوسرے انہوں نے ہمارے باہمی معاہدے کو توڑ دیا۔ جس کا بظاہر کوئی سبب نہ تھا، ہم سختی سے ان پر ٹوٹ پڑے اور ہم نے قانون کو اپنا قدرتی راستہ بنانے دیا۔ ملزموں کے خلاف مقدمات درج کئے گئے اور فوجی عدالتوں میں سماعت شروع کی گئی۔ اگلے روز بعد دوپہر طلبہ کے والدین ہمارے پاس آنا شروع ہو گئے وہ اپنے بچوں کو رہا کروانا چاہتے تھے۔ والدین سے ہمدردی کے سبب تیسرے روز ایک کانفرنس کا اہتمام کیا گیا جس میں تمام کالجوں کے پرنسپل صاحبان ڈائریکٹر کالجز، مقامی انتظامیہ نیز والدین اور طلبہ کے نمائندے شامل ہوئے ہم تمام طلبہ کو آزاد کر دینا چاہتے تھے اگر وہ یقین دہانی کروا دیں کہ وہ آئندہ بطور قانونی شہری رہیں گے۔ والدین اور طلبہ کے نمائندوں نے ڈسپلن کو قائم رکھنے کا وعدہ کیا۔ ہم نے مقدمات میں ملوث طلبہ سے تحریری معافی نامے حاصل کئے اور انہیں آزاد کرنے سے قبل ان کے والدین سے ضمانتیں حاصل کیں۔ کچھ مقدمات کی تفصیل بیان کرنا لازمی ہے۔

ایک باپ نے اپنے بیٹے کے لیے تحریری حلف نامے پر دستخط کرنے اور داخل کرنے سے قبل بتلایا کہ وہ ٹھیکیدار ہے اور اس نے دو کاریں خرید رکھی ہیں۔ ایک اپنے لیے دوسری اپنے بچوں کو سکولوں میں لے جانے اور واپس لانے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ وہ کاروبار کے سلسلہ میں باقاعدگی سے صبح نکل جاتا ہے اور اس کی واپسی رات دیر سے ہوتی ہے۔ کالج میں اپنے بیٹے کی سرگرمیوں کے متعلق اسے کچھ علم نہیں۔ اس کا یہ خیال تھا کہ سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے کیونکہ کالج انتظامیہ نے اس کے بیٹے کے متعلق کبھی اطلاع نہیں دی کہ وہ تعلیم کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ اور یہ کہ کالج میں غیر قانونی باتوں میں حصہ لیتا ہے۔ اب یہ پہلی مرتبہ ہے کہ اسے اپنے بیٹے کی سرگرمیوں کے متعلق علم ہوا ہے۔ جسے سن کر اسے بے حد ندامت ہو رہی ہے۔ باپ کی آنکھوں میں آنسو تھے ہمیں اس پر رحم آ رہا تھا۔ ہم نے اسے ہدایت کی کہ کالج انتظامیہ کے ساتھ رابطہ رکھے اور اپنے بیٹے کی تعلیمی ترقی پر نظر رکھے۔ اس نے ایسا کرنے کا وعدہ کیا۔ ساتھ ہی ساتھ ہم نے کالج انتظامیہ کو ہدایت کی کہ وہ طلبہ کے والدین اور سرپرستوں کو ڈسپلن کی کمزوری کے بارے میں مطلع کرتے رہیں۔ تاکہ کالج میں تعلیمی ماحول کی ترقی میں وہ تعاون کر سکیں۔

ایک اور واقعہ یوں ہے: گارڈن کالج کے طلبہ تنظیم کا رہنما ناصر مغل جو ہماری حراست میں تھا، آزاد ہونے والا سب سے آخری طالب علم تھا۔ اس کے والد نے معافی مانگنے اور حلف نامہ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ اپنے بیٹے کو غیر مشروط طور پر رہا کروانا چاہتا تھا۔ اس نے کہا ”مجھے کچھ پروا نہیں اگر میرا بیٹا جیل کے اندر رہے۔ بے شک لیڈر تو مصائب سے گزرے بغیر پیدا نہیں ہوتے۔ ہم نے

اسے رائے دی کہ صرف مصائب سے گزرنے کا عمل ہی رہنماؤں کو جنم نہیں دیتا۔ جب تک کہ وہ اعلیٰ تعلیم کو حاصل نہ کرے۔ چنانچہ بہتر ہوگا کہ وہ اپنے فرزند کی تعلیم پر پہلے توجہ مرکوز کرے۔

گورنمنٹ ٹیکنیکل کالج نے معمولی امن وامان بھی قائم نہ رکھا۔ یہ پشاور روڈ پر واقع ہے۔ یہاں کے طلبہ کی معمولی سی گڑبڑ بھی تمام ٹریفک میں رخنہ پیدا کر سکتی تھی۔ امن وامان کے حوالہ سے یہ کالج بے حد تنقید کا نشانہ تھا۔ پہلے ہی دو طلبہ وہاں مارے گئے تھے۔ اور سیاسی جماعتیں جو طلبہ تنظیموں کے ذریعے کام کرتی تھیں انتظامیہ کے لیے ہمیشہ مشکلات پیدا کرتیں۔ روزانہ کلاسوں کا بائیکاٹ کیا جاتا۔ سڑکوں پر ٹریفک کو روک دیا جاتا۔ ایک مرتبہ فوجی گاڑی پر سنگ باری کی گئی۔ اور کبھی کبھی اکا دکا گاڑیوں کو نذر آتش کیا گیا ہم نے سفارش کی کہ اس کالج کو سہالہ منتقل کر دیا جائے اور اسی طرح پولیس ٹریننگ سکول کو یہاں منتقل کر دیا جائے۔ ہماری سفارش کو تسلیم نہ کیا گیا۔ اس کے برعکس حکومت نے وقتی طور پر اس کالج کو بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس سے فوراً امن بحال ہو گیا۔ بالآخر فوج کے الیکٹریکل مکینیکل انجینئرنگ کالج کو کوئٹہ سے مستقل طور پر یہاں تبدیل کر دیا گیا۔

خودسوزی کے ذریعے قربانی کے مظاہرے کی کوشش

سیاسی سطح پر مسٹر بھٹو کا کیس کمزور ہو گیا۔ کیونکہ اس کے حمایتی قابل ذکر طاقت کا مظاہرہ (26) کرنے میں ناکام ہو گئے۔ وہ گلی کوچوں میں جلوس نہ نکال سکے۔ مارشل لاء حکومت کو آہستہ آہستہ یقین ہو گیا کہ وہ کسی بھی سیاسی افراتفری پر قابو پا سکے گی جو اس کی پھانسی کے سبب ہو گی۔ لاہور ہائی کورٹ کے فیصلہ سے قبل حکومت پریشان تھی۔ لیکن جب فیصلے کا اعلان ہو گیا تو مظاہرے کم رہے۔

پہلے تو پیپلز پارٹی نے تند و تیز مظاہروں کا اہتمام کیا۔ انہیں امید تھی کہ گرفتاریاں تو لازماً پیش آئیں گی۔ اس سے عوام کی تائید حاصل ہو گی۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ مسٹر بھٹو کے بعض حامیوں نے انہیں جیل سے رہا کروانے کے لیے خودسوزی کا سہارا بھی لیا۔ (27)

26۔ سیاسی سطح پر بھی اس کا کیس کمزور ہو گیا۔ کیونکہ اس کے حمایتی گلی کوچوں میں قابل ذکر طاقت کا مظاہرہ کرنے میں ناکام ہو گئے۔ (نیوز ویک ۲۹ مئی ۱۹۷۸ء)

ب۔ پی پی پی کے تمام حمایتی جو اعلیٰ عہدوں پر تھے ایسی صورت کے متعلق پرامید تھے۔ چنانچہ مجھے بتایا گیا کہ وہ کئی ہفتوں کے لیے زیر زمین چلے گئے۔ (سنڈے ٹیلی گراف ۲۱ جنوری ۷۹)

27۔ پچھلے ہفتے پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو رہا کروانے کے لیے نیا حربہ خودسوزی کا استعمال کیا (نیوز ویک ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۸ء)

۱۹۷۸ء میں پیپلز پارٹی کی پیپلز ایکشن کمیٹی نے تقریباً دو ہفتوں تک روزانہ دو یا تین گرفتاریاں دینا شروع کر دیں۔ یہ بھی بھٹو کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کرنے کا ایک طریقہ تھا۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۷۸ء کو اس کمیٹی نے اعلان کیا کہ اپنے مطالبات کو منوانے کے لیے ان کے ورکر اپنے آپ کو جلانا شروع کریں گے۔

پہلا واقعہ مری روڈ پر کمیٹی چوک میں پیش آیا جہاں گوجرانوالہ کے ایک شخص نے جس کو عام طور پر 'گلو' کہا جاتا تھا، لوگوں کے مجمع میں چھلانگ لگائی۔ مسٹر بھٹو کے حق میں نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھا اور اس نے اپنے آپ کو آگ لگا لی۔ وہ بری طرح سے جھلس گیا۔ برکی اس کو ملنے کی غرض سے ہسپتال گئے۔ ڈاکٹر اس کے بچ جانے کے متعلق پرامید نہ تھے۔ بہترین طبی امداد کے باوجود گلو وفات پا گیا۔

فوت ہونے سے قبل گلو نے برکی کے سامنے بیان دیا کہ پیپلز پارٹی کی اعلیٰ کمانڈ نے اسے بتایا تھا کہ ان کی پارٹی کے جاں نثار ورکروں کو نامزد کر دیا گیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو جلائیں گے۔ ایک فہرست تیار کر لی گئی ہے اور روزانہ دو یا تین نامزد شدہ افراد ایک ہی وقت پر کمیٹی چوک میں خود سوزی کریں گے۔ اس نے مزید انکشاف کیا کہ اس کی وفات کی صورت میں پی پی پی کی اعلیٰ قیادت اس کے پسماندگان کی ہر صورت دیکھ بھال کرے گی۔ انہوں نے مزید اس امر کی یقین دہانی کروائی تھی کہ وہ اس کو جلنے نہیں دیں گے انہوں نے منصوبہ تیار کر لیا تھا کہ جونہی وہ اپنے آپ کو آگ لگائے گا دوسرے ورکر آگ کو بجھا دیں گے۔ بدقسمتی سے اس کے معاملہ میں ایسا نہ ہو سکا۔ اب اسے یقین تھا کہ وہ مرنے کے قریب ہے۔ تین روز بعد وہ چل بسا۔

اس واقعہ نے انتظامیہ کو عقلمند بنا دیا۔ گلو نے ہمیں بتلا دیا کہ پی پی پی ایک خطرناک راستہ اختیار کر رہی ہے۔ انتظامیہ نے ہر لحاظ سے اس انداز کی حوصلہ شکنی کی کوشش کی۔ پھر یہ بھی کوشش کی کہ جلنے کے سبب زخموں کی وجہ سے موت واقع نہ ہو۔

ہم نے یہ حکمت عملی اپنائی کہ خود سوزی کے لیے نمودار ہونے والے افراد کو پولیس فی الفور گرفتار کر لے۔ ایسا کرنا بے حد مشکل تھا کیونکہ بڑا مجمع جمع ہو جاتا۔ پی پی پی ورکرز نعرہ بازی شروع کر دیتے اس کے علاوہ یہ جاننا مشکل تھا کہ کس کو خود سوزی کے لیے منتخب کیا گیا تھا مجمع میں مل جل جانے کے لیے انتظام کیا گیا کہ پولیس سادہ کپڑوں میں لوگوں میں مل جائے۔ اور ممکنہ جگہ پر موجود رہے۔ پولیس خود سوزی کرنے والوں کو کمبل سے ڈھانپ دے۔ اور آگ کو فوراً بجھا دے۔ خود سوزی کرنے والوں کو موقع پر گرفتار کر لیا جائے۔ انتظامیہ کے لیے پی پی پی کی طرف سے نامزد خود

سوزی کرنے والوں کو پہچاننا مشکل تھا۔موقع پر موجود افراد عام طور پر جوش کا مظاہرہ کرتے۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے طریقوں میں پولیس کے جوان بہتری کرتے رہے۔ان میں تبدیلی اور سختی کو لاتے گئے۔اور اس طرح کئی انسانی زندگیوں کے ضیاع کو روکتے رہے۔

یکم اکتوبر ۱۹۷۸ء کو پارٹی کے کہنے پر تین افراد بذریعہ بس نو بجے صبح راولپنڈی میں پیرودھائی بس سٹاپ پر پہنچے۔عبدالوحید قریشی، رشید ناگی اور شیخ گل محمد۔وہ بذریعہ ٹیکسی شاہراہ پہلوی پہنچے۔ جہاں وہ لوگوں کے مجمع میں شامل ہو گئے۔ان میں سے ہر ایک نے مٹی کے تیل کی بوتل اپنی قمیضوں میں چھپائی ہوئی تھی۔

عبدالوحید قریشی نے شلوار اور قمیض پہن رکھی تھی۔رشید ناگی نے شوخ ارغوانی رنگ کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔اس وقت سنیما شو ختم ہوا تھا۔اور مجمع میں بے حد اضافہ ہو گیا تھا۔چونکہ عام طور پر اسی جگہ پر گرفتاریاں دی جاتی تھیں اس لیے پہلے ہی سے اس منظر پر نظر رکھنے کا اہتمام کر لیا گیا تھا۔کسی ناخوشگوار واقعہ کے پیش آنے سے قبل قابل ذکر پولیس کی نفری اس موقع پر موجود رہتی۔

دو بج کر پچیس منٹ پر عبدالوحید قریشی مجمع میں سے نکلا اور ''بھٹو زندہ باد'' کا نعرہ لگاتا ہوا سڑک کے درمیان جا پہنچا۔اس نے اپنے لباس کے نچلے حصہ کو آگ لگا دی۔چونکہ یہ پہلے ہی مٹی کے تیل سے بھیگے ہوئے تھے۔فوراً وہ آگ کی پکڑ میں آ گیا وہ چند قدم آگے بڑھا اور پھر سڑک کے درمیان گر پڑا موقع پر موجود پولیس نے عبدالوحید قریشی پر کمبل ڈال کر آگ بجھا دی۔اس اثنا میں عبدالوحید قریشی بے ہوش ہو چکا تھا۔آگ کو بجھاتے ہوئے پولیس کے ایک سب انسپکٹر کے دونوں ہاتھ بھی آگ کے شعلوں سے جھلس گئے۔پاکستان پیپلز پارٹی کے ورکرز ایک ساتھی کی قربانی پر نعرہ بازی کرتے رہے۔

رشید ناگی نے اپنے ہاتھوں اور گردن کے گرد پٹیاں لپیٹ کر اپنی شناخت کو چھپا رکھا تھا، وہ سڑک کے درمیان چھلانگ لگا کر کھڑا ہو گیا۔اس نے پاکستان پیپلز پارٹی کے حق میں اور جنرل ضیاء کے خلاف نعرے لگانے شروع کر دیئے۔اس نے ماچس نکال کر اپنے آپ کو آگ لگانے کا ارادہ کیا۔اس کے کپڑے پہلے ہی مٹی کے تیل میں بھیگے ہوئے تھے۔انہیں فی الفور آگ لگ سکتی تھی۔ لیکن پولیس نے بروقت مداخلت سے ماچس کی ڈبیہ چھین کر رشید ناگی کو جلنے سے بچا لیا، البتہ قانون کی خلاف ورزی کرنے پر اسے گرفتار کر لیا گیا۔

ان کے تیسرے ساتھی شیخ گل محمد نے راولپنڈی کے مقامی ساتھی سجاد انور کے ساتھ مل کر نعرہ بازی شروع کر دی اور سڑک کے درمیان بھاگ کر آ گیا۔اپنے ایک ساتھی کو بُری طرح سے جھلس

جانے کے بعد ذاتی قربانی دینے کا ان کا جذبہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ صرف پارٹی کی ہائی کمانڈ کی طرف سے احکامات کی تعمیل کرتے نظر آنا چاہتے تھے۔ ایسا نظر آیا کہ انہیں خودسوزی کے اصل مرحلہ سے گزرنے کے لیے زیادہ تیار نہ کیا گیا تھا اگر وہ ایسا کرنا چاہتے تھے تو انہیں یکبارگی اقدامات کرنے چاہئیں تھے۔ دوسری طرف جب عبدالوحید قریشی کو ابتدائی طبی امداد مہیا کر دی گئی تھی تو ہر ایک کی توجہ دوسری طرف ہو گئی تھی اور انہیں ایک ہی مرتبہ اپنے آپ کو آگ لگا دینی چاہیے تھی لیکن اس کے برعکس انہوں نے عبدالوحید قریشی کو ابتدائی طبی امداد کے مل جانے تک انتظار کیا۔ مگر پی پی پی ہائی کمانڈ کے حکم کی تعمیل لازمی تھی لہٰذا ایک ایک کر کے سب نے سڑک کے درمیان پہنچنے کی کوشش کی۔ انہوں نے خودسوزی کی بددلی سے کوشش کی۔ یہ ناکام ہو گئی اور ان کو گرفتار کر لیا گیا۔ عبدالوحید قریشی کو فوری طبی امداد فراہم کر دی گئی۔ پھر اسے سول ہسپتال منتقل کر دیا گیا جہاں سے اسے علاج کی خاطر ہولی فیملی ہسپتال بھیج دیا گیا۔ اس کے زخم گہرے تھے۔ اس کے بال جل چکے تھے۔ اس سے جلی ہوئی کھال کی بو آ رہی تھی۔ چونکہ پیپلز پارٹی گرفتاریاں پیش کرنے کے لئے ایک روز قبل جگہ کا اعلان کرتی تھی۔ انتظامیہ موثر تعداد میں افراد کو جمع کر لیتی آگ بجھانے والے آلات اور ایمبولینس کے ہمراہ ڈاکٹر کو وہاں پہنچا دیا جاتا اس موقع پر جہانزیب برکی مقررہ جگہ پر بروقت پہنچ جاتے۔ اور تمام مراحل کا جائزہ لے کر طریق کار پر تسلی کا اظہار کر دیتے۔ جسے انتظامیہ نے اپنانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔

تفتیش کے دوران انکشاف ہوا کہ گوجرانوالہ کے تین جاں نثاروں کو مختلف جرائم کی پاداش میں سزا دی جا چکی تھی۔ جہاں تک ان کے عہدوں کا تعلق تھا، عبدالوحید قریشی گوجرانوالہ شہر میں پاکستان پیپلز پارٹی کا نائب صدر تھا۔ اس کی ملکیت نو دکانیں تھیں۔ رشید ناگی شاعر تھا۔ شیخ گل محمد کی ایک معمولی سی دکان تھی۔ جہاں وہ روٹی بیچتا تھا۔ سجاد انور برطانوی سفارت خانہ اسلام آباد میں بطور مترجم کام کرتا تھا۔

خودسوزی کی ایک اور مثال عزیز ملک تھا جو مقامی روزنامہ کے دفتر میں پریس فوٹو گرافر تھا۔ وہی طریقہ اپنا کر اس نے کمیٹی چوک میں نعرہ بازی شروع کی اور اپنے آپ کو آگ لگا لی۔ مصمم ارادہ رکھنے کے سبب اس نے پہلے ہی سے اپنے لباس کو مٹی کے تیل میں بھگویا ہوا تھا۔ جس نے فوراً آگ پکڑ لی۔ اسے ہولی فیملی ہسپتال میں لے جایا گیا۔ جہاں وہ زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا اس نے اپنے پیچھے دو بیوائیں چھوڑیں، جن میں ایک ہجیرہ آزاد کشمیر میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ اور دوسری راولپنڈی میں تھی۔ بہرحال پاکستان پیپلز پارٹی نے اسے اپنا کارکن تسلیم کرنے سے انکار کر

دیا۔ پھر اس کے خاندان میں دوسری بیوی نے راولپنڈی میں انتظامیہ سے دردمندانہ اپیل کی۔ تحقیقات سے انکشاف ہوا کہ پاکستان پیپلز پارٹی اور خودسوزی کرنے والے کارکنوں میں ایک معاہدہ موجود تھا کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکن جو اس جگہ موجود ہوں گے ان کو بچائیں گے اور آگ لگانے کے فوراً بعد اس کو بجھا دیں گے ان کی قربانی کے صلہ میں فراخدلی سے پارٹی ان کے خاندانوں کو نقدی عطا کرے گی عزیز ملک کی راولپنڈی والی بیوی نے ان انتظامات کا انکشاف کیا اور اس کے خاوند کی موت کے ذمہ دار افراد کے خلاف اقدامات کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس انداز سے پاکستان پیپلز پارٹی کے خودسوزی کے پروگرام کے مقاصد کا علم ہوا(28)۔ یقیناً روپے کی خاطر یہ سب قربانی دی جا رہی تھی۔

لہٰذا ہم نے محسوس کیا کہ یہ دیر تک نہیں چل سکے گا۔ بلاشبہ جلد ہی اس کا زور ٹوٹ گیا۔

اس قسم کی حکمت عملی پارٹی کے رہنماؤں کی طرف سے ذاتی قربانی چاہتی ہے۔ اور یہ قربانی لفظوں سے نہیں عمل سے ظاہر ہوتی ہے۔ کہیں بھی پارٹی کارکنوں کی طرف سے قابل دید طاقت کا مظاہرہ کرنے اور ذاتی مثال سے جان کا نذرانہ پیش نہ کیا گیا۔ پارٹی کے بعض اہل کاروں نے متاثرہ خاندانوں کو مالی اعانت پیش کی ہوگی۔ لیکن یہ حقیقت تصدیق نہ ہو سکی۔

ایسا عمل جس کی بنیاد مصنوعی جذبہ پر ہو، ریت کی دیوار کی مانند ہوتا ہے چند کارکن جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ لہٰذا ان کے خاندان مفلس ہو گئے۔ کیونکہ ان کے بعد کوئی بھی ان کی دیکھ بھال کرنے والا نہ تھا۔ بچے یتیم ہو گئے۔ جن کے مستقبل کا کچھ علم نہیں۔ چونکہ پیپلز پارٹی کے مقاصد اس قسم کے قابل نفرت ہتھکنڈوں سے حاصل نہ کئے جا سکے۔ ان سے متاثرہ خاندانوں کے

28۔ الف۔ مسٹر بھٹو نے فوراً کہا ''کوئی اپنی انگلیاں بھی جلانے کی ہمت نہیں کرتا لیکن ہمارے کارندے اپنے آپ کو جلا رہے ہیں۔ اور ''خودسوزی'' کا ذریعہ اپناتے ہیں۔ (ان دنوں بعض غریب لوگ اپنے اوپر مٹی کا تیل چھڑکتے ہیں اور اپنے کپڑوں کو آگ لگاتے ہیں) انہوں نے کہا ''میں نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا ہے۔ وگرنہ ایک بڑی تعداد اپنے آپ کو جلا کر قربان ہو جاتے۔'' یہاں میں نے ایک آفیسر کے بیان کردہ واقعہ کا ذکر کیا۔ ''بعض غریب لوگ روپیہ پیسہ ملنے کی خاطر اپنے آپ کو آگ لگاتے ہیں۔ لیکن انہیں فوراً کمبلوں میں لپیٹ کر آگ سے جلنے سے بچایا جاتا ہے۔ لیکن ایسے لوگوں کو بڑی قیمتیں دی جاتی ہیں۔'' بھٹو صاحب نے ایسا سن کر سخت برہمی کا اظہار کیا اور کہا ''یہ سب جھوٹ کا پلندہ ہے'' اور پھر کہا ''میں نے اپنی پارٹی کو ہدایت بھیجی ہے کہ کسی کو بھی جل کر جان دینے کا ابھی موقع نہیں آیا'' (بھٹو کے آخری ۳۲۳ دن مصنفہ کرنل رفیع صفحہ ۴۷) بزبان اُردو

ب۔ جواباً حکومت نے خودسوزی کرنے والوں کی مذمت کی اور اسے ''سٹیج پر منظم ڈرامہ'' کا نام دیا۔ ایک اہلکار نے دعویٰ کیا کہ اس کے پاس ناقابل تردید ثبوت ہے کہ جلنے والوں کو معاوضہ میں رقم دی گئی ہے۔ پھر ان کو بچا لینے کے وعدے کئے گئے ہیں۔ (نیوز ویک ۱۶۔ اکتوبر ۱۹۷۸ء)

مصائب میں اضافہ ہی ہوا۔ امن و امان کا ایک نا قابل بیان مسئلہ کھڑا ہو جاتا اگر اس قسم کے مظاہرے طول پکڑ جاتے۔ عوام سے لاتعداد ہمدردیاں رکھنے والے مسحور ہو جاتے۔ اور اس طرح حکومت کے لیے آئندہ کے لائحہ عمل کے متعلق فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا۔ خوش بختی سے پیپلز پارٹی کے مظاہروں کے پیچھے فلسفہ بے حد غیر دانشمندانہ ثابت ہوا۔ انہوں نے صرف جائیدادوں کو نقصان پہنچایا اور عوام کے لیے مصائب کو جنم دیا۔ اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ بہر حال وہ انتظامیہ کو بے حد متفکر بنانے میں کامیاب رہے۔ خوش قسمتی سے امن و امان کا مسئلہ اس قدر نازک نہ بنا کہ پولیس کے لیے اس کو قابو میں رکھنا محال ہو جاتا۔ حساس اداروں میں سے کسی نے بھی درست طور پر پیشگی اطلاعات فراہم نہ کیں کہ جن کی بنیاد پر ہم ان مظاہروں کو ابتدا ہی میں روک لیتے۔ ایک ہی طاقت جس نے ہماری اعانت کی وہ رب العزت کی طاقت تھی۔ خداوند تعالیٰ کی امداد کے سبب انتظامیہ راولپنڈی کے ضلع میں قیام پذیر عوام کی طرف سے ان پر عائد ذمہ داریاں پوری کرنے کے فرض سے عہدہ برآ ہوسکی۔

یوم پاکستان پریڈ اور امن و امان

جناب بھٹو کے مقدمہ کی سماعت تقریباً اختتام پذیر ہو چکی تھی۔ انتظامیہ راولپنڈی میں امن و امان کی صورت حال کے متعلق زیادہ سے زیادہ متفکر ہوتی جا رہی تھی۔ ہمیں یقین تھا کہ پی پی پی کے جوشیلے کارکن ایسی سرگرمیوں میں لازماً مصروف ہوں گے۔ جس کے سبب مارشل لاء حکومت کے لیے مسئلہ بن جائے گا۔ ہمیں یہ بھی یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی بیرونی ہاتھ جیل سے مسٹر بھٹو کو بچانے کی سعی کرے گا۔ اس قسم کے تمام مفروضے ہمارے لیے دباؤ کا باعث بن رہے تھے۔ ان باتوں نے ہمیں زیادہ محتاط بنا دیا۔ لیکن یہ خطرات ہمارے ذہن پر سوار تھے اچانک جنرل ہیڈ کوارٹرز کی طرف سے پاکستان ڈے پیریڈ کو کمانڈ کرنے کے لیے مجھے میری نامزدگی موصول ہوئی۔ اگرچہ پریڈ کو کمانڈ کرنا میرے لیے بے حد عزت افزائی کا سبب تھا۔ لیکن میں اس کام کے لیے ذہنی طور پر بالکل تیار نہ تھا۔ یہ خبر مجھے بم کے گولہ کی مانند لگی۔ میں نے ایک سپاہی کی طرح اپنی نامزدگی کے خلاف احتجاج کیا کیونکہ راولپنڈی میں امن و امان قائم رکھنا بھی تو میری ایک ذمہ داری تھی کوئی میری رائے کو نہیں سن رہا تھا۔ اور سب کہہ رہے تھے کہ صدر نے اس کام کے لیے مجھے نامزد کیا ہے۔ جب حکم کا ذکر آتا ہے تو سپاہی کی کوئی رائے نہیں ہوتی۔ لہٰذا میں نے اسے تسلیم کیا اور ۲۳ مارچ ۱۹۷۹ کے روز پریڈ کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

یوم پاکستان کی پریڈ راولپنڈی ریس کورس گراؤنڈ میں منعقد ہوتی تھی اس میں آرمی، ایئر فورس، نیوی، فرنٹیئر کور، نیشنل گارڈز، ویمن گارڈ بھاری اور ہلکی گاڑیوں کے دستے، جہاز اور ہیلی کاپٹر وغیرہ حصہ لیتے تھے۔ ہر محکمہ کی ڈیوٹی بٹی ہوئی تھی اور وہ ہر روز اپنی ذمہ داری کو احسن طریقہ سے نبھانے میں مشغول رہتے تھے۔

پریڈ کمانڈر کی حیثیت سے مجھے ساری پریڈ میں یکسانیت پیدا کرنی تھی۔ بدقسمتی سے موسم ہمارے حق میں نہیں تھا اور وقفہ وقفہ کے بعد بارش ہمارا پروگرام خراب کر دیتی تھی۔ پھر بھی ہم نے ہمت نہ ہاری۔ ہر کوئی یونٹ کمانڈر اپنی یونٹ کو پہلے نمبر پر دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا جو خوش قسمت یونٹ نے پریڈ کے دوسرے روز بڑے کھانے کے موقع پر جنرل ضیاء الحق سے وصول کیا۔

میری مدد کے لیے نیوی سے ڈپٹی پریڈ کمانڈر متعین کیا گیا اور ایئر فورس سے ایک سٹاف آفیسر۔ ان دونوں نے انتھک محنت سے پریڈ کو کامیاب بنانے میں میری مدد کی۔ امن وامان کا مسئلہ ہر وقت میرے سر پر سوار رہتا تھا۔

کرنل ٹریسلر سٹیشن کمانڈر نے ہم سے تعاون کیا۔ گراؤنڈ کی تیاری اور پریڈ پروگرام میں اس کے آدمیوں نے ہمارے کام میں قطعاً دخل اندازی نہ کی۔ خدا کا شکر ہے کہ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ پریڈ بے حد سکون سے ہوئی اور گراؤنڈ میں موجود تمام افراد کی سیکورٹی اور حفاظت کے متعلق تمام خدشات غلط ثابت ہوئے۔ نیشنل ڈے پریڈ کی کمانڈ میرے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔

فوج کا استعمال

میں نے اپنے ہی ہم وطنوں کے خلاف فوج کو استعمال نہ کرنے کا اصول سختی سے ذہن میں رکھا۔ بشرطیکہ لوگوں کی جان کو اور جائیدادوں کو نقصان پہنچنے کا حقیقی خطرہ درپیش نہ ہو۔ خوش قسمتی سے راولپنڈی اور بعد ازاں سرگودھا ڈویژن کے لیے مارشل لاء کے فرائض کی انجام دہی میں مجھے کبھی بھی مشکل مرحلہ پیش نہ آیا۔ لیکن میں نے فوج کو ہمیشہ تیار رکھا۔ فوج کے لیے ایسا بے شک تھکا دینے والا اور مشکل کام تھا۔ لیکن ایسا کرنے کا فائدہ ضرور ہوا۔ ذاتی طور پر میں ہمیشہ بغیر ہتھیار کے گھومتا پھرتا رہا۔ اور نہ ہی ذاتی سیکورٹی کی خاطر کسی محافظ کو ساتھ رکھا میرا خیال تھا کہ بچاؤ کے لیے ایسے انتظامات خطرات کو دعوت دینے کے مترادف ہوتے ہیں۔ اور بے شک اعلیٰ بچاؤ کے انتظامات کے باوجود انسان موت کی گود میں جا سکتا ہے۔ مثلاً امریکہ کے صدر جان ایف کینیڈی بہترین انتظامات کے باوجود قتل کر دیئے گئے۔ ضلعی انتظامیہ کی حیثیت سے ہم نے ہمیشہ

عوام کے جمگھٹوں کا سامنا کیا۔ کئی دفعہ تشدد آمیز گروہ کا بھی سامنا ہوا۔ لیکن ہم نے مسائل کو ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ حل کیا۔

اب جب میں راولپنڈی کے سب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی خدمات کا زمانہ یاد کرتا ہوں تو میں اپنے آپ کو بے حد خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ مجھے بریگیڈ میں شامل فوج کے استعمال کی کبھی ضرورت پیش نہ آئی۔ اگرچہ کئی دفعہ بے حد خطرناک صورت حال کا سامنا ہوتا رہا۔ ایک بے حد حساس موقع اس وقت پیش آیا جب بھٹو کے تابوت کو آخری سفر کے لیے فوجی گاڑی میں چکلالہ ہوائی اڈہ پر اس کے خاندانی قبرستان تک پہنچانے کے لیے لے جایا گیا تھا۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ جہاں فوج کا استعمال لازمی ہو جاتا۔ کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل چشتی اور اس کے سی او ایس بریگیڈیئر وڑائچ دونوں بھٹو کی پھانسی کے روز راولپنڈی سے غیر حاضر تھے(29) اگر مجھے فوج کے استعمال کی ضرورت پڑ ہی جاتی تو میں اجازت لینے کے لیے کور کمانڈر یا اس کے سی او ایس کو کہاں ڈھونڈتا۔ جب دونوں نے شہر سے غیر حاضر ہونا تھا تو مجھ پر یہ پابندی کور کمانڈر نے کیوں عائد کی تھی۔ اس کا تو بہتر جواب کور کمانڈر خود ہی دے سکتے ہیں۔

29۔ حاشیہ نمبر ۲۴ کو دیکھئے (Betrayal of Another Kind) مصنفہ لیفٹیننٹ جنرل فیض علی چشتی ص ۱۹۶)

ذوالفقار علی بھٹو کے مقدمہ کے حقائق اور تاریخ

پاکستان کے سابق وزیر اعظم کو کیوں تختہ دار پر لٹکایا گیا؟ اس کے خلاف مقدمہ کیوں درج کیا گیا؟ اس نے رحم کے لیے اپیل کیوں نہ کی؟

غالباً تاریخ ان تمام سوالات کا جواب دے گی۔ مناسب ہوگا کہ یہاں ہم پاکستان سپریم کورٹ کے فیصلہ کے اہم نکات کا خلاصہ درج کر دیں۔(30)

۱۰ نومبر ۱۹۷۴ء کو مسٹر احمد رضا قصوری رکن قومی اسمبلی جو مسٹر بھٹو کے ایک وقت قریبی ساتھی ہوتے تھے، شادی کی ایک تقریب کے بعد اپنے گھر واپس لوٹ رہے تھے احمد رضا قصوری کے والد نواب محمد احمد خاں بھی اسی گاڑی میں سفر کر رہے تھے جب ان کی گاڑی شاہ جمال چوک

30۔ وقوعہ کے روز ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز تھے۔ اس عہدہ پر وہ اگست ۱۹۷۳ء سے لے کر ۵ جولائی ۱۹۷۷ء تک فائز رہے جب کہ ملک میں مارشل لاء کا نفاذ ہوا۔ دوسرے لوگوں میں فیڈرل سیکورٹی فورس کے اراکین میاں محمد عباس ڈائریکٹر آپریشن اور انٹیلی جنس، غلام مصطفیٰ ارشد اقبال، رانا افتخار احمد جو مذکورہ فورس میں بالترتیب بطور انسپکٹر، سب انسپکٹر اور اسسٹنٹ سب انسپکٹر بھرتی کئے گئے۔ فیڈرل سیکورٹی فورس کے ڈائریکٹر جنرل مسعود محمود اور ایک دوسرے انسپکٹر غلام حسین بھی ملزمان کی فہرست میں شامل تھے۔ لیکن بعد میں ان کو معاف کر دیا گیا۔ بعد ازاں انہوں نے سرکاری گواہ کے طور پر شہادتیں دیں۔

وقوعہ دس اور گیارہ نومبر ۱۹۷۴ لاہور میں شادمان۔ شاہ جمال چوک کے نزدیک پیش آیا احمد رضا قصوری (پی ڈبلیو۔۱) ماڈل ٹاؤن میں اپنے گھر واپس آ رہے تھے۔ شادمان کالونی میں بشیر حسین شاہ کے ہاں شادی کی تقریب تھی۔ وہ اپنی کار نمبر ایل ای جے۔ ۹۴۹۵ چلا رہے تھے۔ ان کے والد محمد احمد خان مرحوم ان کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ان کی والدہ اور بہن گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھیں۔ جب وہ متذکرہ چوک کے قریب پہنچے شادی کے گھر سے ۱۰۰ گز دوران کی کار پر گولیاں برسائی گئیں جو خودکار ہتھیار سے چلیں۔ گاڑی کی سامنے والی بتیاں اور کار کے دوسرے حصے متاثر ہوئے۔ ان کے والد کو گولیاں لگیں۔ گاڑی کی بتیاں تو بچ گئیں لیکن احمد رضا قصوری گاڑی چلاتے رہے اور زخمی باپ کو لے کر یو سی ایچ پہنچے۔ ان کے والد زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسے (دو بجکر ۵۵ منٹ صبح)

(فیصلہ سپریم کورٹ پاکستان مجرمانہ اپیل نومبر ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۹۷۸ء ذوالفقار علی بھٹو اور دیگر صفحات ۴۔ ۵)

شادمان کالونی لاہور سے گزر رہی تھی تو بعض نامعلوم افراد نے ان پر فائرنگ کر دی۔ گولیوں کی بوچھاڑ سے نواب محمد احمد خان دم توڑ گئے۔ قتل کے مقدمہ کو اچھرہ پولیس سٹیشن پر درج کروا دیا گیا۔

۱۳ دسمبر ۱۹۷۵ء کو لاہور ہائی کورٹ نے جسٹس شفیع الرحمٰن کی سربراہی میں ٹربیونل مقرر کیا۔ جس کی رپورٹ اب تک شائع نہیں کی گئی (31)۔ بعد ازاں ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو جب جنرل ضیاء الحق کی سربراہی میں تیسرے مارشل لاء کا انعقاد کیا گیا تو مارشل لاء حکومت نے فیڈرل سیکورٹی فورس کے معاملات کی تحقیقات کی۔ تفتیش کے دوران نواب محمد احمد خان کے قتل کے متعلق بعض انکشافات ہوئے۔ نتیجتاً ۲۴ جولائی ۱۹۷۷ء کو انسپکٹر ارشد اقبال اور اسسٹنٹ سب انسپکٹر رانا افتخار جن کا تعلق ایف ایس ایف سے تھا، کو مقدمہ کی مزید تحقیقات کے لیے شریک کر لیا گیا۔ بعد ازاں ۲۵ جولائی کو ان دونوں افسران کو گرفتار کر لیا گیا۔

تین روز بعد ۲۸ جولائی کو فیڈرل سیکورٹی فورس سے تعلق رکھنے والے انسپکٹر غلام حسین کو بھی گرفتار کر لیا گیا جو بعد میں سرکاری گواہ بن گیا۔ ۳۱ جولائی کو انسپکٹر صوفی غلام مصطفیٰ اور بعد ازاں ۱۱/اگست کو میاں عباس ایف ایس ایف کا ڈائریکٹر آپریشن جسے پہلے ہی شریک اراکین بنایا گیا تھا گرفتار کر لئے گئے۔ میاں عباس نے قتل میں ملوث ہونے کا اعتراف کر لیا۔ لیکن بعد ازاں وہ مکر گیا۔ ۲۴۔ اگست کو مسعود محمود ڈائریکٹر جنرل ایف ایس ایف کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے بھی نواب محمد احمد خان کے قتل میں شرکت کا اعتراف کر لیا۔ بعد ازاں وہ سلطانی گواہ بن گیا۔ گواہوں نے اپنی شہادتوں میں درج کروایا کہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے حکم پر انہوں نے قتل کیا۔ انہوں نے مزید الزام لگایا کہ مسٹر بھٹو رضا قصوری کو قومی اسمبلی کے رکن کے طور پر نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے قصوری کو قتل کرنے کے لیے احکامات صادر کئے۔ بدقسمتی سے ان کی کوشش کے دوران نواب محمد احمد خان ہلاک ہو گئے۔ ان تحقیقات کی روشنی میں مسٹر بھٹو کو گرفتار کر لیا گیا۔ جبکہ وہ کراچی میں ۷۰ کلفٹن میں قیام پذیر تھے۔ اسی روز انہیں لاہور پہنچا دیا گیا۔

۱۳ ستمبر ۱۹۷۷ء کو لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس مسٹر صمدانی نے مسٹر بھٹو کو پچاس ہزار روپیہ کی ضمانت پر رہا کر دیا۔ ۲۷۔ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو لاہور ہائی کورٹ نے ضمانت منسوخ کر دی اور مسٹر بھٹو کو پھر گرفتار کر لیا گیا۔ لاہور ہائی کورٹ میں اس مقدمہ کی کارروائی تقریباً پانچ ماہ جاری رہی۔ ۱۸ مارچ ۱۹۷۸ء کو لاہور ہائی کورٹ نے اپنے فیصلے کا اعلان کیا اور مسٹر بھٹو اور دوسرے چار ملزمان میاں عباس، ارشد اقبال، صوفی غلام مصطفےٰ اور رانا افتخار کو موت کی سزا سنائی۔ ۲۲ مارچ ۱۹۷۸ء کو

31۔ بہاول پور سے چار کوس دور مصنفہ ناصر نقوی صفحات ۱۱۶۔ ۱۱۸ بزبان اُردو

چاروں شریک ملزمان نے سپریم کورٹ آف پاکستان میں لاہور ہائی کورٹ کے فیصلہ کے خلاف اپیل دائر کر دی۔ ۲۵ مارچ ۱۹۷۸ء کو مسٹر بھٹو کے وکیل نے بھی ایسا ہی کیا۔ تمام اپیلیں اپریل ۱۹۷۸ء کو باقاعدہ سماعت کے لیے منظور کر لی گئیں۔ نیز سپریم کورٹ آف پاکستان نے ملزمان کو ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی منتقل کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ مزید تیاری کی خاطر مسٹر بھٹو کے وکیل کی استدعا پر ۲۰ مئی ۱۹۷۸ء کو سماعت کی تاریخ ملتوی کر دی گئی۔

سپریم کورٹ بنچ میں نو جج تھے۔ مقدمہ کی کارروائی ابھی جاری تھی کہ مسٹر جسٹس قیصر خان ۳۰ جولائی ۱۹۷۸ء کو ریٹائر ہو گئے۔ اس کے بعد ۲۰ نومبر ۱۹۷۸ء تک بقیہ آٹھ ججوں کے ساتھ کارروائی جاری رہی۔ بدقسمتی کے ساتھ بنچ کے ایک رکن جسٹس وحید الدین علیل ہو گئے۔ انہیں دماغی دوران خون کا حملہ ہوا جس کے سبب بینائی، قوت گویائی اور عام صحت پر برُا اثر پڑا۔ تین ہفتوں کے التواء کے بعد جبکہ ان کی صحت یابی نہ ہوئی تو عدالت نے ان کے بغیر مقدمہ کی سماعت شروع کرنے کا فیصلہ کیا(32)۔

بھٹو کے وکیل نے عدالت عالیہ سے درخواست کی کہ مسٹر بھٹو کو ذاتی طور پر مقدمہ کے متعلق دلائل پیش کرنے کی اجازت دی جائے جیسا کہ سپریم کورٹ آف پاکستان کے فیصلہ کے اقتباس سے ظاہر ہے ''اپیل کو سننے کے آغاز سے قبل اور مابعد زبانی استدعا کی گئی کہ درخواست دہندہ کو عدالت میں آخری بیان دینے کا موقع فراہم کیا جائے۔ سیکشن ۳۴۲ ضابطہ مجرمانہ کارروائی کے مطابق درخواست دہندہ کو سماعت کی عدالت میں اس موقع کی فراہمی سے انکار کر دیا گیا۔'' درخواست دہندہ کی جانب سے ایک تحریری درخواست بھی عدالت کو پیش کی گئی جس میں استدعا کی گئی کہ مقدمہ کے بعض پہلوؤں پر درخواست دہندہ کو عدالت سے خطاب کرنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ اس استدعا کو تسلیم کر لیا گیا اور درخواست دہندہ چار روز ۱۸ سے ۲۱ دسمبر ۱۹۷۸ء تک عدالت کے سامنے پیش ہوتا رہا(33)۔

بہرحال سپریم کورٹ میں کارروائی ۲۰ مئی ۱۹۷۸ء سے دسمبر تک مسٹر بھٹو کے بغیر جاری رہی۔ اس کارروائی کے انداز کا اندازہ ان الفاظ تحسین سے لگایا جا سکتا ہے جو عدالت نے دونوں اطراف کے وکلاء کے متعلق کہے: ''اس مقدمہ میں دلائل کئی ماہ پر محیط ہیں۔ جس کے دوران دونوں اطراف کے فاضل وکلاء نے ہمیں بیش قیمت امداد فراہم کی اور فوجداری قانون کی وضاحت اور کاروائی میں

32۔ پاکستان سپریم کورٹ کا فیصلہ مجرمانہ اپیلیں نمبر ۱۱۔ ۱۲ اور ۱۳۔ ۱۹۷۸ء ذوالفقار علی بھٹو و شریک ملزمان صفحات ۲۔ ۳

33۔ سپریم کورٹ پاکستان کا فیصلہ پی پی ۱۸۔ ۱۹ پیراگراف ۲۳۔ ۲۴

مدد ملی۔ تحریری نوٹ مہیا کرنے سے عدالت کو بے حد مفید اعانت ملی جو غیر معمولی (34) محنت سے تیار کئے گئے مواد کے مظہر تھے۔

مسٹر بھٹو کو سپریم کورٹ بحفاظت پہنچانا

پاکستان سپریم کورٹ میں مسٹر بھٹو کی اپیل کی سماعت کے لیے تاریخ مقرر کر دی گئی۔ عدالت پشاور روڈ پر ڈسٹرکٹ جیل (35) سے تقریباً تین کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع تھی۔ مسٹر بھٹو کو متواتر چار روز تک حفاظت سے لے جانا تھا اور واپس بھی لانا تھا عدالت نے بھٹو کو اپنی ذاتی پسند کا لباس پہننے کی اجازت دے دی تھی ان کی سیکورٹی عدالت (36) میں جاتے اور واپس آتے بلاشبہ ایک مشکل کام تھا۔ جسے ہم نے یقینی بنانا تھا۔

ڈپٹی کمشنر سعید مہدی، سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس، جہانزیب برکی سپرنٹنڈنٹ پولیس سپیشل برانچ راجہ محمود اور میں نے درپیش مسائل پر غور کیا۔

جناب بھٹو ایک تسلیم شدہ رہنما تھے۔ چنانچہ ان کے جوشیلے کارکن بھٹو کو عدالت میں جاتے اور واپس لاتے ہوئے بچانے کی کوشش کر سکتے تھے۔ہم نے یہاں تک بھی سوچا کہ بعض سر پھرے پارٹی کے کارکن بھٹو کو ہلاک بھی کر سکتے تھے۔ مثلاً اس کی پارٹی کے اپنے کارکن اسے قتل کر کے یہ الزام پھیلا دیں کہ جنرل ضیاء ہی نے بھٹو کو قتل کروایا ہے۔ اس طرح وہ ضیاء کو قدموں سے اکھاڑ سکتے تھے۔ اگر وہ کامیاب ہو جائیں تو وہ مسٹر بھٹو کو ایک قاتل سے شہید بنا کر پیش کر سکتے تھے۔ اگر لیاقت باغ میں لیاقت علی خان کا قتل کچھ اس قسم کے جذبے سے وابستہ کیا جا سکتا ہے جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے تو مسٹر بھٹو کے سلسلہ میں بھی یہ بعید از فہم نہ ہوگا۔ ان تمام باتوں سے سب سے زیادہ خطرناک یہ ممکنہ صورت ہو سکتی تھی کہ پیپلز پارٹی کے جوشیلے کارکن مسٹر بھٹو کو لے جانے والی کانوائے کو گھیر لیں اور مسٹر بھٹو کو رہا کروانے کی کوشش کریں اور حکومت کے کنٹرول سے نکال لیں۔ یہ بظاہر سب سے خطرناک صورت حال تھی لیکن کم سے کم ممکن نظر آتی تھی۔ کیونکہ خودسوزی کی مشق چند ہی روز بعد دم توڑ گئی تھی۔ مسٹر بھٹو جیل سے مظاہرہ کے لیے رہنمائی نہیں کر سکتے تھے۔ اور پیپلز پارٹی کی بقیہ لیڈرشپ عوام کی رہنمائی کرنے کے قابل نہ تھی۔ لہٰذا پارٹی بذات خود غیر موثر ہو گئی تھی۔ کوئی بھی

34۔ پاکستان سپریم کورٹ کا فیصلہ صفحہ ۸۲۴

35۔ ان دوررس واقعات کے ہمراہ جس جیل میں مسٹر بھٹو کو رکھا گیا تھا۔ اسے گرا دیا گیا اور نئی جگہ پر منتقل کیا گیا جسے اڈیالہ کہتے ہیں جو راولپنڈی سے ۱۴ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

36۔ پلان ٹو سپرنگ بھٹو (مائی فیوڈل لارڈ مصنفہ تہمینہ درانی صفحہ ۵۔۱۱ پیرا۔ ۵)

عوام کو راہ دکھانے کے قابل نہ تھا۔ لہٰذا تمام مظاہرے عارضی نوعیت کے تھے۔ ہمیں یقین تھا کہ اگر پیپلز پارٹی کی لیڈر شپ خودسوزی کی حکمت عملی پر قدم جمائے رہی تو حکومت کیلئے یہ صورت حال باعث تشویش ہو جائے گی۔ لیکن وہ جنہوں نے اپنے آپ کو آگ لگائی کرایہ کے لوگ تھے۔ جنہیں پارٹی نے اس کام کیلئے قیمت ادا کی تھی۔ لہٰذا یہ تماشا جلد ختم ہو گیا۔ اس وقت تک پارٹی میں لیڈر شپ کے خواہش مند افراد کو معلوم ہو گیا تھا کہ صرف بے لوث پارٹی کے پرعزم کارکن ہی اس مہم کو کامیابی کی منزل سے ہمکنار کر سکتے تھے۔ بہر حال مسٹر بھٹو کو بچانے کی کوشش حقیقی خطرہ بنی رہی۔ چنانچہ اس کو ممکنہ خطرناک اقدامات پر سرفہرست رکھا گیا۔ اور اس کے مقابلہ کیلئے جوابی اقدامات کی تیاری جاری رہی۔ لیکن ہم نے تمام خطرات کا مناسب جواب دینے کے لیے حل تیار رکھے۔ بعد ازاں ہم نے اپنے تمام منصوبوں پر جیل سپرنٹنڈنٹ یار محمد سے تبادلہ خیال کیا۔ جس نے ہم سے اتفاق کیا۔

صلاح الدین نیازی ایڈیشنل سپرنٹنڈنٹ پولیس راولپنڈی کو ہر روز مسٹر بھٹو کو جیل سے سپریم کورٹ بحفاظت لے جانے اور واپس لانے کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ حکومت نے جیل سپرنٹنڈنٹ کو ہدایات جاری کیں کہ مسٹر بھٹو کو قیدیوں کی پولیس گاڑی میں لے جایا جائے۔ اس مقصد کے لیے تین گاڑیوں پر مشتمل ایک کارواں تشکیل دیا گیا۔ آگے اور پیچھے کی گاڑیاں حفاظتی گارڈ ہوں گی اور مسٹر بھٹو درمیان والی گاڑی میں سفر کریں گے۔ ٹرانسپورٹ اور افراد مقامی پولیس جیل سپرنٹنڈنٹ کے لیے مہیا کرے گی۔ جیل سے سپریم کورٹ جانے والے تین راستوں کے فوائد اور نقصانات کے متعلق ہم نے تبادلہ خیال کیا۔

پہلا بایاں راستہ تھا۔ اس میں جونہی یہ جیل دروازہ سے باہر نکلتا۔ کارواں بائیں طرف گیٹمل موٹل کو مڑتا۔ بعد ازاں گرینڈ ٹرنک روڈ سے گزر کر یہ سنٹرل آرڈیننس ڈپو کی طرف جاتا۔ پھر لال کرتی کی طرف جاتے ہوئے جنرل ہیڈ کوارٹر سے سٹیشن سکول کی طرف جاتا۔ پھر مغرب سے ملٹری ہسپتال کا چکر لگاتا ہوا پشاور روڈ پر نکلتا۔ اور یہاں سے سپریم کورٹ پہنچتا۔ یہ دوسرا لمبا راستہ تھا۔ فورس کی ضرورت ہوتی۔ اس راستہ کا زیادہ تر حصہ زیادہ آبادی والے علاقہ سے گزرتا تھا جس میں زیادہ پولیس فورس کی ضرورت تھی۔ تاکہ سیکورٹی قائم رہے۔ اس میں سنٹرل آرڈیننس ڈپو میں مزدوروں کی بڑی تعداد متوجہ ہو سکتی تھی۔ جو مسٹر بھٹو کی سیکورٹی کے لیے ایک سنگین خطرہ بن سکتی تھی۔ اسی طرح لال کرتی سے آگے زیادہ آبادی والا علاقہ آسانی سے ٹریفک کی زیادتی کے باعث بند ہو سکتا تھا۔ اور اس طرح مسٹر بھٹو کی سیکورٹی کے لیے خطرہ بن سکتا تھا۔

سب سے چھوٹا درمیانی راستہ تھا کاروان جیل سے نکل کر سیدھا چلتا ڈسٹرکٹ کورٹ سے گزرتا۔

مال کی طرف سے سپریم کورٹ کو پہنچتا۔ چونکہ یہ سب سے چھوٹا راستہ تھا۔ اس میں وقت کم درکار تھا اور سپریم کورٹ کم وقت میں پہنچا جا سکتا تھا اگر اسے اپنایا جاتا تو تھوڑے وقت کے لیے مسٹر بھٹو کو خطرہ لاحق ہوسکتا تھا۔ چونکہ مال روڈ پر بڑی ٹریفک کی اجازت نہ تھی۔ یہاں ٹریفک کے رک جانے کا خطرہ نہ تھا۔ چنانچہ سپریم کورٹ جانے کے لیے مسٹر بھٹو کے قافلہ کو کوئی مشکل پیش نہ آتی اور یہ بہ آسانی چلتا رہتا۔ اس راستہ پر صرف دو جگہوں پر لوگوں کا جمگھٹا ہوسکتا تھا۔ جہاں دو سنیما گھر موجود تھے۔ لیکن وہ قبل دوپہر بند ہوں گے۔ لہٰذا ان سے کوئی حقیقی خطرہ نہ ہوگا۔ علاوہ ازیں چودہ چوراہے تھے۔ جن سے کئی متبادل راستے نکلتے تھے۔ جو ٹریفک رک جانے کی صورت میں سپریم کورٹ کی طرف جاتے تھے۔ پھر یہی چودہ چوراہے عوام کے لیے جمع ہونے اور کارواں پر حملہ کر کے بھٹو کو چھڑوا سکتے تھے۔ اسی طرح سرسید کالج اس شاہراہ پر واقع تھا اور طلبہ افراتفری پیدا کر سکتے تھے۔

دایاں راستہ سب سے طویل تھا۔ اس منصوبہ کے تحت جونہی کارواں جیل کے دروازہ سے نکلتا۔ یہ ہوائی اڈہ کی سڑک کی جانب دائیں سمت مڑ جاتا۔ اور پھر اسلام آباد ہائی وے سے مل جاتا۔ اور زیرو پوائنٹ سے ہوکر یہ شاہراہ کشمیر کی طرف جاتا اور پھر گولڑہ چوک سے ہوکر جانب جنوب جا کر پشاور روڈ سے سپریم کورٹ پہنچ جاتا۔ یہ راستہ ٹریفک سے فارغ تھا۔ اور گولڑہ چوک تک کوئی مشکل بات نہ تھی چنانچہ اس پر کم سے کم سیکورٹی کے انتظامات کی ضرورت تھی اور سپریم کورٹ کافی تیزی سے پہنچا جا سکتا تھا۔ اس راستہ میں کافی دور تک دوہری سڑک موجود تھی۔ لیکن یہ راستہ بے حد طویل تھا۔ اور اس طرح کارواں کو خطرہ زیادہ عرصہ تک رہتا۔ طویل راستہ ہونے کے باعث اس کے لیے زیادہ پولیس فورس کی ضرورت تھی۔ تاکہ سیکورٹی یقینی ہو سکے۔ ہوائی اڈہ اور گولڑہ چوک جیسے علاقے جہاں مزدوروں کی تعداد زیادہ تھی۔ سیکورٹی کے لحاظ سے زیادہ خطرناک تھے۔ مثلاً مختلف صنعتوں میں مزدوروں کی کثیر تعداد کے باعث ٹریفک میں رکاوٹ آ سکتی تھی۔ چنانچہ ریزرو پولیس فورس کی بڑی تعداد مطلوب ہوتی۔ تمام نفع اور نقصان کے اعداد کو سامنے رکھ کر ہم نے درمیانی راستہ کا انتخاب کیا۔ جہاں فوائد زیادہ تھے۔

اب ہم نے اس امر کا فیصلہ کرنا تھا کہ ہم ناگہانی صورت حال کا مقابلہ کیسے کریں گے۔ جیل اخباری نمائندوں اور دوسروں کی متواتر توجہ کا مرکز بن چکا تھا۔ اس سے بچنے کے لیے ہم نے فیصلہ کیا کہ سپریم کورٹ پہنچنے کے لیے تینوں راستوں کا استعمال کیا جائے۔ چنانچہ ایک جیسی تین گاڑیوں کے تین دستے ترتیب دینے کا فیصلہ کیا گیا لہٰذا ایس ایس پی نے راولپنڈی رینج کے ڈی آئی جی کی معاونت سے ایک جیسی تین گاڑیوں کے حصول کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ ہماری حیرت کی

کوئی حد نہ رہی کہ انتہائی کوشش کے باوجود ہمیں ایک ہی قسم کی گاڑیوں کے تین سیٹ جو ہم چاہتے تھے میسر نہ آ سکے۔ بہرحال انسپکٹر جنرل پولیس کی اعانت سے ایس ایس پی کسی حد تک ایک جیسی گاڑیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

جناب بھٹو کو سپریم کورٹ لے جانے کے لیے ایک روز قبل گاڑیوں کی ضرورت تھی۔ ہم نے منصوبہ بنایا کہ گاڑیوں کے تینوں دستے بہ یک وقت ایک ایک کر کے جیل میں پہنچیں تاکہ کوئی غیر ضروری افراتفری نہ پڑے۔ منصوبہ کے مطابق ہر روز تینوں گاڑیاں جیل سے باہر نکلیں اور تین گاڑیوں پر مشتمل تین دستے۔ ہر راستہ پر ایک دستہ آگے بڑھے۔ تینوں گاڑیوں کے تین دستے سپریم کورٹ پاکستان کی عمارت کے سامنے ظاہر ہو جائیں۔

جناب بھٹو درمیانی گاڑی میں روانہ ہوں گے۔ جو قیدیوں کی گاڑی تھی۔ اس میں پردے لگائے گئے تھے۔ تاکہ کوئی بھی اندر نہ دیکھ سکے۔ پہلی اور آخری میں حفاظتی دستوں کے سفر کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جب عدالت کی کارروائی اختتام پذیر ہوتی تو مسٹر بھٹو کو ہر روز اسی انداز سے واپس لے جایا جاتا۔

یہ بے انتہا خفیہ منصوبہ تھا۔ باہر کے کسی فرد کو یہ معلوم نہ ہوتا کہ مسٹر بھٹو کس راستہ پر سفر کرتے ہیں۔ اس منصوبے پر ڈی ایم ایل اے میجر جنرل شاہ رفیع عالم نے منظوری دی اور ساتھ یہ بھی کہا کہ اگر مسٹر بھٹو کے مقدمہ میں سپریم کورٹ کی جانب سے ان کی اپیل مسترد ہو جائے تو کوڈ ورڈ 'بلیک ہارس' وائرلیس پر استعمال کر کے رفیع عالمؒ کو اطلاع کر دی جائے۔

جناب بھٹو کو میرا پہلی مرتبہ دیکھنا

جیل کے سپرنٹنڈنٹ یار محمد کو اس منصوبہ کی اہم باتوں سے روشناس کر دیا گیا۔ اس نے مسٹر بھٹو کو ایک روز قبل ہی آگاہ کر دیا تھا کہ انہیں سپریم کورٹ میں ایک روز بعد اپنی ذاتی شنوائی کے لیے لے جایا جائے گا۔ جیسا کہ پہلے بتلایا گیا مسٹر بھٹو کو اپنی پسند کا لباس زیب تن کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

جب بھٹو اپنے سیل سے باہر تشریف لائے اور کھلے صحن میں کھڑے ہو گئے۔ جیل میں قیام کے بعد اس وقت میں نے انہیں پہلی مرتبہ دور سے دیکھا۔ وہ گاڑی پر سوار ہونے کے لیے آئے جسے کھلی جگہ کھڑا کیا گیا تھا۔ عمدہ سلے ہوئے سوٹ میں وہ خوبرو نظر آ رہے تھے (37)۔ بہرحال ان کا

37۔ سپریم کورٹ کی جانب سے مسٹر بھٹو کو ذاتی شنوائی کی اجازت سے قبل عام افواہ پھیل چکی تھی کہ ان کی صحت خراب ہو گئی ہے۔ اور علیحدگی میں رہنے کے سبب ان کی قوت ارادہ سلب ہو چکی ہے۔ لیکن جب وہ سپریم کورٹ میں داخل ہوئے تو ہمارے اندیشے غلط ثابت ہو گئے۔ انہوں نے سمارٹ سوٹ پہنا ہوا تھا۔ بہرحال وہ کافی دبلے پتلے نظر آئے۔ لیکن ان کے چہرہ پر وہی چمک موجود تھی۔ (بچپن سے تختہ دار تک مصنفہ سلمان تاثیر صفحہ ۲۰۰۔ اشاعت بزبان اُردو)

وزن گھٹ چکا تھا۔ ان کا سوٹ ڈھیلا نظر آ رہا تھا انہوں نے ارد گرد دیکھا۔ مسکرائے اور تھوڑے سے وقفہ کے لیے توقف کیا۔ میرے ساتھ ضلعی انتظامیہ کے افراد جیل کے دروازہ کے پورچ میں کھڑے تھے۔ ہم اس طرح کھڑے تھے کہ مسٹر بھٹو ہمیں نہ دیکھ سکیں۔

یہ وہ دن تھا جب اپیل کرنے کے لیے بھٹو کو سپریم کورٹ لے جانا تھا۔ زیر حراست ہونے کے تمام عرصہ کے دوران یہ میرا اس کے ساتھ پہلا نظری رابطہ تھا اور اگلے چار ایام کے دوران یہ رابطہ جاری رہا یعنی ایک مرتبہ جیل میں اور بعد ازاں کورٹ میں اپیل کے وقت۔ تمام زندگی میں ذاتی طور پر مسٹر بھٹو سے میں کبھی نہیں ملا۔ مجھے ان سے بات چیت یا مصافحہ کرنے کا موقع سرکاری تقریبات کے دوران عام تعارف کے طور پر ملا ہوگا۔

جب انہوں نے اپنے سفر کے انتظامات کو دیکھا تو وہ آگ بگولا ہو گئے۔ انہوں نے گاڑی کے اندر داخل ہونے سے انکار کر دیا اور جیل کے سپرنٹنڈنٹ یار محمد خان سے بحث شروع کر دی۔ انہوں نے دھمکانے والے الفاظ کے ساتھ سخت زبان استعمال کی۔ یار محمد بنیادی طور پر ٹھنڈی طبیعت کا مالک تھا۔ جس نے مسٹر بھٹو کے ساتھ احترام کا انداز اختیار کیا۔ کسی لمحہ اس نے بے عزتی کا انداز نہ اپنایا۔ یار محمد نے فون پر عدالت کو صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ عدالت نے سختی سے کہا کہ مسٹر بھٹو قیدیوں والی گاڑی میں سفر کریں۔ یار محمد نے بے حد نرم لہجہ اور احترام کے ساتھ اپنے طور پر تجویز پیش کی کہ وہ گاڑی میں مسٹر بھٹو کے لیے کرسی رکھ دیں گے۔ اس نے مزید زور دے کر کہا کہ مسٹر بھٹو کے لیے سپریم کورٹ میں جلد حاضر ہونا کس قدر اہم تھا۔ کیونکہ سپریم کورٹ نے ذاتی شنوائی کے لیے انہیں مقررہ وقت عطا کیا تھا۔ بڑی مشکل سے گاڑی میں کرسی رکھی گئی اور بھٹو ہر قسم کے تند و تیز الفاظ استعمال کرتے ہوئے گاڑی میں داخل ہو گئے۔ یہ سب باتیں ہم نے سنیں۔ پھر تینوں کاروان (ہر ایک میں تین گاڑیاں) سپریم کورٹ آف پاکستان کی سمت مختلف راستوں پر ایک دستہ کی صورت میں روانہ ہو گئے۔ جنرل رفیع عالم فوجی جیپ میں وائرلیس کے ساتھ مسٹر بھٹو سے کچھ فاصلہ پر پیچھے درمیانی راستہ پر چل پڑے۔ خدا کا شکر ہے کہ کسی بھی راستہ میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔

سپریم کورٹ کے دروازہ پر پولیس کسی قسم کے عوام کے جمگھٹا کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ سپریم کورٹ کے رجسٹرار کی طرف سے اجازت ناموں والے افراد ہی عدالت تک جا سکتے تھے جہاں اپیل کو سنا جا رہا تھا میں نے عام لباس پہن رکھا تھا۔ تاکہ نمایاں نہ ہو سکوں۔ نیز ڈپٹی کمشنر کی کار میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ میں عدالت تک گیا۔ جونہی مسٹر بھٹو قیدیوں والی گاڑی سے باہر

نکلے وہ کچھ وقفہ کے لیے کھڑے ہو گئے اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ ہاتھ ہلایا اور رجسٹرار کے دفتر میں چلے گئے۔ کارروائی کے آغاز سے قبل مسٹر بھٹو یہاں اپنے وکلاء سے ملے اور یہاں ہی انہیں کافی اور بسکٹ پیش کئے گئے۔

یہ بے حد سنگین ایام تھے۔ متواتر چار روز تک مسٹر بھٹو کو سپریم کورٹ لے جایا گیا اور واپس لایا گیا۔ اس کام کے لئے ہم نے صرف تین گاڑیوں کو استعمال کیا۔ ان کی حفاظت کے لئے پولیس کا مختصر سا محافظ دستہ تعین کیا گیا تھا۔ اگر پی پی پی کے کچھ جوشیلے چاہتے تو آسانی سے بھٹو کو چھڑا سکتے تھے۔ مگر پارٹی میں تو ایسی قیادت ہی نہ تھی جو اس طرف اشارہ کر سکتی۔ لیکن ہم نے کسی سنگین حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری تیاری کر لی ہوئی تھی۔ ان حفاظتی انتظامات کے باوجود اگر پی پی پی کے جوشیلے چاہتے تو اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے بھی بھٹو کو زبردستی چھڑوا سکتے تھے۔ لیکن کسی رہنما کی غیر موجودگی میں یہ ممکن نہ تھا۔

سپریم کورٹ کے اندر

۱۸ دسمبر ۱۹۷۸ء کو مسٹر بھٹو کو سپریم کورٹ میں سیدھا رجسٹرار کے دفتر میں لایا گیا جو ان کے اور ان کے وکلاء کے لیے خالی کیا گیا تھا یہی کمرہ انہوں نے اور ان کے وکلاء نے سپریم کورٹ میں چاروں روز استعمال کیا۔ وقت مقررہ پر کمرہ عدالت میں بحفاظت لے جایا گیا۔ جہاں اس کی پارٹی کے کارکن بھی بیٹھے تھے۔ داخلہ کے وقت وہ اپنے رہنما کی عزت کی خاطر کھڑے ہو جاتے۔ مسٹر بھٹو مسکراتے ہوئے جواب دیتے اور چند ایک کو گلے بھی لگا لیتے۔ پہلے روز کارروائی صبح ۱۱:۳۵ پر شروع ہوئی مسٹر بھٹو نے اپنے دلائل کا آغاز کیا۔ انہوں نے جغرافیائی، سیاسی ماحول، جیل میں ان کے ساتھ بُرے سلوک (38)، فوجی حکومت کی حکمت عملیاں، نیز پاکستان کے لیے انتخابات کیوں ضروری ہیں وغیرہ تمام باتوں پر بحث کی۔ بار بار ججوں نے اس دوران مداخلت کی اور مسٹر بھٹو کو بتلایا کہ وہ مقدمہ کے ساتھ بے تعلق باتوں کا تذکرہ نہ کریں اور نہ ہی اپنا وقت ضائع کریں۔ چیف جسٹس نے انہیں نصیحت کی کہ وہ مقدمہ کے متعلق بات کریں۔ اور مہیا شدہ اس موقع کو بہتر طور پر استعمال کریں جو ان کے دفاع میں کام آ سکے۔ چار روز متواتر مسٹر بھٹو کو سپریم کورٹ

38۔ اپنے بیان میں مسٹر بھٹو نے وسیع موضوعات پر اظہار رائے کیا۔ جس میں بین الاقوامی سیاسی مسائل، جیل میں ان کے ساتھ بدسلوکی، فوجی حکومت کی دوہری حکمت عملی پاکستان میں انتخابات کے انعقاد کی ضرورت شامل ہیں۔ ان کے بیان کے دوران ججوں نے بار بار دخل اندازی کی اور انہیں ہدایت کی کہ مقدمہ کی قانونی حدود کے اندر رہنے کی سعی کریں۔ (ذوالفقار علی بھٹو۔ بچپن سے تختہ دار تک مصنفہ سلمان تاثیر صفحہ ۲۰۱۔ اشاعت اُردو)

لے جایا گیا۔ ۲۱ دسمبر ۱۹۷۸ مسٹر بھٹو جو کچھ بھی پیش کرنا چاہتے تھے، کر دیا۔ اس کے بعد ایسا ہی موقع ان چار شریک ملزمان جن میں میاں عباس، صوفی غلام مصطفیٰ، ارشد اقبال اور رانا افتخار کو بھی دیا گیا۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۷۸ء کو اپیل کی شنوائی اختتام پذیر ہوئی۔ اور فیصلہ محفوظ کر لیا گیا۔ ۶ فروری ۱۹۷۹ء کو مسٹر بھٹو کی اپیل بالآخر مسترد کر دی گئی۔ میں نے فوراً ڈی ایم ایل اے کو وائرلیس پر ''بلیک ہارس'' کا کوڈ استعمال کر کے مطلع کر دیا۔

۶ فروری ۱۹۷۹ء کو سات میں سے چار ججوں نے ملزم کو قصور وار قرار دیا تھا۔ تین ججوں (39) جسٹس محمد حلیم، جسٹس دراب پٹیل اور جسٹس صفدر شاہ نے تین ملزمان کو قصور وار قرار دیتے ہوئے مسٹر بھٹو اور مسٹر عباس ڈائریکٹر آپریشنز ایف ایس ایف کو رہا کر دیا۔

سپریم کورٹ کے سات جج مئی ۱۹۷۸ء سے مسٹر بھٹو کی سزائے موت کی اپیل پر بڑے حوصلہ کے ساتھ غور کرتے رہے۔ لیکن آخر چار اور تین کے تناسب سے بھٹو کی اپیل لاہور ہائی کورٹ کے سزائے موت کے حکم کے خلاف مسترد کر دی گئی۔ تین ججوں جنہوں نے مسٹر بھٹو کی رہائی کا حکم دیا، ان کا تعلق صوبہ سندھ اور سرحد سے تھا، دوسرے چار جج پنجاب سے تھے۔

نظر ثانی کی درخواست

اگرچہ لاہور ہائی کورٹ کے فیصلہ کے خلاف مسٹر بھٹو کی اپیل مسترد ہو گئی۔ لیکن وہ اب بھی ایک قانونی شق کا سہارا لے سکتے تھے۔ اس شق کو ''نظر ثانی کی درخواست'' کہا جاتا ہے۔ ۱۹۰۸ کے سول پروسیجر کوڈ آرڈر XLVII سیکشن ۱۱۴ کے مطابق نظر ثانی کی درخواست کوئی بھی فرد پیش کر سکتا ہے جو اپنے آپ کو مظلوم سمجھتا ہو اور جو کسی نئے اور اہم معاملات یا شہادت کے مل جانے پر جسے مناسب غور و خوض کے بعد پتہ چلے کہ اس کے علم میں نہ تھے یا اسے پیش نہ کیا جا سکا ہو۔ جب فیصلہ کیا گیا ہو یا حکم دیا گیا ہو یا کسی اشتباہ کے سبب یا کسی غلطی کے باعث جو بظاہر اس کے خلاف ہوا ہو تو فیصلہ پر نظر ثانی کے لیے عدالت کو درخواست دے سکتا ہے۔

سپریم کورٹ کے سامنے نظر ثانی کی درخواست مسٹر بھٹو کے وکیل کی جانب سے پیش کی گئی۔ سپریم کورٹ کی معلومات پر کئی بنیادوں پر اعتراض کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا گیا کہ سزائے موت کو گھٹا کر قید کی سزا میں بدلنا چاہیے تھا۔ جس کے جواب میں سپریم کورٹ نے توضیح کی کہ کہیں کوئی بنیاد فراہم نہیں کی گئی کہ نظر ثانی کی درخواست پر غور کیا جائے۔ انہوں نے مزید موقف اختیار

39۔ سپریم کورٹ کا فیصلہ صفحات ۸۲۵۔۸۲۶

کیا کہ سزا میں تخفیف کی استدعا اپیل کی شنوائی کے دوران کی جانی چاہیے تھی جو کہ نہیں کی گئی۔ لہٰذا کوئی بنیاد مہیا نہیں کی گئی کہ عدالت گزشتہ فیصلہ پر نظر ثانی کرے چنانچہ ۲۴ مارچ ۱۹۷۹ء کو نظر ثانی کی درخواست اتفاق رائے سے مسترد کر دی گئی۔ (40)

میرے ذہن میں یہ سوال اُبھرتا رہا کہ مسٹر بھٹو نے رحم کے لیے کیوں نہ کہا (41)۔ اس بات کے لیے یہ اور بھی حیرت انگیز امر تھا کہ ان کی اپیل اور نظر ثانی کی درخواست سپریم کورٹ سے مسترد ہو جانے کے بعد ایسا کیوں نہ کیا۔ بھٹو اکثر یار محمد سپرنٹنڈنٹ ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی سے بحث کیا کرتے تھے کہ اگر انہیں تختہ دار پر لٹکا دیا گیا تو اس کے کیا ممکنہ سیاسی اثرات ہوں گے۔

یار محمد نے اپنے خیالات کا اظہار (42) کرتے ہوئے کہا کہ وہ اکثر بھٹو کو مشورہ دیا کرتے تھے کہ حالات کو سمجھیں اور موجودہ صورت حال کا جائزہ لیں۔ جن سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ حالات یقیناً ان کے حق میں نہیں ہیں۔ وہ پاکستان میں اقتدار نہیں رکھتے۔ جب کہ اختیار جنرل ضیاء کے پاس ہے۔ مسٹر بھٹو کو (43) دباؤ کے تحت رہا کرنا جبکہ وہ رحم کے لیے بھی درخواست دینے کے لیے تیار نہ ہوں، کا مطلب یہ ہوگا کہ جنرل ضیاء خود خطرہ میں گھر جائیں گے۔ ظاہر ہے جنرل ضیاء تو اس صورت حال میں کبھی نہیں پھنسیں گے (44)۔ لہٰذا وہ اس مقدمہ میں تساہل پسندی کا مظاہرہ نہ کریں۔ بلکہ جنرل ضیاء سے رحم کی درخواست کریں۔

بہر حال مسٹر بھٹو یار محمد کے مشورے پر عمل کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ کیونکہ ان کے قریبی

40۔ نظر ثانی کی درخواست متفقہ رائے کے ساتھ مسترد کر دی گئی اور اس کے ہمراہ جسٹس دراب پٹیل کی ایک توضیحی تحریر تھی جس میں مقدمے کا تفصیلی فیصلہ شامل تھا۔

41۔ اب جبکہ سپریم کورٹ نے مسٹر بھٹو کی نظر ثانی کی موت کی سزا کے خلاف درخواست کو مسترد کر دیا ہے۔ سابق وزیر اعظم کی آخری امید جس سے وہ پھانسی سے بچ سکیں وہ پاکستان کے سربراہ ریاست جنرل ضیاء الحق کے سامنے رحم کی درخواست کا عمل رہ گیا ہے (سنڈے ٹیلی گراف مارچ ۲۵، ۱۹۷۹ صفحہ (۲)

42۔ مصنف کے ساتھ یار محمد کے انٹرویو سے اقتباسات

43۔ مسٹر بھٹو کا پیغام جو جیل سے سپریم کورٹ کے فیصلہ سے قبل باہر سمگل کیا گیا۔ اس میں تنبیہ کی گئی تھی کہ میرے بیٹے میرے بیٹے نہیں ہوں گے اگر انہوں نے میرے خون پینے والوں کا خون نہ پیا۔ (ٹائم ۱۹ فروری ۱۹۷۹)

44۔ (الف) اب جرنیل نے سوچنا شروع کر دیا کہ وہ یعنی جرنیل رہیں گے یا مسٹر بھٹو رہیں گے۔ ان کو یہ خوف بھی تھا کہ اگر مسٹر بھٹو پھر برسر اقتدار آ گئے تو وہ ان کے خلاف قانونی جنگ کا آغاز کریں گے اور ان جرنیلوں کے خلاف جنہوں نے مارشل لاء لگایا دستور کی شق ۶ کے تحت قانونی کارروائی کریں گے یعنی طاقت یا کسی دوسرے طریقوں سے اختیار پر قبضہ بغاوت کے مترادف ہوگا۔ ظاہر ہے کہ فوجی حکمران ایسا نہیں ہونے دیں گے (ذوالفقار علی بھٹو بچپن سے تختہ دار تک مصنفہ سلمان تاثیر صفحہ ۲۰۴ شائع شدہ بزبان اُردو) (بقیہ صفحہ گزشتہ)

ساتھی اور وکلاء انہیں یقین دہانی کرواتے رہے کہ عدالت کے تین ججوں نے سپریم کورٹ کے فیصلہ سے اختلاف کیا ہے اور چونکہ بین الاقوامی اور اندرون ملک بے پناہ دباؤ ہے کہ رحم کیا جائے۔ اس لیے جنرل ضیاء انہیں پھانسی پر لٹکانے کی جرأت نہیں کریں گے۔ علاوہ ازیں بعض اخبارات اور رسائل نے انہیں یقین دلایا ہے کہ ملک کے لیے اب بھی ان کی سلامتی بے حد ضروری اور لازمی ہے۔ اس طرح بیگم بھٹو اور بے نظیر نے بھی اور ان افراد نے جو ان کے قریبی دائرہ میں آتے تھے، ان کو یقین دلایا ہے کہ پاکستان کے عوام ان کے ساتھ ہیں۔ اور اگر ان کو پھانسی دی گئی تو پورا آسمان سرخ ہو جائے گا۔ جس کا یہ مطلب ہوگا کہ پورا ملک آگ کی لپیٹ میں آ جائے گا۔ بین الاقوامی (45) دباؤ کے متعلق مسٹر بھٹو کو متواتر ان کے دوست اور وکلاء کہتے کہ اکثر بیرونی ممالک جن میں مسلم ریاستیں بھی شامل ہیں، نے پاکستان کو دھمکی دی ہے کہ ان کی طرف سے دی جانے والی امداد روک لی جائے گی۔ اور بعض ممالک نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ وہ پاکستان کے ساتھ سفارتی تعلقات منقطع کر لیں گے۔ ایسی کشیدہ صورت حال میں جنرل ضیاء سیاسی لحاظ سے اپنے آپ کو کمزور پائیں گے اور اس طرح مسٹر بھٹو کو رہا کر دیں گے۔ لہٰذا وہ نہ تو جھکیں گے اور نہ ہی رحم کی درخواست کریں گے۔ مسٹر بھٹو اس پر ڈٹے رہے اور انہوں نے جنرل ضیاء کے سامنے رحم کی درخواست نہ کی (46)۔ معافی کی درخواست کرنے والوں میں ان کی پہلی بیوی امیر بیگم تھیں۔ جنہوں نے اپنے خاوند کی طرف سے جنرل ضیاء کو تحریری طور پر استدعا کی تھی۔ ان کی دوسری بیوی نصرت بھٹو کا خط رحم کے لیے بے حد دیر سے جنرل ضیاء کو اس وقت ملا جب کہ بھٹو کے پھانسی کے

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

(ب) جنرل ضیاء کے قریبی کہتے تھے کہ پھانسی کے بعد کسی قسم کی مداخلت نہ ہوگی۔ سیدھی سی بات ہے کہ پھانسی بھٹو کی گردن یا ضیاء کی گردن میں ہوگی۔ ضیاء مسٹر بھٹو کو پھانسی دینے کا موقع نہیں جانے دیں گے۔ (سنڈے ٹیلی گراف جنوری ۲۱، ۱۹۷۹ء مصنفہ بروس لاڈن متعین لاہور۔

45۔ ساتھ ہی ساتھ جنرل ضیاء بیرونی ملکوں سے آنے والے وفود کے مقابل سخت سزا دینے پر تُلا تھا۔ جو سزائے موت کی مذمت کر رہے تھے امریکہ، مغربی جرمنی اور چینی حکومتوں نے سزا کی مذمت میں تار ارسال کئے اور موت کی سزا پر اپنی مخالفت کا اظہار کیا۔ سوویت رہنما لیونڈ برژنیف اور برطانوی وزیراعظم جیمز کیلاہن نے ذاتی درخواستیں ارسال کیں۔ لیبیا کے صدر معمر قذافی نے جہاز بھیج کر سابق وزیراعظم مسٹر بھٹو کو ملک بدر کر کے لیبیا روانہ کرنے کی استدعا کی۔ ۱۰۔ ایران کی حکومت نے آخری ہفتہ میں اعلان کیا کہ اگر پھانسی کی سزا پر عمل کیا گیا تو ایران کی طرف سے سالانہ ۳۰۰ ملین ڈالر کی پاکستانی امداد کو بند سمجھا جائے۔ (نیوز ویک مئی ۲۹، ۱۹۷۹ء مصنفہ کیتھلین تھلیبی اور بیری کیم متعین راولپنڈی)

46۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسٹر بھٹو کیوں رحم کی درخواست نہ کرنا چاہتے تھے۔ حالات یہ ظاہر کرتے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

تختہ پر چڑھنے میں کچھ گھنٹے باقی تھے۔ یہ ایک بڑا المیہ ہے۔

سپریم کورٹ سے اپیل مسترد ہو جانے کے بعد ہم نے سنا کہ مسٹر بھٹو کو میانوالی یا ڈیرہ اسماعیل خان کی جیلوں میں منتقل کر دیا جائے گا۔ یہ ہمارے لیے ایک مسئلہ تھا کیونکہ انہیں سڑک کے راستے وہاں لے جانے کے انتظامات کرنے پڑیں گے۔ ان کے پورے سفر کے دوران سیکورٹی انتظامات راولپنڈی انتظامیہ (سول اور فوجی دونوں) کو کرنا تھے۔ اتنی طویل مسافت میں مسئلہ کی سنجیدگی کے باعث ہم بے حد پریشان تھے کہ کس طرح ہم اس طویل راستہ میں سیکورٹی کی یقین دہانی کروائیں گے۔ ہم نے مفصل سیکورٹی منصوبہ تیار کیا۔ اسی اثنا میں مسٹر بھٹو کے فاضل وکیل نے سپریم کورٹ میں ایک مختصر عرضداشت پیش کی کہ چونکہ اپیل پر نظر ثانی کو سپریم کورٹ میں فائل کر دیا گیا ہے۔ یہ ان کے لیے بے حد مشکل اور دشوار کام ہوگا اگر ان کے موکل مسٹر بھٹو کو راولپنڈی سے باہر کسی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ وہ صلاح مشورہ نہ کر سکیں گے۔ یہ عرضداشت تسلیم کر لی گئی۔

بیگم بھٹو کا فرار

جناب بھٹو کی اپیل مسترد ہو گئی اور انہیں واپس بحفاظت جیل پہنچا دیا گیا۔ اس کے فوراً بعد سول انتظامیہ کے ساتھ میرے دفتر میں ایک اجلاس ہوا۔ ابھی ہم مزید راہ عمل پر سوچ بچار کر رہے تھے کہ ہمیں وائرلیس پر پیغام موصول ہوا کہ مسز بھٹو اسلام آباد میں اپنے گھر سے بغیر اجازت بذریعہ کار روانہ ہو گئی ہیں اور سمت کا علم نہیں تھا۔ تحقیقات کرنے سے معلوم ہوا کہ جونہی انہیں پتا چلا کہ سپریم کورٹ نے بھٹو کی اپیل مسترد کر دی ہے۔ انہوں نے سیکورٹی گارڈ سے کہا کہ انہیں جیل جانے کی اجازت دی جائے۔ تاکہ وہ اپنے خاوند کو مل سکیں۔ سیکورٹی گارڈ نے انہیں بتلایا کہ یہ دن ان کے خاوند سے ملاقات کا مقررہ کردہ روز نہیں۔ لیکن انکار کے باوجود نتائج سے بے پروا وہ گاڑی پر روانہ ہو گئیں۔ پولیس سپیشل برانچ کی جیپ نے ان کا تعاقب کیا۔ لیکن ان کی جیگوار گاڑی

(بقیہ صفحہ گزشتہ) ہیں کہ ان کے قریبی ساتھی اور وکلاء نے ان کو دھوکہ دیا۔ اور آخر تک ان کو یقین دلاتے رہے کہ فیصلہ میں اختلاف رائے ظاہر کی گئی ہے۔ لہٰذا کسی صورت میں بھی پھانسی نہیں ہوگی۔ دوسرے یہ کہ بہت سے اخبارات اور رسائل نے پیپلز پارٹی اور مسٹر بھٹو کو یقین دلایا اور ان کے قریبی ساتھیوں کو مطمئن کر دیا کہ وہ ملک کے لیے ناگزیر ہیں۔ اور پھانسی کے ذریعے موت نہیں دی جائے گی۔ دنیا کی کوئی طاقت مسٹر بھٹو کو پھانسی کے تختہ پر نہیں چڑھا سکتی۔ یہ وکلاء جو مسٹر بھٹو کو جیل میں ملے۔ مسٹر یحییٰ بختیار ڈی ایم اعوان اور غلام علی میمن تھے۔ بیگم نصرت بھٹو اور مس بے نظیر بھی ان کو ملیں۔ سب کے سب نے ذوالفقار علی بھٹو کو یقین دلایا کہ پاکستان کے عوام آپ کے ساتھ ہیں۔ وہ آپ کو تختہ دار پر نہیں چڑھنے دیں گے۔ (بہاولپور سے چار کوس دور مصنفہ ناصر نقوی صفحات ۱۲۶۔ ۱۲۷ بزبان اُردو)

کا پیچھا نہ کر سکی۔ ہمیں گارڈ کے ساتھ ان کی گفتگو کی نوعیت کا علم نہ تھا۔

ایس ایس پی برکی فوراً جیپ طلب کر کے مسز بھٹو کا سراغ لگانے کے لیے روانہ ہو گئے۔ میرا خیال ہے ایک اچھے پولیس آفیسر ہونے کی وجہ سے وہ جانتے تھے کہ ایک بیوی جسے معلوم تھا کہ اس کا خاوند عنقریب پھانسی پر چڑھنے والا ہے، صرف جیل کی طرف ہی جا سکتی ہے۔ چنانچہ برکی نے جیل کا تیزی سے رخ کیا۔ لیکن انہیں وہاں نہ پا سکے۔ اس کے بعد براستہ ایئرپورٹ روڈ وہ اسلام آباد چل پڑے۔ فیض آباد چوک پہنچ کر انہوں نے مسز بھٹو کی کار کو ڈھونڈ لیا جو ایئرپورٹ کی جانب بڑھ رہی تھی۔ مسٹر برکی واپس مڑے اور مسز بھٹو کی کار کا پیچھا شروع کر دیا یہاں تک کہ وہ جیل کے دروازہ پر جا رکی۔

اس سے پہلے میں نے ڈی ایم ایل اے میجر جنرل رفیع عالم سے رابطہ قائم کیا اور مسز بھٹو کو لے جانے والی جیگوار کار کی تلاش کے لیے ہیلی کاپٹر فراہم کرنے کی درخواست کی۔ ڈی ایم ایل اے نے فوراً جواب دیا اور کہا کہ میں دھمیال آرمی ایوی ایشن بیس پر پہنچوں۔ جہاں مجھے ہیلی کاپٹر تیار ملے گا۔ سعید مہدی اور میں فوراً دفتر سے نکلے اور دھمیال ایئر بیس کی سمت روانہ ہوئے۔ ہم راستہ میں ہی تھے کہ برکی نے ہمیں وائرلیس پر پیغام دیا کہ ''مسز بھٹو جیل پہنچ چکی ہیں۔ ان کا پارہ چڑھا ہوا ہے اور وہ اپنے خاوند سے ملاقات کرنا چاہتی ہیں۔ فوٹو گرافر اور غیر ملکی اخبار نویس بھی موجود ہیں۔'' مسز بھٹو کو دیکھ کر لوگ اکٹھا ہونا شروع ہو گئے۔ امن و امان کے مسئلہ کے اٹھ کھڑا ہونے کے ڈر سے مسز بھٹو کو جیل سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں بحفاظت پہنچا دیا گیا۔ جہاں انہوں نے بلند آواز میں بولنا شروع کر دیا۔ انہیں وضاحت سے بتلایا گیا کہ وہ اپنے خاوند کو صرف مقررہ ایام میں ہی مل سکتی ہیں۔ ملاقات کے مقررہ ایام کے علاوہ حکومت پنجاب کے محکمہ داخلہ سے اجازت حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اگرچہ انہوں نے جیل کی انتظامیہ پر پابندیوں کو سمجھ لیا، لیکن وہ اپنے خاوند سے ملاقات کے لیے بضد رہیں۔ جیل سپرنٹنڈنٹ نے آخر کار مسٹر بھٹو سے ملاقات کی اجازت دلوا دی۔ کچھ عرصہ مسٹر بھٹو کے پاس رہنے کے بعد انہیں بحفاظت اسلام آباد پہنچا دیا گیا۔

پاکستان کی تاریخ کے یہ اہم واقعات جو سرخ روشنائی سے لکھے جا چکے ہیں ان تک پہنچنے کے لیے مجھے ان تمام واقعات اور حالات کو بھی قلم بند کرنا ہے جن کے نتیجے میں ملک میں مارشل لاء لگا۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو جو ایک مقبول سیاسی پارٹی کے سربراہ تھے وہ کہاں کہاں لغزش کھا گئے اور پاکستان کے دولخت ہونے میں ان کا کیا کردار رہا اگر وہ عوامی لیڈر تھے تو اقتدار میں آ کر وہ عوام ہی کو کیوں فراموش کر بیٹھے۔ متحدہ اپوزیشن کی تحریک کے کامیاب ہونے میں کون سے عوامل

کارفرما تھے۔ بھٹو صاحب پہلے خود مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کیوں بنے اور بالآخر فوج کو ملک میں مارشل لاء کیوں نافذ کرنا پڑا؟ یہ چند باتیں ہیں جن پر غور کرنا لازمی ہے۔

ملک کے ایک سابق وزیراعظم کو پھانسی کی سزا اس ملک کی سیاسی تاریخ کا انوکھا واقعہ ہے۔ یہ سزا کیوں دی گئی، ان کے خلاف کیس کیوں رجسٹر ہوا اور انہوں نے رحم کی اپیل کیوں نہیں کی؟ ان باتوں کا جواب تو تاریخ کو از خود دینا ہے۔ لیکن میرے علم میں جو جو بات ہے وہ میں بغیر کسی حاشیہ آرائی کے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

کردار کی تشکیل میں بہت سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں جو فطری جبلت کے ساتھ ایک ان کہے انداز سے ہم آہنگ ہو کر آپ کی شخصیت میں آئینہ دار ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی تو فطری جبلت پر حاوی ہوتے نظر آتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم آپ کا خاندانی پس منظر ہوتا ہے۔ دیہات کا ہو یا شہر کا، پہاڑی علاقے کا ہو یا گنجان آباد میدانی علاقے کا۔ صنعتکار ہو یا بیوپاری۔ درس و تدریس ہو یا سیاست۔ وکالت ہو یا میڈیکل پروفیشن۔ آرمی ہو یا بیوروکریسی جو بچہ جس ماحول میں آنکھ کھولتا ہے، اس کی چھاپ تمام زندگی اس پر سے نہیں جاتی اس کے ہر انداز سے جھلکتی ہے اور ہر عمل میں سرایت کر جاتی ہے۔ انسان کو خدا نے انتہائی حساس اور زود اثر صلاحیتوں سے مرصع کیا ہے۔ بنیادی طور پر وہ جس سانچے میں ڈھلتا ہے وہی خدوخال لیے وہ تمام عمر زندگی سے نبرد آزما رہتا ہے۔ 37 سال پہلے کا وہ دن مجھے آج بھی اسی طرح یاد ہے جس طرح سے وہ گزرا تھا۔ 3 اپریل 1952ء کو میں نے یونیفارم میں اپنے ملک کی خدمت کے لیے فوج کی عملی زندگی میں پہلا قدم رکھا۔ جبکہ میرا تعلق ایک تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔

اس کتاب کو لکھنے کا ایک بنیادی مقصد ہے۔ جب پنڈی جیل میں جناب ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ میں اس وقت راولپنڈی میں سب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھا یہ وہ تاریخی واقعہ ہے جس کی میں نے اول الذکر نشاندہی کی ہے اور جس کے اثرات سے آج تک پاکستان کی سیاسی تاریخ بے ربط چلی آ رہی ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو ایک بڑی سیاسی پارٹی کے بانی اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ایوب خان کے دور میں ان کا سیاسی اُفق پر اُبھرنا، ایک سیاسی تحریک کا چلنا، ایک نئے انداز فکر کا رائج ہونا، ایک مارشل لاء اور فوجی سول حکومت کا ختم ہونا اور ایک نئے قسم کے سول مارشل لاء کا لاگو ہونا، طبقاتی کشمکش کا آغاز ہونا، ملکی صنعت کا قومیائے جانا اور اس مکتبِ فکر کے تحت تعلیمی اور دیگر نجی اداروں کے قومیائے جانے کا رجحان اور پھر ملک کا دولخت ہوجانا، ان سب واقعات کے کئی پہلو ہیں اور ہر پہلو سے بات بھی ہوسکتی ہے لیکن میں مبصر کے طور پر تبصرہ نہیں کر

رہا۔ان واقعات سے جہاں تک میرا تعلق ہے وہ فوجی ذمہ داری کے دائرۂ عمل تک محدود ہے۔

پاکستانی قوم کا ایک المیہ ہے کہ وہ آج تک ایک قوم نہیں بن سکی۔ یہ ملک نظریاتی بنیادوں پر حاصل کیا گیا اس کی خاطر لاکھوں افراد بے گھر ہوئے، ہزاروں خاندان برباد ہوئے۔ بے شمار قیمتی جانوں کا زیاں بھی ہوا اور ایک ایسی تاریخ رقم ہوئی جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ پاکستان دنیا کے نقشے پر ایک نئی جغرافیائی سرحد بن کر اُبھرا، اس کی بنیاد نظریات پر تھی یعنی مسلمان اور ہندو دو الگ الگ قومیں ہیں۔ یہ بات بالآخر ہندوؤں اور انگریزوں دونوں کو سمجھ آ گئی تھی۔ پاکستان تو بن گیا لیکن ہم لوگ وہ قوم نہ بن سکے جس کا تصور لے کر قائداعظم محمد علی جناح نے تن تنہا ایک سیاسی جنگ لڑی تھی۔ وہ مسلمان جن کے لئے ایک الگ خطہ پاکستان کا مژدہ سنایا گیا تھا وہ گمراہی، بے ایمانی، اقربا پروری، استحصال اور فرقہ واریت کا شکار ہو کر بار بار انتشار کی انتہا کو چھوتے رہے۔ جمہوریت، اخوت اور بھائی چارے کا جو سبق بابائے قوم نے پڑھایا تھا وہ یکسر فراموش کر کے ہم نے آج تک کسی ادارے یا نظام کو ملک میں پنپنے ہی نہیں دیا۔ بار بار سیاسی چپقلش اس قدر بڑھتی رہی کہ لوگ ایک دوسرے کے دشمن بنتے چلے گئے۔ جب شہریوں کی جان و مال غیر محفوظ ہونے لگتی تو فوج کو مداخلت کرنی پڑتی۔ مارشل لاء لگتے رہے لیکن مارشل لاء تو جمہوریت نہیں لاسکتا۔ وہ تو اپنے ہی انداز سے حالات کو درست کرسکتا ہے۔ انصاف دلانے کا اس کا اپنا ایک آہنی طریقہ ہوتا ہے۔ اس نظام کو صرف وہ لوگ برداشت کر سکتے ہیں جن کی تربیت فوجی انداز سے مشقت کے ذریعے ہوئی ہو۔ عام شہری کا اس نظام سے ہم آہنگ ہونا مشکل ہوتا ہے اور غالباً یہی وجہ تھی کہ ہمارے ہاں مارشل لاء فوجی انداز میں لگتا رہا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس میں لچک پیدا ہوتی رہی اور بالآخر وہ سول مارشل لاء کا روپ دھار لیتا رہا۔ مارشل لاء پر جمہوری عمل کو سلب کرنے کا بھی الزام ہوتا ہے جو فطری بات ہے۔ اصل مسئلہ جمہوری اداروں اور سیاسی قوتوں کی اپنی نااہلی ہے۔ جس کے نتیجے میں فوجی مداخلت کا ردّعمل وجود میں آتا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی سے متعلق مختلف کہانیاں گردش میں رہی ہیں اور وہ ایسے لوگوں کی اختراع بھی گردانی جاسکتی ہیں جو اپنی طرف اٹھنے والی انگلی کو مروڑ کر دوسرے کی طرف کردیتے ہیں تاکہ ان کا چہرہ بے نقاب نہ ہوسکے۔ دوستی اور رفاقت کی آڑ میں بہت سے تیر چلائے جاتے ہیں۔ ان چہروں کو بے نقاب ہونے کے لئے وقت درکار ہوتا ہے۔ حالات کی گرمی اور کھولتے ہوئے جذبات میں تو ہر افواہ ایک مستند خبر کی طرح معلوم ہوسکتی ہے لیکن میں نے انتظار اس وقت کا کیا ہے جب اڑتی گرد بیٹھ چکی ہے۔ اور ماہ و سال کی گردش میں دودھ دودھ اور پانی پانی ہو چکا ہے۔

میں انتہائی ذمہ داری کے ساتھ ذوالفقار علی بھٹو کے پنڈی جیل میں زندگی کے آخری دن اور آخری لمحوں کو قلمبند کر رہا ہوں جس طرح سے میں نے اپنی ڈیوٹی کے دوران ان کو دیکھا یا سنا، میں نے جو کچھ بھی کیا دیانتداری اور قانون کی حدود میں رہ کر کیا اور میرا ضمیر مطمئن ہے۔

جناب بھٹو کی اسیری کے دوران ان سے میرا واسطہ صرف ضلع راولپنڈی کا ایس ایم ایل اے ہونے کی حیثیت سے تھا۔ ۲۷ پنجاب رجمنٹ میری کمان کے تحت تھی۔ جسے مسٹر بھٹو کو کسی بیرونی خطرہ سے محفوظ رکھنے کے لیے سیکورٹی کے فرائض تفویض کئے گئے تھے۔ جبکہ مسٹر بھٹو کے لیے اندرونی سیکورٹی صرف جیل کے عہدہ داران کی ذمہ داری تھی۔

ضلع راولپنڈی میں بطور سب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر میرے کام کے باعث میں اہم حیثیت میں آ گیا۔ بلاشک وشبہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں انصاف اور برابری کو میں نے ہمیشہ پیش نظر رکھا اور اس سبب سے بعض افراد کے ذہنوں میں حسد اور نفرت کے جذبات امنڈ آئے۔ میں یوں بھی ایس ایم ایل اے اور لوکل فارمیشین کمانڈر ہونے کے ناطے حکومت کے اعلیٰ پیشواؤں کے قریب تھا۔ لہٰذا دونمایاں حیثیتوں کے سبب فرائض سرانجام دینے کے سبب مجھے دشمنی اور حسد کا نشانہ بننا پڑا۔

میں نے راولپنڈی میں بطور ایس ایم ایل اے اپنے فرائض اگست ۱۹۷۸ء میں سنبھالے اور ۴۔ اپریل ۱۹۷۹ء تک کسی بھی قسم کے الزامات مجھ پر نہیں تھے۔ کیونکہ حکومت اور عوام کی پوری پوری توجہ مرحوم بھٹو کی پھانسی کے ماقبل اور مابعد کے تفکرات کے زمانوں پر مرکوز تھی۔ مسٹر بھٹو کے متعلق افواہیں (جنہیں اگلے صفحات میں درج کیا گیا ہے) اس وقت شروع ہوئیں جب امن عامہ کو درپیش خطرات ان کی پھانسی کے بعد ختم ہو گئے پھر میری رہائش گاہ پر غیر شائستہ ٹیلی فون کالوں کی آمد شروع ہو گئی جو پھر روز کا معمول بن گئی۔ ان فون کالوں کے بعد میری زندگی کے خاتمہ کی دھمکیاں آنا شروع ہو گئیں۔ ہوسکتا ہے کہ میری زندگی کو خطرہ والی دھمکیاں فون کالوں کی آمد سے قبل بھی موجود ہوں۔ غالباً ایسے ہی خطرات کے پیش نظر مرحوم جنرل ریاض ڈی جی آئی ایس آئی نے پہلے ہی مجھے اپنی رہائش گاہ پر سیکورٹی گارڈ رکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن اس وقت میں حالات کی نزاکت کو نہ جان سکا۔ اب میں جب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو مجھے قطعاً کوئی شبہ نہیں کہ یہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات تھی جس نے مجھے اور میرے خاندان کو حفظ و امان میں رکھا۔ میں نے اپنی رہائش گاہ پر کوئی سیکورٹی گارڈ متعین نہ کی نہ میں کسی محافظ کے ساتھ سفر پر نکلا اور نہ ہی میں نے اپنے پاس کوئی ہتھیار رکھا۔ یہاں تک کہ میں اپنی چھڑی کو بھی جیپ میں چھوڑ جاتا۔ کہیں اسے دیکھ کر ہجوم غضبناک نہ ہو جائے یا پھر اس کے استعمال کے لیے میرے ذہن میں رغبت نہ پیدا ہو

جائے۔ میں لیفٹیننٹ کرنل رفیع کو ملنے والی دھمکیوں (47) کا اندازہ کر سکتا ہوں جو مسٹر بھٹو کو کسی بیرونی خطرہ کے خلاف زیادہ سے زیادہ سیکورٹی مہیا کرتے تھے۔

میری زندگی کو درپیش خطرات کی سچائی کا مجھے اس وقت یقین ہو گیا جب میں ڈپٹی ڈائریکٹر ملٹری انٹیلی جنس کرنل صغیر کو کسی سرکاری کام سے ملا۔ میں نے اس سے الذوالفقار کی صداقت کے متعلق دریافت کیا اور یہ بھی پوچھا کہ کہاں تک یہ امر درست ہے کہ میں ان کی ہٹ لسٹ پر ہوں؟ میں نے ڈی آئی جی پولیس بہاولپور قادر حیٔ کی فراہم کردہ اطلاعات کی بناء پر یہ باتیں اس سے پوچھی تھیں جو انہوں نے مجھے دی تھی۔ جبکہ چند مشتبہ افراد گرفتار ہوئے اور تفتیش کے دوران انہوں نے انکشاف کیا کہ میں ان کی ہٹ لسٹ پر ہوں۔ ڈی ڈی ایم آئی نے جواب میں مجھے بتلایا کہ یہ بات درست ہے کہ الذ والفقار میرے پیچھے ہے۔ اور تجویز پیش کی کہ میں فوراً حسب ذیل دو احتیاطیں اختیار کروں:

(الف) میرے بچے سیکورٹی گارڈ کی نگرانی میں سکول جائیں۔

(ب) اپنے دوروں کا پروگرام صرف متعلقہ افراد کو بتلاؤں۔ منزل مقصود پر میری رہائش کا بندوبست صرف میرے سٹاف آفیسر کے علم میں ہونا چاہیے۔ تاکہ ہنگامی صورت میں وہ فوری رابطہ قائم کر سکے۔

یہ دونوں طریقے اپنانے محال تھے۔ اور اس کے متعلق میں نے انہیں تفصیل سے بتایا میں نے کہا کہ لوگ کبھی نہ سمجھ پائیں گے کہ میں نے بچوں کے لیے سیکورٹی گارڈ کا کیوں بندوبست کیا ہے۔ وہ تو صرف یہ خیال کریں گے کہ میں غالباً شان وشوکت کا رسیا ہوں۔ اور یہ کہ میں غیر ضروری طور پر اپنی اور اپنے بچوں کی اہمیت کو اجاگر کرنا چاہتا ہوں۔ ایبٹ آباد ایک چھوٹی سی جگہ ہے جہاں ایسے اقدامات اختیار کرنا مناسب نہیں۔ کرنل صغیر نے صرف اتنا کہا کہ اور کوئی دوسرا طریقہ بھی نہیں اور ان پر عمل کرنا میرے اپنے مفاد میں ہے۔

افواہیں

جناب بھٹو کے تختہ دار پر لٹکائے جانے کے بعد یہ افواہ گردش کرنا شروع ہو گئی کہ انہیں مارا پیٹا گیا

47۔ کرنل رفیع بعض سیکورٹی انتظامات کام میں لا سکتے تھے۔ لیکن جو بات واضح نظر آ رہی تھی وہ ان کے گھر میں سیکورٹی گارڈ کی موجودگی تھی۔ یہ بات میں نے اس وقت نوٹ کی جب میں اپنی بیگم کے ہمراہ ان کے گھر گیا۔ رفیع نے وضاحت کی کہ گارڈ کی تعیناتی ضروری ہو گئی تھی جب فون پر ناگوار پیغامات آنے شروع ہو گئے۔ مجھے اور میرے خاندان کو دھمکیاں ملنے لگیں۔ میں نے ان سے مزید بحث نہیں کی کیونکہ مجھے ان کے فرائض کی نزاکت کا بخوبی علم تھا۔

تا کہ ان سے ایک اقرار نامہ پر دستخط کروائے جائیں کہ مسٹر بھٹو نے تسلیم کر لیا تھا(48) کہ انہوں نے اپنے ایک سیاسی حریف کے قتل کا حکم صادر کیا تھا۔لیکن وہ متواتر اس سے انکار کرتے رہے نتیجتاً صرف دوضربوں نے انہیں مار ڈالا۔اس افواہ کے مطابق ایسے اقرار نامہ کے حصول سے جسے مسٹر بھٹو سے حاصل کیا تھا مجھے بریگیڈیئر کے عہدہ سے میجر جنرل کے عہدہ پر ترقی کا وعدہ کیا گیا۔

48۔ سابق وزیر اعظم کو جیل کے کمرہ میں تشدد سے مارا گیا۔ پھانسی صرف پردہ ڈالنے کی کوشش تھی۔ سابق گورنر پنجاب مصطفیٰ کھر نے کل یہ دعویٰ کیا۔

انہیں ایک زیادہ ہی سرگرم بریگیڈیئر نے ضربیں لگا کر مارا۔ جسے اس کے عوضانے میں جنرل کا عہدہ عطا کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے کہ وہ کامیابی سے اقرار نامہ حاصل کرے۔کھر نے کہا۔

صدر پاکستان جنرل ضیاء نے پھانسی پر عمل کا حکم دیا۔ جیسے وہ ابھی زندہ تھا۔اور اس رسم کو ویڈیو کیمرہ پر ریکارڈ کیا گیا۔

جنرل ضیاء کے قریبی دوست اور سیاسی مشیر نے بتلایا کہ پردہ ڈالنے والی کہانی حکومت کے اعلیٰ افسروں نے بیان کی جنہیں یہ ڈرامہ رچانے کا حکم دیا گیا۔

مسٹر کھر پچھلے سال لندن بھاگ گئے۔ ان پر دباؤ ڈالا گیا کہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو پر قتل کا مقدمہ بنائیں۔ افسروں نے انہیں بتلایا کہ جنرل ضیاء نے چوٹی کے جرنیلوں اور کور کمانڈروں کو طلب کیا تا کہ ایک خفیہ اجلاس میں ۳۔اپریل کو شامل ہوں۔

اس پر اتفاق کر کے کہ مسٹر بھٹو کو پھانسی دی جائے۔ضیاء نے بریگیڈیئر راحت لطیف ایک اعلیٰ پولیس آفیسر کے بھائی کو حکم دیا کہ مسٹر بھٹو سے ہاتھ سے تحریری "اقرار نامہ" اس کے مرنے سے قبل حاصل کرے۔کامیابی کی صورت میں جرنیل کے عہدہ پر موسم گرما کے وسط تک ترقی سمجھی جائے۔

بھٹو نے اقرار کرنا تھا کہ اس نے ایک سیاسی حریف کے قتل کا حکم صادر کیا۔لیکن وہ متواتر انکار کرتے رہے۔ اور دوضربوں نے ان کا کام تمام کر دیا۔

ان کی موت کے بعد فوجی آفیسر تذبذب میں مبتلا ہو گئے کیونکہ ان کا بھٹو کو اگلے روز پھانسی دینے کا منصوبہ ناکام ہو گیا۔ضیاء نے حکم دیا کہ اس کے جسم کو سٹریچر پر پھانسی کے پھندے تک لے جایا جائے۔

اس رات بعد ازاں بریگیڈیئر راحت لطیف مسٹر بھٹو کے جسم کو لاڑکانہ کے قریب خاندان کے قبرستان تک پہنچانے کے لیے ساتھ گئے۔

اسلامی رسوم کے برخلاف مسٹر بھٹو کی پہلی بیوی کو نعش دیکھنے کی اجازت نہ دی گئی۔ یا تدفین سے قبل غسل کی اجازت نہ دی گئی۔لباس اتارنے سے اس لیے انکار کیا گیا کہ یہ پھولوں کو زیروزبر کر دے گا۔کھر نے کہا۔

میجر افتخار احمد سابق پاکستانی فوجی آفیسر نے کل لندن میں کہا کہ راولپنڈی جیل کے سٹاف اراکین نے بتلایا کہ مسٹر بھٹو کے کمرہ سے چیخوں اور ضربوں کی آوازیں سنی تھیں جو انہوں نے بھٹو فیملی کو خطوط میں بتلائیں۔ یہ انہوں نے ۳۔اپریل رات دس بجے سنیں۔ جو بعد ازاں یک لخت ختم ہو گئیں۔ (ڈیلی ایکسپریس لندن مصنفہ رابرٹ ایڈیسن ۲۱ مئی ۱۹۷۹ء)

ایک دوسری افواہ کے مطابق فوجی افسروں نے جسمانی طاقت کے ذریعے ایک اقرار نامہ(49) پر مسٹر بھٹو کے دستخط کرانے کی کوشش کی جس میں یہ لکھا گیا تھا کہ اس نے تختہ الٹنے کی سازش خود تیار کی اور جنرل ضیاء کو دعوت دی کہ وہ ملک کا نظم ونسق سنبھال لیں۔ افواہ میں کسی قدر سچائی کی روشنی نہ تھی۔ اگر مسٹر بھٹو پر دستخط کروانے کے لیے زور ڈالا گیا تو کون سا وقت ایسے کام کے لیے درست قرار دیا جا سکتا ہے؟ کیا وہ وقت موزوں تھا جب اسے موت کی سزا سنائی جا چکی تھی۔ اور پھانسی پانے سے قبل مسٹر بھٹو کے پاس صرف چند گھنٹے باقی تھے۔ یا پھر وہ وقت صحیح تھا جب ملک میں مارشل لاء کا نفاذ ہو گیا اور مارشل لاء والے ایسی دستاویز کو سچائی کے مظاہرہ کے لیے ممکنہ قرار دے سکتے تھے؟

اب جبکہ مسٹر بھٹو کو علم تھا کہ انہیں چند گھنٹوں کے بعد موت کی ابدی نیند سلایا جانے والا ہے۔ یہ کسی بھی شخص کے لیے ناممکن قرار دیا جا سکتا ہے کہ کسی بھی ناپسندیدہ تحریر پر ان سے دستخط حاصل کرنے کی سعی کرتا۔ خواہ انہیں موت کی دھمکی ہی کیوں نہ دی جاتی۔ اب جبکہ موت ان کے لیے واضح اور لازمی نظر آ رہی تھی۔ یہ بعید از قیاس ہے کہ ایک دو گھنٹہ کے بعد مقررہ موت سے ہمکنار ہونے والا شخص خوفزدہ ہو جاتا کہ وہ کسی اقرار نامہ پر دستخط کرتا جو اس کی سیاسی اور نظریاتی سوچ کے خلاف ہوتا۔ کوئی بھی دھمکی جسے مسٹر بھٹو کے لیے ممکنہ یا معقول قرار دیا جا سکتا ہے یا کسی اور

49۔ (الف) ایک متواتر رپورٹ کے مطابق میرا باپ جیل کی کوٹھری میں لڑائی کے نتیجہ میں مارا گیا۔ فوجی افسران اس سے زبردستی ''اقرار نامہ'' پر دستخط کروانا چاہتے تھے۔ جس کے مطابق ظاہر ہوتا کہ اس نے حکومت کا تختہ الٹنے کی خود سازش کی اور ضیاء کو دعوت دی کہ وہ ملک پر قبضہ کر لے۔ میرے باپ نے اس جھوٹ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ جسے حکمران درست قرار دینے کے درپے تھے۔

اس رپورٹ کے مطابق افسران میں سے ایک نے میرے باپ کو زور سے دھکا دیا۔ وہ گر پڑا اور اس کا سر کوٹھری کی دیوار سے جا لگا۔ اور پھر اسے ہوش نہ آ سکا ایک ڈاکٹر کو بلایا گیا تا کہ اسے ہوش میں لائے۔ اس کے دل کو مالش دی گئی۔ اور ہوا کی نالی کا آپریشن کیا گیا جس سے گردن پر نشانات کو مٹایا جا سکے۔ جسے نذر محمد نے خود دیکھا تھا۔ لیکن اس کا کچھ فائدہ نہ ہوا۔

مجھے اس کہانی پر یقین کے لیے کہا گیا۔

Daughter of the East مصنفہ بے نظیر بھٹو صفحات ۱۴۔ ۱۵ سائمن وشوستر مقدر کی بیٹی مصنفہ بے نظیر بھٹو صفحہ ۲۶ نیو یارک

(ب) مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو فوجی افسران نے قتل کیا ہوگا۔ نہ کہ سابق وزیراعظم پاکستان پھانسی پانے کے بعد مرے ہوں گے۔ یہ دعویٰ ان کے بڑے بیٹے ۲۴ سالہ مرتضیٰ نے کل لندن میں کیا۔ رپورٹ کے مطابق اسے پاکستان سے اطلاعات موصول ہوئی ہیں کہ بعض فوجی افسران اس کے باپ کی کوٹھری میں داخل ہوئے ان کے پاس چند کاغذات تھے۔ جن پر زبردستی اس کے دستخط کروائے۔

کے لیے جو ایسی ہی صورت سے دو چار ہو تو وہ صرف اسے موت سے بچا لینے کی کوئی پیش کش ہو سکتی تھی جس کے لیے اس سے اقرار نامہ پر دستخط ثبت کرنے کو کہا جا سکتا تھا۔ مزید برآں، مارشل لاء حکومت کے لیے قطعاً یہ ضروری نہ تھا کہ ضیاء حکومت مسٹر بھٹو سے اپنی حکومت کے قانونی ہونے کی سچائی کی توثیق پر مہر ثبت کرواتی (50)۔

پاکستان کے عوام بھٹو کی برسر اقتدار حکومت کے خلاف زبردست مظاہرے کر رہے تھے ان کی حکومت کے دور میں پائی جانے والی افراتفری کے بعد مارشل لاء کے نفاذ کو انہوں نے خوش آمدید کہا۔ مسٹر بھٹو سے سندِ جواز حاصل کر کے مارشل لاء بُری شہرت کو حاصل کر لیتی اگر وہ ایک ایسی حکومت سے گٹھ جوڑ کر لیتی جسے پاکستان عوام کی اکثریت رد کر چکی تھی۔ چنانچہ اس افواہ میں کوئی منطق نظر نہیں آتی۔

ایک اور افواہ پھیلی کہ میجر جنرل کے عہدہ پر میری ترقی کا انحصار اس بات کو قرار دیا گیا کہ تختہ دار پر لے جانے سے قبل مسٹر بھٹو سے اقرار نامہ حاصل کروں۔ حسب ذیل سے اس امر کا اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے کہ افواہ میں آیا کوئی سچائی یا صداقت موجود ہے یا کہ نہیں۔

سب سے پہلے یہ کہ جب وہ فوت ہوئے مسٹر بھٹو نے اقرار نامہ پر دستخط نہ کئے جس سے یہ ظاہر ہو کہ انہوں نے فوج کو دعوت دی کہ وہ ملک میں مارشل لاء کا نفاذ کریں۔ مسٹر بھٹو کی بیٹی بے نظیر بھٹو ہمیں بتلاتی ہیں کہ ایک دوسری متواتر خبر یہ آتی رہی جس کے مطابق میرا باپ کوٹھری میں لڑائی میں مارا گیا (51)۔ فوجی افسروں نے اس سے زبردستی دستخط کروانے کی کوشش کی۔ اس دعویٰ کے مطابق یہ کہ

50۔ کسی بھی فوجی انقلاب کے لیے قانونی جواز کی خاطر برطرف شدہ وزیر اعظم کے دستخطوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ تو انقلاب کے پہلے روز ہی حاصل کر لئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد انقلاب خود اس کی نگہداشت کرتا ہے۔ لہٰذا کسی قسم کے دستخطوں کی ضرورت ہی نہ تھی۔ (بھٹو، ضیاء اور میں مصنفہ لیفٹیننٹ جنرل چشتی صفحہ ۲۳۲۔ اُردو میں)

51۔ (الف) میرے خیال میں دوسرا نقطہ وضاحت طلب ہے۔ جس کا تعلق افواہوں سے ہے۔ جن کے مطابق یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ مسٹر بھٹو کو جیل میں تشدد کر کے مارا گیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ کسی نے بھی ایسا نہیں کیا۔ اگر ایسا ہوا ہوگا تو اس کی تفتیش ہونی چاہیے کہ کس نے ایسا کیا اور کس کے حکم سے ایسا کیا؟ اگر یہ محض افواہ تھی تو کس نے اور کن مقاصد کے تحت اس افواہ کو پھیلایا؟ مس بے نظیر بھٹو نے اپنے بیس ماہ وزیر اعظم رہنے کے دوران اس کی تفتیش کیوں نہ کروائی۔ تا کہ سچائی منظر عام پر آ سکے۔

(ب) بھٹو کو تشدد سے نہیں مارا گیا۔

پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو قانون کے مطابق پھانسی کی سزا دی گئی۔ اور انہیں تشدد سے نہیں مارا گیا۔ جیسا کہ اس کی بیوی اور بیٹی نے دعویٰ کیا۔ حکومت کے ایک ترجمان نے کل بتلایا۔

بیگم نصرت بھٹو اور مس بے نظیر بھٹو سابق صدر آکسفورڈ یونین نے ایک ہفتہ قبل یہ الزام لگایا۔ بیگم بھٹو نے پہلی پریس کانفرنس میں دعویٰ کیا کہ اسکے خاوند کو ۴۔ اپریل کو قتل کی سازش میں ملوث پائے جانے پر پھانسی کی سزا دی گئی۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

انہوں نے تختہ الٹنے کی خود سازش کی اور ضیاء کو دعوت دی کہ ملک پر قبضہ کر لے۔ میرے باپ نے حکمرانوں کے جھوٹ کے پلندہ پر دستخط کرنے سے انکار کیا۔ جسے حکمران حقیقی بنانے کے درپے تھے۔

بے نظیر کے اس دعویٰ کی کہ اس کے باپ نے کوئی اقرار نامہ دستخط نہیں کیا، یوں بھی تصدیق ہوتی ہے کہ کبھی کسی نے ایسا اقرار نامہ پیش نہیں کیا۔ کسی نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس کے پاس ایسی تحریر موجود ہے۔ اگر ضیاء کی مارشل لاء حکومت کوئی ایسی تحریر چاہتی کہ اس کے جواز کو ثابت کرے تو اس کی موجودگی کی وجہ سے اس کو ضرور شائع کرتی۔ چنانچہ یہ دعویٰ دوہرا درست ہے کہ کوئی ایسا اقرار نامہ مسٹر بھٹو سے حاصل ہی نہیں کیا گیا۔ اس کے باوجود کہ میجر جنرل کے عہدہ پر میری ترقی ہوئی۔ لیکن فوج مجھے کیسے ترقی دے سکتی تھی۔ اگر میں اپنے مقصد میں ناکام ہوتا جو میرے لیے ضروری تھا اور میری ترقی سے منسلک تھا۔

بقیہ صفحہ گزشتہ

محکمہ جیل خانہ جات کے ترجمان نے ان الزامات کی تردید کی کہ ۳۔ ۴ کی شب بھٹو کو تشدد سے ہلاک کیا گیا۔

''یہ کہنا مضحکہ خیز ہے کہ مسٹر بھٹو کو غیر آئینی طریقوں سے مارا گیا۔ جبکہ ہمارے پاس ان کی موت کے وارنٹ موجود تھے۔ جو دو روز قبل جاری ہوئے۔ اور جن کے مطابق پھانسی کے لیے ابھی وقت تھا۔ اور یہ اس پر تحریر تھا۔'' اس نے کہا۔

اگر بیگم بھٹو یا کسی اور کو اس بات پر کوئی شک ہے تو انہیں چاہیے کہ وہ جنوبی پاکستان میں نوڈیرو جائیں اور مدفون کو قبر سے نکلوائیں۔

نعش کو نکلوانے کے بعد پاکستان اور غیر ملکی ڈاکٹر اس کا معائنہ کریں۔ تو یہ بات ثابت ہوگی کہ پھانسی سے گردن ٹوٹنے کے سبب موت واقع ہوئی تھی۔

اسلام آباد میں طبی رائے کے مطابق موت کا سبب ثابت کرنے کے لیے موت کے چار سال کے اندر معائنہ ہوسکتا ہے۔ (ڈیلی ٹیلی گراف ۲۱ اگست ۱۹۷۹ مسٹر آفتاب اسلام آباد)

(ج) مسٹر بھٹو کی پہلی بیوی امیر بیگم نے پھانسی کے بعد اپنی رائے کا اظہار کیا ''میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ انہوں نے اس کی حجامت کروائی ہوئی تھی۔ لیکن اس کی گردن سے یہ بات ثابت ہوتی تھی کہ اس کو پھانسی دی گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ پھول کی مانند معصوم نظر آتا تھا۔'' (ڈیلی ٹیلی گراف ۵ اپریل ۱۹۷۹ء بروس لاڈن، راولپنڈی)

(د) مجھے ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی ۳۔ ۴۔ اپریل ۱۹۷۹ء کو لے جایا گیا۔ میں وہاں تقریباً ۱۲ بجے شب پہنچا۔ تقریباً تین بجے مجھے کہا گیا کہ میں بھٹو صاحب کے جسم کو غسل دوں۔ میں نے غسل دیا ان کا مردہ جسم مکمل طور پر درست حالت میں تھا۔ اور کہیں بھی کسی زخم کا نشان نہ تھا۔

(بیان حیات محمد ولد نواب خاں اعوان عمر ۵۷ سال خادم مسجد بھوسہ منڈی راولپنڈی بعدالت سیشن جج راولپنڈی ضمیمہ ۶/۳ بتاریخ ۸۰۔ ۲۔ ۱۴ نجی شکایت ۱۹۷۹۔ ۱۱۔/۲۰/۱۹۸۲/۱۹۷۹/۳۶)

جیل میں حفاظتی انتظامات

ضلع راولپنڈی میں ایس ایم ایل اے کے فرائض سنبھالتے وقت میرے پیشرو نے مجھے میرے فرائض کے متعلق آگاہ کیا۔ ۲۷ پنجاب رجمنٹ نے مسٹر بھٹو کو کسی بھی بیرونی خطرہ سے محفوظ رکھنے کے لیے حفاظت اور سیکورٹی کے فرائض جاری رکھے۔ ایک افواہ سرگرم تھی کہ شاید کوئی بیرونی طاقت غالباً پی ایل او مسٹر بھٹو کو جیل سے رہا کروانے (52) کی سعی کرے گی۔ لہٰذا میرے پیشرو نے جیل کے منتظمین کے مشورہ کے ساتھ سیکورٹی انتظامات مضبوط کر لیے۔ اس رجمنٹ نے اپنا ہیڈ کوارٹر جیل کے اندر قائم کیا ہوا تھا۔ جیل کے جس حصہ میں بھٹو کو رکھا گیا تھا اس صحن کو جیل انتظامیہ کے ساتھ تعاون سے کانٹے دار تار کے ساتھ گھیرا ہوا تھا۔ ۲۷ پنجاب رجمنٹ کی جانب سے فراہم سیکورٹی گارڈ مستقل طور پر اس حصار کی نگرانی کرتی، لیکن جیل انتظامیہ کے روزمرہ کے کام میں کوئی مداخلت نہ کرتی۔ جیل کا اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ مع جیل وارڈن گارڈ مستقل طور پر صحن میں کیمپ لگائے رہتے۔ اس طرح جو کوئی جیل کی کوٹھریوں جہاں مسٹر بھٹو کو رکھا گیا تھا، تک جانا چاہتا اسے یہاں سے گزر کر جانا ہوتا۔ مسٹر بھٹو کی کوٹھری کی دوسری جانب والا حصہ خاردار تاروں کی رکاوٹ سے بند کرایا گیا تھا۔ مزید لوہے کی سلاخوں والے

52۔ (الف) ہمیں مصطفیٰ نے بتلایا کہ ''یاسر عرفات مسٹر بھٹو کو جیل سے نکالنے کا منصوبہ رکھتا ہے۔ فلسطینی کمانڈو پاکستان روانہ کئے جائیں گے۔ وہ راولپنڈی جیل پر حملہ کریں گے۔ اس طرح انتشار پیدا کیا جائے گا اور مسٹر بھٹو کو چھینا جائے گا۔ ایک اور دوست ملک کا جہاز چکلالہ ہوائی اڈہ پر انتظار کرے گا۔ جس پر بظاہر ایک وی آئی پی ہوگا۔ اس طرح مسٹر بھٹو کو محفوظ جگہ پہنچایا جائے گا۔ وہ جلد ہمارے ساتھ آ ملے گا اور ضیاء کی جابرانہ حکومت کے خلاف لڑے گا۔ بے حد دلچسپ مواد ہے''

(میرا فیوڈل لارڈ مصنفہ تہمینہ درانی صفحہ ۱۱۵)

(ب) ایک فوجی ٹرک راولپنڈی جیل سے علی الصبح نکلا۔ تھوڑے عرصہ بعد یاسمین (بینظیر کی ایک قریبی دوست) نے سنا کہ ایک چھوٹا جہاز اسلام آباد سے نکلے گا۔ اسے یقین تھا کہ یہ کسی عرب رہنما سے تعلق رکھتا ہے جو جیل میں پہنچا ہے۔ وہ میرے باپ کو محفوظ جگہ لے جائے گا لیکن اس نے کہا کہ جہاز میں میرے باپ کی لاش تھی جو لاڑکانہ گیا۔''

(مقدر کی بیٹی صفحہ ۱۶۴۔۱۶۵ اور Daughter of the East صفحہ ۱۵۷ بےنظیر بھٹو)

دروازے دوہری سیکورٹی کی خاطر لگائے گئے تھے۔ جن کی چابیاں جیل سپرنٹنڈنٹ کی حفاظت میں تھیں کوئی بھی شخص جیل کے سپرنٹنڈنٹ کی اجازت کے بغیر اس علاقہ میں نہیں جا سکتا تھا۔

سیکورٹی انتظامات میں دو باتوں پر زور دیا گیا تھا۔ پہلا تو مسٹر بھٹو کو کسی بیرونی خطرہ سے محفوظ رکھنا دوسرا زائد احتیاط سے ضلع راولپنڈی میں امن وامان کو قائم رکھنا۔

جیل میں جناب بھٹو کی رہائش

جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے کہ بھٹو صاحب کو میں نے جیل میں صرف ایک مرتبہ دیکھا تھا(53)۔ یہ واقعہ اس پہلی صبح کا ہے جب انہیں اپنے حق میں اپیل دائر کرنے کے لیے سپریم کورٹ لے جایا جا رہا تھا۔ اس وقت میں نے انہیں کچھ فاصلے سے دیکھا۔ جب وہ اپنی کوٹھریوں سے اس گاڑی میں سوار ہونے کے لیے نکلے جو انہیں کورٹ لے جانے والی تھی۔

راولپنڈی ڈسٹرکٹ جیل میں مسٹر بھٹو کو منتقل کرنے سے قبل عورتوں کے وارڈ میں ردوبدل کیا گیا عورتوں کا خالی کردہ حصہ (دیکھئے جیل کا نقشہ) دوسیٹوں پر مشتمل تھا جس میں چار کوٹھریاں مشرق کی طرف اور چار ہی مغرب کی طرف واقع تھیں۔ جنہیں کشادہ اندرونی راستہ جدا کرتا تھا۔ شمال کی جانب دیوار کے ساتھ اس کو مزید مضبوط کر دیا گیا تھا۔ پورے کمپلیکس پر ایک ہی چھت تھی۔ آٹھ کوٹھریوں تک جانے کے لیے پہلے جنوب میں واقع لوہے کے سلاخوں کے بڑے دروازہ سے گزرنا پڑتا اور ہر کوٹھری کا دروازہ لوہے کی متوازی سلاخوں سے بنایا گیا تھا۔ سلاخوں کے درمیان فاصلہ تقریباً چار انچ کا تھا۔ مسٹر بھٹو کے لیے آٹھوں کوٹھریاں استعمال میں تھیں۔ مغرب کی جانب چار کوٹھریاں رہائش کے لیے مخصوص تھیں۔ دو میں ان کا سامان تھا اور ایک عام طور پر خالی رہتی۔ لیکن کسی بھی مخصوص مقصد کے لیے برتی جا سکتی تھی۔ مشرق کی طرف چار کوٹھریاں ایک غسل خانہ کے سامان سے آراستہ تھی۔ دو میں ان کا باورچی خانہ تھا اور پھر عام طور پر ایک خالی رہتی۔ لیکن کسی بھی ضرورت کے لیے استعمال ہو سکتی تھی۔

مجھے بتایا گیا کہ جناب بھٹو کو منتقل کرنے سے قبل کمپلیکس کا ایس ایم ایل اے بریگیڈیئر ممتاز ملک اور ڈی ایم ایل اے میجر جنرل رفیع عالم نے معائنہ کیا۔ تمام آٹھ کوٹھریاں بغیر تالا کے تھیں سوائے لوہے کے سلاخوں والے دروازہ کے جو صحن میں کھلتا۔ چنانچہ مسٹر بھٹو کسی بھی وقت راستہ کا استعمال کر سکتے تھے۔ جہاں وہ ورزش یا کرسی پر استراحت کر سکتے تھے۔ لیکن یہ کہنا کہ بھٹو صاحب دو اندھیری کوٹھریوں میں مقید تھے اور جس میں قفل لگا ہوا تھا بالکل غلط اور نادرست ترجمانی ہے۔ صرف لوہے کی

53۔ (الف) دراصل سوائے میرے جیل سٹاف کے کوئی شخص مسٹر بھٹو کو ان کی کوٹھری کے اندر یا باہر ان سے ملاقات کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ (بھٹو کے آخری ۳۲۳ دن مصنفہ کرنل رفیع صفحہ ۴۳ بزبان اُردو)

سلاخوں والا دروازہ جو راستہ کو صحن سے جدا کرتا تھا، مقفل رہتا۔ چابیاں جیل کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے پاس تھیں اور وہ اسے کھول سکتا تھا۔ دروازہ مسلسل وارڈن گارڈ کی نگرانی میں رہتا۔ جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا آٹھ کوٹھڑیوں کے کمپلیکس کو صحن کے مقابل خاردار تار سے مزید گھیر رکھا تھا اس سمت سے کمپلیکس تک پہنچنے کے لیے ایک اور دروازہ کا قفل کھولا جا سکتا تھا جو خاردار تاروں میں جوڑا گیا تھا۔ مسٹر بھٹو کے کواٹروں کے قریب ایک مزید ٹاور بنایا گیا تھا جو سنتری پوسٹ کا کام دیتا تھا۔

جناب بھٹو کی حفاظت کی ذمہ داری

جیل کا سپرنٹنڈنٹ مسٹر بھٹو کے لیے بالواسطہ طور پر سیکورٹی کا ذمہ دار تھا۔ سپرنٹنڈنٹ کے کسی کام میں مداخلت نہیں کی جا سکتی تھی۔ لیکن مسٹر بھٹو کی زندگی یا سیکورٹی کو کسی قسم کے خطرہ کے پیش نظر جو بیرونی ہو، مارشل لاء کے ارباب اختیار کی ذمہ داری تھی۔ سیکورٹی کی پیش بندیوں پر ۲۷ پنجاب رجمنٹ عمل پیرا تھی جو اپنی ذمہ داری احسن طریقہ سے سرانجام دے رہی تھی۔ میں اس رجمنٹ کو سلام پیش کرتا ہوں جنہوں نے ناموزوں رہائش کے انتظامات کے باوجود کبھی اپنی ڈیوٹی میں کوتاہی نہ آنے دی۔

جناب بھٹو کے لیے سہولیات

مسٹر بھٹو کو جو سہولیات فراہم کی گئیں وہ معمول کے جیل قوانین کے مطابق کسی موت کے سزا یافتہ قیدی کو نہیں دی جاتیں۔ حکومت مسٹر بھٹو کے ساتھ ایک خصوصی قیدی کا برتاؤ کر رہی تھی۔ جن پر قوانین کا اطلاق نہ ہونے کے برابر تھا۔ (بھٹو کے لیے رہائشی انتظامات کا نقشہ ملاحظہ کریں)

انہیں جو آراستہ اشیاء مہیا کی گئیں ان میں نوار کی چارپائی، فوم کا گدا (یہ انہیں گھر سے لانے کی اجازت دی گئی) چار کین کی آرام دہ کرسیاں، میز بجلی کا لیمپ، رسالوں کے لیے ریک، اپنی پسند کے کسی بھی مقدار میں کپڑے، کھانا پکانے کے لیے بجلی کا چولہا، تمام ضروری برتن، کافی اور چائے، بجلی کا ریفریجریٹر۔ ٹھنڈے مشروبات اور جوس مسٹر بھٹو کے ذاتی خرچ پر مہیا کئے گئے۔ مسٹر بھٹو کو ایک قابل اعتماد جیل کے حوالاتی کی خدمات مہیا کی گئیں جو ان کے لیے بطور مددگار کام کرتا۔ اسے مقامی زبان میں مشقتی کہتے ہیں۔

جناب بھٹو کو جیل کے سپرنٹنڈنٹ کے پاس کچھ نقدی جمع کروانے کی اجازت دے دی گئی۔ جس سے وہ ذاتی ضروریات کو پورا کرتے۔ مسٹر بھٹو کو صرف ایک کاغذ کے پرزے پر اپنی ضرورت کی شے کا نام لکھ کر سپرنٹنڈنٹ کے دفتر بھجوانا ہوتا اور بازار سے اسی رقم سے وہ شے خرید لی جاتی۔

جناب بھٹو کے باورچی خانہ میں عام طور پر چائے یا کافی بنائی جاتی۔ اور ان کا ناشتہ بنایا جاتا جس

میں عام طور پر انڈے اور ٹوسٹ ہوتے۔ان کے دوسرے کھانے باہر سے ان کا خاندان مہیا کرتا۔

نہانے کے کمرہ میں کموڈ موجود تھا۔ تازہ پانی کا نل لگوایا گیا تھا۔ مسٹر بھٹو لوشن اور ٹائلٹ کا ضروری سامان خود منگواتے۔ان کے تمام لباس دھلائی کے لیے بھیجے جاتے۔ جب کبھی لباس یا خوراک کی کھیپ آتی تو پہلے اسے جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو بھیجا جاتا جو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل کے ذریعے مسٹر بھٹو کو بھجوا دیتے۔ یہ حکومت پنجاب کے محکمہ داخلہ کے ذریعے انتظام کیا جاتا۔ان کی بیوی بیگم نصرت بھٹو اور ان کی بیٹی بے نظیر بھٹو ہفتہ میں دو مرتبہ آدھ گھنٹہ کے لیے ہر مرتبہ ملاقات کرسکتیں۔ان کی بیوی اور بیٹی الگ الگ دن ان سے ملاقات کرتیں۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مسٹر بھٹو کو جتنی مرتبہ اور جس وقت چاہیں مل سکتے تھے۔ مسٹر بھٹو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کو تقریباً روزانہ بلاتے اور سپرنٹنڈنٹ کو کبھی کبھی۔ یہ سہولت معمول کے مطابق سزا یافتہ قیدی کو نہیں دی جاتی۔

جناب بھٹو کی ذہنی کیفیت

جناب بھٹو کے قانونی مشیران سے بعد دوپہر جیل کے اندر ملاقات کرنے آتے۔ایک (54) روز ساڑھے دس بجے رات مسٹر یحییٰ بختیار جو مسٹر بھٹو کے سینئر وکیل تھے، نے یار محمد سپرنٹنڈنٹ جیل کو مطلع کیا کہ وہ ابھی ابھی مسٹر بھٹو سے ملاقات کر کے آئے ہیں اور یہ کہ مسٹر بھٹو علیل ہیں اور کسی ڈاکٹر سے معائنہ کروانا چاہتے ہیں۔ یار محمد نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بختیار کو بتایا کہ مسٹر بھٹو نے جیل کے کسی اہلکار سے اس امر کی شکایت نہیں کی۔ نہ تو انہوں نے مجھ سے شکایت کی اور نہ ہی جیل کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کو بتلایا جو ہمیشہ ان کے قریب رہتے ہیں۔ مسٹر بختیار نے جواب دیا کہ چونکہ مسٹر بھٹو مزید رعایات کا مطالبہ کر رہے تھے۔ جن میں پردے اور ایئر کنڈیشنز شامل ہیں اور وہ ان کو مہیا نہیں کیئے گئے۔ اس لیے انہوں نے بطور احتجاج لاتعلق رہنا شروع کر دیا ہے۔ اور یہی وجہ ہوسکتی ہے کہ مسٹر بھٹو نے جیل کے اہلکاروں کو اپنی بیماری کے بارے میں نہیں بتلایا۔ یار محمد نے کہا کہ اس وقت رات گئے کسی ماہر کی تلاش کرنا محال ہے۔ لیکن جیل کے میڈیکل آفیسر ڈاکٹر اصغر ان کا معائنہ کریں گے۔ یار محمد ڈاکٹر اصغر کو ساتھ لے گئے۔ تو انہوں نے دیکھا کہ مسٹر بھٹو گدے پر لیٹے تھے اور مطالعہ میں مصروف تھے۔ یار محمد نے مودبانہ سلام کیا اور شکایت کے انداز میں کہا! ''جناب عالی! آپ نے اپنی علالت کا مجھ سے تذکرہ نہیں کیا! اس کی اطلاع مجھے آپ کے وکیل مسٹر یحییٰ بختیار کے ذریعے ملی ہے۔'' مسٹر بھٹو نے جواب میں کہا۔

''مجھے گھور گھور کر نہ دیکھو۔''

54۔ یار محمد کے مصنف کے ساتھ انٹرویو کے اقتباسات

''جناب! میں آپ کو گھور کر نہیں دیکھ رہا۔ مجھے تو صرف حیرانگی ہو رہی ہے کہ اگر آپ کو طبی توجہ کی ضرورت تھی تو آپ نے مجھے بتلانا تھا۔''

''نہیں تم مجھے گھور کر دیکھ رہے ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں صدر، وزیراعظم اور پاکستان کا چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر رہا ہوں۔ میں پہلا سویلین سی ایم ایل اے تھا اور اب بھی میں وہی ہوں۔ آپ کو یہ جان لینا چاہیے''

جناب مجھے کسی دوسرے شخص سے آپ کی بیماری کی اطلاع ملی ہے میں نے فوراً ڈاکٹر کو بلایا ہے تاکہ آپ کا معائنہ کرے۔ میری تشویش کو سراہنے کی بجائے جو مجھے آپ کی صحت کے متعلق ہے، آپ مجھے ناراضگی دکھا رہے ہیں۔ اسی وجہ سے میں ششدر رہ گیا ہوں۔ اور میں سوچتا ہوں کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟''

جناب بھٹو(55) کا لاہور میں علاج ہوا جب وہ سیاسی قیدی کے طور پر کوٹ لکھپت جیل میں تھے اور لاہور ہائی کورٹ میں ان کا مقدمہ زیر سماعت تھا۔ اس وقت وہ مجرم نہ تھے اور قوانین سے الگ رہ کر ان کو خصوصی رعایات دی گئی تھیں جن کی صوبائی حکومت نے اجازت دی تھی۔ انہیں ایئر کنڈیشنر تک دیا گیا تھا۔ لاہور ہائی کورٹ کی جانب سے موت کی سزا سنائے جانے کے بعد مسٹر بھٹو کو صرف ایسی رعایات عطا کی جاسکتی تھیں جو ایک سزا یافتہ مجرم کو قوانین کے تحت مل سکتی تھیں۔ جب مسٹر بھٹو نے سپریم کورٹ میں موت کی سزا کے خلاف اپیل کی تو انہیں راولپنڈی جیل منتقل کر دیا گیا تاکہ ان کے وکیل کو سہولت میسر آسکے۔ جو اپنے موکلین کو گاہے بگاہے ملنا چاہتے تھے۔ راولپنڈی جیل میں منتقل ہونے کے بعد مسٹر بھٹو کو وہ تمام رعایات میسر نہ آئیں جن کے وہ عادی تھے۔ چنانچہ وہ غضبناک ہو گئے۔ وہ اکثر ناراض ہو جاتے۔ ایک مرتبہ ان کی بیٹی بے نظیر بھٹو ان کے لیے کراکری کا ڈنر سیٹ لائی جو استعمال کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اس پر مسٹر بھٹو ناراض ہو گئے۔ اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل کو بُرا بھلا کہا۔ اس طرح چھوٹے چھوٹے معاملات بھی ان کی ناراضگی کا سبب بن جاتے اور وہ سخت الفاظ کا استعمال شروع کر دیتے۔ ان کی انتہائی ناراضگی کا اندازہ ہم لگا سکتے تھے۔ کیونکہ ابھی تھوڑا ہی عرصہ پہلے وہ پاکستان کے بے انتہا طاقتور وزیراعظم تھے۔ اور کئی لوگ اپنی انتہائی خوش بختی سمجھتے کہ وہ ان کی طرف مسکرا کر نگاہ ڈالتے۔ اب وہ قیدی تھے۔ اب انہیں ان لوگوں نے بند کمروں کے اندر اپنی حفاظت میں رکھا ہوا تھا جو کبھی ان کے زیر اختیار تھے۔ ان کا تشددانہ رویہ اس وقت تک جاری رہا جب تک سپریم کورٹ نے ان کی اپیل مسترد نہیں کی۔ اس کے بعد وہ نرم مزاج ہو گئے اور جیل کے حکام سے دوستانہ رویہ کا مظاہرہ شروع کر

55۔ یار محمد کے مصنف کے ساتھ انٹرویو کے اقتباسات

دیا۔ اکثر وہ یار محمد کو بلا بھیجتے۔ اسے بیٹھنے کے لیے کہتے اور اس سے پوچھتے کہ اگر ان کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا تو عوام کا ردعمل کیا ہوگا۔ یار محمد نے ہمیشہ انہیں تصویر کا درست رخ دکھایا اور انہیں بتلایا! ''جناب! وقت آپ کے حق میں نہیں۔ یہ میری انتہائی دوستانہ تجویز ہوگی کہ کوئی بھی کسی کے لیے جان نہیں دیتا۔''

ایک دفعہ جب ان کی نظر ثانی کی درخواست مسترد کر دی گئی تو زیادہ تر خصوصی رعایات واپس لے لی گئیں۔ ان کا سامان جس میں حجامت کا سامان بھی تھا، ہٹا لیا گیا۔ اور انہیں کوٹھڑی کے اندر رکھ دیا گیا۔ کسی بھی شے کا مطالبہ وہ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ سے جو وہاں ڈیوٹی پر ہوتا، کر سکتے تھے۔ اس طریقہ کار سے مسٹر بھٹو غضبناک ہو گئے۔ احتجاج کے طور پر انہوں نے چار پائی سے بستر اٹھا دیا جو بھی واپس نہیں لیا گیا تھا۔ اور اسے زمین پر بچھا دیا۔ وہ آخری دم تک اسی طرح سوتے رہے۔

جب تک وہ کوٹھری میں تھے (56) مسٹر بھٹو کافی شور مچاتے رہے۔ اور جیل کے عملہ کو کہتے رہے کہ وہ کسی کے آگے سر نہیں جھکائیں گے۔ خواہ اس میں ان کی جان تک چلی جائے۔ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر موت بھی آ گئی تو وہ بہادری سے اس کا مقابلہ کریں گے۔ اور آنے والی نسلیں یاد کریں گی کہ کس طرح ذوالفقار علی بھٹو نے موت کا سامنا کیا۔ وہ درست کہتے تھے۔ انہوں نے دلیری سے موت کا سامنا کیا۔ انہیں معلوم تھا کہ مسٹر بھٹو کے ملنے والے انہیں غلط اطلاعات دیتے رہے اور کہتے رہے کہ ان کے پارٹی کارکن انہیں پھانسی ملنے پر تشدد پر اتر آئیں گے اور ہر چیز کو جلا کر راکھ کر دیں گے جو کہ نہ ہوا۔ حالات نے بعد ازاں ثابت کیا کہ ہمارا کہنا درست تھا۔ سابق وزیر اعظم کو پھانسی دے دی گئی اور کوئی بھی زیادہ ردعمل نہ ہوا جو ان کی پارٹی کے کارکنوں سے ظاہر ہو اور جس سے راولپنڈی کے امن کے لیے خطرہ ثابت ہو۔

پی پی پی قیادت نے جناب بھٹو کے خلاف سازش کی

پروگریسو پیپلز پارٹی کے صدر مولانا کوثر نیازی کا ایک انٹرویو جو انہوں نے ایک بھارتی رسالے کو دیا اور جو روزنامہ مسلم بتاریخ سوموار ۲۸ نومبر ۱۹۸۳ء چھپا، درج کیا جاتا ہے:

''نئی دہلی ۲۷ نومبر۔ مولانا کوثر نیازی پروگریسو پیپلز پارٹی کے صدر۔ نے بھارتی رسالہ کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے کہ بیگم نصرت بھٹو اور موجودہ پیپلز پارٹی کی قیادت جو مسٹر بھٹو کی جماعت کے دعویدار ہونے کا اعلان کرتے پھرتے ہیں، اطمینان سے اپنے گھروں میں بیٹھے ہیں جبکہ مسٹر بھٹو کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ مولانا کوثر نیازی کے ساتھ انٹرویو ایک ماہوار میگزین دہلی ریکارڈز میں آراستہ سرخیوں کے ساتھ

56۔ یار محمد کے مصنف کے ساتھ انٹرویو کے اقتباسات
پی پی پی قیادت کی بھٹو کے خلاف سازش۔ مسلم ۲۸ نومبر ۱۹۸۳۔

چھپا ''نصرت نے بھٹو کے خلاف سازش کی'' رسالے کے ایڈیٹر راجپال سنگھ چوہدری نے حال ہی میں پاکستان کا دورہ کیا۔

پارٹی قیادت نے عوام کو گلیوں میں نکل آنے کے لیے کیوں نہ کہا۔ تاکہ سپریم کورٹ کے دیئے گئے پھانسی کے فیصلے کے خلاف احتجاج کرتے'' مولانا نے کہا:

''مولانا نے یاد دہانی کرائی کہ سپریم کورٹ نے جب مسٹر بھٹو کو پھانسی کا حکم سنایا تو پارٹی کی مرکزی قیادت پورے تین روز تک اسلام آباد میں اجلاس کرتی رہی۔ انہوں نے خود تو شرکت نہ کی، لیکن پارٹی قیادت کو پیغام بھیجا اور مشورہ دیا کہ حالات کا تقاضا ہے کہ پاکستانی عوام کو گلیوں میں نکل آنے کے لیے کہا جائے تاکہ سپریم کورٹ کے فیصلہ کے خلاف احتجاج کریں۔

لیکن تمام مرکزی قیادت صرف ایک کمزور تجویز پر متفق ہو سکی کہ صدر کے سامنے رحم کی اپیل کی جائے۔ ''اب اس میں کیا حکمت تھی'' انہوں نے دریافت کیا۔ ''اگر جواب صرف رحم کی اپیل ہی تھا تو ہمیں اس شخص (صدر ضیاء) کے ساتھ بات چیت کو جاری رکھنا چاہیے تھا۔ اور اس کے ساتھ مقابلہ کی حکمت عملی کو نہیں اپنانا چاہیے تھا۔'' انہوں نے دلیل پیش کی۔

''مولانا کوثر نیازی نے کہا کہ ہائی کورٹ کی کارروائی کا مقاطعہ کیا گیا۔ اور پی پی پی نے مسئلہ کو سیاسی رنگ دے دیا۔

''ایک سوال کے جواب میں کہ کیا بیگم بھٹو بھی اس سازش میں شریک تھی؟ مولانا کوثر نیازی نے جواب دیا کہ بے شک وہ تو خود ہی اس تمام کیس کو چلا رہی تھی۔ وہ سیاسی رہنما بھی تھی اور قانونی سیل کی سربراہ بھی۔

ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ تمام افراد جو آج بھٹو کی حمایت کے دعویدار اور جمہوریت کے فرشتے بنے پھرتے ہیں، بڑے آرام سے اپنے گھروں میں بیٹھے تھے۔ جبکہ بھٹو کو تختہ دار پر لٹکایا جا رہا تھا۔''

مسٹر بھٹو کے آخری لمحات

میت کو لاڑکانہ لے جانے کے انتظامات

جناب بھٹو کے مقدمہ کی سماعت نے تمام قانونی تقاضے پورے کر لیے اور کسی بھی مرحلہ پر لاہور ہائی کورٹ کی جانب سے دی جانے والی سزائے موت میں تبدیلی نہ کی گئی۔ پھانسی سے دی جانے والی موت صاف نظر آ رہی تھی۔ بجز اس کے کہ صدر پاکستان رحم کی اپیل منظور کر لیں۔ بہر حال مسٹر بھٹو کے جسد خاکی کے حمل و نقل کے لیے انتظامات کرنا ضروری تھے۔ اس صورت میں کہ صدر پاکستان رحم کی اپیل کو مسترد کر دیں۔ اس سلسلہ میں صدر کے سی او ایس میجر جنرل عارف (بعد میں لیفٹیننٹ جنرل) نے مجھے طلب کیا اور ہدایات دیں۔ ''مسٹر بھٹو کے پھانسی پر لٹکائے جانے کے بعد میت کی ذمہ داری ہماری ہو گی۔ اسے پی اے ایف بیس چکلالہ لے جایا جائے گا۔ جہاں سے اسے سی۔ ۱۳۰ جہاز کے ذریعہ لیفٹیننٹ کرنل رفیع کی زیر نگرانی بمع آرمڈ گارڈ جیکب آباد لے جایا جائے گا۔ پی اے ایف بیس کمانڈر کو سمجھا دیا گیا ہے۔ بیس کمانڈر کے ساتھ مزید تفصیلات طے کر لیں''۔ بالآخر ۴۔اپریل (57)

57۔ جنرل چشتی کا نظریہ: ۲/۳۔اپریل کو انہوں نے مجھے راولپنڈی میں موجود نہ پایا۔ جنرل ضیاء نے مسٹر بھٹو کی پھانسی ملتوی کر دی۔ وجہ یہ بیان کی گئی کہ پیشگوئی کے مطابق موسم اس قدر خراب ہوگا کہ سی۔ ۱۳۰ لاڑکانہ جانے کے لیے مسٹر بھٹو کی میت کو لے کر منزل تک نہیں پہنچ سکے گا (سی۔ ۱۳۰ نہایت ہی خراب علاقہ اور برے موسم میں اُڑ سکتا ہے)

(Betrayal of Another Kind مصنفہ لیفٹیننٹ جنرل چشتی صفحہ ۸۹)

(ب) کرنل رفیع کا نظریہ: مسٹر بھٹو کے موت کے وارنٹ ۲۔اپریل ۱۹۷۹ء راولپنڈی جیل میں سہ پہر موصول ہوئے۔ اور ۳۔اپریل کی رات ۲ بجے مسٹر بھٹو کو پھانسی دینے کا عمل شروع ہو گیا۔ (مصنف کا بظاہر مطلب ۲/۳۔اپریل ۱۹۷۹ء کی رات ہے) بیگم نصرت بھٹو اور مس بے نظیر بھٹو کو ان کی آخری ملاقات کے لیے طلب کیا گیا۔ (دراصل ان کو یہ نہیں بتلایا گیا کہ یہ ان کی آخری ملاقات ہے۔ انہیں صرف یہ بتلایا گیا کہ وہ مسٹر بھٹو سے ملاقات کے لیے جیل میں آئیں) مس بے نظیر بھٹو جو سہالہ ریسٹ ہاؤس میں زیر حراست تھی اس نے آنے سے معذوری کا اظہار کیا یہ ۲۔اپریل بعد دوپہر قدرے علالت کی وجوہات کے باعث کیا گیا۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

پھانسی کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ میں نے فوراً ڈپٹی کمشنر سعید مہدی، ایس ایس پی جہانزیب برکی اور ایس پی سپیشل برانچ کے ساتھ رابطہ قائم کیا اور جنرل عارف کے بیان کردہ منصوبہ پر تبادلہ خیال کیا۔ ہدایات بالکل واضح تھیں۔ پھانسی کی تمام تفصیلات جیل حکام کی نگرانی میں طے پائی تھیں۔

ہماری ذمہ داری کا آغاز میت کے حصول کے بعد ہونا تھا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ایک عام ۳/۴ ٹن کی فوجی گاڑی جسے کینوس کے ساتھ ڈھانپا گیا ہو بھٹو کے جسد خاکی کو لے جانے کے لیے استعمال کی جائے اور کوئی ایسا طریقہ استعمال نہ کیا جائے جو کہ راہگیروں کی توجہ کا باعث بنے۔ اسے سیدھے چکلالہ ایئر بیس پر پہنچایا جائے اور لیفٹیننٹ کرنل رفیع کی نگرانی میں بھیجا جائے۔ ڈاج گاڑی سے میت کو سی۔ ۱۳۰ جہاز میں رکھ کر جیکب آباد روانہ کر دیا جائے۔ جیکب آباد پہنچنے پر اسے ہیلی کاپٹر پر لاڑکانہ ایک دوسرے محافظ کے ساتھ لے جایا جائے گا جو صوبہ سندھ میں ان کا آبائی قصبہ ہے۔ حفاظتی دستہ کرنل رفیع کی معیت میں جیکب آباد مسٹر بھٹو کا جسد خاکی سپرد کر کے اسی سی۔ ۱۳۰ میں واپس آ جائے گا۔ ضلعی انتظامیہ کے افراد اور میں ایئرپورٹ تک ایس ایس پی کی جیپ میں جائیں گے۔ اور ہماری جیپ مسٹر بھٹو کی میت کو لے جانے والی ڈاج گاڑی کے عقب میں چلے گی۔

شام کو ضلعی انتظامیہ کے ہمراہ میں پی اے ایف بیس کمانڈر کے ساتھ سی۔ ۱۳۰ کے استعمال کے لیے تفصیلات طے کرنے چکلالہ گیا۔ اس نے ہمیں بتلایا کہ سی۔ ۱۳۰ کہاں کھڑا کیا جائے گا۔ سی۔ ۱۳۰ چلانے والوں کو مشن بتلایا جائے گا۔ اس طرح راز کے افشا ہونے کا خطرہ ہو سکتا تھا۔ انہوں نے میری خواہش سے اتفاق کیا کہ ایک دوسرا سی۔ ۱۳۰ جہاز تیار رکھا جائے۔ تاکہ تکنیکی خرابی کے باعث پروگرام کو تبدیل نہ کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ سی۔ ۱۳۰ کی وی آئی پی حیثیت کا انتخاب کیا گیا ہے۔

بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر کی جناب بھٹو سے آخری ملاقات

بالعموم جیل کا سپرنٹنڈنٹ سزا یافتہ قیدی کے لیے اس کی موت کے خلاف کی گئی اپیل کے مسترد ہو

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

اس اثنا میں ہوم سیکرٹری حکومت پنجاب ڈی ایم ایل اے کے دفتر میں موجود تھے اور وہ سپرنٹنڈنٹ جیل راولپنڈی کے دفتر میں آئے اور میری موجودگی میں انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات اور سپرنٹنڈنٹ جیل کو بتلایا کہ بھٹو صاحب کو قانونی طور پر ۳۔ اپریل کی رات ۲ بجے پھانسی نہیں دی جا سکتی۔ کیونکہ صدر پاکستان کے وارنٹ پر دستخط کرنے کے بعد اس وقت تک ۴۸ گھنٹے نہیں گزرے ہوں گے۔ اس نکتہ کا اظہار پنجاب حکومت نے کیا ہے۔ لہٰذا مسٹر بھٹو کی پھانسی کو ایک اور دن کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ دوسری طرف بیگم نصرت بھٹو اور مس بے نظیر بھٹو کو مطلع کیا گیا کہ اگر وہ بیمار ہیں تو ان کے آنے کی ضرورت نہیں۔

(بھٹو کے آخری ۳۲۳ دن مصنفہ کرنل رفیع صفحہ ۹۱ بزبان اُردو)

جانے کے بعد سات روز کے اندر پھانسی کی تاریخ مقرر کرتا ہے (58)۔لیکن مسٹر بھٹو کے لیے تمام فیصلے حکومت پنجاب کی طرف سے کیے جاتے تھے۔چنانچہ ۴/اپریل دو بجے علی الصبح مسٹر بھٹو کی پھانسی کی تاریخ مقرر کی گئی۔ ۳۔اپریل کو جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے سہالہ سب جیل میں متعین اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کو کہا کہ مسٹر بھٹو سے ملاقات کے لیے بیگم بھٹو اور بے نظیر کو لے کر آئیں۔دونوں خواتین کو شک گزرا کیونکہ یہ روز ان کے مقررہ ایام میں نہیں تھا۔انہوں نے پوچھا کہ انہیں کیوں جیل بلایا گیا ہے جبکہ یہ دن ملاقات کے مقررہ ایام میں سے نہیں ہے؟ سپرنٹنڈنٹ جیل نے یہ سمجھ کر کہ صحیح سبب کا افشاء کرنا بدمزگی کا باعث بنے گا۔فون پر بھٹو خواتین کو بتلایا کہ مسٹر بھٹو علیل ہیں۔لہٰذا انہیں مسٹر بھٹو سے ملاقات کے لیے بلایا گیا ہے۔خواتین آئیں اور جیل کے پہلے مین گیٹ سے اندر داخل ہوئیں۔وہ رکیں اور انہوں نے جیل کے عملہ سے پوچھا کہ کیا یہ ان کی آخری ملاقات ہے۔اس نے جواب دیا کہ اس کا اسے علم نہیں۔پھر انہوں نے جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو طلب کیا اور یہی سوال دہرایا۔یار محمد نے اثبات میں جواب دیا۔بیگم بھٹو نے یار محمد سے احتجاج کیا کہ اس کا فرض بنتا تھا کہ بچوں کو بلانے کا بندوبست کرتا جو آج ہی بیرون ملک سے پہنچنے والے تھے۔تا کہ وہ اپنے والد سے ملاقات کر لیتے یار محمد نے کوئی جواب نہ دیا۔بیگم بھٹو نے کہا کہ چونکہ یہ ان کی آخری ملاقات ہے وہ مسٹر بھٹو کے ساتھ زیادہ دیر تک ملاقات کرنے کی خواہشمند ہیں۔یار محمد نے جواب میں کہا کہ وہ ایسا کرنے کی کوشش کریں گے۔اس روز وہ مسٹر بھٹو کے پاس تقریباً چار گھنٹے رہیں۔

جناب بھٹو کی رہائشی کوٹھری کا آہنی دروازہ مقفل تھا (59) اور کاریڈور میں باہر دو کرسیاں رکھ دی گئی تھیں جہاں دونوں خواتین بیٹھ گئیں۔(مسٹر بھٹو کی اپیل اور نظر ثانی کی درخواستیں سپریم کورٹ کی جانب سے مسترد کی جا چکی تھیں۔ان کی کوٹھری مقفل رہنے لگی۔اب وہ آزادانہ طور پر آٹھوں کوٹھریوں تک نہیں پہنچ سکتے تھے اور نہ ہی ان کا استعمال کر سکتے تھے۔جیسا کہ وہ ماضی میں کرتے تھے) انہوں نے مسٹر بھٹو سے استفسار کیا کہ کیا یہ ان کی آخری ملاقات (60) ہے؟ مسٹر بھٹو حیرت زدہ رہ گئے۔اور انہوں نے جواب دیا کہ اگر یہ ایسا ہی ہے تو انہیں مطلع نہیں کیا گیا۔

تھوڑے عرصہ کے بعد مسٹر بھٹو نے یار محمد سپرنٹنڈنٹ جیل کو بلوا بھیجا۔وہ فوراً آیا اور اس نے دیکھا کہ دونوں خواتین آرام دہ کرسیوں پر کاریڈور میں بیٹھی ہیں۔اور مسٹر بھٹو اپنی کوٹھری میں آرام دہ کرسی پر بیٹھے تھے۔یار محمد نے سب کو مودبانہ سلام کیا۔اور پھر اس کرسی کے پیچھے جس پر مس بے نظیر بیٹھی تھیں،

58۔یار محمد کے مصنف کے ساتھ انٹرویو سے اقتباسات

59۔یار محمد کے مصنف سے انٹرویو کا اقتباس

60۔بے نظیر کے ایک بعد ازاں پیغام میں بتلایا گیا کہ چونکہ وہ علیل تھیں اس لئے یہ طے پایا ہے کہ انہیں آج راولپنڈی لے جایا جائے گا۔تا کہ وہ خدا حافظ کہہ سکیں۔(ڈیلی ٹیلی گراف ۳۔اپریل ۱۹۷۹ء بروس لاڈن، راولپنڈی)

کھڑا ہو گیا۔ مسٹر بھٹو نے مس بے نظیر کو کہا کہ یار محمد کے لیے کرسی خالی کر دیں۔ اس نے فوراً ایسا کیا لیکن یار محمد کھڑا ہی رہا۔ مسٹر بھٹو نے یار محمد کو کہا کہ وہ اس کے قریب آ جائیں۔ اور پھر کہا کہ کیا یہ درست ہے کہ آج اپنی فیملی کے ساتھ ان کی آخری ملاقات ہے۔

''ہاں جناب! یہ درست ہے''

''پھر تم نے اس کے متعلق مجھے اس سے قبل کیوں نہیں بتلایا؟''

''جناب یہ اچھی خبر نہ تھی''

''اس کے باوجود مجھے مطلع کیا جانا چاہیے تھا''

''جناب! میں نے آپ کی فیملی کو مطلع کر دیا تھا''

''لیکن تم نے مجھے نہیں بتلایا''

''جناب! یہ کوئی خوش آئند بات نہ تھی کہ میں آپ کو مطلع کرتا۔ میں نے سوچا کہ یہ بہتر ہوگا کہ آپ اپنی فیملی سے اطلاع پائیں۔''

سرگوشی کے انداز میں مسٹر بھٹو نے یار محمد کو کہا کہ اور زیادہ قریب آ جائیں یار محمد نے سوچا کہ انہوں نے سرگوشی کے عالم میں اس لیے کہا ہوگا کہ شاید انہیں احتمال ہو کہ ان کی کوٹھڑی میں ایسے آلات نصب ہوں (61)۔ جن کے ذریعے ان کی حتمی پھانسی کے متعلق ان کے ردعمل کا اندازہ کیا جا سکے۔ جب یار محمد قریب ہو گئے تو مسٹر بھٹو نے اپنا ہاتھ اپنے گلے پر پھیرا۔ جیسے کہ اسے کاٹ دیا گیا ہو۔ پھر انہوں نے اپنے گلے کو سوالیہ انداز میں جھٹکا دیا۔ تاکہ معلوم ہو کہ ان کے خلاف مہلک اقدام لیا جائے گا۔ یار محمد

61۔ مئی ۱۹۷۸ء کے دوسرے ہفتہ میں مسٹر بھٹو کے راولپنڈی جیل میں آنے سے چند روز قبل مجھے مطلع کیا گیا کہ فلاں فلاں شخص (نام نہیں بتلایا گیا) جس کا تعلق انٹیلی جنس ایجنسی سے تھا، وہ اہم آلات کے ساتھ آئے گا۔ اور سیکورٹی وارڈ میں جہاں مسٹر بھٹو کو رکھا گیا تھا، لگائے گا۔ اسے اس طرح بنایا گیا ہے کہ مکمل سیکورٹی قائم رہے۔ لہٰذا اگلے روز ایک ڈائریکٹر جس کے ساتھ دو تکنیکی معاون تھے آئے اور دیکھ بھال کے آلات لگائے وہ اس کوٹھری کی دیوار میں لگائے گئے۔ جہاں مسٹر بھٹو نے قیام کرنا تھا۔ وائرلیس کے علاوہ یہ پرزہ زیر زمین تار کے ذریعے متصل سپرنٹنڈنٹ جیل کے کمرہ سے جوڑا جائے گا ایک دو ہفتہ کے بعد یہ سہولت میرے بٹالین ہیڈ کوارٹر کے کمرہ تک بڑھا دی گئی (جو جیل میں واقع تھا) لہٰذا کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ جیل میں آلات کب استعمال ہو رہے ہیں اور کب ان کے ماہر اپنی ڈیوٹی پر موجود نہیں۔ شروع میں ان آلات سے کام لیا گیا۔ اور دن رات ایسا ہوتا رہا۔ لیکن چند ہفتوں کے بعد آپریٹرات کے آٹھ نو بجے ان کو بند کر دیتے۔ اس کے بعد کوئی بھی مسٹر بھٹو کو ملنے نہ آتا اور بقایا رات ایسا ہی ہوتا۔ پھر آپریٹرات کو چلے جاتے اور صبح کو واپس آتے اور دیکھ بھال کے فرائض انجام دیتے۔ ان آلات کو درست رکھنے کے لیے شمالی دو کمروں کے حصہ کو الگ رکھنے کے لیے نئی دیوار بنائی گئی۔ ان کمروں کو ''آؤٹ آف باؤنڈ'' قرار دے کر جیل کے تمام سٹاف کے لیے ان آلات کو نہ صرف خفیہ رکھا گیا بلکہ ان کی پہنچ سے بھی دور رکھا گیا (بھٹو کے آخری ۲۳ ۳۔ ایام مصنفہ کرنل رفیع ص ۷ بزبان اُردو)

نے صاف (62) صاف اثبات میں جواب دیا اور کہا کہ ہاں جناب یہ درست ہے۔

پھر جناب بھٹو نے اشارہ سے دریافت کیا اور یار محمد نے پھر اثبات میں جواب دیا۔

یہ غمناک لمحہ تھا۔ ایک خاتون کے لیے اس کے خاوند اور دوسری کے لیے اس کے باپ کے پھانسی پر لٹکنے کی بات تھی۔ اب غالباً وہ دیکھ رہی تھیں کہ ان کا مردہ جسم جیل سے باہر نکل رہا ہے۔ وہ بے حد اداس تھیں۔ مسٹر بھٹو ملک کے سابق وزیر اعظم تھے۔ اب صوبہ پنجاب کی ہائی کورٹ نے انہیں موت کی سزا سنا ڈالی تھی۔ اور سپریم کورٹ آف پاکستان نے ان کی اپیل اور نظر ثانی کی اپیل مسترد کر دی تھی۔ یار محمد ہمدردی کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ اور کچھ بھی نہ کر سکتے تھے سوائے اس کے کہ بھٹو صاحب کی بیوی اور بیٹی (63) کی ملاقات کا وقت بڑھا دیں۔ یہ غم انگیز لمحہ تھا۔ لیکن آخری جدائی کا لمحہ آن پہنچا تھا۔

اب وقت گزر چکا تھا۔ چار گھنٹے گزر چکے تھے۔ دونوں خواتین اپنے طور پر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور مسٹر بھٹو کو چھوڑ کر چلی گئیں اب وہ اسے کبھی نہیں ملیں گی۔ اگر چہ وہ قانون کے آگے بے بس تھیں، لیکن انہیں اب بھی امید تھی۔ بھاری بوجھل دل کے ساتھ وہ جیل کے اندرونی دروازہ کی طرف آئیں۔ انہوں نے یار محمد کو طلب کیا جو اس وقت اپنے دفتر میں پہنچ چکے تھے۔ ناسازی طبیعت کے باعث انہوں نے کرنل رفیع سے کہا کہ وہ ان خواتین سے ملاقات کر لیں۔ بیگم بھٹو نے التجا کی:

"کرنل رفیع! میں صدر سے ملنا چاہتی ہوں"

"مجھے افسوس ہے میں ایسے انٹرویو کا بندوبست نہیں کر سکتا۔"

"پھر اور کون کر سکتا ہے؟" وہ صدر کو ملنے کے لیے بضد تھیں۔

"مجھے معلوم نہیں لیکن میں معلوم کروں گا۔"

بمشکل دونوں خواتین کو بحفاظت سہالہ ریسٹ ہاؤس پہنچا دیا گیا۔ جہاں وہ زیر حراست تھیں جونہی وہ وہاں پہنچیں انہوں نے پھر سب جیل کے انچارج سے دریافت کیا کہ ان کا صدر سے ملاقات کی التماس کا کیا بنا۔ فوری طور پر یہ پیغام سپرنٹنڈنٹ جیل کو بھیج دیا گیا۔

62۔ یار محمد کے مصنف کے ساتھ انٹرویو کا اقتباس

63۔ (الف) بھٹو کو پھانسی سے قبل دو خواتین کو آخری تین گھنٹے ملاقات کی اجازت دی گئی پھر انہیں ہر طرف سے بند تیز رفتار پولیس گاڑی میں سہالہ پہنچا دیا گیا۔ یہ لوگ راولپنڈی سے باہر سہالہ ریسٹ ہاؤس گئے۔ اور رابطہ کے بغیر (نیوز ویک ۱۹۷۵ء اپریل)

(ب) کل بیگم بھٹو اور بے نظیر بھٹو جیسے سکتے میں تھیں۔ جب انہیں پولیس کی ایک بند تیز رفتار گاڑی میں ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی سے باہر تین گھنٹے تک مسٹر بھٹو سے ملاقات کے بعد لے جایا گیا۔ (ڈیلی ٹیلی گراف ۴۔ اپریل ۱۹۷۹ء بروس لاڈن راولپنڈی)

اس وقت میں اور سول انتظامیہ کے افراد سپرنٹنڈنٹ جیل کے دفتر میں بیٹھے ہوئے اس امر پر سوچ بچار کر رہے تھے کہ اگر عوام کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ دونوں خواتین مسٹر بھٹو کے ساتھ آخری مرتبہ ملاقات کر کے آ رہی ہیں تو اس سے امن و امان کا مسئلہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ اب جبکہ جیل کے سپرنٹنڈنٹ یار محمد بیگم بھٹو کی التماس صدر کے ملٹری سیکرٹری یا کسی مناسب شخص تک نہ پہنچا سکے۔ انہوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ کیا میں کچھ کر سکتا ہوں۔ میں نے اسی وقت فون سے میجر جنرل عارف سے گفتگو کی جو صدر کے چیف آف سٹاف تھے۔

''ہیلو سر! میں آپ سے مخاطب ہوں کیونکہ مسٹر بھٹو کی بیگم اور بیٹی مسٹر بھٹو سے آخری بار مل چکی ہیں۔ اور وہ بضد ہیں کہ جیل کے سپرنٹنڈنٹ ان کے لیے صدر سے ملاقات کا بندوبست کریں۔

جنرل عارف: ''ان کی التماس کا کیا مقصد ہے؟''

''میں تو نہیں جانتا۔''

جنرل عارف: ''کیا جیل کے سپرنٹنڈنٹ اس امر سے واقف ہیں؟''

''میں انہی کے فون سے بات کر رہا ہوں اور وہ اس وقت یہاں ہی بیٹھے ہیں۔ دراصل انہوں نے خود صدر کے ملٹری سیکرٹری سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ نتیجتاً انہوں نے مجھے امداد کے لیے کہا ہے۔ انہوں نے مجھے مزید بتلایا ہے کہ بیگم بھٹو، مسٹر بھٹو سے آخری بار ملاقات کرنے کے بعد اس امر پر بضد ہیں۔ وہ جیل سے نکلنے کے لیے تیار نہیں تھیں جب تک صدر کے ساتھ ان کے انٹرویو کا بندوبست نہیں کر دیا جاتا۔

جنرل عارف: ''اس قدر جلد انٹرویو کا بندوبست کرنا محال ہے۔ انہیں کہیں کہ وہ اپنی التماس تحریری طور پر پیش کریں۔''

''جناب! میں آپ کی تجویز جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو پہنچا دوں گا۔ اس اثناء آپ سے التماس کرتا ہوں کہ از راہ کرم ان کا پیغام صدر تک پہنچا دیں۔ وہ بے حد پریشان ہیں۔''

جنرل عارف: ''اوکے میں ڈی ایم ایل اے میجر جنرل صغیر کو کہہ دوں گا کہ ان سے ملاقات کرے۔''

بیگم نصرت بھٹو کی جانب سے صدر کے نام رحم کے لیے ذاتی خط

تھوڑے ہی عرصہ کے بعد میجر جنرل صغیر حسین سید جیل کے سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں پہنچے۔ جنرل صغیر نے کہا کہ ''انہیں جنرل عارف نے ہدایت کی ہے کہ وہ بیگم بھٹو سے ملاقات کریں اور معلوم کریں کہ وہ کس لیے صدر سے ملنا چاہتی ہیں۔''

انہوں نے برکی کو اپنے ساتھ چلنے کو کہا اور وہ دونوں رخصت ہو گئے۔ کچھ دیر بعد وہ واپس

آئے۔ جنرل صغیر نے ہاتھ سے تحریر کردہ ایک خط یار محمد کو دیا۔ جسے صدر پاکستان کو پہنچایا جانا تھا۔ ہم نے اس بے حد دردناک خط کو پڑھا۔ اس میں واضح طور پر تحریر کیا گیا تھا کہ بھٹو خاندان کو آج کے دن کے آنے (64) کی توقع نہ تھی۔ انہیں توقع تھی کہ پورا ملک ہڑتالوں اور مظاہروں میں یک جان ہو کر جنرل ضیاء کو مجبور کر دیں گے کہ وہ بھٹو کو معاف کر دیں۔ تقریباً دو ماہ گزر چکے ہیں کہ سپریم کورٹ نے ان کی اپیل مسترد کر دی۔ اور کہیں بھی مظاہروں کا نام ونشان نہیں۔ اب مسز بھٹو کو علم ہو گیا کہ یہ مسٹر بھٹو کے ساتھ ان کی آخری ملاقات ہے اور انہیں احساس ہو گیا کہ مسٹر بھٹو جو کبھی وزیراعظم صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے، تختہ دار پر لٹکا دیئے جائیں گے۔ انہوں نے اس خط کے توسط سے صدر ضیاء الحق سے رحم کی اپیل کی۔ ان کے خط کا نچوڑ یہ تھا کہ اگر مسٹر بھٹو کی زندگی کو بچا لیا جائے تو حکومت کی جانب سے عائد کردہ پابندیاں بھٹو خاندان منظور کرے گا۔ وہ سیاست میں ہرگز حصہ نہیں لیں گے اور مزید یہ کہ وہ اس ملک کو چھوڑنے کے لیے تیار ہیں اور کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ مختصر یہ کہ مسز بھٹو کے خط میں مکمل اطاعت کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔ جس میں صدر پاکستان کی حاکمیت کو تسلیم کیا گیا تھا۔ صرف صدر جنرل ضیاء الحق ان کے خاوند کو معاف کر دیں (65)۔ اس خط سے ہم بے حد متاثر ہوئے۔ ہم حیران تھے کہ انہوں نے مناسب وقت پر ایسا کیوں نہ کیا۔ ہم صرف یہ اندازہ ہی کر سکے کہ یہ خط بے حد دیر سے لکھا گیا ہے۔ لیکن پھر بھی ہم نے اسے یار محمد کو دے دیا۔ تا کہ فوراً صدر کو پہنچا دے۔ یار محمد نے فوراً صدر

64۔ جب اسے سزا سنائی گئی تو شاید ہی کوئی سوچتا تھا کہ بھٹو کو حقیقتاً پھانسی دے دی جائے گی۔ (نیوز ویک اپریل ۱۶، ۱۹۷۹ء)

65۔ قانون کے مطابق ۶ فروری ۱۹۷۹ء سپریم کورٹ کے سامنے اپیل کے مسترد ہو جانے کے بعد ۱۳ مارچ ۱۹۷۹ تک صدر پاکستان کے سامنے رحم کی اپیل پیش کی جا سکتی تھی۔ اس عرصہ کے دوران دنیا کی مختلف طاقتوں اور مغربی ممالک کے سربراہان نے حکومت پاکستان سے ملک کے سابق وزیراعظم مسٹر بھٹو کی جان بخشی کے لیے اپیلیں کیں۔ ان کے علاوہ مسٹر بھٹو کی بڑی بہن، مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ اور مسٹر عزیز احمد نے بھی رحم کی اپیلیں پیش کیں۔ لیکن وہ اپنے پہلے بیان سے چمٹا رہا کہ اس نے اس جرم کا ارتکاب نہیں کیا چنانچہ وہ خدا کو بھی معاف کر دینے کے لیے نہیں کہے گا۔ یہ ظاہر ہے کہ مسٹر بھٹو ایسا کہنے میں حق بجانب تھے کیونکہ مقدمہ کی کارروائی کے مطابق انہوں نے تو احمد رضا قصوری کے قتل کا حکم دیا تھا نا کہ اس کے والد کے قتل کے لیے کہا تھا۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کا نظریہ تھا کہ ان کی بیوی نصرت بھٹو اور ان کی بیٹی بے نظیر بھٹو کو بھی رحم کے لیے اپیل نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن اس کے آخری ایام میں مسز بھٹو کو یقین ہو گیا تھا کہ اس کے خاوند کو پھانسی دے دی جائے گی۔ وہ بے حد بے چین تھی۔ اور اس نے بڑے بڑے سرکاری اہلکاروں کو کہا کہ وہ صدر پاکستان سے اس کی ملاقات کا اہتمام کریں یا ان سے بات کرنے کا موقع دلوائیں۔ خواہ ٹیلی فون ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اہلکاروں نے جواب میں کہا کہ وہ ایسا نہیں کروا سکتے۔ پھر بیگم نے ایک اہم خط جنرل ضیاء الحق کو لکھا جس میں اس نے ذمہ داری قبول کی کہ حکومت کی جانب سے اٹھائے گئے تمام نکات کو ہم تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اور حکومت کی طرف سے لگائی گئی شرائط پر امن قائم کریں گے۔ اگر حکومت چاہے تو ہم سیاست چھوڑنے پر آمادہ ہیں۔

(بہاولپور سے چار کوس دور مصنفہ ناصر نقوی صفحہ ۱۲۶ بزبان اُردو)

کے ملٹری سیکرٹری سے بات کی جو کھیلوں سے واپس آئے تھے۔ انہوں نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے توسط سے یہ خط دستی ان تک پہنچا دیا۔

ہم یار محمد کے دفتر سے نکلے اور سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس برکی کے دفتر چلے گئے جو جیل سے تھوڑے ہی فاصلہ پر تھا۔ یہ ایک غمناک لمحہ تھا۔ اور ہم خاموش تھے۔ غالباً ہر کوئی اسی سوچ میں تھا کہ ایک وقت کے طاقتور انسان کے المناک خاتمہ کا وقت کیسے آن پہنچا۔ لیکن ہم نے تو اپنا فرض ادا کرنا تھا۔ ہمیں کسی بھی امن وامان کی صورت کے مقابلہ سے نپٹنے کے لیے جوابی اقدامات کے متعلق سوچنا تھا۔ اگر پاکستان پیپلز پارٹی کے جوشیلے کارکنوں کو علم ہو گیا کہ ان کے رہنما کا اس دار فانی میں آج آخری دن ہے تو وہ بات جو عام طور پر کہی جارہی تھی کہ اگر مسٹر بھٹو کو پھانسی دے دی گئی تو پورے ملک میں احتجاج سے لگائی جانے والی آگ سے آسمان سرخ ہو جائے گا، کہیں ثابت نہ ہو جائے۔ (66)

66۔ (الف) پارٹی کے زیادہ تر رہنما صرف ہاں میں ہاں ملانے والے تھے۔ جنہوں نے مسٹر بھٹو کو گھیر رکھا تھا۔ جب ان کے رہنما کو پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا گیا تو انہوں نے اپنے آپ کو اپنے گھروں میں مقفل کر لیا۔ اور وسیع پیمانے پر کئے جانے والے مظاہروں کی پیشگوئیاں قطعاً سچی ثابت نہ ہوئیں۔ (نیوز ویک جولائی ۲۳،۱۹۷۹ء)

(ب) سیاسی سطح پر بھی مسٹر بھٹو کے حامیوں نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے میں ناکامی دکھائی۔ ضیاء اور اس کے ساتھیوں کو اب یقین واثق تھا کہ بھٹو کو تختہ دار پر لٹکائے جانے کے باعث ہونے والی متوقع بے چینی اور افراتفری کو وہ بہ آسانی دبا سکیں گے۔ (نیوز ویک ۲۹ مئی ۱۹۷۸ء)

(ج) پی پی پی کے بعض اراکین پہلے ہی دوسری پارٹیوں میں چلے گئے تھے۔ اور دوسروں کے متعلق احتمال تھا کہ وہ بھی چلے جائیں گے۔ (نیوز ویک ۱۶۔ اپریل ۱۹۷۹ء)

(چ) اب بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی میں جو بظاہر رہنما بنے بیٹھے تھے، ان میں قیادت کے لیے کوئی نشانیاں نہ تھیں۔ دوسری طرف مسٹر بھٹو کے قریبی رشتہ دار مسٹر ممتاز بھٹو اور سابق وزیر مالیات مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ نے کسی انداز سے بھی گڑبڑ والے علاقہ کے نزدیک نظر آنے کے متعلق عجیب ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا۔ (گارڈین ۶۔ اپریل ۱۹۷۹ء)

(ح) میں نے تعزیت کے پیغامات کا مطالعہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو مجبوراً تیار کیا ۵۔ اپریل کو لاہور سے ایک فیملی دوست نے لکھا میری پیاری آنٹی اور بے نظیر اپنے دُکھ اور غم کے اظہار کے لیے میرے پاس کوئی الفاظ نہیں۔ جو کچھ ہوا ہے اس کے لیے پوری قوم آپ کے سامنے جوابدہ ہے۔ ہم تمام مجرم ہیں...

ہر پاکستانی غمگین ہے۔ غیر محفوظ اور دل شکستہ ہم تمام مجرم ہیں۔ اور گناہ کے بوجھ تلے مدفون۔

(Daughter of the East صفحہ ۲۵۔۲۶ اور دختر مشرق صفحہ ۱۴ مصنفہ بے نظیر بھٹو)

میں رات کو اکثر جاگتی رہتی۔ مجھے اُلجھن تھی۔ مجھے بھاگ جانے کی اُلجھن تھی۔ مجھے اس امر کی اُلجھن تھی کہ ہم نے مسٹر بھٹو کو موت کی کوٹھری میں چھوڑ دیا۔ مجھے ایک گھٹیا سودے کی وجہ سے اُلجھن تھی۔ جن کے باعث ہمیں بھاگنے کی اجازت دی گئی۔ مجھے معلوم نہیں کہ کس طرح اس (مسٹر غلام مصطفیٰ کھر) نے انتظام کیا۔ لیکن مجھے معلوم ہوا کہ اس نے زندگی کی خاطر اپنی عزت کا سودا کیا۔ (مائی فیوڈل لارڈ مصنفہ تہمینہ درانی صفحہ ۹۴۷)

مجھے اس بات کا قلق تھا جس انداز میں ہم نے حکمران گروہ فیض علی چشتی اور راؤ فرمان علی کو چھوڑا تھا۔ مجھے (بقیہ آگے)

بھٹو کے ذہن میں کیا تھا؟

یار محمد نے مجھے بتلایا کہ ایک روز مسٹر بھٹو نے ملاقات میں مجھے کہا: وہ مجھے کبھی تختہ دار پر نہیں لٹکائیں گے۔ جنرل ضیاء پر ملکی اور بین الاقوامی دباؤ ہے۔ اور وہ اس قدر بھاری ہے کہ ضیاء کو مجبور کر دیں گے(67) کہ وہ مجھے پھانسی نہ دے۔لیکن وہ مجھے رہا نہیں کرے گا۔ اور مجھے جیل میں مقید رکھے گا۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

معلوم تھا کہ مصطفیٰ کھر نے اپنی جان کے لیے سودا کیا ہے۔ اس نے لندن سے بعض اہم دستاویزات کے ہمراہ واپس آنے کا وعدہ کیا تھا، جو مسٹر بھٹو کو ملزم قرار دیں گی۔ جرنیلوں نے اس پر اعتماد کیا۔ یہ بجائے خود ایک ایسا کلنک کا ٹیکا ہے جو مصطفیٰ تمام عمر اٹھائے رکھے گا۔ (مائی فیوڈل لارڈ مصنفہ تہمینہ درانی صفحہ ۱۱۲)

مسٹر بھٹو اس امر سے پریشان اور دل برداشتہ تھے کہ ان کے عوام، ان کی سزا میں کام نہ آئے۔ سیلاب کی مانند آمر کو بہا لے جانے والی ان کی امیدیں ہوا میں تحلیل ہو گئیں۔ انہیں سمجھ نہ آئی کہ لوگ بغاوت کر کے کیوں ان کی جیل تک نہیں پہنچے۔ اور ان کو رہا نہیں کروایا۔ اس بات نے اسے اُداس کر دیا۔

طارق نے بھٹو سے کہا کہ عوام کو دعوت دی جائے۔ اس نے اطلاع دی کہ پارٹی قیادت نے کسی طرح خود کو روک لیا ہے اور اسے عوام کو ابھارنے کے لیے کہا جائے۔ حفیظ اور ممتاز کو مسٹر بھٹو کے قتل سے ایک ماہ قبل جیل سے رہا کر دیا گیا۔ اس موقع پر ان کی رہائی اس کے لیے حیران کن تھی۔ ''کیا وہ چاہتے ہیں کہ میں ان کو بچوں کی طرح سبق دوں۔ کیا وہ نہیں جانتے۔ جو ان کو کرنا ہے؟ ممتاز اور حفیظ وہ بک گئے ہیں۔ وہ لوگوں کو نہیں للکاریں گے۔'' طارق بضد رہا۔ اسے یقین تھا کہ فوج آخری قدم اٹھائے گی۔ جب تک کہ اس کا مقابلہ نہ کیا جائے۔ مسٹر بھٹو نے پارٹی کے رہنماؤں کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے طارق سے کہا کہ ان کا پیغام حفیظ تک لے جائے۔ وہ لوگوں کو کال دینا چاہتے تھے۔

طارق اپنے چچا سے رخصت ہوا۔ اسے احساس ہو گیا کہ ان کے ساتھ اس کی یہ آخری ملاقات ہے۔ وہ ظالم ہوا کے تیز جھونکوں سے چمٹا رہا۔ وہ ڈاکٹر نیازی کے ہمراہ حفیظ کو ملنے کے لیے گیا۔ یہ غلط موقع تھا۔ گھر کے باہر بہت سی کاریں کھڑی تھیں۔ وہ دوسری شادی رچائے ہوئے تھا۔ تاہم وہ طارق کو ملنے کے لیے باہر آیا۔ پیغام دیا گیا حفیظ عجیب نظر آ رہا تھا۔ ''آپ کا مطلب ہے کہ وہ ہمیں عوام کو کال دینے کے لیے کہہ رہا ہے؟'' ہاں'' ''ابھی؟ میں...... ایسا کروں...... فوراً ...... کل صبح'' دولہا کے دل میں اور باتیں تھیں۔ کسی طرح بھی کال نہ دی گئی۔ اس شخص کی گردن کے گرد پھندا جو پارٹی کا چیف تھا، کس دیا گیا۔ (مائی فیوڈل لارڈ مصنفہ تہمینہ درانی صفحہ ۱۱۹۔ ۱۲۰)

67۔ (الف) اندرون ملک سیاسی سوچ کا بیرون ملک خیالات سے بھاری وزن ہوگا۔ جس وقت ضیاء اسلامی انصاف کے سخت فیصلے کو لاگو کرنے یا نہ کرنے کے متعلق آخری فیصلہ کرے گا کہ کیا قابل نفرت شخص کو پھانسی دے دی جائے۔ (ٹائم ۱۹ فروری ۱۹۷۹ء)

(ب) ضیاء اور اس کے ساتھیوں کو اب یقین تھا کہ وہ کسی بھی قسم کی سیاسی بے چینی کو دبا سکیں گے۔ خاص طور پر بھٹو کو پھانسی دینے کے بعد جو بے چینی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ وہ لاہور ہائی کورٹ کے فیصلہ سے قبل بے حد بے چین تھے اس امر کا تذکرہ ایک بیرونی سیاسی سفارت کار نے راولپنڈی میں کیا۔ اور جب فیصلہ آیا اور انتشار نہ ہونے کے برابر ہوا تو ان کو اطمینان کا سانس آیا۔ (نیوز ویک ۲۹ مئی ۱۹۷۸ء)

(ج) ضیاء جب صدر بنا تو اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ جس شخص کو اس نے اقتدار سے الگ کیا ہے۔ اس (بقیہ آگے)

حکومت میں قائم رہنے کے لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ بیرونی طاقتوں سے اچھے تعلقات قائم رکھنے کی خاطر سمجھ بوجھ پیدا کی جائے۔ اور ضیاء نے اس کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان کے عوام اس قدر گڑبڑ پیدا کر دیں گے کہ اسے مجبوراً لوگوں کی سوچ کے مطابق چلنا ہوگا جو ظاہراً میری پھانسی پر لٹکائے جانے کے حق میں نہ ہوگی۔

یہ خیال (68) انہیں اپنے ملنے والوں، وکلاء، اپنے قریبی دوستوں اور اپنی بیوی اور بیٹی سے ملاقاتوں میں ہوا۔ یار محمد ان کی سوچ سے متفق نہ ہوا اور مسٹر بھٹو کے ساتھ بے حد احترام سے یہ تجویز پیش کی کہ اگر حالات آپ کے اندازے کے مطابق سامنے نہ آئے تو اس صورت حال سے بچ نکلنے کا راستہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے۔ ورنہ جان بچانے کے لئے آخری قدم اٹھانے کے لئے شاید مہلت نہ ملے۔ دریں حالات اس نے مسٹر بھٹو کو تجویز دی کہ کوئی قابل عمل راستہ اپنایا جائے۔ اپنے ہی مفادات کے پیش نظر انہیں مارشل لاء حکومت کے ساتھ صلح کی حکمت عملی کو اپنانا چاہیے۔ یار محمد نے اپنے نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ''رسہ ایک ہے اور افراد دو ہیں۔ لیکن ایک وقت میں ایک ہی فرد لٹکایا جا سکے گا۔ ایک آپ ہیں اور دوسرا ضیاء۔ ضیاء کے پاس طاقت ہے اور وہ اسے اس تک پہنچنا گوارا نہیں کرے گا۔ قانون کی نظر میں آپ مجرم ہیں۔ اور آپ کا کوئی اختیار نہیں۔ لہٰذا آپ کو ایک بے بس فرد کا راستہ اپنانا چاہیے جو پناہ کے لیے التجا کر رہا ہے آپ لوگوں پر بہت بھروسہ نہ کریں۔'' یار محمد نے کہا کہ اس کی نصیحت کا مسٹر بھٹو کی سوچ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ کیونکہ ان کی مضبوط ''انا'' نے انہیں ضدی بنا دیا تھا۔

ایک روز مسٹر بھٹو نے یار محمد سے کہا کہ حکومت سے مفاہمت کے لیے کوئی راستہ اپنائیں لیکن ان کا یعنی بھٹو کا نام نہ لیا جائے۔ کیونکہ مسٹر بھٹو کا خیال تھا کہ عوام یہی سوچیں کہ اس مفاہمت کے لئے جنرل ضیاء نے ہی پہلا قدم اٹھایا ہے۔

مسٹر بھٹو نے مسٹر حفیظ پیرزادہ کو ملاقات کے لیے بلایا۔ پنجاب گورنمنٹ کے ہوم ڈیپارٹمنٹ نے اجازت دے دی۔ اور مسٹر حفیظ پیرزادہ مقررہ وقت پر ملنے کی خاطر جیل میں پہنچے۔ وہ مسٹر بھٹو کے ساتھ کچھ وقت رہے۔ عام طور پر کہا جا رہا تھا کہ مسٹر بھٹو نے انہیں لائحہ عمل سے آگاہ کیا۔ جس میں جنرل

(بقیہ آگے) پر کوئی رحم نہ ہوگا۔ (نیوز ویک ۱۶ اپریل ۱۹۷۹ء صفحہ ۷)

(چ) پاکستان کے فوجی حکمران جنرل ضیاء الحق نے اپنے واشگاف بیان میں جو مسٹر بھٹو کی قسمت کے متعلق تھا کل رات کہا کہ سابق وزیر اعظم مسٹر بھٹو کے لئے سپریم کورٹ نے اگر سزائے موت بحال رکھی تو وہ اس کو تختہ دار پر لٹکانے کا پختہ ارادہ رکھتا ہے۔ (ڈیلی ٹیلیگراف ۲ مارچ ۱۹۷۹ء بروس لاڈن)

68۔ یار محمد کے مصنف کے ساتھ انٹرویو کا اقتباس

ضیاء سے رحم کی (69) درخواست کے لیے کہا گیا۔ جب وہ جیل چھوڑ رہے تھے تو یار محمد نے پیرزادہ سے پوچھا کیا وہ رحم کی درخواست دے رہے ہیں۔ حفیظ پیرزادہ جو پہلے ہی ناراض دکھائی دے رہے تھے، انہوں نے جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو گھور کے دیکھا اور جواب دیئے بغیر چلے گئے۔

69۔ (الف) مسٹر بھٹو کی بڑی بہن، مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ اور عزیز احمد نے بھی رحم کی اپیلیں دائر کیں۔
(بہاولپور سے چار کوس دور مصنفہ ناصر نقوی ص ۱۲۵)
(ب) مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ بھٹو کی کابینہ کے ایک وزیر، جنرل ضیاء سے دو گھنٹہ کی غیر متوقع طویل ملاقات کے بعد مسٹر بھٹو کو ان کی موت کی کوٹھری میں جو راولپنڈی ڈسٹرکٹ جیل میں ہے، آج اپنی ملاقات کے نتائج سے آگاہ کریں گے۔
(ڈیلی ٹیلی گراف ۵ مارچ ۱۹۷۹ء بروس لاڈن راولپنڈی)

آخری چند گھنٹے

ہم برکی کے دفتر میں بیٹھے تھے اور جیل کے اندر کیا ہو رہا تھا ہمیں معلوم نہ تھا۔ جیل میں کرنل رفیع دوسرے جیل کے اہلکاروں کے ساتھ موجود تھے۔ ایک مشہور شخصیت کو پھانسی دی جانے والی تھی۔ ملک کا ہر بچہ ان کے نام سے آشنا تھا۔ بین الاقوامی سطح پر وہ تسلیم شدہ سیاست دان تھے۔ یہ بڑی المناک صورت تھی کہ انہیں پھانسی کے ذریعے موت کی آغوش میں دھکیلا جا رہا تھا۔ لیکن یہ تو ہائی کورٹ کا فیصلہ تھا جس کی پاکستان کی سپریم کورٹ نے توثیق کر دی تھی۔ واقعات کے رخ سے وکلاء ہی اندازہ لگا سکتے تھے کہ آئینی طور پر فیصلہ درست تھا یا غلط۔ ہمیں جو فرائض سونپے گئے تھے، ان کی روشنی میں ہم نے تو امن و امان کو ہر قیمت میں برقرار رکھنا تھا۔ حکومت نے ہمیں آئینی طریقوں کا جائزہ لینے کے لیے تو مقرر نہیں کیا تھا۔ ہر ایک کو مروجہ دائرہ کے اندر رہ کر اپنے فرائض سرانجام دینے چاہئیں۔ ہمارے لیے دائرہ کار امن و امان کی برقراری تھا۔ ہم نے کسی بھی بیرونی خطرہ سے مسٹر بھٹو کی زندگی کی حفاظت کرنا تھا۔ آج ہمارا فرض امن و امان کو برقرار رکھنا اور ان کی میت کو جیل سے چکلالہ ایئر پورٹ بیس تک پہنچانے کے دوران امن و امان کو یقینی بنانا تھا۔ تا کہ بھٹو صاحب کا جسد خاکی پی اے ایف جہاز میں منتقل کر دیا جائے اور منزل مقصود تک لے جانے کے لیے جہاز ہوا میں بلند ہو جائے۔ ہم نے اپنی بہترین صلاحیتوں کے مطابق اپنے فرائض سرانجام دیئے۔ اور اپنے اختیارات کے دائرہ کے اندر رہ کر اپنی ذمہ داریوں کو سنبھالا۔ اس لئے امن و امان کی خاطر یہ ضروری تھا کہ مسٹر بھٹو کو تختہ دار پر لٹکائے جانے کے وقت ہم جیل کے باہر موجود ہوں تا کہ غیر متوقع حالات کے ساتھ نپٹا جا سکے۔ پس ہم نے ایسا ہی کیا اور جیل کی اندرونی کارروائی کو قریب سے نہ دیکھا۔

مصنف کے ساتھ یار محمد کا انٹرویو

3اور4اپریل 1979ء کی منحوس رات کوظہور پذیر واقعات کوضبط تحریر میں لانے کے لیے میں نے یار محمد سپرنٹنڈنٹ جیل کی امداد طلب کی جو مسٹر بھٹو کو تختہ دار پر لٹکانے کے وقت پھانسی گھاٹ پر موجود تھے۔انہوں نے ازراہ نوازش وہ اطلاعات مجھے فراہم کیں تا کہ سچائی کو عوام تک پہنچایا جا سکے۔انہوں نے مجھے بتلایا''کوئی بھی بات چھپانے والی نہیں۔میں نے اپنا فرض ادا کیا اور دراصل میں نے مسٹر بھٹو کے مطالبات کو پورا کرنے کے لیے بساط سے بڑھ کر امداد کی۔جو کبھی خود ملک کے صدر اور بعدازاں وزیراعظم بنے اور آج سزا یافتہ قیدی تھے۔انہیں ایسی سہولیات مہیا کی گئیں جو ایسے حالات میں گزرنے والے فرد کو نہیں دی جاتیں۔''ایسا کیوں ہوا صرف حکومت پنجاب ہوم ڈیپارٹمنٹ ہی اس پر تبصرہ کرسکتا ہے۔

سات بجے رات

یار محمد نے کہا کہ وہ اور کرنل رفیع کمانڈنگ آفیسر ۲۷ پنجاب رجمنٹ مسٹر بھٹو سے ملاقات کے لیے آئے۔وہ اپنے کمرہ میں فرش پر فوم کا گدا بچھائے لیٹے ہوئے تھے۔میں نے ان سے کہا:''جناب عالی! کیا آپ وصیت تحریر کروانا چاہیں گے۔''یار محمد نے وضاحت کی کہ سزا یافتہ قیدی اپنی وصیت خود بھی تحریر کرسکتا ہے یا پھر وہ اپنی وصیت زبانی لکھوا سکتا ہے جسے جیل کے عہدہ دار ڈرافٹ کرتے ہیں۔بعدازاں یہ قیدی کے سامنے اس کے پھانسی چڑھنے سے قبل ڈیوٹی مجسٹریٹ کی موجودگی میں پڑھی جاتی ہے اور ڈیوٹی مجسٹریٹ اس پر دستخط ثبت کرتا ہے۔

مسٹر بھٹو نے یار محمد سے کہا''کون سا وقت مقرر کیا گیا ہے؟''

''جناب عالی! یہ خفیہ ہے اور جیل کے قوانین کے مطابق اس کو افشا نہیں کیا جا سکتا۔''

''مسٹر بھٹو نے بضد کہا۔یہ کون سا وقت ہوگا؟''

یار محمد نے وقت نہیں بتلایا اور خاموش رہے مسٹر بھٹو نے یار محمد سے پوچھا:''میں اپنی وصیت تمہیں کیوں لکھواؤں؟''

''جناب عالی! ہم آپ کے لیے ڈرافٹ کریں گے تا کہ متعلقہ افراد جان سکیں کہ مرنے سے قبل آپ کیا کہنا چاہتے تھے۔''

''پھانسی کا کون سا وقت ہے؟''

''جناب عالی! یہ خفیہ ہے اور میں نہیں بتلا سکتا۔''

لیکن مسٹر بھٹو نے ضد جاری رکھی۔ بالآخر یار محمد نے صرف اتنا کہا'' مجھے افسوس ہے میں آپ کو نہیں بتلا سکتا۔''

''پھر تم مجھے صرف کاغذ بھیج دو۔ میں خود تحریر کروں گا۔''

''بہت اچھا جناب عالی!''

اس کے بعد یار محمد دفتر واپس آئے اور مسٹر بھٹو کو لکھنے کا سامان روانہ کر دیا گیا۔ مجید قریشی جو جیل کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ تھے، وہ مسٹر بھٹو کے ساتھ ڈیوٹی پر تھے۔ انہوں نے یار محمد کو اطلاع دی کہ مسٹر بھٹو ۱۰:۵۰ شب تک لکھتے رہے اور کافی پیتے رہے۔ پھر انہوں نے تحریر کردہ تمام مواد سگریٹ لائٹر (70) سے جلا دیا پھر وہ اپنے بستر پر لیٹ گئے جسے انہوں نے فرش پر بچھا رکھا تھا۔ اور سگار پینا شروع کر دیا۔ جبکہ کوٹھڑی کی چھت کو ٹکٹکی لگا کر دیکھتے رہے۔

بارہ بجے رات

سپرنٹنڈنٹ جیل کے دفتر میں انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات چوہدری نذیر احمد، ڈیوٹی مجسٹریٹ مسٹر بشیر خان، لیفٹیننٹ کرنل رفیع کمانڈنگ آفیسر ۲۷ پنجاب رجمنٹ جو بھٹو کے جسد خاکی کو جیل سے باہر لے جانے کے ذمہ دار تھے اور ڈاکٹر اصغر میڈیکل آفیسر، بیٹھے ہوئے تھے۔ یار محمد نے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جیل کو کہا کہ تھوڑے عرصہ کے لیے مسٹر بھٹو کی کوٹھڑی کے سامنے پھریں تاکہ وہ بیدار ہوں، غسل کریں اور نماز پڑھ لیں۔ مذکورہ آفیسر نے چند مرتبہ آگے پیچھے چکر لگائے لیکن مسٹر بھٹو بیدار نہ ہوئے اور وہ خراٹے بھرتے نظر آئے۔ اور وہ گہری نیند میں تھے۔ اس کے بعد مذکورہ بالا افسران نے اس پر اتفاق کیا کہ مسٹر بھٹو کو جگایا جائے۔ چنانچہ یار محمد، ڈاکٹر اصغر اور لیفٹیننٹ کرنل رفیع مسٹر بھٹو کے پاس گئے اور بڑی تعظیم سے انہیں جگانے کی کوشش کی۔ مسٹر بھٹو نے کوئی جواب نہ دیا اور خراٹے بھرتے رہے۔ لہٰذا جیل کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے انہیں گھٹنے پر چھوا۔ انہوں نے آنکھیں کھولیں جو سرخ نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے ہکلاتی آواز میں کہا، جیسے وہ کسی مضبوط نشہ کے اثر تلے ہوں۔

''یہ کیا ہے؟''

یار محمد نے نرمی سے جواب دیا۔ مہربانی کر کے ہمیں اپنی وصیت لکھوائیں۔''

70۔ (الف) میں نے (اپنے خیالات کاغذ پر لکھنے کی) کوشش کی لیکن میرے خیالات میں اس قدر ہلچل تھی کہ میں نہ کر سکا۔ میں نے انہیں جلا دیا (بھٹو کے آخری ۳۲۳ دن مصنفہ کرنل رفیع ص ۱۲۴)

(ب) کل جو تفصیلات میسر آئیں ان میں یہ رپورٹ شامل تھی کہ پھانسی سے قبل والی شام مسٹر بھٹو کو قلم اور کاغذات دیئے گئے۔ تاکہ وصیت لکھیں۔ انہوں نے ایسا کیا۔ پھر صفحات کو جلا دیا (ڈیلی ٹیلی گراف ۱۶ اپریل ۱۹۷۹ء بروس لاڈن، راولپنڈی)

''مسٹر بھٹو نے ہکلاتی ہوئی کمزور آواز میں جواب دیا''میری وصیت اب تاریخ لکھے گی۔''

بھٹو معمول کے مطابق دکھائی نہیں دے رہے تھے۔لہٰذا ڈاکٹر کو کہا گیا کہ وہ ان کا معائنہ کریں اس نے فوراً ان کے دل اور نبض کا معائنہ کیا جو اس کے خیال میں معمول کے مطابق کام کر رہے تھے۔ میڈیکل آفیسر کا اندازہ تھا کہ مسٹر بھٹو عصبی کسالت میں مبتلا ہیں۔ بہر حال یار محمد کے خیال کے مطابق مسٹر بھٹو نے بظاہر سکون آور ادویات کی بھاری مقدار استعمال کی تھی۔ جس کے باعث ان پر گہری غنودگی طاری ہوگئی تھی۔ یار محمد نے مزید اندازہ لگایا کہ مسٹر بھٹو نے اس لیے ایسا کیا تھا تا کہ انہیں پھانسی کی مکمل اذیت سے نہ گزرنا پڑے۔لہٰذا اس سبب سے مسٹر بھٹو بضد تھے کہ انہیں پھانسی کا وقت بتلایا جائے۔ یہ خیال درست بھی ہوسکتا ہے کیونکہ مسٹر بھٹو اس لیے سکون آور ادویات پھانسی سے چند لمحات قبل لینا چاہتے تھے۔ تا کہ دوائی کے اثرات اس وقت عروج پر ہوں جب ان کو پھانسی کے تختہ پر لٹکایا جا رہا ہو۔ چنانچہ یار محمد اپنے دفتر چلے گئے اور انہوں نے انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات چوہدری نذیر احمد کو مطلع کر دیا۔ انہوں نے اس پر غور کیا۔ اور چوہدری نذیر نے بالآخر کہا کہ اگر وہ چلنے کے قابل نہیں تو انہیں جیپ میں لے جایا جائے۔ یار محمد نے بتلایا کہ پھانسی کے تختہ تک لے جانے کا کوئی راستہ نہیں۔ کیونکہ کئی جگہ رکاوٹیں ہیں۔ پھر فیصلہ ہوا کہ انہیں سٹریچر پر لے جایا جائے۔

تختہ دار کی طرف

جیل کے وارڈنوں نے مسٹر بھٹو کو سٹریچر پر ڈالا۔ انہوں نے آنکھیں کھولیں اور ہکلاتی ہوئی نرم آواز میں کہا''آپ کیا کر رہے ہیں؟''مسٹر بھٹو اپنی ذاتی شلوار قمیض پہنے ہوئے تھے۔ انہیں ہمیشہ اس بات کی فکر رہتی تھی کہ جس طرح اُن کی پرداخت ہوئی ہے وہ کبھی وہ لباس نہیں پہنیں گے جو سزا یافتہ قیدی پہنتے ہیں۔ انہوں نے اپنا سر اونچا کیا۔ اور بائیں اور دائیں طرف دیکھتے رہے۔ تا آنکہ سٹریچر کو تختہ دار کے نزدیک رکھ دیا گیا۔ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جیل مجید قریشی نے مسٹر بھٹو سے کہا۔ جناب: کھڑے ہو جائیں۔ آپ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ لوگ یاد کریں گے کہ کس طرح ذوالفقار علی بھٹو نے موت کو سینے سے لگایا۔ اپنی بات پر قائم رہیں جس کا آپ نے ہمیشہ دعویٰ کیا۔ تاریخ تو لکھی جا رہی ہے۔ مسٹر بھٹو اٹھ کھڑے ہوئے اور سٹریچر پر سے جھٹکے سے کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جیل سے سہارا لیا اور پھانسی کے تختہ کی طرف بڑھے (71) اور وہاں کھڑے ہو گئے۔ جلاد

71۔ دو مزید خبروں کی تصدیق نہیں ہوسکی۔ ایک یہ کہ مسٹر بھٹو کو کوٹھری سے پھانسی تک سٹریچر پر لے جایا گیا۔ لیکن دراصل وہ پھانسی کی سیڑھیوں تک چل کر گئے۔ پہلی تمام رپورٹوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ بڑی شان سے تختہ دار تک چل کر گئے۔ (ڈیلی ٹیلی گراف ۱۶ اپریل ۱۹۷۹ء بروس لاڈن، راولپنڈی) (بقیہ اگلے صفحہ پر)

نے ان کے دونوں ہاتھ سوتی رسی سے ان کے جسم کے ساتھ باندھ دیئے۔ اس نے ان کے دونوں پاؤں کو بھی ٹخنوں سے سوتی رسی سے باندھ دیا۔ مسٹر بھٹو نے اب بھی ہکلاتی نحیف آواز میں کہا ''یہ تکلیف دیتی ہے۔'' ان کا اشارہ اس رسی کی طرف تھا جس کے ساتھ ان کے ہاتھ باندھے گئے تھے۔ یار محمد نے جلاد تارا مسیح کو کہا۔ ڈھیلی کر دو۔ جو اس نے کر دی۔ پھر مسٹر بھٹو نے کہا ''اسے ختم کرو'' اس موقع پر یار محمد نے اشارہ کیا اور تارا مسیح نے لیور کھینچ دیا۔ اور اس طرح مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو عدالت کے فیصلے کے مطابق پھانسی دے دی گئی۔

ہم سبھی جو جیل کی عمارت سے باہر ایس ایس پی کے دفتر میں منتظر بیٹھے تھے۔ بمشکل ایک دوسرے سے ہم کلام ہو رہے تھے۔ ہم سوچ رہے تھے کہ اپنے وقت کا طاقتور انسان دو بجے موت کی آغوش میں چلا جائے گا۔ میں اس سوچ میں گم تھا کہ اس کے اور اس کے افراد خانہ کے کیا احساسات ہوں گے۔ وہ کبھی پاکستان کا وزیر اعظم تھا جو دوسروں پر رحم کرنے کا اہل تھا۔ لیکن وہ آج صدر ضیاء الحق کے رحم و کرم پر تھا۔ جس نے اس پر رحم نہ کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ اس کی موت کا لمحہ تیزی سے قریب آ رہا تھا۔ سعید مہدی کی طبیعت قدرے علیل تھی۔ انہیں معدے کی خرابی کا عارضہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہمارے ساتھ موجود رہے۔ گھڑی نے دو بجائے اور وائرلیس کی خاموشی کو کرنل رفیع کے خفیہ لفظ نے توڑ دیا۔ مسٹر بھٹو کو سزائے موت دے دی گئی۔ وہ ایک سزا یافتہ قیدی کی حیثیت سے فوت ہوئے۔ ہم سب خاموش تھے۔ ہمارے سکوت کو اس لمحے شاید برکی نے اپنی ڈائری میں درج کر لیا۔ صبح ہونے سے تھوڑا وقت قبل وائرلیس پر سب ٹھیک ہے کا اعلان کیا گیا۔ جیل کے دروازے کھلے اور ۳/۴ ٹن ڈاج گاڑی مسٹر بھٹو کی غسل شدہ میت کو اٹھائے باہر نکلی۔ ۲۷ پنجاب رجمنٹ کے محافظ میت کے ساتھ پیچھے بیٹھے تھے۔

چونکہ اس گاڑی کے ہمراہ کوئی حفاظتی دستہ نہ تھا۔ لہٰذا یہ سمجھا جائے گا کہ اس گاڑی کا تعلق کسی قسم کی غیر معمولی سرگرمی سے نہیں۔ اس گاڑی کا سامان والا حصہ مکمل طور پر کینوس سے ڈھانپا گیا تھا۔ ہم تینوں ڈی سی۔ ایس ایس پی اور خود میں) کچھ فاصلہ دور برکی کی جیپ میں چلے آ رہے تھے۔ کوئی بھی سرسری نظر رکھنے والا شاید سوچے گا کہ پولیس یا فوج کی یہ گاڑی رات کی ڈیوٹی دینے کے بعد واپس جا رہی

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

(ب) سٹریچر کو چاروں کونوں سے چار وارڈروں نے اٹھایا۔ بھٹو صاحب نے اپنا سر اٹھائے رکھا لیکن بے حس و حرکت رہے۔ ان کے پاؤں پیلے نظر آ رہے تھے۔ جیسے کہ جسم میں خون ہی نہ ہو۔ ان کی کوٹھری سے پھانسی تک گھاٹ (۲۰۰ سے ۲۵۰ گز) وہ خاموش رہے۔ اور بے حس و حرکت رہے۔ پھانسی پر وارڈروں نے سٹریچر کو زمین پر رکھ دیا۔ اور ان میں سے دو نے مسٹر بھٹو کو کندھوں سے سہارا دیا اور مسٹر بھٹو پھانسی کے تختہ پر کھڑے ہو گئے (بھٹو کے آخری ۳۲۳ دن مصنفہ کرنل رفیع صفحہ ۱۲۵ بزبان اُردو)

ہے۔ جب ہم چکلالہ ایئر پورٹ پہنچے تو سی ۔ ۱۳۰ ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ یہاں سے آگے کسی قسم کا ردعمل خطرناک ہوسکتا تھا۔ اگر چہ ہمیں خطرے کی توقع تھی لیکن ہم نے بے خوفی سے بڑھ کر دانستہ کسی طاقت کا مظاہرہ نہ کیا۔ تاکہ صیغہ راز راز رہے۔ ہم نے نفسیاتی طور پر مسئلہ کا حل نکالا۔ بیس کے آس پاس پولیس یا فوج نہ تھی۔ اس طرح ہم نے اپنا مقصد حاصل کرلیا۔ خوش بختی سے ہماری مساعی کامیاب رہیں۔ کوئی بھی واقعہ پیش نہ آیا۔ ہم نے میت کو اتارنے میں امداد کی اور اسے منتظر سی۔ ۱۳۰ میں منتقل کر دیا۔ محافظ، کرنل رفیع کے ہمراہ اسی جہاز میں سوار ہوئے۔ دروازے بند ہوئے اور صبح کی تاریکی کی خاموشی انجنوں کے چلنے سے ٹوٹ گئی۔ جہاز مسٹر بھٹو کی میت اور اس کے آخری فوجی محافظوں کے ساتھ بلند ہوا۔ ہم ایئر پورٹ لاؤنج میں آئے اور کچھ عرصہ وہاں ٹھہرے۔ کوئی بھی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ اس کے بعد ہم ڈسٹرکٹ جیل کے لیے روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر ہم نے یار محمد اور دوسروں کو خاموش پایا۔ ہم سب غمگین تھے لیکن کچھ بھی تو نہ ہوسکتا تھا۔ میں نے ڈیوٹی پر موجود سپاہیوں سے بات کی۔ لیکن ہونے والے واقعات کا انہیں علم نہ تھا۔

سی۔130 کی ناکام اڑان

صبح جبکہ ابھی ہم یار محمد کے دفتر میں ہی تھے کہ ٹیلی فون آیا۔ جس میں مجھے بتلایا گیا کہ وہ جہاز جو مسٹر بھٹو کی میت کو لے کر جا رہا تھا، کسی تکنیکی خرابی کے باعث واپس اڈے پر آ رہا ہے۔ ڈپٹی کمشنر، سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس اور میں، ہم بڑی تیز رفتاری سے چکلالہ ہوائی اڈہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جب ہم پہنچے۔ جہاز ابھی ابھی اڈہ پر اترا تھا۔ خوش قسمتی سے ہم نے ایسے ناگہانی حالات کے لیے منصوبہ سوچ رکھا تھا۔ متبادل جہاز کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ یہ سی۔ ۱۳۰ سامان پہنچانے والا جہاز تھا۔ جس میں ہم نے فوراً میت اور اس کے محافظوں کو منتقل کر دیا۔ اب اس وقت دن نمودار ہو چکا تھا اور لوگ اپنی روزمرہ کی ڈیوٹی سرانجام دینے کے لئے آنا شروع ہو گئے تھے۔ اس دوران ہمیں یقین تھا کہ ضرور کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہوگی۔ لیکن پھر کچھ نہ ہوا۔ دروازے بند کر دیئے گئے اور جہاز آسمان کی وسعتوں میں پرواز کر گیا۔ بظاہر یہ حجم کے لحاظ سے ہلکا وزن لے کر جا رہا تھا۔ لیکن ایک بے حد بھاری بین الاقوامی شہرت رکھنے والی شخصیت ذوالفقار علی بھٹو کو لے کر یہ جہاز محو پرواز تھا۔ ہم نے ہوائی اڈہ پر ٹھہرنے کا فیصلہ کیا تا آنکہ ہمیں جہاز کی منزل مقصود تک پہنچ جانے کی اطلاع موصول ہو جائے۔ بھٹو کو وی آئی پی والی دیکھ بھال دی گئی۔ ان کے جسد خاکی کے لئے بھی وی آئی پی کی طرز کا سی۔ ۱۳۰ طیارہ دیا گیا تھا۔ لیکن شاید ان کی قسمت میں وی آئی پی سلوک کے ساتھ آخری سفر طے کرنا نہ لکھا تھا۔ اس کی بجائے انہوں

نے سامان والے جہاز میں سفر کیا۔

جنرل عارف صدر کے سی او ایس نے ہدایت کی تھی کہ جونہی مسٹر بھٹو کو تختہ دار پر لٹکایا جائے، فوراً ٹیلی فون پر اطلاع کر دی جائے۔ نیز میجر جنرل صغیر حسین سید ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے بھی مجھے کہا تھا کہ جونہی مسٹر بھٹو کو پھانسی دی جائے، انہیں فوراً اطلاع دی جائے۔ بے شک وہ سو ہی رہے ہوں۔ میں اب تذبذب میں تھا کہ کس کو پہلے اطلاع دی جائے۔ میں نے فیصلہ کیا یہ مناسب ہوگا کہ کمانڈ کے سلسلہ پر عمل کر کے ترجیحات پر چلا جائے۔ چنانچہ میں نے پہلے جنرل صغیر کو جگایا اور انہیں مطلع کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ اب مجھے جنرل عارف کو مطلع کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ خود ایسا کر دیں گے۔

جونہی ہم جیل میں واپس پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ پاکستان کے ایک اخبار روزنامہ جنگ کی طرف سے شائع کردہ ضمیمہ تقسیم کیا جا رہا ہے۔ جس نے اہم خبر شائع کر دی (72) کہ مسٹر بھٹو کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا ہے۔ ہمیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ روزنامہ جنگ کی اس خبر تک پہنچ ہو سکتی تھی۔ کیونکہ سی ایم ایل اے کے سی او ایس کی جانب سے یہ حکم تھا کہ جیل میں کام کرنے والے کارکنان میں سے کسی کو جیل کی حدود سے باہر جانے کی اجازت نہیں جب تک بھٹو کی میت منزل تک نہ پہنچ جائے۔ چنانچہ یہ خبر کس طرح باہر نکل گئی؟ بعد ازاں ہمیں معلوم ہو گیا کہ جب ہم ایس ایس پی کے دفتر میں بیٹھے منصوبے بنا رہے تھے کہ مسٹر بھٹو کی پھانسی کے سبب کسی امن و امان کی صورت کے پیدا ہو جانے سے کس طرح مقابلہ کیا جائے۔ تو جنگ اخبار کا ایک رپورٹر کنول برکی کے پی۔ اے کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ کنول ایک صحافی کے ناطے ایس ایس پی کے دفتر کے ساتھ اچھے پیشہ وارانہ تعلقات رکھے ہوئے تھا۔ اس وقت برکی اس کی موجودگی سے لاعلم تھے دوسری طرف پی۔ اے یہ سمجھتا رہا کہ شاید برکی نے اسے وہاں آنے کے لیے کہا ہے۔ ایسی صورت ہرگز نہ تھی۔ چنانچہ کنول خبر لے کر چپکے سے وہاں سے نکل گیا۔ جسے ضمیمہ کے طور پر شائع کر دیا گیا۔

ہم بیدار رہے اور مسلسل ۱۳ اپریل سے دباؤ کا شکار رہے۔ خوش قسمتی سے راولپنڈی میں کسی بھی جگہ

72۔ (الف) پاکستان کے عوام کو پھانسی کی خبر پہلی بار اس وقت ملی جب نو گھنٹے گزرنے کے بعد ریڈیو پاکستان نے اپنے خبرنامہ میں اطلاع دی کہ جنرل ضیاء نے رحم کی اپیلیں مسترد کر دی ہیں اور یہ کہ مسٹر بھٹو مر چکے ہیں اور ان کو دفن کر دیا گیا ہے۔
(ڈیلی ٹیلی گراف ۱۵ اپریل ۱۹۷۹ء بروس لاڈن راولپنڈی)

(ب) متذکرہ بالا طریقوں کے باعث انتظامیہ بڑی حد تک مسٹر بھٹو کی پھانسی کو خفیہ رکھنے میں کامیاب ہوگئی (بھٹو کے آخری ۳۲۳ دن مصنفہ کرنل رفیع صفحہ ۱۲۹ بزبان اُردو)

(ج) پاکستانیوں کو اخباروں کے ذریعے خبر کے افشاء ہونے کے باعث معلوم ہوا کہ مسٹر بھٹو کو ۲ بجے صبح پھانسی دے دی گئی ہے۔ (نیویارک ٹائمز ۱۵ اپریل ۱۹۷۹ء رابرٹ ٹرمبیل۔ نیویارک ٹائمز کے لیے خصوصی نمبر)

کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ بہر حال ہم کسی صورت سہل انگاری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اگر راولپنڈی کے لوگوں نے کوئی ردعمل دکھایا تو یہ خطرناک ہوگا۔ اب تک لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ مسٹر بھٹو کو پھانسی دے دی گئی ہے اور یہ کہ ان کی لاش کو گڑھی خدا بخش میں دفن کرنے کے لیے بھیج دیا گیا ہے۔ دو بھٹو خواتین کو ابھی تک سہالہ سب جیل میں نظر بند رکھا گیا تھا۔ چنانچہ وہ مسٹر بھٹو کے جسد خاکی کے ہمراہ نہ جا سکیں۔ میں بمشکل اپنے گھر پہنچا تھا کہ میرے سٹاف آفیسر کو فون ملا کہ ڈی ایم ایل اے نے ۴۔اپریل ۱۹۷۹ء کو دس بجے صبح اجلاس طلب کیا ہے۔

ڈاکٹر اصغر کی تحریری شہادت

13 اکتوبر 1991ء کو ڈاکٹر اصغر نے ضلع راولپنڈی میں واقع اپنے ہسپتال میں مصنف کو تین گھنٹے کا انٹرویو دیا۔ ستمبر 1978ء کے ان دنوں میں ڈاکٹر اصغر ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال کے سٹاف میں شامل تھے۔ وہ ڈاکٹر صدیقی کی جگہ سینٹرل جیل راولپنڈی میں ڈیپوٹیشن پر تعینات ہوئے۔ وہ اب اسی ہسپتال میں ایڈیشنل میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے متعین تھے۔ انہوں نے بہت ہی بے تکلفانہ اور دوستانہ انداز میں درج ذیل روداد بیان کی:

میں اپنے جیل کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا جب جناب بھٹو کا مشقتی (مددگار) میرے پاس آیا اور مجھے بتایا کہ بھٹو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وہ مجھ سے معائنہ کروانا چاہتے ہیں۔ میں نے فوری طور پر ان کا معائنہ کیا وہ معدے میں درد کی شکایت کر رہے تھے۔ مکمل معائنے کے بعد میں نے کہا، ''میں آپ کو دوائیں بھیجوں گا''۔ جناب بھٹو نے پوچھا ''کون سی دوائیں؟''۔ لہٰذا میں نے انہیں دواؤں کے نام بتا دیئے۔ انہوں نے دوبارہ پوچھا کہ کیا وہ والیوم کی گولی کھاتے رہیں جو وہ پہلے ہی استعمال کر رہے ہیں۔ میں نے کہا ''آپ لے سکتے ہیں''۔ میں نے انہیں کچھ اور دوائیں تجویز کیں جو جیل کے سپرنٹنڈنٹ کے ذریعے خریدی جا سکتی تھیں۔

جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے جناب بھٹو کو دوائیں دینے کی بجائے مجھ سے کہا کہ میں خود انہیں دوائیں دے دوں۔ لہٰذا میں نے بذاتِ خود دوائیں جناب بھٹو کے حوالے کیں اور اپنی نگرانی میں انہیں پہلی خوراک دی۔ اگلے دن بھٹو کے مشقتی نے مجھے بتایا کہ وہ اب بہتر محسوس کر رہے ہیں۔

دس دنوں کے بعد ان کے مشقتی نے مجھے پھر بتایا کہ جناب بھٹو نے مجھے بلایا ہے۔ جناب بھٹو سے ملاقات کا طریقہ یہ اپنایا گیا تھا کہ مشقتی پہلے ان کو ملنے کے لیے آنے والے کا نام بتاتا تھا۔ صرف اس

کے بعد ملاقاتی کو ملنے کی اجازت دی جاتی تھی۔جیل کا عملہ عام طور پر جناب بھٹو سے ڈرتا تھا مگر میری وہ بہت عزت کرتے تھے لہٰذا مشقتی نے میرے معاملے میں بھی ایسا ہی کیا۔ میں کوٹھری کے اندر چلا گیا۔ انہوں نے میرے لیے اپنی کرسی خالی کر دی جبکہ خود بستر پر بیٹھ گئے۔ وہ کبھی بھی میری بے عزتی نہیں کرتے تھے اور خوشی سے میرے طبی مشوروں پر عمل کرتے تھے۔ میں کبھی بھی جناب بھٹو کے پاس غیر ضروری نہیں ٹھہرتا تھا اور ان سے ملنے صرف ان کی طبی ضروریات کے پیش نظر جاتا تھا۔

اس دفعہ جب میں ان سے ملنے گیا تو انہوں نے مجھے کہا کہ کیا میں سید ہوں جب میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ اسی وقت اٹھ کر گئے اور اپنی کرسی چھوڑ دی اور مجھے اس پر بیٹھنے پر اصرار کیا۔ میں نے کہا نہیں شکریہ جناب! انہوں نے فوری طور پر دوسری کرسی منگوائی اور مجھے اس پر بیٹھنے کے لیے کہا وہ اور باتیں کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہ سوچ کر کہ کہیں ان کی کوٹھڑی کی خفیہ نگرانی نہ ہو رہی ہو میں ان کے ساتھ غیر رسمی باتوں میں مصروف نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس بناء پر میں ہمیشہ محتاط رہا۔ اس دن چینی نائب سربراہ حکومت پاکستان کا دورہ کر رہے تھے انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے آج کا اخبار پڑھا ہے۔ میں نے نفی میں جواب دیا، انہوں نے فوری طور پر اس دن کا اخبار نکالا اور مجھے جنرل ضیاء الحق کی تصویر دکھائی جو نائب سربراہ کے ساتھ کھڑے مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے طنزاً کہا ''اپنے صدر کی طرف دیکھو''، میں نے جواب دیا ''میں ایک سرکاری ملازم ہوں اور سیاست کے بارے میں کچھ نہیں جانتا''۔ اب جب کہ مزید کسی طبی مشورے کی ضرورت نہیں تھی، میں اپنے دفتر واپس چلا آیا۔

جناب بھٹو کے معدے میں رسولی کا پھوڑا تھا، جو انہیں حد سے زیادہ کافی پینے کی وجہ سے تکلیف دیتا تھا۔ وہ آٹھ کپ روزانہ پیتے اور سگار نوشی بھی کرتے تھے۔ میں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ کافی اور سگار کا استعمال کم کر دیں، کیونکہ وہ ان کی صحت کے لے مضر ہیں۔ لیکن انھوں نے اس مشورے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ ڈاکٹر اعظم کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے جو ان کے خاندانی معالج تھے۔ ڈاکٹر اعظم کے والد ان کے خاندان کے ساتھ طویل عرصہ تک سندھ میں کام کرتے رہے تھے۔ وہاں طویل عرصہ رہنے کی وجہ سے ڈاکٹر اعظم روانی سے سندھی زبان بول لیا کرتے تھے اور جناب بھٹو بھی اسی زبان میں ان سے گفتگو کرتے تھے۔

جب جناب بھٹو کی درخواست کو سپریم کورٹ میں ذاتی طور پر سننے کے لیے منظور کیا گیا تو اس کا لازمی مطالبہ ڈاکٹروں کے ایک بورڈ سے ان کا طبی معائنہ تھا۔ میڈیکل بورڈ میں میڈیکل سپرنٹنڈنٹ اکرام الحق ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال، ڈاکٹر اعظم اور میں شامل تھے۔ جناب بھٹو نے فوری طور پر خود کو طبی معائنے کے لیے پیش کرنے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر اعظم نے انہیں مشورہ دیا کہ یہ ان کے اپنے

مفاد میں ہے کہ وہ میڈیکل بورڈ سے معائنے کے لیے پیش ہو جائیں۔ پھر وہ رضامند ہو گئے۔ میڈیکل بورڈ نے انہیں صحت مند قرار دے دیا اور انہیں ذاتی طور پر سپریم کورٹ کی کارروائی میں شریک ہونے کی اجازت مل گئی۔

ایک دن جناب بھٹو نے مجھے بلایا اور کہا ''ڈاکٹر صاحب! ان دنوں جیل کی انتظامیہ مجھے زیادہ اذیتیں دے رہی ہے۔ انہوں نے کچھ لوگوں کے بارے میں تفصیلات بتائیں جو کوٹھری کی چھت پر (چھت بل دار لوہے کی چادروں سے بنی تھی) کودتے رہتے تھے اور اس پر طرہ یہ کہ دو طاقت ور بلب ساری رات جلتے رہتے ہیں جو انہیں سونے نہیں دیتے۔ اس لیے انہیں نماز پڑھنے کے لیے ذہنی سکون بھی میسر نہیں۔ انہوں نے پھر موضوع بدلا اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ ڈاکٹر کس لیے اپنا ملک چھوڑتے ہیں اور باہر جا کر ملازمت اختیار کرتے ہیں اور پھر وہیں بس جاتے ہیں؟

''جناب! دو وجوہات کی بناء پر، جب کوئی شخص ڈاکٹر بن جاتا ہے اور گھر واپس آتا ہے تو اس کا کنبہ اسے سونے کی چڑیا سمجھنے لگتا ہے۔ یہ اس کے مصداق ہے کہ جیسے ایک مرغی سونے کے انڈے دیتی ہے۔ لیکن جب مہینے کے آخر میں ڈاکٹر اپنی تنخواہ جو صرف -/950 روپے ہے، اپنے کنبے کو دیتا ہے تو وہ یہ بات ماننے سے انکار کر دیتے ہیں کہ ایک ڈاکٹر کی تنخواہ اتنی کم ہو سکتی ہے۔ لہٰذا وہ ڈاکٹر پر دغا بازی کا شبہ کرنے لگتے ہیں۔ بعض اوقات اس کی خاندانی ذمہ داریاں بہت ہوتی ہیں تو اسے بہتر مالی معاوضے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس کا معاوضہ اس کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے ناکافی ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں جب سے نچلے عارضی عملے کی ملازمت مستقل ہو گئی ہے تب سے انہوں نے احکامات کے جواب میں کام چوری کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے تمام اداروں کی انتظامیہ کو بہت شدید نقصان پہنچا ہے۔ اس قانون کی منظوری سے پہلے عملے کی کسی بھی غفلت اور قانون کی خلاف ورزی پر اسے نوکری سے نکال دیا جاتا تھا۔ خالی اسامی فوری طور پر نئے ملازم سے پر کر دی جاتی تھی۔ اب جب ہم انہیں چارج شیٹ دیتے ہیں تو وہ مارشل لاء کے ارباب اختیار کو ہمارے بارے میں لکھتے ہیں اور الزام لگاتے ہیں کہ ہم بدعنوان اور بد اخلاق ہیں۔ یہ جھوٹے الزامات ڈاکٹر کو سزا کے طور پر تبادلے کا حق دار ٹھہراتے ہیں''۔

جناب بھٹو نے میرے بیان کا دوسرا حصہ پسند نہیں کیا کیونکہ انہوں نے خود یہ طریق عمل ملک میں متعارف کروایا تھا۔

''پھر آپ کیوں بیرون ملک آباد ہونے کے لیے نہیں گئے؟''

''جناب! میری کوئی ذمہ داریاں نہیں ہیں اور آمدنی کا بڑا حصہ مجھے زمینی جائیداد سے حاصل ہو جاتا

ہے۔ میں پہلے ہی بہت زیادہ سفر کر چکا ہوں جس میں حج کے لیے سعودی عرب کا دورہ بھی شامل ہے''۔

''تم بیرون ملک ملازمت کیوں نہیں کرتے؟''

''جناب! میری دلچسپی صرف حج اور اپنے علم میں اضافے کے لیے نئی جگہوں کو دیکھنے تک محدود تھی''۔

ایک دن جب مجھے دوبارہ جناب بھٹو نے طلب کیا تو انہوں نے کہا: ''جیل کے حکام مجھے پریشان کر رہے ہیں اور انہوں نے تقریباً دس مسلح افراد میرے پاس بھیجے ہیں جو زبردستی مجھ سے میرے استعمال کی کچھ چیزیں لے گئے ہیں''۔

ہر کوئی جناب بھٹو کی عزت کرتا تھا اور کوئی ان کے حوالے سے حد سے بڑھنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ اس بناء پر مسلح افراد کی ان کے ذاتی استعمال کی چیزیں زبردستی چھین کر لے جانے کی بات سچ نہیں تھی۔

جناب بھٹو کو روزانہ برآمدے میں ایک گھنٹہ چہل قدمی کی اجازت تھی۔ وہ اکثر زیادہ وقت کرسی پر بیٹھنے کو ترجیح دیتے تھے۔ وہ محافظوں کو ساتھ دکھائی دینا پسند نہیں کرتے تھے اس بناء پر وہ ان سے دور ہی رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ محافظ بھی ان کے احساسات کا احترام کرتے تھے۔ جب بھی انہیں بتایا جاتا کہ وقت ختم ہو گیا ہے وہ دوبارہ کوٹھری کی طرف چلے جاتے۔ ایک دن انہوں نے زیادہ دیر تک بیٹھنے کا فیصلہ کیا اور جب انہیں وقت کے بارے میں بتایا گیا تو وہ جیل کی انتظامیہ کے ساتھ اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکے۔ جب جیل کی انتظامیہ نے اصرار کیا تو انہوں نے اپنی کوٹھری سے باہر آنا چھوڑ دیا اور اس کے ساتھ ہی بھوک ہڑتال کر دی۔ مجھے روزانہ جناب بھٹو کا معائنہ اور وزن کرنا پڑتا۔ ان کی صحت کے بارے میں رپورٹ گورنمنٹ کو پیش ہوتی تھی۔ ایک دن جب میں صحن میں انہیں ملنے گیا تو میں نے ان کے مشقتی سے کہا کہ وہ جناب بھٹو کو یہ بتا دیں کہ میں ان کا معائنہ کرنے آیا ہوں۔ مجھے اندر بلا لیا گیا ''تم یہاں کس لیے آئے ہو ڈاکٹر؟''

''جناب! میں نے سنا ہے کہ آپ نے آج کچھ نہیں کھایا۔ کیا بات ہے؟''

''میں کوئی کمزور دل آدمی نہیں ہوں کہ بھوک ہڑتال سے مر جاؤں گا''۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے مشقتی کو بلایا اور کہا کہ وہ ان کے لیے ایک انڈا اور دو توس تیار کرے۔ جناب بھٹو نے انہیں میرے سامنے کھایا اور اصرار کیا کہ مجھے بھی ان کے ساتھ حصہ لینا چاہیے۔ ظاہر ہے میں نے نرمی سے معذرت کر دی۔

میں اس کھانے کی نگرانی بھی کیا کرتا تھا جو ان کے گھر کی طرف سے آتا تھا۔ کیونکہ یہ کھانا کسی

ملاوٹ سے پاک ہونا چاہیے تھا۔ ان کا کھانا چھ حصوں پر مشتمل ایک بڑے ٹفن کیریئر میں آتا تھا۔ یہ عام طور پر مرغ کے ایک یا دو کھانوں اور ایک سلاد پلیٹ کی ڈش پر مشتمل ہوتا تھا، سوپ کے دو تھرموس بھی کھانے کے ساتھ ہوتے تھے۔ وہ بہت کم کھاتے اور باقی کا بچا ہوا جیل کے پہریدار اور مشقتی کھا لیتے تھے۔ وہ روزانہ آٹھ کپ کافی اور ایک سگار پیتے تھے۔ میں ہمیشہ انہیں مشورہ دیتا کہ کافی اور سگار سے پرہیز کریں کیونکہ یہ ان کے معدے کے لیے اچھے نہیں۔ مگر جناب بھٹو نے ان باتوں سے متعلق میرے کسی طبی مشورے پر توجہ نہیں دی۔

جناب بھٹو سپاری اور ٹافی کھانے کے عادی تھے۔ جب ان کی بیگم نصرت بھٹو اور بیٹی بے نظیر بھٹو آخری دفعہ ان سے ملنے آئیں تو وہ کچھ چیزیں ساتھ لائی تھیں۔ بے نظیر نے ان چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے طنزاً کہا ''اس میں کچھ ڈال دو''۔

کیوں کہ میں جناب بھٹو کو دی جانے والی کھانے کی ہر چیز کو جانچتا تھا۔ اس لیے اس نے یہ طنزاً کہا۔ میں نے نرمی سے جواب دیا کہ یہ میرے فرائض منصبی کا حصہ ہے کہ میں ہر چیز کے محفوظ ہونے کو پرکھوں اس لیے انہیں اس طرح کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ جب وہ چلی گئیں تو میں اپنے گھر واپس آ گیا۔

3اپریل 1979ء کی اسی شام کو مجھے سہالہ جیل لے جایا گیا۔ مجھے مس بے نظیر کا معائنہ کرنے کے لیے کہا گیا جو پیچش میں مبتلا تھیں، میں نے فوری طور پر دوائیں تجویز کر دیں۔

3,4اپریل 1979ء کی تقریباً درمیانی شب کو پہرے دار محافظ پیدل آیا اور مجھے اپنے ساتھ جیل لے گیا۔ میرا گھر جیل سے بہت قریب تھا مجھے سیدھا جناب بھٹو کی کوٹھری میں لے جایا گیا۔ جناب بلوچ اور اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جیل میرے ساتھ تھے۔ انہوں نے کوٹھری کا دروازہ کھولا اور میں نے جناب بھٹو کو اپنے بستر پر لیٹے ہوئے دیکھا جو زمین پر پھیلایا ہوا تھا۔ میں بستر پر بیٹھ گیا اور ان کی نبض دیکھی، جناب بھٹو اٹھ بیٹھے اور بولے:

''ڈاکٹر! تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

''جناب! مجھے یہ پیغام ملا تھا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے لہٰذا میں آپ کا معائنہ کرنے یہاں چلا آیا''۔

''میں ٹھیک ہوں''۔

وہ دوبارہ اپنے بستر پر سونے چلے گئے اور خراٹے لینا شروع کر دیئے۔ میں نے ایک کرسی گھسیٹی اور بیٹھ گیا۔ جس دوران میں وہاں بیٹھا ہوا تھا جناب یار محمد، جناب بشیر خان مجسٹریٹ، جناب بلوچ اور جناب

مجید قریشی، جیل کے دونوں اسسٹنٹ سپر نٹنڈنٹ کوٹھری میں گئے۔ جناب یار محمد اپنے ساتھ سزائے موت کا پروانہ لے کر آئے تھے وہ کہنے لگے "ہم آپ سے پھانسی کے بارے میں بات کریں گے"۔ جناب مجید قریشی نے جناب بھٹو کے اوپر اوڑھا ہوا ہلکا سا لحاف ہٹا دیا۔ جناب بھٹو نے مزاحمت (73) کی اور کہا "میری بیوی روئے گی جب وہ میرے بستر کو اس حالت میں دیکھے گی"۔ جناب مجید قریشی نے کہا "مہربانی فرما کر اٹھ جائیں اور چلیں کہ آپ ایک بہادر آدمی ہیں اور اب اپنی بہادری کا مظاہرہ کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ جناب بھٹو سخت قسم کی دواؤں کے اثر میں تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ والیوم لیتے تھے۔ لہٰذا انہیں ہتھکڑیاں پہنائی گئیں اور سٹریچر پر لٹا دیا گیا اور چار پہرے دار انہیں اپنے ساتھ تختہ دار پر لے گئے۔

بارش ہوئی تھی اور تختہ دار تک جانے والا رستہ کیچڑ زدہ اور پھسلنے والا ہو چکا تھا۔ سٹریچر کو تختہ دار (پھانسی گھاٹ) کے قریب رکھا گیا تھا۔ جناب بھٹو کو ایک مرتبہ پھر یاد دلایا گیا کہ وہ بہادری کا مظاہرہ کریں، اٹھیں اور تختہ دار کی طرف چل کر جائیں۔ جناب بھٹو نے ان کے الفاظ کے مطابق عمل کیا اور اٹھے اور تختہ دار (پھانسی گھاٹ) کی طرف چل پڑے۔ تارا مسیح نے جناب بھٹو کا سر اور چہرہ کالی ٹوپی سے ڈھانپ دیا اور گردن کے اردگرد رسی باندھ دی۔ ان کے پاؤں بھی رسی کے ساتھ باندھ دیئے گئے۔ یہ 4 اپریل 1979ء صبح کے دو بجے کا وقت تھا۔ جیل کے سپر نٹنڈنٹ جناب یار محمد نے اشارہ کیا اور لیور کھینچ لیا گیا اور جناب بھٹو لکڑی کے بنے ہوئے جس تختے پر کھڑے تھے، اس سے نیچے خالی حصے میں گر گئے۔ میں تختہ دار (پھانسی گھاٹ) کے فرش کے نیچے خالی حصے میں گیا، جو دس فٹ گہرا تھا۔ ڈسپنسر نے ان کی قمیض اٹھائی اور میں نے ان کا معائنہ کیا۔ لہٰذا میں نے تصدیق کر دی کہ جناب بھٹو وفات پا چکے ہیں۔ انہیں تقریباً آدھ گھنٹہ لٹکا کر رکھا گیا جس دوران میں نے ان کا تین مرتبہ معائنہ کیا اور آخر کار ایک تصدیق نامے پر دستخط کر دیئے کہ وہ وفات پا چکے ہیں۔

تارا مسیح نے رسی نیچے کی اور پہرے داروں نے بھٹو کے جسم کو اتارا۔ پھانسی گھاٹ کے دائیں جانب اس لکڑی کے تختے کو چھپانے کے لیے پردہ لگایا گیا تھا جس پر کہ ایک دینی معلم نے جناب بھٹو کی میت کو غسل دینا تھا۔ انہیں پوری طرح تدفین کا لباس پہنایا گیا۔ کچھ لوگوں نے ان کی تصویریں بھی اتاریں۔ ان کا جسم لکڑی کے بکسے میں رکھا گیا اور بند کر دیا گیا۔ بکسے کو گاڑی میں رکھا گیا جس کے اوپر

73۔ راولپنڈی کے اخبار "پاکستان ٹائمز" نے جو ملک پر حکومت کرنے والے جرنیلوں کی ہدایات پر عمل کرتا تھا یہ رپورٹ دی کہ جناب بھٹو نے پھانسی گھاٹ پر جانے کے وقت سے پہلے تھوڑی سی مزاحمت کا مظاہرہ کیا۔ اس کے علاوہ اخبار میں مزید کوئی تفصیل نہیں دی گئی۔ (6 اپریل ڈیلی ٹیلی گراف راولپنڈی)

فوج کا ایک دستہ سوار تھا۔جیلوں کے انسپکٹر جنرل جناب نذیر اختر جیل سے باہر آئے اور اس وقت چلے گئے جب میں اپنے گھر جا رہا تھا۔زیادہ سے زیادہ بیس منٹ ہی گزرے تھے جب مجھے دوبارہ جیل بلایا گیا جہاں سے مجھے بعد میں بھی جانے کی اجازت نہیں تھی۔جناب یار محمد کو دل میں درد کی شکایت کی وجہ سے جلد جانے کی اجازت مل گئی۔باقی ماندہ لوگوں کو اس وقت اجازت ملی جب جہاز جناب بھٹو کی میت کو لے گیا اور منزل مقصود تک پہنچ گیا۔

مجید قریشی کا انٹرویو

جناب مجید قریشی نے مجھے اجازت دی کہ انہوں نے 4-3 اپریل 1979ء کی رات کو جو کچھ دیکھا، اس سے متعلق تفصیل کا اندراج کرلوں۔ یہ ان کا واقعات سے متعلق نقطہ نظر ہے:

میں نے بحیثیت اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جیل جنوری 1976ء سے اگست 1979ء تک راولپنڈی ڈسٹرکٹ جیل میں خدمات انجام دی ہیں۔ یہ مئی کے اوائل 2 یا 3 مئی 1978ء کی بات ہے جب جناب بھٹو لاہور جیل سے منتقل ہو کر اس جیل میں آئے جہاں میں تعینات ہوا تھا۔ صوبائی حکومت کے حکم پر جناب بھٹو کی سزائے موت کے قیدی کی حیثیت سے لائے۔ لاہور ہائی کورٹ نے جناب بھٹو کو سزائے موت دی تھی۔ جناب بھٹو نے اس فیصلے کے خلاف راولپنڈی میں سپریم کورٹ پاکستان میں اپیل کی تھی۔

جناب بھٹو کی کوٹھری پر ان کی حفاظت کے لیے جیل کا ایک علیحدہ گارڈ متعین کیا گیا۔ جس کا کمانڈر ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جیل تھا۔ ان کے فرائض متبادل شفٹوں کی بنیاد پر مقرر کیے گئے۔ بعض دفعہ میں خود جناب بھٹو سے ملنے والوں کے ساتھ ان کی کوٹھری تک گیا۔ کبھی کبھار میں ان کی کوٹھری میں رہتا جب تک گارڈ کی تبدیلی مکمل نہ ہو جاتی۔ جس دوران جناب بھٹو کے ملاقاتی ان سے ملتے تو میں محافظوں کے ساتھ بیٹھ جاتا اور پھر ان ملاقاتیوں کو جیل کے دروازے تک چھوڑ آتا۔

جناب بھٹو ایک مضبوط شخصیت (74) کے طور پر جانے جاتے تھے، جو آخر تک برقرار رہی۔ وہ اپنے

74۔ اپریل 1972ء میں اوریانہ فلاسی نے جناب ذوالفقار علی بھٹو کا انٹرویو کیا۔ اس کا یہ انٹرویو بنگلہ دیش کے اخبار میں شائع ہوا۔ وہ ان کے بارے میں کچھ اس طرح بیان کرتی ہے: ''وہ شخص غیر یقینی اور اپنے جنون اور عجیب فیصلوں کے ساتھ اپنی دھن میں مگن انتہائی ذہین نظر آتا۔ اس میں چالاکی سے بھرپور ذہانت تھی۔ لومڑی کی طرح دوسروں کو تذبذب اور مخمصے میں ڈالنے والا انداز جب کہ ساتھ ہی تہذیب و اخلاق سے آراستہ باصلاحیت انسان نظر آتے۔ وہ لمبے قد اور تندرست جسم کے مالک تھے۔ جب کہ ان کی ٹانگیں پتلی ہونے کی وجہ سے مضبوط نظر آتیں اور ان کے پاؤں بہت نازک تھے وہ ایک بینکر کی طرح (بقیہ آگے)

طرز فکر کے حوالے سے جارحانہ تھے۔ بعض دفعہ وہ بطور قاتل مجرم قرار پانے کی وجہ سے بے چینی کا مظاہرہ کرتے۔ وہ جیل میں رہتے ہوئے بہت زیادہ مطالعہ کرتے تھے۔ وہ بہت ذہین اور زیرک تھے۔ وہ پولیس اور فوج سے نفرت کرتے تھے۔ وہ اکثر بڑی تعداد میں ہونے والے جنرلز کے قتل کا حوالہ دیا کرتے تھے اور پھر کہا کرتے کہ بہت جلد ایسا ہی واقعہ پاکستان میں بھی ہونے والا ہے۔ وہ بہت مستعد تھے (75) اور خود کو علمی سرگرمیوں، مطالعہ اور لکھنے میں مصروف رکھتے تھے۔ وہ گرم مزاج تھے اور چھوٹی چھوٹی بات پر بھی بہت ناراض ہو جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ان کی بیٹی بے نظیر، مقررہ وقت پر وہاں نہیں پہنچی۔ اصولوں کے مطابق بے نظیر اور بیگم بھٹو کو ہفتے میں ایک دفعہ لیکن مختلف دنوں

(بقیہ صفحہ گزشتہ) نظر آتے تھے۔ وہ اپنی اصلی عمر سے چالیس برس بڑے نظر آتے تھے اور وہ گنجے ہو رہے تھے۔ جو بال بچے تھے وہ سفیدی مائل تھے۔ ان کی گھنی بھنوؤں کی وجہ سے ان کا چہرہ، رخسار، ہونٹ اور پپوٹے بھاری نظر آتے تھے۔ ایک پراسرار اداسی ان کی آنکھوں میں نظر آتی تھی۔ ان کی مسکراہٹ میں جھجک تھی اور وہ بہت سے دوسرے طاقتور رہنماؤں کی طرح اپنی جھجک کی وجہ سے کمزور نظر آتے تھے۔ آپ جتنا زیادہ ان کو پرکھتے جاتے اتنا ہی آپ بے یقینی اور تذبذب کا شکار ہوتے جاتے۔ ایک منشور کی طرح ہر مرتبہ آپ کو ان کا ایک مختلف چہرہ نظر آتا۔ اس لمحے جو بھی رائے ان کے بارے میں ہوتی وہ اس سے الگ نظر آتے اور یوں اگر آپ ان کی شخصیت کا یقین کسی بھی وقت کسی بھی انداز میں کرتے تو وہ بالکل صحیح محسوس ہوتا جیسے کہ روشن خیالی، حاکمانہ فاشسٹ، کمیونسٹ اور دروغ گو وغیرہ۔ وہ بلا شبہ ہمارے وقت کے سب سے زیادہ پیچیدہ رہنماؤں میں سے ایک اور اپنے ملک کے اب تک پیدا ہونے والے ایسے واحد رہنما ہیں۔ ان کا ارادہ اپنی جان بچانے کے لیے نہ تو ہتھیار ڈالنے کا ہے اور نہ مزاحمت کرنے کا۔ وہ طاقت (اقتدار) کو پسند کرتے ہیں۔

75۔ الف۔ ان کو اس بات کا بھی خوف تھا کہ اگر جناب بھٹو دوبارہ اقتدار میں آ گئے تو وہ آئین کی دفعہ 6 کے تحت مارشل لاء کے نفاذ میں ملوث جرنیلوں کے خلاف قانونی کارروائی شروع کر دیں گے۔ اس دفعہ کے مطابق آئین کو منسوخ کرنا یا پھر طاقت کے ذریعے یا کسی اور ذریعے سے منسوخ کرنے کی کوشش کرنا ملک سے غداری کرنے کے مترادف ہے۔ (ذوالفقار علی بھٹو: بچپن سے تختہ دار تک از سلمان تاثیر صفحہ 204 اردو میں)

ب۔ جناب بھٹو عدالت میں پیش ہوئے تو وہ ابھی تک وزیراعظم والے شاہانہ انداز کا مظاہرہ کر رہے تھے وہ بالکل انجان تھے۔ وہ سرعام جرنیلوں کو برا بھلا کہتے اور ان پر غداری کا الزام لگاتے۔ انہوں نے بدلہ لینے کی قسم اٹھائی اور عہد کیا کہ جب وہ دوبارہ اقتدار میں آئیں گے تو ان سے پورا حساب لیں گے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہاں مائیکروفون لگا ہوا ہے۔ جرنیل ان کے ارادوں کا اندازہ لگا رہے تھے۔ انہوں نے جب ٹیپ دوبارہ سنی ہو گی تو وہ خوفزدہ ہو گئے ہوں گے ان کا بھٹو کو طبعی طور پر ختم کر دینے کا ارادہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پختہ ہوا۔ (مائی فیوڈل لارڈ تہمینہ درانی، صفحہ 238)

ج۔ جناب بھٹو بالکونی میں آئے۔ وہ خود کو محفوظ محسوس کر رہے تھے۔ اتنے بلند جتنی کہ ہمالیہ کی چوٹی۔ جرنیل بونوں کی طرح تھے۔ انہوں نے جاندار تقریر کی: ''جرنیل ضیاء نے غداری کی ہے۔ اس نے آئین کو نقصان پہنچایا ہے۔ پاکستانی عوام اس غدار کو نہیں چھوڑیں گے۔ فوج کو کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ عوام کے نمائندوں کو ہٹا کر اور وزیراعظم کو تحویل میں لے کر حکومت پر غاصبانہ قبضہ کر لے۔ یہ بے انتہا خوشی بہت جلد ہوا ہو جائے گی''۔ ٹینک اور بندوقیں عوامی خواہشات کی نسبت زیادہ مؤثر ثابت ہوئیں۔ (مائی فیوڈل لارڈ از تہمینہ درانی، صفحہ 242,243)

میں ملنے کی اجازت تھی۔ اس دن بیٹی کو نہ ملنے کی وجہ سے وہ غصے میں آگئے اور مجھ پر اور جیل سپرنٹنڈنٹ پر خوفناک نتائج کی دھمکی دیتے ہوئے چلانے لگے کہ اگر انہیں پتہ چلے کہ ان کی بیٹی حکام کی بدانتظامی کی وجہ سے ان سے نہ مل سکی تو وہ کیا کریں گے۔ لیکن اس دن بےنظیر خود تین گھنٹے لیٹ پہنچی اور جب وہ آئیں تو غصہ ختم ہو چکا تھا۔

جناب بھٹو عام طور پر دن میں تین چار گھنٹے سوتے تھے۔ وہ اپنے اندر پڑھتے رہنے کی بڑی قوت رکھتے تھے۔ وہ عام طور پر خود کو لکھنے میں مصروف رکھتے۔ وہ کبھی یہ ظاہر نہ کرتے کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں۔ مگر میرے خیال میں وہ سپریم کورٹ میں اپنی سزائے موت کے حکم کے خلاف قانونی کارروائی کے بارے میں لکھتے تھے۔

عام طور پر وہ تقریباً صبح آٹھ بجے اٹھ جاتے تھے اور شیو کرنے، نہانے اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد کافی کا ایک کپ مانگتے تھے۔ انہیں مشقتی دیا گیا تھا جو ان کے لیے ناشتہ، چائے اور کافی بناتا تھا۔ ناشتے کے بعد وہ کرسی پر بیٹھ جاتے اور کتابیں اور رسائل پڑھنا شروع کر دیتے تھے۔ انہیں اپنے خاندان کے ذریعے ان چیزوں کو حاصل کرنے کی اجازت تھی۔ وہ سگار پینا پسند کرتے تھے۔ کبھی کبھار وہ مور برانڈ کا سگریٹ بھی پیتے تھے۔ وہ بہت کم خوراک کھاتے تھے۔ ناشتے کے علاوہ ان کا کھانا گھر سے آتا، جو ایک پتلی سی چپاتی اور تھوڑے سے سالن پر مشتمل ہوتا جس سے فالتو گھی نکال لیا جاتا۔ وہ قیمے میں پکی پھلیاں، آلو یا مٹر پسند کرتے تھے۔ وہ میٹھا کھاتے تھے لیکن بڑی تھوڑی مقدار میں کبھی کبھار وہ رات کا کھانا نہیں کھاتے تھے اور صرف کافی یا چائے پر گزارا کرتے تھے۔ وہ پیپسی کولا یا سیون اپ بھی پیتے تھے۔ آٹھ بوتلوں کا ذخیرہ، چار پیپسی چار سیون اپ ہمیشہ ان کے باورچی خانے میں پڑے فریج میں رکھا رہتا جو انہیں حکومت کی طرف سے فراہم کیا گیا تھا۔ ایک دن جناب بھٹو نے اپنے مشقتی سے کہا کہ وہ اس کے لیے سوڈا لائے۔ مشقتی نے اس کے لیے فریج میں دیکھا مگر اسے ایک بھی (بوتل) نہ مل سکی۔ جناب بھٹو نے اس سے کہا کہ وہ اس ضرورت کے بارے میں انچارج کو بتائے۔ جب پیغام مجھ تک پہنچا تو میں نے محافظ سے کہا کہ وہ جناب بھٹو سے پوچھے کہ انہیں کس طرح کا سوڈا چاہیے۔ مشقتی نے جناب بھٹو سے پوچھا، جس کے بعد وہ غضبناک ہو گئے اور جیل انتظامیہ کے خلاف اونچی آواز میں چلانا شروع کر دیا۔

انہوں نے مطالبہ کیا کہ سپرنٹنڈنٹ جیل یار محمد کو فوری بلایا جائے۔ انہوں نے جو کہا تھا وہ نہیں جانتے تھے کہ کیا ہوا ہے۔ جناب بھٹو یار محمد پر چلائے اور کہا ''یہ کیا مصیبت ہے کہ آپ سوچ رہے ہیں کہ میں سوڈا کیوں مانگ رہا ہوں۔ میرے معدے میں درد ہے اور میں سادا سوڈا چاہتا ہوں۔ کیا آپ کا خیال

ہے کہ میں اسے شراب کے ساتھ پینا چاہتا ہوں'' یار محمد اپنے دفتر واپس آئے اور مجھے کہا کہ بازار سے سوڈا منگوا کر جناب بھٹو کو کیوں نہیں دیا گیا۔ میں نے جواب دیا چونکہ جناب بھٹو معدے میں معمولی سے درد کی شکایت کر رہے تھے، میں نے تو محض پوچھا تھا کہ انہیں کس طرح کے سوڈے کی ضرورت ہے۔ میرا مطلب ہرگز ان کے ساتھ حد سے بڑھنا نہیں تھا۔ میں اس کے بعد جناب بھٹو کے پاس گیا اور انہیں اپنی صفائی دی۔ جناب بھٹو نے اطمینان محسوس کیا، مجھے گلے لگایا اور میری پیشانی چوم لی۔

جناب بھٹو بعض اوقات چار کوٹھریوں کے کناروں کے درمیان برآمدے میں چہل قدمی کیا کرتے تھے جو ان کے استعمال کے لیے چھوڑا گیا تھا لیکن وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہاں کسی محافظ کے ساتھ جائیں۔ احترام کے طور پر محافظ ساتھ اپنے خیمے میں چلا جاتا یا دیوار کے پیچھے جگہ میں چلتا رہتا۔ تھوڑی سی چہل قدمی کے بعد جناب بھٹو اپنی کوٹھری میں واپس چلے جاتے تھے۔

جناب بھٹو اپنے مشقتی کے لیے بہت زیادہ شفقت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ اسے اپنے ساتھ کھانے کے لیے کہتے اور کبھی اس کی شکایت نہیں کرتے۔ وہ اسے صرف اسی وقت بلاتے جب اس کی ضرورت ہوتی۔

ان سے باقاعدگی سے ملنے والوں میں ان کے تین وکیل جناب جی ایم اعوان جناب غلام نبی میمن اور جناب یحییٰ بختیار شامل تھے۔ وہ انہیں روزانہ 5 سے 6 بجے شام ملنے آتے تھے وہ سپریم کورٹ کی التوا میں پڑی ہوئی قانونی کارروائی کے متعلق ان سے گفتگو کرتے اور ان (76) پر جناب بھٹو سے

76۔ جناب بھٹو کو بلاشبہ عام طور پر قانونی معاملات میں اپنے قانونی مشیروں سے زیادہ علم تھا۔ دلیپ مکر جی کی کتاب زیڈ۔اے اے بھٹو۔ کوئسٹ فار پاور (Z.A. Bhutto : Quest for Power) میں مصنف ٹھوس انداز میں یہ تصدیق کرتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ جناب بھٹو 5 جنوری 1928ء کو لاڑکانہ میں پیدا ہوئے اور اپنی ابتدائی تعلیم لاڑکانہ میں حاصل کی اور پھر بہت کم عمری میں اپنے والد کے ہمراہ بمبئی (انڈیا) چلے گئے۔ انہوں نے کیتھڈرل اور جان کینن سکول میں داخلہ لیا اور وہاں سے دوسری دفعہ کی شمولیت سے سینئر کیمبرج کا امتحان پاس کیا۔ سکول میں نوجوان بھٹو جناح کو اپنے ہیرو کے طور پر پوجتے تھے۔

ستمبر 1947ء کو بھٹو صاحب بیرون ملک کیلیفورنیا کی یونیورسٹی برکلے تعلیم کے حصول کے لیے روانہ ہوئے جہاں سے انہوں نے سیاسیات میں اعزاز کے ساتھ گریجویشن کی۔ پھر آپ کرائسٹ چرچ آکسفورڈ روانہ ہو گئے وہاں سے 1952ء میں علم قانون میں ایم اے کی ڈگری امتیازی حیثیت کے ساتھ حاصل کی۔ اگلے سال وہ لندن میں لنکن ان بار (مخصوص عدالت) کے ساتھ منسلک ہو گئے۔

1953ء میں بھٹو صاحب کراچی واپس گئے اور سندھ مسلم کالج میں دستوری قانون کی تعلیم دینے لگے اور ہائیکورٹ میں قانون کی پریکٹس شروع کی۔ ان کی عوامی مقرر کے طور پر اہلیت نے وزیر اعظم حسین شہید سہروردی کو متوجہ کیا تو انہوں نے بھٹو صاحب کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔

ہدایات لیتے تھے۔

دیگر باقاعدہ ملاقات کرنے والوں میں ان کی بیوی بیگم نصرت بھٹو اور بیٹی بے نظیر بھٹو شامل تھیں۔ انہیں الگ الگ دنوں میں ہفتے میں ایک دن ملنے کی اجازت تھی۔ ملاقاتیوں کو اکثر مقررہ وقت سے زیادہ ٹھہرنے کی اجازت مل جاتی تھی۔ اصولوں پر عمل درآمد کرتے ہوئے ہمیشہ انسانی پہلو کو مدنظر رکھا جاتا۔

ایک دفعہ جناب بھٹو کی پہلی بیوی مسز امیر بیگم انہیں ملنے کے لیے آئیں۔ وہ آئیں اور جناب بھٹو کے قدموں میں بیٹھ گئیں، جو اپنے بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ امیر بیگم جتنی دیر اپنے شوہر کے ساتھ رہیں، تمام وقت روتی رہیں۔ بھٹو صاحب ان کو تسلی دیتے رہے کہ ہر چیز ٹھیک ہو جائے گی اور وہ یہاں امریکہ اور روس کی بنی ہوئی سازش کا شکار ہو کر آئے ہیں وہ وہاں ایک گھنٹہ ٹھہریں اور انہوں نے برقع نہیں اتارا۔ امیر بیگم جناب بھٹو سے تقریباً 13 سال بڑی تھیں۔ جناب بھٹو کی جب ان سے شادی ہوئی تو وہ صرف 13 برس کے تھے۔ یہ سب ان کی (77) خاندانی رسوم اور روایات کو برقرار رکھنے کے لیے ہوا، جہاں شادی خاندان کے اندر ہی انجام پاتی ہے۔

یہ تین اپریل 1979ء کی بات ہے، تقریباً سہ پہر تین بجے بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو آخری بار ان سے ملنے کے لیے آئیں۔ جیلوں کا انسپکٹر جنرل ان کے لیے موت کا پروانہ لے کر آیا۔ تمام انتظامات مکمل نظر آتے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ ان کی بیوی اور بیٹی سے آخری ملاقات ہے۔ تاہم ان کے آنے سے پہلے میں نے لکڑی کا ایک تختہ داخلہ گیٹ کے قریب رکھا ہوا دیکھا تھا۔ ابھی تک کچھ وجوہات کی بناء پر میرے ذہن میں شک پیدا ہوا۔ اس دن جب میں جناب بھٹو کے محافظ کے ساتھ

77۔ الف۔ غلام مرتضیٰ بھٹو (بھٹو کے بیٹے) نے کہا کہ ہمارے دادا جان سر شاہنواز نے پہلی مرتبہ جاگیردارانہ روایت سے انحراف کیا جس پر تمام معاشرہ عمل پیرا تھا۔ اس دور تک بھٹو خاندان کے لوگ اپنے خاندان میں ہی شادیاں کیا کرتے تھے۔ مثلاً فرسٹ کزن اور ممکن ہو تو سیکنڈ کزن کے ہمراہ ہی شادیاں ہوتیں۔ اسلام نے چونکہ عورت کو جائیداد کی وراثت میں حصے کا حق قرار دیا ہے۔ لہٰذا صرف شادی کے ذریعے ہی زمین جائیداد خاندان میں رکھی جاسکتی تھی اس قسم کی کاروباری شادی میرے والد (بھٹو صاحب) اور ان کی کزن امیر بیگم کے مابین ہوئی جب ان کی عمر بارہ تیرہ سال اور امیر بیگم کی عمر ان سے بارہ تیرہ سال زیادہ تھی۔ وہ (بھٹو صاحب) اس پر مزاحمت کرتے رہے جب تک کہ ہمارے دادا جان نے انہیں ایک کرکٹ بیٹ دا ا نے کی پیشکش نہ کر دی۔ شادی کے بعد امیر بیگم واپس اپنے خاندان کے ساتھ رہنے کے لیے چلی گئیں اور میرے والد واپس اپنے سکول چلے گئے۔ زبردستی کی خاندانی شادی کی وجہ سے اس انصاف کا دائمی اثر خاص طور پر خاتون پر زیادہ ہوا۔

ب۔ میری والدہ نے 1957ء میں شادی کی۔ (اسلام ایک آدمی کو چار بیویاں رکھنے کی اجازت دیتا ہے اگر وہ سب کے ساتھ مساوی سلوک کر سکے (ڈاٹر آف دی ایسٹ از بے نظیر بھٹو صفحہ 32)

فرائض منصبی انجام دے رہا تھا دونوں خواتین کو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل خواجہ غلام رسول، جناب بھٹو کے پاس لے کر گئے۔ ان کو جب پتا چلا کہ یہ ان کی جناب بھٹو سے آخری ملاقات ہے تو انہوں نے اس کی تصدیق کے لیے جناب بھٹو سے پوچھا۔ جواب میں انہوں نے یار محمد سے کہا کہ اس کی تصدیق کریں۔ جناب یار محمد نے کہا یہ سچ ہے۔ خواتین بہت پریشان تھیں اور وہ اس وقت تک روتی رہیں جب تک کہ وہ تقریباً 5-15 بجے وہاں سے رخصت نہیں ہوئیں۔ جیل سپرنٹنڈنٹ نے انہیں وہاں لامحدود وقت تک ٹھہرنے کی اجازت دے دی تھی۔ بیگم بھٹو کا اصرار تھا کہ انہیں صدر سے ملنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن سلسلہ واقعات کے اس مرحلے پر ان کی درخواست پر عمل کے لیے بڑی دیر ہو چکی تھی۔ پہلی بار میں نے دیکھا کہ جناب بھٹو پریشان تھے۔ وہ ایک شکستہ آدمی لگے۔ ان کی جماعت کے وفادار ساتھیوں نے انہیں اس بات کی اجازت نہیں دی تھی کہ وہ رحم کے لیے کہیں یا درخواست دیں۔ وہ مسلسل بھٹو کو یقین دلاتے تھے کہ ان کی زندگی کو پہنچنے والے کسی بھی نقصان کے نتیجے میں سارا آسمان سرخ ہو جائے گا اور ہمالیہ کی چوٹیوں سے برف پگھل جائے گی لیکن کافی یقین دہانی کے باوجود وہاں کوئی احتجاج، کوئی جلوس اور آتش زنی کا کوئی واقعہ نہیں ہوا جو آسمان کو سرخ کر دیتا اور ہمالیہ کی برف کو پگھلا دیتا (78)۔

جناب بھٹو لکھتے اور پھر اپنے تحریری دستے سے کاغذ پھاڑ دیتے۔ انہوں نے کبھی اپنی وصیت نہیں لکھی۔ انہوں نے ایک سگار پیا۔ یہ لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اچانک کمزور ہو گئے ہیں وہ کانپ رہے تھے اور یقینی طور پر ساٹھ اور ستر کی دہائی کے بھٹو نہیں لگ رہے تھے۔

تقریباً دس بجے میں جناب بھٹو کے پاس گیا اور انہیں غسل کرنے کا مشورہ دیا۔ یہ پیشکش سزائے موت کے ہر قیدی کو پھانسی دینے سے قبل کی جاتی ہے۔ میں ہمیشہ اپنی چابیوں کا گچھا ہلاتا ہوا جناب بھٹو کی کوٹھری میں داخل ہوتا جو بالواسطہ میرے پہنچنے کا اعلان ہوتا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جناب بھٹو گہری نیند میں خراٹے لے رہے ہیں ان کا سر اور منہ کمبل میں چھپے ہوئے تھے۔ ان کی کوٹھری میں روشنی جل رہی تھی۔ میں نے کوٹھری کا لوہے کا دروازہ کھولا اور کہا ''جناب!''۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور اسی انداز میں سیدھے لیٹے رہے۔ میں نے فوری طور پر ڈاکٹر اصغر کو بلایا میں نے نرمی سے

78۔ میں راحت لطیف، جناب سعید مہدی، جناب جہاں زیب برکی اور راجہ محمود کے ساتھ جیل کے باہر ہی رہ گیا تا کہ اس بات کو یقینی بنایا جا سکے کہ جب جیل کے اندر ''موت کا پروانہ'' پہنچایا جا رہا تھا تو کسی نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش نہیں کی۔ ہمارے لیے بھٹو کے کیس کے سلسلے میں مصروفیت کے وہ طویل ترین گھنٹے تھے۔ جب کہ یقینی طور پر بھٹو اور ان کے خاندان کے لیے وقت اڑتا جا رہا تھا۔

ان کی ٹانگوں کے نچلے حصے کو چھوا اور آہستگی سے ہلایا انہوں نے اپنی آنکھیں کھول دیں جو سرخ لگ رہی تھیں۔ انہوں نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا ''یہ کیا ہے''؟

میں نے کہا ''جناب! کیا آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسی دوران ڈاکٹر آیا اور ان کا معائنہ کیا۔ اسے تمام طبی علامات ٹھیک لگیں لہٰذا انہیں صحت مند قرار دے دیا گیا۔ تاہم انہوں نے یہ شبہ ظاہر کیا کہ جناب بھٹو نے کوئی طاقت ور خواب آور دوائی لے رکھی ہے جس کی وجہ سے وہ غنودگی کی حالت میں ہیں۔ یہی بات لگ رہی تھی کیونکہ قریب ہی آدھا پیا ہوا پانی کا ایک گلاس بھی پڑا تھا۔ میں ان کے بستر کے قریب ہی بیٹھ گیا اور نرمی اور شائستگی سے انہیں بتایا کہ وہ اپنی موت کے قریب ہیں اور یہ ان کی اس دنیا میں آخری رات ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ ہمیشہ کہتے رہے ہیں کہ آپ (جناب بھٹو) بغیر کسی انسان کے سامنے جھکے ایک بہادر آدمی کی طرح موت کا سامنا کریں گے۔ یہ آنے والی نسلوں کو یاد رہے گا کہ بھٹو موت سے کبھی نہیں ڈرے اور انہوں نے اصولوں پر کبھی سودا نہیں کیا۔

جناب بھٹو ہمیشہ میری باتیں غور سے سنتے رہتے تھے اس لیے میں انہیں وہ باتیں یاد دلاتا رہا کہ وہ پہلے موت آنے کے بارے میں کیا کہا کرتے تھے۔ جناب بھٹو کو یقین نہیں آیا کہ وہ اس رات کسی بھی وقت مرنے والے ہیں۔ اس کی وجہ وہ غلط یقین دہانیاں تھیں جو ان کی جماعت کے رہنما انہیں کروا رہے تھے۔ جناب بھٹو نے میری باتیں سنتے ہوئے خود کو سیدھا کیا اور سر اوپر اٹھایا۔ میں نے کہا کہ جناب: ہر جاندار شخص کو ایک دن موت کا ذائقہ چکھنا ہے بدقسمتی سے آپ کے معاملے میں موت کا طریقہ عمل اچھا نہیں ہے۔ لیکن اب یہ آپ کا مقدر ہے کہ آپ کو اسے اس طرح دیکھنا پڑ رہا ہے۔ لہٰذا مہربانی فرما کر اٹھیں اور آنے والی نسلوں کے لیے مثال قائم کریں۔

میں نے کہا ''جناب! مہربانی فرما کر غسل کر لیں''۔ یہ کہہ کر میں ان کی کوٹھری سے نکل گیا۔ وہ اپنی آنکھیں کھولتے اور بند کرتے رہے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ غسل خانے کی طرف کوئی حرکات وسکنات نہیں ہو رہی ہیں میں دوبارہ ان کی کوٹھری کی طرف گیا اور انہیں سویا ہوا پایا۔ جب میں نے نرمی سے ان کی ٹانگوں کے نچلے حصے کو دبایا تو وہ اٹھ بیٹھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کے لیے مجھے کوئی پیغام دینا چاہتے ہیں جواب میں انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا وہ اس سے ملی ہیں، وہ بیگم بھٹو کا صدر ضیاء الحق سے ملنے کی کوشش کا حوالہ دے رہے تھے، یہ ان کی چند گھنٹے پہلے ہونے والی ملاقات کے دوران آپس میں طے پایا تھا کہ بیگم بھٹو صدر سے رحم کی درخواست کریں۔ اس کے نتیجے کے طور پر بیگم نصرت بھٹو نے صدر کو ایک خط لکھا تھا جس میں انہوں نے شوہر کے لیے رحم کی درخواست

کی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ کیا صورت حال ہے اور میں نے جواب دیا ''نہیں وہ صدر ضیاء الحق سے نہیں ملیں۔ انہوں نے دوبارہ پوچھا کہ کیا آپ کو یقین ہے؟'

میں نے کہا ''یقینی جناب!'' میں نے دوبارہ انہیں درخواست کی کہ وہ اپنے خاندان کے نام پیغام لکھوا دیں، انہوں نے کہا کہ وہ دو صفحات لکھ چکے تھے لیکن پھر اسے پھاڑ دیئے اور جلا دینے کا فیصلہ کیا۔ اس بات کا ثبوت اس سے ظاہر ہو رہا تھا جو ایک جلے ہوئے سگار کے ساتھ ان کی کوٹھری میں پڑا تھا۔ انہوں نے اردو میں کہا ''وہ اب کتابوں میں لکھی جائے گی''۔

ان کی پھانسی کا وقت قریب آ رہا تھا اور جناب بھٹو نے ابھی تک اپنا بستر نہیں چھوڑا تھا۔ یہ خبر سپرنٹنڈنٹ جیل کو پہنچا دی گئی تھی جو اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا یہ بڑی پریشانی کے لمحات تھے۔ مقررہ وقت کے مطابق پھانسی کا حکم نامہ جاری ہو چکا تھا جو 4 اپریل 1979ء بوقت 2 بجے صبح کا وقت تھا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل کے ہمراہ ڈاکٹر اصغر ڈیوٹی پر موجود مجسٹریٹ جناب بشیر، لیفٹیننٹ کرنل رفیع کمانڈنگ آفیسر 27ویں پنجاب رجمنٹ اندر آئے۔ میں فرش پر بیٹھا جناب بھٹو کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ غسل کر لیں۔ وہ غنودگی میں تھے اور یقینی طور پر سکون آور ادویات کے اثر میں تھے۔ جناب یار محمد نے بھی درخواست کی کہ اٹھیں اور غسل کر لیں جناب بھٹو نے کہا کہ انہیں غسل کرنے نہیں جانا۔

میں نے بات کاٹی اور کہا ''جناب! کم از کم منہ تو دھو لیں، کیونکہ بے نظیر بھٹو کی یہ خواہش تھی کہ اگر آپ کو پھانسی ہو تو آپ تر و تازہ لگیں۔ جناب بھٹو نے فوری طور پر پلٹ کر جواب دیا ''کیا میں تر و تازہ نہیں لگ رہا''۔

لیفٹیننٹ کرنل رفیع نے بھی انہیں سلام کیا اور ان سے پوچھا کہ وہ کیسے ہیں؟ جناب بھٹو نے کہا کہ وہ ٹھیک ہیں۔ جناب بھٹو نے کافی طلب کی اصولی طور پر سزائے موت کے قیدی کو پھانسی سے پہلے کچھ نہیں دیا جاتا۔ اس کے علاوہ کافی بنانے اور پینے کے لیے اتنا زیادہ وقت میسر نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا جناب یار محمد نے پنجابی میں کہا ''چلو جناب؟ چلو (آئیں جناب! چلیں)

جناب بھٹو نے اردو میں جواب دیا ''ایسے تو نہیں جاؤں گا''۔

جناب یار محمد نے پنجابی میں دوبارہ جواب دیا ''فیر کیویں جاؤ گے؟ (پھر کیسے جائیں گے)

جناب بھٹو نے کہا ''پھر آپ کو مجھ پر بھرپور وار کرنا ہوگا''۔

اوہ کیہہ کرنا، جناب! چلو (بحث میں الجھنے کی کیا ضرورت ہے، جناب آئیں چلیں)

خواجہ غلام رسول، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل نے کہا ''بارش ہوئی اے چکڑ زیادہ اے سٹریچر تے چلو (بارش ہونے کی وجہ سے تمام راستے کیچڑ زدہ ہیں اس لیے ہم آپ کو سٹریچر پر لے کر جا رہے ہیں)

جناب بھٹو نے کہا ''چل کے جاؤں گا''۔
یار محمد نے کہا ''پھر چلو''۔
جناب بھٹو اٹھ نہیں سکے۔ مجھے وہ پوری طرح سے متزلزل لگے اور ان کی ٹانگیں کانپنا شروع ہو گئیں۔ انہیں سٹریچر پر لٹایا گیا اور چار پہرے دار انہیں لے گئے۔ میں نے ان کی ذاتی چیزوں کی حفاظت کے خیال سے فوراً تمام کوٹھریوں کو تالا لگا دیا پھر اسی طرح میں جناب بھٹو کو سٹریچر پر لے جانے والے لوگوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔ وہ دائیں بائیں دیکھ رہے تھے، انہوں نے مضمحل ہو کر کمزور آواز میں کہا ''یہ دکھ کی بات ہے کہ نصرت اکیلی رہ جائیں گی''۔ سٹریچر تختہ دار کی سطح پر رکھ دیا گیا جناب بھٹو کو اس کے پاس لے جانے میں دس منٹ لگے۔

تمام متعلقہ لوگ وہاں موجود تھے۔ تارا مسیح اپنے بھتیجے صادق مسیح کے ساتھ تختہ دار کے قریب کھڑا تھا۔ علاقے کو روشن کرنے کے لیے پیٹرومیکس کے گیسی لیمپ جلائے گئے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ بھٹو چل کر پھانسی گھاٹ تک جائیں اور موت کا سامنا ایک بہادر رہنما کی طرح کریں۔ لہٰذا میں نے بہت ہی محبت اور ہمدردی کے ساتھ ان کے کانوں کے پاس منہ لے جاتے ہوئے انہیں یاد دلایا کہ آپ ہمارے ملک کے سب سے کامیاب وزیر خارجہ، صدر اور وزیراعظم رہے ہیں اور ان تمام میں سے ہر ایک عہدے پر آپ کی بہادری کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ جیل میں قید کے دوران آپ نے ہمیشہ کہا ''کہ اگر مجھے پھانسی ہوئی تو میں رسی کو چوم کر گلے میں ڈالوں گا تاکہ آنے والی نسلیں یاد رکھیں کہ بھٹو نے کس طرح جان دی۔ جناب! تاریخ لکھی جا رہی ہے اور آپ اپنے لیے اس کے صفحات میں جگہ بنائیں۔ لہٰذا کھڑے ہو جائیں اور رسی کو خود اپنی گردن کے گرد ڈال لیں۔ جناب بھٹو میری ان چند باتوں سے متاثر ہو گئے انہوں نے جھرجھری لی اور سٹریچر سے اٹھ کر اپنے قدموں پر کھڑے ہو گئے۔ جیل کے قوانین کے مطابق ہتھکڑیاں نہیں اتاری (79) گئی تھیں۔ وہ ایک بہادر رہنما کی طرح مکمل بیدار (80) اور کھڑے ہو کر تختہ دار تک جا کر سفید نشان پر کھڑے ہو گئے۔ جب وہ تختہ دار کی طرف جا رہے تھے

79۔ مجرم کو سٹریچر پر لٹانے سے پہلے ہتھکڑیاں لگائی جاتی ہیں جب وہ تختہ دار پر پہنچتا ہے تو ایک ہاتھ میں ہتھکڑی دوبارہ لگا دی جاتی ہے۔

80۔ جناب بھٹو کو جب پھانسی دی گئی تو میں موجود تھا۔ میں جناب بھٹو کو ان کی کوٹھری سے سٹریچر پر تختہ دار تک لے کر گیا۔ میری موجودگی میں انہوں نے یہ نہیں کہا کہ وہ مجرم نہیں ہیں اور اللہ ان کی مدد کرے گا۔ چار افراد سٹریچر لے کر گئے۔ میرے علاوہ جو دوسرے افراد سٹریچر لے کر گئے وہ فیض اللہ، شبیر حسین اور ایک فوج کا حوالدار تھا۔ جناب بھٹو خود چل کر پختہ دار تک گئے۔ (ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی کے جیل نگران سرفراز کے بیٹے زوار حسین کا بیان۔ راولپنڈی سیشن جج کی عدالت میں 20.11.79 کو اردو میں پرائیویٹ استغاثہ نمبر 1982-1979/36 دائر کی گئی۔

میں نے اپنا دایاں ہاتھ ان کے بائیں کندھے پر رکھا ہوا تھا۔ تارا مسیح نے ان کے پاؤں باندھ دیئے اور سر پر کالی ٹوپی پہنا دی۔ جس سے ان کا چہرہ ڈھانپا گیا جب انہیں ٹوپی پہنائی جا رہی تھی وہ مجھ سے مخاطب ہوئے اور کہا ''قریشی صاحب! اسے ہٹا دو''۔

جناب بھٹو اپنا چہرہ چھپانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ وہاں موجود تمام لوگوں کو دیکھنا اور شاید ان کی آنکھوں میں جھانکنا چاہتے تھے۔ یہ ان کے آخری الفاظ تھے۔ چوہدری یار محمد نے جیل کے تمام لوازمات کو پورا کرتے ہوئے ایک سفید رومال سے اشارہ دیتے ہوئے تارا مسیح کو پھانسی کی کارروائی کرنے کا حکم دیا۔ تارا مسیح نے لیور کو کھینچا اور جناب بھٹو اپنے پورے وزن کے ساتھ تختے کے نیچے خالی جگہ میں لٹک گئے۔ ان کا جسم اسی طرح آدھا گھنٹہ لٹکا رہا۔

وہ جا چکے تھے، نواب احمد خان کے قتل کے مقدمے کا طویل سلسلہ اختتام پذیر ہو گیا تھا۔ کوئی بین الاقوامی دباؤ جنرل ضیاء الحق کے ذہن کو نہ بدل سکا۔ وہ کئی موقعوں پر کہہ چکا تھا کہ وہ سپریم کورٹ (81) کے فیصلے کا احترام کرتا ہے۔ اپنے لفظوں کو سچ ثابت کرنے کے لیے وہ اپنا ذہن نہیں بدل سکا۔ ملک کے اندر سے بھی کوئی واضح دباؤ ضیاء الحق پر دکھائی نہیں دیا، یہ قیاس آرائیں کی جا رہی تھیں کہ لوگ جناب بھٹو کی جیل سے رہائی کے لیے باہر نکلیں گے لیکن یہ سب جھوٹ ثابت ہوا۔ پی پی پی کے سرکردہ رہنماؤں کی طرف سے نہ کوئی احتجاج ہوا اور نہ ہی کوئی جلوس نکالا گیا جو ضیاء الحق کے لیے زیادہ پریشانی کا باعث ہوتا۔ اس نے بلیک وارنٹ پر دستخط کیے اور لاہور ہائی کورٹ سے منظور ہونے والی سزا کے قانونی اختتام پر عمل درآمد کرنے کی اجازت دی۔ تندخو بھٹو جا چکے تھے۔ ہماری قوم کا ایک خوش لباس قومی رہنما وفات پا چکا تھا۔

ایک مقرر جس نے سقوط ڈھاکہ کی قرارداد کی کاپی سیکورٹی کونسل کے سامنے پھاڑ دی تھی، عوام کو اپنی حمایت میں کرنے کے لیے اب ہمارے ساتھ نہیں تھا۔

آدھے گھنٹے بعد جناب بھٹو کا جسم اتار لیا گیا۔ ڈاکٹر اصغر نے تصدیق کی کہ ان کی زندگی ختم ہو گئی

81۔ الف۔ بڑھتی ہوئی انتہائی شدید مخالفت والی حکمت عملی بھٹو کی خاطر مظاہرے کرنے والے افراد پر الٹا حملہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کی مزید تصدیق حکومت کے ایک پاکستانی یونیورسٹی کے پروفیسر کر سکتے ہیں۔ درحقیقت پہلے ہی سے ظاہر ہوتا تھا کہ ضیاء الحق اپنے سیاسی دشمن کو کسی قسم کی یکطرفہ معافی نہ دینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ ضیاء الحق نے کچھ عرصہ قبل اعلان کیا ''اگر سپریم کورٹ اسے رہا کرتی ہے تو میں بھی اسے رہا کر دوں گا۔ اگر سپریم کورٹ بھٹو کو پھانسی دینے کا حکم سناتی ہے تو میں اسے پھانسی دے دوں گا (نیوز ویک 16 اکتوبر 1979ء)

ب۔ ضیاء صدر بنے تو انہوں نے جلد ہی یہ واضح کر دیا کہ وہ اس شخص کے ساتھ جسے انہوں نے عہدے سے ہٹا دیا ہے کسی قسم کا رحم کرنے کو تیار نہیں۔ (پیٹر وویب، نیوز ویک 16 اپریل 1979ء)

ہے۔جناب بھٹو مر چکے تھے۔انہوں نے اپنے ذاتی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔انہیں ایسے کپڑے کبھی نہیں دیئے گئے جو جیل کے حکام بالا کی طرف سے ایک سزا یافتہ آدمی کو دیئے جاتے ہیں۔ان کے ساتھ جیل کے قوانین سے بالاتر ہو کر سلوک کیا جاتا تھا۔قریب پڑے ہوئے بیڈ پر ان کی میت کو لٹا دیا گیا،ان کے جسم پر کوئی نشان نہ تھا سوائے اس نشان کے جوان کے بائیں جبڑے کے نیچے تھا اور جو کہ عام طور پر پھانسی پانے والے شخص کی رسی کی گرہ کی وجہ سے بن جاتا ہے وہ مطمئن لگ رہے تھے۔پھر انہیں پھانسی گھاٹ سے آگے ایک دینی شخصیت حیات محمد ولد نواب خان نے غسل دیا جسے یہ دینی رسم ادا کرنے کے لیے طلب کیا گیا تھا۔ایک کفن انہیں پہنایا گیا ان کے کفن پر بہت ساری مقدار میں خوشبوئیں چھڑکی گئیں۔ان کی میت کو پھولوں کے ساتھ ایک لکڑی کے تابوت میں رکھا گیا۔پھر میں نے ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی میت کو لیفٹیننٹ کرنل رفیع کے حوالے کیا۔جیل کے گیٹ پر میں نے رجسٹر میں اندراج کیا ''ذوالفقار علی بھٹو کی میت لیفٹیننٹ کرنل رفیع کے حوالے کی گئی''۔

جناب بھٹو پھانسی سے پہلے ایک انگوٹھی پہنے ہوئے تھے،جب ان کی میت تختہ دار سے ہٹائی گئی تو میں نے دیکھا کہ ان کی انگوٹھی انگلی میں نہیں ہے میں نے فوری طور پر پوچھا تو صادق مسیح کو خوفزدہ پایا۔اس نے کہا کہ جب جناب بھٹو کا جسم پوری قوت کے ساتھ زمین پر آیا تو انگوٹھی ان کی انگلیوں سے نکل گئی۔اس نے انگوٹھی مجھے دے دی۔میں نے فوری طور پر جناب بھٹو مرحوم کی ذاتی اشیاء کی ایک فہرست بنالی جس میں ان کے ذاتی کپڑے،کتابیں،بستر،انگوٹھی جوتے اور وہ کپڑے شامل تھے جو انہوں نے پھانسی کے وقت پہن رکھے تھے۔اگلے دن میں سہالہ کے ریسٹ ہاؤس گیا اور تمام چیزیں بے نظیر بھٹو کے حوالے کر دیں۔یہاں تک کہ وہ گلاس بھی دے دیا جو آدھا پانی سے بھرا ہوا تھا۔جب کہ آدھا ظاہری بات ہے جناب بھٹو نے کسی سکون آور دوا کے ساتھ استعمال کیا تھا،میں نے سوچا کہ اسے ان کے خاندان کے پاس الماری میں کسی مناسب جگہ پر ہونا چاہیے اپنے والد کی چیزیں دیکھ کر مس بے نظیر بھٹو رونے لگیں اور مجھ سے کہا کہ والد سے ان کی ملاقات کے بعد ہونے والی تمام باتیں بیان کروں۔میں نے انہیں بالکل ویسی روداد سنائی جو جنرل راحت!میں نے آپ کے سامنے بیان کی ہے۔میں نے اگلے کمرے میں موجود بیگم نصرت بھٹو کے رونے کی آواز سنی جو عدت میں تھیں،اسلامی روایات کی وجہ سے انہیں ان تمام مردوں سے دور رہنا تھا جو ان کے قریبی رشتہ دار نہیں تھے۔یہ ایک اداس لمحہ تھا۔

پھر کیا ہوا

نہ ہی پیپلز پارٹی کے رہنما اور نہ ہی جلوس سڑکوں پر دیکھے گئے (82)۔ ایک عام کہاوت ہے کہ ایک بڑے طوفان سے قبل سکوت ہوتا ہے۔ ڈی ایم ایل اے کا اس کانفرنس کو طلب کرنے کا مقصد کسی متوقع گڑبڑ کے متعلق سوچ بچار تھا۔ اجلاس میں شرکت کرنے والوں میں کمشنر ایف آئی ملک، ڈی آئی جی پولیس اصغر ملک، سعید مہدی ڈپٹی کمشنر، برکی ایس ایس پی اور میں تھے۔ پیپلز پارٹی نے مسٹر بھٹو کے لیے اسی روز لیاقت باغ میں غائبانہ نماز جنازہ کرنے کے لیے لوگوں کو بلایا تھا۔ یہ بے حد سنجیدہ معاملہ تھا۔ ہمیں یقین تھا کہ لیاقت باغ میں لوگوں کا ایک بڑا اجتماع ہوگا۔ جہاں غائبانہ نماز جنازہ ادا کی جائے گی۔ اور کوئی بھی ناپسندیدہ واقعہ پیپلز پارٹی کے جوشیلوں کے جذبات کو بھڑکا دے گا۔ اس کے بعد مکمل افراتفری ہوگی۔ جس کے باعث صورت حال انتظامیہ کے ہاتھوں سے نکل جائے گی۔ لہٰذا مارشل لاء کے ارباب اقتدار لیاقت باغ میں لوگوں کے اجتماع کے متعلق پہلے ہی سوچنا چاہتے تھے۔ اس مقام پر تشدد کی ایک تاریخ ہے۔ مسٹر لیاقت علی خان پاکستان کے وزیراعظم اسی جگہ قتل کئے گئے تھے۔ مختلف تجاویز میں سے ایک تجویز یہ تھی کہ پارک میں پانی چھوڑ دیا جائے تا کہ اس مقام کو پیپلز پارٹی کے لیے ناقابل استعمال بنا دیا جائے۔ مگر اس طرح اسلامی عقائد کی نفی ہوگی۔ کیونکہ اسلام غائبانہ نماز جنازہ کی اجازت دیتا ہے۔ میں نے ایک دوسری تجویز پیش کی کہ لوگوں کو اسلامی رسم ادا کرنے کی اجازت دی جائے۔ میں نے مزید کہا کہ لازماً وہاں پیپلز پارٹی کے فدا کار اور جوشیلے بھی ہوں گے۔ جو ہر صورت

82۔ مسٹر بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی کی بظاہر انچارج قیادت کا کہیں کوئی نشان نہ تھا۔ اور نہ ہی کہیں اس کے قریبی لیفٹیننٹ نظر آ رہے تھے۔ بلکہ مسٹر بھٹو کے چچازاد بھائی مسٹر ممتاز بھٹو اور اس کے سابق وزیر مالیات عبدالحفیظ پیرزادہ نے عجب قسم کی بے تعلقی کا مظاہرہ کیا۔ وہ کہیں بھی نظر نہ آئے جہاں گڑبڑ کا اندیشہ ہو۔

کل بعد دوپہر راولپنڈی میں نماز جنازہ میں شرکت کے لیے آئے وہ ایک گھنٹہ تاخیر سے آئے اور انہیں معلوم ہوا کہ اس میں جھگڑا ہو گیا ہے آنسو گیس کے پہلے ہی گولے کے پھٹنے کے بعد مسٹر ممتاز بھٹو اور مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ واپس لوٹ گئے۔ (گارڈین ۷ اپریل ۱۹۷۹ء)

اپنے ردعمل کا اظہار چاہیں گے۔ چنانچہ جس وقت اور جہاں کہیں ان کو موقع ملے گا، وہ ایسا کریں گے۔ لہٰذا جہاں کہیں وہ غائبانہ نماز جنازہ ادا کرنے کے متمنی ہوں انہیں ایسا کرنے دیا جائے۔ میں نے مزید کہا کہ اگر انہوں نے لوگوں کو غائبانہ نماز جنازہ ادا کرنے کے لیے اگلے روز بھی بلایا تو ان کو ایسا کرنے دیا جائے۔ بشرطیکہ پہلے روز انہوں نے کسی صورت بھی امن وامان کا مسئلہ پیدا کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ بعدازاں کسی مجوزہ غائبانہ نماز جنازہ کی اس مقام پر اجازت نہ دی جائے۔ کیونکہ پہلی غائبانہ نماز جنازہ کے بعد اچھے جذبے کے ساتھ کوئی بھی دوسرا اسی جگہ غائبانہ نماز جنازہ ادا نہیں کرسکتا۔ اس صورت میں تو اس کے پس منظر میں سیاسی مصلحتیں ہوں گی۔ اور ہمیں اس کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور اجلاس برخاست ہو گیا۔

بعدازاں اسی روز مقررہ وقت پر مسٹر بھٹو کے لیے غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی۔ حاضرین کی تعداد ہماری توقعات سے کہیں کم تھی۔ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ صرف حکومت کی مخالفت میں نعرہ بازی کی گئی کہیں کہیں پتھراؤ کیا گیا۔ توقع کے مطابق اگلے روز بھی پارٹی کے کارکنوں کی جانب سے اسی مقام پر لوگوں کو جمع ہونے کی دعوت دی گئی اس دفعہ حصہ لینے والوں کی تعداد کافی حد تک بڑھ گئی۔ انتظامیہ نے قطعاً مداخلت نہ کی۔ لیکن ہم کسی بھی ناخوشگوار صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے۔ بدقسمتی سے اس مرتبہ مجمع تشدد پر اتر آیا۔ انہوں نے بسیں اور جائیداد کو نذر آتش کرنا شروع کر دیا۔ فوراً ہی پولیس نے انہیں اشک آور گیس سے روکنے کی سعی کی۔ مجمع میں امن وامان نافذ کرنے والے اداروں کو للکارنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ان میں مقصد کے لیے کوئی گہری سوچ نہ تھی۔ مسٹر بھٹو کو موت کی سزا لاہور ہائی کورٹ نے دی۔ اور اس کے خلاف اپیل کو پاکستان سپریم کورٹ نے مسترد کر دیا۔ مقدمہ میں تمام اقدامات آئینی تھے۔ پیپلز پارٹی کے جیالے کہیں بھی نظر نہیں آ رہے تھے یا وہ زمین دوز ہو گئے یا جیلوں سے بچنے کی خاطر ملک سے فرار ہو گئے۔ پیپلز پارٹی کی قیادت عوام کو راہ دکھانے کے لیے کہیں بھی نظر نہیں آتی تھی۔ اور غائبانہ جنازہ تو فقط عارضی نوعیت کا تھا اور اس میں بھی مقامی پارٹی کی طرف سے ہڑتال کا انتظام کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ بے جان ہڑتال سے یہ بالکل واضح تھا کہ مسٹر بھٹو کے حامی اپنی ہمدردیاں تبدیل کرنے کو تیار تھے۔ اس کے بعد راولپنڈی میں غائبانہ نماز جنازہ کے لیے کسی قسم کا کوئی اجلاس طلب نہ کیا گیا۔ اسی لیے ہم نے اس صورت حال (83)

83۔ (الف) اس سال آغاز میں پی پی پی بظاہر زوال پذیر نظر آئی۔ بھٹو جیل میں تھے۔ ان کی بیوی اور بیٹی زیر حراست تھیں۔ بہت سے دوسرے پارٹی رہنما خوشامدی تھے۔ جن کے درمیان بھٹو نے اپنے آپ کو محصور رکھا۔ جب ان کا رہنما پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو اپنے گھروں میں مقفل کرلیا۔ اور پارٹی کی جانب سے وسیع پیمانے پر مظاہرے جو کہ پارٹی کی طرف سے توقع کئے جا رہے تھے، کبھی بھی سامنے نہ آئے۔ (نیوزویک ۲۳ جولائی ۱۹۷۱ء) (بقیہ آگے)

میں فوج کا قطعاً کوئی استعمال نہ کیا۔

برکی زخمی ہو گئے

ہم اپنے ایک ساتھی کی بیٹی کی شادی جو گل نور ہوٹل مری روڈ میں ۵ راپریل ۱۹۷۹ء کو منعقد ہو رہی تھی، شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ہم نے اپنے ساتھی سے اجازت لی اور مری روڈ لیاقت باغ کے راستے واپسی اختیار کی۔ ڈپٹی کمشنر کی سرکاری کار میں سعید مہدی اور میں پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے جب کہ برکی اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈرائیور بڑے اطمینان سے گاڑی چلا رہا تھا، کیونکہ اس روز ابھی تک کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ جونہی ہم کمیٹی چوک کے قریب پہنچے ہم نے دیکھا کہ بعض کاریں یوٹرن بناتے ہوئے واپس آ رہی ہیں۔ انہوں نے ہمیں متنبہ کیا کہ واپس ہو جائیں۔ کیونکہ آگے کسی قسم کی گڑبڑ تھی۔ اپنی ڈیوٹی کو سمجھتے ہوئے ہم آگے بڑھتے گئے اور لیاقت باغ پہنچ گئے۔ وہاں ہم نے دیکھا کہ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی بس سڑک کے درمیان جل رہی تھی۔ راہ گیروں پر پتھر برسائے جا رہے تھے۔ کاروں اور دکانوں پر اینٹیں برس رہی تھیں۔ جائیدادوں کو تباہ کیا جا رہا تھا(84)۔ ہنگامہ کرنے والوں میں عورتوں اور لڑکیوں کی کثیر تعداد شامل تھی۔ ہنگامی واقعات سے نپٹنے کے لیے پولیس پہلے ہی وہاں موجود تھی۔ اور پولیس کی مخصوص نفری صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے مکمل طور پر تیار تھی۔ ان کے ہمراہ ڈیوٹی مجسٹریٹ بھی موجود تھا۔ لوگ خطرہ

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

(ب) پی پی پی پچاس افراد بھی مظاہرہ کرنے کے لیے اکٹھا نہ کر سکی۔ سوائے اس کے خاندان کے افراد کے کوئی بھی اس کی زندگی (بھٹو) کے لیے پریشان نظر نہ آیا۔ جنرل ضیاء کا فیصلہ کہ اس نے رحم کی درخواست مسترد کر دی درست تھا یا غلط تھا، اس کے متعلق دو نظریات ہو سکتے ہیں۔ لیکن پی پی پی جس نے مسٹر بھٹو کی ہر دل عزیزی کا ڈھنڈورا پیٹا کہیں بھی نظر نہ آئی۔ اسی سبب سے جنرل ضیاء کے اس طرح عمل کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نظر نہ آئی۔ بیرونی ممالک اور ان کے سربراہوں کی طرف سے اپیل صرف ایک عام بات تھی۔ جیسا کہ جنرل ضیاء نے قرار دیا۔ (بھٹو، ضیاء اور میں مصنفہ لیفٹیننٹ جنرل چشتی صفحہ ۲۳۵)

84۔ راولپنڈی کے تاریخی لیاقت باغ میں کل شروع ہونے والا دعائیہ اجلاس۔ جلد ہی بھٹو کے حامی چھ ہزار مظاہرین جنہیں آہ و زاری کرنے والی خاتون لائی تھی۔ اور سیکڑوں لوہے کے خود پہنے پولیس والوں کے درمیان لڑائی میں تبدیل ہو گیا۔ پولیس نے اشک آور گیس کے بے شمار گولے چلائے۔ مظاہرین نے سڑکوں پر سیمنٹ کے بلاک کھڑے کیے سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ حکومت کے حامی اخبار کے دفتر کو جلا دیا گیا۔ دو بسیں جلائی گئیں۔ نیز بے شمار پولیس کی اور دوسری گاڑیوں پر پتھراؤ کر کے نقصان پہنچایا گیا۔ پولیس نے مظاہرین کے خلاف بار بار لاٹھی چارج کیا۔ مظاہرین نے ان پر پتھر برسائے۔ اور انہیں نعروں سے طعنہ دیا۔ نیز فوجی حکمران اور فوج پر فقرے کسے۔ (ڈیلی ٹیلیگراف ۶ اپریل ۱۹۷۹ء) بروس لاڈن راولپنڈی)

سے بچنے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ فسادی پولیس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے، افراتفری کا عالم تھا۔ اس بہت بڑے مجمع میں راہ چلتے ہوئے مسافر بھی شامل تھے۔ جو محض تماشائی کے طور پر وہاں موجود تھے۔ برکی کے کہنے پر ڈرائیور نے کار کو سڑک کے بائیں کنارے کھڑا کر دیا۔ برکی نے کار سے نکل کر بھاگتے ہوئے لوگوں کا پیچھا کرنا شروع کر دیا وہ ایک شخص کا پیچھا کر رہے تھے جس کو انہوں نے پولیس کی گاڑی پر پتھر پھینکتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ یہ شخص اس ہجوم کا حصہ تھا۔ پولیس جس کے تعاقب میں لگی ہوئی تھی۔ لیاقت باغ میں بے شمار گلیاں ہیں جو ایک دوسرے کو کاٹتی ہیں اور اس طرح ہنگامہ پرور افراد کے لیے موقع فراہم کرتی ہیں کہ وہ اپنی مرضی سے سامنے آئیں اور پھر غائب ہو جائیں۔ بعض لوگ اپنے گھروں کی چھتوں پر چڑھ گئے اور انہوں نے متواتر گورنمنٹ کی گاڑیوں اور پولیس فورس پر سنگباری شروع کر دی۔ نڈر برکی نوجوان کو دبوچنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور اس پر قابو پا لیا۔ چونکہ مسٹر برکی سادہ لباس میں تھے۔ نوجوان نے مقابلہ شروع کر دیا اور اس عمل میں مسٹر برکی اپنے منہ کے قریب زخمی ہوئے اور خون نکلنا شروع ہو گیا۔ لیکن انہوں نے مجرم کو بھاگنے نہ دیا۔ اسی اثناء میں ڈپٹی کمشنر کا ڈرائیور ریاض بھی آن پہنچا اور مجرم کو پولیس کی گاڑی میں بٹھا دیا بعد میں ہم نے برکی سے دریافت کیا کہ انہوں نے کیوں خود بھاگ کر اس شخص کو پکڑا؟ انہوں نے ہمیں بتلایا کہ عام طور پر الزام لگایا جاتا ہے کہ پولیس معصوم راہگیروں کو پکڑ لیتی ہے۔ اور ایسے موقع پر اصل شرارتی عناصر بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس شخص کو میں نے ذاتی طور پر دیکھ لیا تھا کہ وہ پتھر پھینک رہا تھا۔ لہٰذا میں کود پڑا۔ برکی نے بلاشبہ ایک اچھا لیڈر ہونے کا ثبوت دیا۔

پیپلز پارٹی کی خواتین کا مجمع

ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے پولیس اشک آور گیس کے گولے وقفے وقفے کے بعد چلا رہی تھی اس کے باوجود فسادی متصل گلیوں سے باہر آتے پتھر پھینکتے اور پھر اگلی گلی میں غائب ہو جاتے۔ پارٹی کی بلوائی موجود خواتین کی وجہ سے آنکھ مچولی کا مظاہرہ قدرے زیادہ ہوتا گیا۔

پولیس نے آہستہ آہستہ فسادیوں کے گرد حلقہ تنگ کر کے انہیں کثیر تعداد میں گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ مجھے پہلی مرتبہ اس امر کا احساس ہوا کہ جب پولیس مجسٹریٹ کی زیر نگرانی آگے بڑھتی ہے تو وہ پختہ ارادے سے اپنے فرائض ادا کرتی ہے۔ وگرنہ وہ اپنا فرض بے دلی سے انجام دیتی ہے جو صحت مندانہ علامت نہیں۔ اس دن میں نے پولیس فورس کے ہمراہ مجسٹریٹ کو بنفس نفیس ہجوم پر جھپٹتے دیکھا۔ اگرچہ اس سے مدد ملی مگر میری دانست میں جب تک خواتین مظاہرین کو میدان سے نہ ہٹایا جائے گا تو مرد

مظاہرین بھی نہیں جائیں گے۔اب تک خاموش تماشائیوں کا ایک انبوہ کثیر مری روڈ کے اطراف میں جمع ہو گیا تھا۔اس امر کا مشاہدہ کافی دلچسپ ہوتا ہے کہ ابتدا میں شرارتی عنصر جمع ہوتے ہیں۔جو آہستہ آہستہ تشدد پر اتر آتے ہیں۔جو وہاں شروع میں غیر متحرک ہوتے ہیں وہ بھی ہجوم میں شامل ہو کر تشدد پر اتر آتے ہیں۔اور اس طرح اکادکا اینٹ یا پتھر پھینک کر اس تشدد میں اپنا حصہ ڈال دیتے ہیں۔ جونہی اصل بلوائی بھاگنا شروع ہوتے ہیں، دوسرے پھر تماشائیوں کا حصہ بن جاتے ہیں اور خواتین بلوائیوں کی موجودگی بڑے ہجوم کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔جب تک ان کو نہ ہٹایا جاتا بلوائیوں کی تعداد میں اضافہ ہونا ناگزیر تھا۔لہٰذا ہم نے خواتین پولیس کو بلا لیا۔بدقسمتی سے انہیں پہنچنے میں دیر لگ گئی۔

مجھے پارٹی کی فسادی خواتین (85) نے لیاقت باغ چوک میں گھیرے میں لے لیا اور کچھ نے مجھ پر آوازے کسنے شروع کر دیئے مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان میں سے بعض اَن پڑھ ہیں اور بعض تعلیم یافتہ۔کچھ کا تعلق اونچے طبقہ کے گھرانوں سے تھا۔بعض دیکھے بھالے چہروں والی اپنے مسائل کے حل کے لیے میرے پاس مارشل لا ہیڈ کوارٹرز میں آ چکی تھیں۔ان کا انداز جارحانہ تھا اور وہ مجھ پر مسٹر بھٹو کے قتل کا الزام لگا رہی تھیں۔بعض نے گالی گلوچ والی زبان استعمال کی اور ایک نے مجھ پر تھوک کر بھٹو کو پھانسی دینے کا الزام لگایا۔میں ان کو دیکھ رہا تھا اور صبر سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔اور ردعمل کا بالکل اظہار نہیں کر رہا تھا۔مجھے معلوم تھا کہ مجھے دانستہ اکسایا جا رہا تھا۔مجھے یہ بھی علم تھا کہ مجھے ردعمل نہیں دکھانا چاہیے۔ان کا تشدد مایوسی اور محرومی کا اظہار تھا۔بعض غالباً دل سے اپنے رہنما کے نقصان کو محسوس کر رہی تھیں۔بعض کا اپنے جذبات کا اظہار صرف ظاہری تھا تا کہ مظاہرین کے لیے قوت کا باعث بن سکے۔گالی گلوچ والی زبان خواتین کو زیب نہیں دیتی۔اچانک مسز نیازی (ڈاکٹر ظفر نیازی جو بھٹو کے دانتوں کے معالج تھے، کی بیوی) جو دوسری خواتین سے زیادہ سمجھدار نظر آ رہی تھی خواتین کو

85۔ راولپنڈی کی معروف تجارتی سڑک مری روڈ پر ٹریفک روک دیا گیا۔بعد دوپہر کا زیادہ حصہ پولیس اور بلوائیوں میں لڑائی میں گزرا۔

ضیاء کو قتل کرو۔بدلہ بدلہ کے نعرے لگتے رہے۔دوسرے نعرے بھی زیادہ تر فوج مخالف تھے۔سویلین لباس میں بریگیڈیئر کو گھیر لیا گیا۔جس کی خواتین نے بے عزتی کی۔حکومت کے حامی اخبارات کے دفتروں پر حملے کیے گئے۔

بلوے کی انتہا پر ایک فوجی جیپ کو اغوا کر لیا گیا۔اور بھٹو کے حامی اس کو چلا کر لے گئے۔اور سویلین کپڑوں میں ایک بریگیڈیئر جس کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ وہ مسٹر بھٹو کو جیل میں پہنچانے کا ایک بڑا ذمہ دار شخص ہے۔اسے گھیر لیا گیا اور اس پر اور فوج پر طعنہ زنی کی گئی کہ ایسے واقعات اور بنگلہ دیش میں ان کا کیا کردار رہا ہے۔(ڈیلی ٹیلی گراف ۶ اپریل ۱۹۷۹ء بروس لاڈن راولپنڈی)

ایک طرف دھکیل کر آگے بڑھی اور ان کو مخاطب کر کے کہنے لگی کہ یہ غریب بریگیڈیئر تو موردالزام نہیں ہے۔ میں نے دیکھا کہ ہجوم میں سے بعض اس کی بات کو سننے کے لیے تیار تھیں۔ لیکن بعض نہیں۔ اسی اثناء میں خواتین پولیس آن پہنچی اور انہوں نے خواتین بلوائیوں کو پولیس کی گاڑی میں ڈالنا شروع کر دیا جونہی خواتین کو وہاں سے ہٹا دیا گیا ہجوم تتر بتر ہونا شروع ہو گیا۔ غروب آفتاب سے قبل ٹریفک کو بحال کر دیا گیا۔

ہم صورت حال کو حل کرنے کی سعی کر رہے تھے کہ ہم نے وائرلیس پر پیغام سنا کہ ڈی آئی جی پولیس مسٹر اصغر ملک قریب ہی پلاٹون کے ہمراہ ہماری اعانت کے لیے تیار کھڑے تھے۔ ہم نے خود دیکھا کہ وہ لیاقت باغ کی دیوار کے ساتھ موجود تھے انہوں نے لوہے کی ٹوپی پہن رکھی تھی اور گاڑی کی اگلی سیٹ پر ایک دلیر افسر کی طرح بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ ان کی ڈیوٹی نہ تھی کہ راولپنڈی ضلع میں بالواسطہ طور پر امن وامان کے مسئلہ میں اپنے آپ کو الجھائیں۔ وہ آسانی کے ساتھ اپنی رہائش گاہ پر ٹھہر سکتے تھے تا آنکہ انہیں مسٹر برکی امداد کے لیے طلب کرتے۔ یقیناً وہ اپنے جذبہ کا اظہار محض دکھاوے کے لیے نہ کرنا چاہتے تھے۔ یقیناً امن وامان کو قائم رکھنے میں امداد فراہم کرنے کی خاطر وہ ٹیم کے ایک رکن کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کرنے کے خواہشمند تھے۔ ہم سب نے ان کی دلیری اور جذبے کو سراہا۔

بے نظیر بھٹو کے ساتھ مکالمہ

چند ہفتے بعد مجھے صدر کے سی او ایس جنرل عارف کی طرف سے ٹیلی فون موصول ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ میں انہیں فوراً ملوں۔ جب میں ان کے دفتر میں پہنچا تو انہوں نے بیگم نصرت بھٹو اور مس بے نظیر بھٹو کی مجوزہ کراچی روانگی پر تبادلۂ خیال کیا۔ انہوں نے مجھے ہدایت کی کہ میں انہیں اس حکم نامہ سے آگاہ کروں تاکہ وہ آج رات اپنی رہائش گاہ ۷۰۔ کلفٹن کراچی بذریعہ جہاز منتقل ہونے کے لئے تیار ہو جائیں۔ انہوں نے کہا وی آئی پی فوکر جہاز چکلالہ ایئر بیس سے سیدھا ان کو کراچی لے جائے گا۔ ان کا تمام سامان ساتھ جائے گا۔ کراچی میں ان کی آمد کے سلسلے میں مناسب انتظام کر دیا گیا ہے۔ میں نے ان کو یاد دلایا کہ ڈی ایم ایل اے میجر جنرل صغیر نے ان کی روانگی کا بندوبست کیا تھا لیکن آخری لمحے اس کو منسوخ کر دیا گیا۔ اب میں ان کو کس طرح یقین دلاؤں گا کہ یہ نیا انتظام حتمی ہے۔ جنرل عارف نے جواب دیا کہ انتظامات یقینی ہیں۔ اور حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ جونہی وہ ۷۰۔ کلفٹن پہنچیں گی ان کو رہا کر دیا جائے گا۔ میں نے سلام کیا اور سیدھا ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں پہنچا۔ جہاں مسٹر برکی اور راجہ محمود بھی منتظر تھے۔ میں نے تفویض کردہ کام سے متعلق ان سے تبادلہ خیال کیا۔ فوری طور

پر میں نے پی آئی ڈی سی ہاؤس جسے عارضی طور پر سب جیل میں تبدیل کر دیا گیا تھا اور جہاں ان دونوں خواتین کو رکھا گیا تھا، وائرلیس پر پیغام بھیجا۔ ہم نے سب جیل کی انتظامیہ سے کہا کہ ہم دونوں خواتین سے ملاقات کی خاطر جلد پہنچ رہے ہیں۔ سب جیل تک پہنچنے کے لیے آدھ گھنٹہ درکار تھا اس طرح جیل انتظامیہ کو ہماری ملاقات کروانے کے لیے کافی وقت مل گیا۔ جب ہم پہنچے تو ہمیں نفاست سے سجائے ہوئے کمرہ میں لے جایا گیا۔ جہاں ہم انتظار کے لیے بیٹھ گئے۔ مس بے نظیر کمرہ میں داخل ہوئیں۔ ان کے بازوؤں میں بلی تھی۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور انہیں سلام کیا۔ لیکن انہوں نے جواب نہ دیا۔ وہ ہمارے سامنے صوفہ پر بیٹھ گئیں۔

میں نے ان سے اپنے ساتھیوں کا تعارف کروایا۔ بے نظیر کی والدہ نہ دیکھ کر میں نے ان کے بارے میں دریافت کیا کہ وہ کہاں ہیں اور کیسی ہیں؟

بے نظیر: بلی سے کھیلتی ہوئی بولی ''میری والدہ عدت کے سبب یہاں نہیں آ سکتی۔ نیز ان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے مجھے خاص طور پر مخاطب کر کے اس نے کہا: ''تم اتنی کم عمر میں بریگیڈیئر کیسے بن گئے ہو؟'' شکریہ ادا کرتے ہوئے جب میں نے جواب دیا میں اتنا بھی کم عمر نہیں ہوں۔ بریگیڈیئر کے عہدہ کے لیے یہی عمر موزوں ہے۔ میں نے مزید کہا ''ہمیں افسوس ہے کہ آپ کی والدہ کی طبیعت ناساز ہے اس سلسلہ میں اگر کسی مدد کی ضرورت ہو تو ضرور بتائیں۔''

بے نظیر: نے فوراً سخت زبان کا استعمال خاص طور پر فوجیوں کے خلاف شروع کر دیا۔ اس نے ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ میں نوے ہزار قیدیوں کا ذکر کیا۔ اور الزام لگاتے ہوئے کہا کہ مشرقی پاکستان میں فوج اپنی پتلونیں نیچے کئے ہوئے پکڑی گئی تھی۔ یہ میرا باپ تھا جس نے انہیں واپس لا کر فوج میں عزت دلوائی اب اسی فوج نے اسے پھانسی پر لٹکایا ہے۔ بے نظیر نے کچھ نازیبا زبان بھی استعمال کی۔ وہ تند مزاج ہو رہی تھی۔

میں: (میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا) ''مہربانی کر کے ناراض نہ ہوں۔ اور نہ ہی سخت لفظوں کا استعمال کریں۔ یہ آپ جیسے پڑھے لکھے فرد کو زیب نہیں دیتا نیز خواتین اس انداز میں بات نہیں کرتیں۔''

بے نظیر: (باآواز بلند) ''کیسے الفاظ؟ تم لوگوں نے میرے باپ کو قتل کیا ہے اور اب تم میری زبان کے متعلق باتیں کر رہے ہو۔ تمام وردی والوں کو بھارتیوں سے ٹھڈے کھانے چاہئیں۔''

میرے لیے اس کا اس طرح غصے میں آنا قابل فہم تھا۔

میں: ''ہم آپ کو اور مسز نصرت بھٹو کو بتلانے آئے ہیں کہ آج رات بذریعہ جہاز کراچی جانے کے لیے تیار ہو جائیں۔''

بےنظیر: (بات کاٹتے ہوئے) ''پہلے بھی اسی قسم کا پیغام آیا تھا۔لیکن آخری لمحے انتظامات منسوخ کر دیئے گئے کہ ہم کراچی نہ جا سکے۔''

میں: ہم سب آپ کو یقین دلانے آئے ہیں کہ جو ہم کہہ رہے ہیں درست ہے۔تمام انتظامات مکمل کر لیے گئے ہیں۔آپ آج غروب آفتاب سے قبل ایک خصوصی طیارہ کے ذریعے جو اسی مقصد کے لیے تیار کیا گیا ہے، روانہ ہو جائیں گی۔''

بےنظیر: ''اتنے مختصر نوٹس پر تیاری کرنا ناممکن ہے۔''

''ہم آپ کی اعانت کے لیے امدادی افراد مہیا کر سکتے ہیں جو سامان کو پیک کرنے میں مدد دیں گے۔ ہم مزید آپ کو مطلع کرنا چاہتے ہیں کہ جونہی کراچی میں آپ ۷۰ کلفٹن کے اندر داخل ہوں گے ''آپ آزاد ہوں گے۔'' اب تک وہ قدرے پُرسکون ہو چکی تھی۔

بےنظیر: ''پہلے مجھے بتلائیں کہ میرا باپ کس طرح مرا تھا؟ کیا اس نے کچھ کہا تھا؟ کیا وہ پھانسی کے تختے تک چل کر گیا تھا؟''

میں: آپ کو ان تمام سوالات کا جواب ۷۰ کلفٹن پہنچنے کے بعد جب آپ عوام سے آزادانہ ملاقاتیں کریں گی ان سے مل جائے گا''۔اس نے دوسری مرتبہ اپنا استفسار دہرایا اور میں نے اپنا جواب دہرایا۔

بےنظیر: ''ہم تیاری شروع کریں گے لیکن غروب آفتاب سے قبل نہیں جا سکیں گے۔ہمارا سامان تو کافی ہوگا۔''

میں: ''یہ کوئی مسئلہ نہیں۔یہ آپ کے پہنچنے سے قبل بحفاظت جہاز میں رکھوا دیا جائے گا''۔

بےنظیر: ''لیکن آپ لوگوں کو تو میں نے چائے کی پیالی بھی نہیں پوچھی۔کیا آپ چائے پینا پسند کریں گے۔'' اس نے بلی سے کھیلتے ہوئے ایسا کہا۔

میں: ''نہیں شکریہ۔آپ اپنا تمام سامان جو آپ کے پاس ہے، لے جا سکتی ہیں۔''

بےنظیر: ''وقت بہت کم ہے اور ہم آج تیار نہیں ہو سکتے۔''

میں: ''ہم آپ کو امدادی افراد مہیا کر سکتے ہیں۔لیکن آپ کو ہر صورت جانا ہوگا۔''

بےنظیر: ''کیا ہوگا کہ اگر ہم کراچی پہنچنے کے بعد پھر سے زیر حراست ہو جائیں؟''

میں: ''جہاں تک ہمارا علم ہے۔آپ کو دوبارہ زیر حراست نہیں رکھا جائے گا'' کراچی پہنچنے کے بعد آپ کو ۷۰۔کلفٹن بحفاظت پہنچا دیا جائے گا۔اس کے بعد دوسروں کی طرح آپ بھی بالکل آزاد ہوں گے۔''

بے نظیر: ''کیا تمہیں یقین ہے کہ ہماری روانگی ملتوی نہیں کی جائے گی؟''

میں: ''ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ آپ کی روانگی ملتوی نہیں کی جائے گی۔ اگر کسی صورت کوئی مدد درکار ہو تو جیل گارڈ کو بتلا دیں تا کہ ضروری بندوبست ہو سکے۔'' ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور میں نے شکریہ ادا کیا اور بیگم بھٹو کے لئے صحت کی تمنا کی۔ میں نے ایک مرتبہ پھر کہا کہ ہم پر اعتماد رکھیں۔ اور کراچی جانے کے لیے تیاری کریں۔

بین الاقوامی شہرت رکھنے والا اس کا باپ جو سیاست دان تھا اور دنیا میں اس کا نام تھا، اب پھانسی لگ چکا تھا۔ اس لئے بے نظیر کی ناراضگی مکمل طور پر جائز تھی۔ لہٰذا میرے خلاف اس کی جارحانہ زبان، یونیفارم والوں، فوج اور سی ایم ایل اے کے خلاف جو کلمات اس نے کہے، مجھے برانگیختہ نہ کر سکے۔ یہ اچھی بات ہوئی کہ ہم نے اس کی ناراضگی کے اظہار کے لیے اس کو موقع فراہم کیا۔ جب نرمی کے ساتھ اس کو اس کی حیثیت یاد دلائی گئی تو ایک پڑھی لکھی خاتون کے ناطے اس کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ اور اس کا انداز تبدیل ہو گیا جس کسی کو بھی اس کے کرب کا تجربہ ہو وہ اسی طرح کرے گا۔ لہٰذا اختیار ہونے کے باوجود ہم نے خندہ پیشانی کے ساتھ اسے تسلیم کیا۔ ٹھنڈے انداز میں اس کے ساتھ گفتگو کی جس کی اس نے تعریف کی۔

میں سیدھا سی ایم ایل اے سیکرٹریٹ گیا اور جنرل عارف کو ملا۔ اور ان کو تمام کہانی سنائی۔ اور اس امر کا ذکر کیا کہ اسے آج کی روانگی کے متعلق بھی شکوک وشبہات ہیں۔ چنانچہ میں نے اس بات پر زور دیا کہ اس کے شک کی بنیاد کو رفع کرنا چاہیے۔ جنرل عارف جو کم گو ہیں ہاں کے لیے اپنا سر ہلایا۔

بھٹو خواتین کی ۷۰ کلفٹن کو روانگی

پی آئی ڈی سی ریسٹ ہاؤس سہالہ میں ہم نے سیکورٹی گارڈ کمانڈر سے رابطہ قائم رکھا۔ انہوں نے ہمیں مطلع کیا کہ اگرچہ بھٹو خواتین نے سامان باندھنے کے لیے کوئی امداد طلب نہیں کی تاہم روانگی کے لیے تیاریاں جاری ہیں۔ شام کے بعد ہم چکلالہ ایئر بیس گئے۔ جہاں پی اے ایف فوکر وی آئی پی جہاز دونوں بھٹو خواتین اور ان کے سامان کو کراچی لے جانے کے لیے منتظر کھڑا تھا۔ پہلے سامان محافظ دستہ کی نگرانی میں جہاز میں لدوا دیا۔ آخر میں دونوں خواتین آئیں۔ مسز نصرت بھٹو مس بے نظیر بھٹو ایک بلی اور ایک کتا۔ بیگم بھٹو سخت پردہ کئے ہوئے تھیں۔ جہاز میں بیٹھ گئیں اور جہاز کراچی کی طرف روانہ ہو گیا (86)۔ کراچی پہنچنے

86۔ پاکستان کے سابق وزیراعظم جنہیں پھانسی دے دی گئی، کی بیگم مسز بھٹو اور ان کی بیٹی کو سرکاری اطلاع کے مطابق راولپنڈی کے قریب کل رہا کر دیا گیا۔ دونوں خواتین کو ان کی درخواست پر کراچی بھجوا دیا گیا۔ جہاں ان کا گھر ہے۔ انہیں مسٹر بھٹو کو پھانسی دینے سے قبل روانہ کر دیا گیا۔ مسٹر بھٹو کو ایک سیاسی حریف کے قتل میں ملوث پایا گیا۔ (ڈیلی ٹیلی گراف ۲۹ مئی ۱۹۷۹ء)

پر دونوں خواتین کو ۷۰۔ کلفٹن بحفاظت پہنچا دیا گیا۔ جہاں اب وہ رہا ہو چکی تھیں۔
ابتداء میں ہم نے سوچا کہ پیپلز پارٹی کی سینئر قیادت زیر زمین چلی گئی ہے۔ اور اپنے آپ کو دوبارہ تیار کرنے میں مصروف ہے۔ تاکہ مارشل لاء حکومت کے ساتھ ٹکر لے سکے۔ ہمیں یقین تھا کہ مارشل لاء کی حکومت کے خلاف تحریک ختم نہ ہو گی۔ لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا کہ کسی صورت سستی کا مظاہرہ نہ کیا جائے۔ ضلعی سطح پر ہمارے اجلاس عام ہو گئے۔ تاکہ اپنی ذمہ داری کے علاقہ میں بنیادی طور پر امن اور سکون کو یقینی بنانے کے طریقے اپنانے پر سوچ بچار کیا جائے۔ ہمارا کام یوں آسان ہو گیا کہ پیپلز پارٹی کے بعض کٹر حامیوں نے رضا کارانہ طور پر ضلعی سطح پر مارشل لاء حکومت سے تعاون کرنا شروع کر دیا جو اگلے مہینوں میں اعلانات سے ثابت ہوا۔ اس مقام پر ثابت ہو گیا کہ ہم شخصیت پرست معاشرہ میں رہتے ہیں۔ طاقت رکھنے والا ہی اہم ہوتا ہے۔ مسٹر بھٹو رخصت ہو گئے اور جنرل ضیاء آ گئے۔ جنرل ضیاء اور اس کی قربت حاصل کرنے کے لیے ایک تیز دوڑ کا آغاز ہو گیا۔ یہ مثال کس قدر درست ہے کہ جب جہاز ڈوبنے لگتا ہے تو چوہے جہاز چھوڑ جاتے ہیں۔

راجہ بازار کا دھماکہ

بھٹو کی پھانسی کے چند ہفتے بعد میں ڈپٹی کمشنر کے ہمراہ ڈسٹرکٹ کونسل ہال میں انجمن تاجران کی پرائس کمیٹی کے اجلاس میں شریک تھا۔ ۱۰:۳۰ بجے کے قریب ایس ایس پی مسٹر برکی کو اطلاع ملی کہ باغ سرداراں میں دھماکہ ہوا ہے جس سے کئی عمارات منہدم ہو گئی ہیں۔ دھماکہ کی وجہ فوری طور پر معلوم نہ ہو سکی۔ ہم نے اجلاس منسوخ کر دیا اور واقعہ کی جگہ کی جانب بھاگ کھڑے ہوئے۔ پہنچنے پر معلوم ہوا کہ رضا کاروں کی امدادی کارروائیاں جاری ہیں۔ ملبے سے لاشوں کو نکالا جا رہا ہے اور زخمیوں کو ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال میں پہنچایا جا رہا ہے۔ اس وقت کاروباری اور تاجر برادری کے افراد رضا کارانہ طور پر ضلعی انتظامیہ کی نگرانی میں امدادی کام کر رہے تھے۔ امدادی کارروائیوں میں میونسپل کمیٹی، ہلال احمر اور کنٹونمنٹ بورڈ نے بھی پوری مدد کی۔ ایس ایس پی برکی کی ہدایات کے باعث ٹریفک جاری کر دی گئی۔ انہوں نے تماشائیوں سے کہا کہ وہ وہاں سے چلے جائیں کیونکہ ان کی موجودگی امدادی کاموں میں رکاوٹ پیدا کر رہی تھی۔ ملبے کو ہٹانا سنگین مسئلہ تھا۔ چنانچہ میں نے سٹیشن کمانڈر راولپنڈی کرنل ایس۔ کے۔ ٹریسلر کو کہا کہ ملبے کو ہٹانے میں امداد فراہم کریں۔ انہوں نے فوراً اس مسئلے کے حل کے لئے ڈوزرز پہنچا دیئے جس سے صفائی کی کارروائیاں شروع ہو گئیں۔ آدھی رات کے قریب سڑک کو صاف کر دیا گیا اور ٹریفک مکمل طور پر بحال ہو گئی۔

سعید مہدی نے ان لوگوں کے لیے خوراک اور خیموں کا بندوبست کیا جو دھماکے سے بچ تو گئے لیکن ان کے گھر تباہ ہو گئے۔ خیموں کو گورنمنٹ کمرشل کالج میں لگایا گیا اور خوراک کا بندوبست مقامی بہبودی اداروں نے کیا۔ لوگوں نے انتسابی جذبہ کے ساتھ کام کیا۔ اور ایسا نظر آیا کہ وہ متاثرہ افراد کو امداد بہم پہنچانے کے جذبہ سے سرشار ہیں۔ ضلعی انتظامیہ کے ہمراہ ہم نے زخمیوں کو ہسپتال میں دیکھا اور یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ طبی امداد کے انتظامات تسلی بخش تھے۔ مریضوں کو کوئی شکایت نہ تھی۔ انہوں نے دیکھ بھال کے معیار کے متعلق کوئی شکایت نہ کی۔ ہم کئی مرتبہ ان لوگوں کو ملے جن کے گھر تباہ ہو چکے تھے۔ اور ٹینٹوں میں قیام پذیر تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ اتنے سکون کے ساتھ وقت نہیں گزار رہے تھے۔ جیسا کہ انہیں اپنے گھروں میں حاصل ہوگا۔

کچھ عرصہ کے بعد ایک رہائشی علاقہ جہاں پانچ مرلہ کے پلاٹ تھے، کا افتتاح ہوا اور لوگوں کیلئے کمشنر ایف آئی ملک نے ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کے توسط سے مکانات تعمیر کرنے کے لیے آسان قسطوں پر قرضوں کا بندوبست کیا۔ نئے گھروں کی تعمیر کے لیے یہ اقدامات بے حد سودمند ثابت ہوئے۔

جنرل سوار کی ناراضگی

پنجاب کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر (ایم ایل اے) جنرل سوار دھماکہ کے تین روز بعد راولپنڈی تشریف لائے ہم نے اسلام آباد بین الاقوامی ہوائی اڈہ پر ان کا استقبال کیا۔ ان کے ٹھنڈے رویہ کے برعکس جو پہلے ان کے متواتر پرجوش مصافحہ سے نظر آیا کرتا تھا، وہ ناراض اور پریشان نظر آئے۔ وہ سیدھے دھماکہ والی جگہ کی طرف روانہ ہوئے تاکہ تباہی سے نقصان کی حد کا اندازہ کر سکیں۔ اس کے بعد زخمیوں کو ملنے کی خاطر وہ ہسپتال گئے۔ اس کے بعد وہ گورنر کی رہائش گاہ پہنچے۔ ان کے ہمراہ انسپکٹر جنرل پولیس حبیب الرحمٰن تھے۔

عام پروٹوکول یہ تھا کہ ایم ایل اے کا استقبال کر کے انہیں سیدھا گورنر کی رہائش گاہ لے جایا جاتا۔ جہاں وہ دفتری کام بھی کرتے تھے۔ استقبالیہ کمیٹی میں ڈی ایم ایل اے میجر جنرل صغیر، ایف آئی ملک کمشنر، اصغر ملک ڈی آئی جی پولیس، سعید مہدی ڈپٹی کمشنر، جہانزیب برکی ایس ایس پی اور میں شامل ہوتے۔ عام دستور کے مطابق ہم ایم ایل اے کو لے کر گورنر کی رہائش گاہ لے جاتے جہاں ان کے ساتھ غیر رسمی باتیں ہوتیں۔ جنرل ہمیشہ خوشگوار موڈ میں ہوتے۔ اور امن وامان کی حالت کے متعلق دریافت کر کے اجلاس کا آغاز کرتے۔ سینئر فوجی اور سول افسران کی موجودگی میں راولپنڈی انتظامیہ سے تعلق رکھنے والے افسران خاموشی سے بیٹھے رہتے۔ جب تک ہم سے کچھ پوچھا نہ جاتا۔ لیکن اس مرتبہ جنرل سوار بے

حد غصہ میں تھے اور انہوں نے پوری انتظامیہ کو جھڑکیاں دینی شروع کر دیں۔ اور کہا کہ اس دھماکہ کو روکنے میں ہم سب نا کام رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ضلعی انتظامیہ کو چاہیے تھا کہ پیشگی اس دھماکہ کو روکنے کیلئے سوچ بچار کر لیتے۔ خصوصاً اس لئے کہ تھوڑے دن پہلے ہی اس قسم کا دھماکہ لاہور میں ہو چکا ہے اور یہ دھماکہ بہت سی اموات کا سبب بنا ہے اور اس طرح کئی بچے یتیم ہو گئے ہیں۔ بہت سے خاندان بے گھر ہو چکے ہیں۔ یہ سب کچھ آپ لوگوں کی لا پرواہی کے باعث ہوا ہے۔ میں نے بے حد سنجیدگی سے اس پر غور کیا ہے میں آپ کے فرائض میں غفلت کو تسلیم نہیں کرتا۔ آپ لوگوں کو اس نقصان کیلئے جواب دینا ہوگا۔

ایف آئی ملک کمشنر راولپنڈی ڈویژن نے کچھ کہنا چاہا مگر جنرل سوار نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ اپنے فرائض کو نہیں جانتے۔'' اور ساتھ ہی انہوں نے انسپکٹر جنرل کو کہا کہ ایس ایس پی کو فوراً تبدیل کر دیں اور کسی دوسرے آفیسر کو فرائض سنبھالنے کے لیے تعینات کیا جائے۔ انہوں نے چیف سیکرٹری مسعود نبی نور کو ایسی ہی ہدایات ٹیلی فون پر دیں اور کہا کہ ڈپٹی کمشنر سعید مہدی کو بھی فوراً تبدیل کر دیا جائے۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر لاہور میں ہونے والے دھماکہ کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ انتظامیہ نے کیوں نہیں پیشگی انتظامات کر لئے۔

جنرل سوار کی مایوسی اور دکھ مناسب تھے۔ لیکن عملاً یہ سوال اٹھتا تھا کہ انتظامیہ کس طرح پیشگی جان لیتی کہ دھماکہ ہونے والا ہے اور یہ کہ کس طرح مستقبل میں اسے روکا جا سکتا تھا۔ وہ دھماکہ جو باغ سرداراں میں ہوا اتفاقاً آگ لگنے کے سبب آتش بازی کا سامان بنانے والے کے گھر آگ بھڑکنے کے باعث ہوا۔ اس شخص کی رہائش نچلی منزل میں تھی۔ جہاں کثیر آبادی موجود تھی۔ عمارت میں تین چار منزلیں تھیں۔ عمارت پرانی تھی اور گھنی آبادی میں موجود تھی۔ راولپنڈی انتظامیہ کو کسی ایسے قانون کا علم نہ تھا۔ جس کے تحت گھنی آبادی میں آتش بازی کا سامان بنانا غیر قانونی قرار دیا جاتا۔ اور میونسپل حدود میں اس کی اجازت روک دی جاتی۔ جنرل سوار نے کسی قانون کا حوالہ نہ دیا جسے ہم لاگو کرتے۔ آتش بازی کا استعمال خاص طور پر تہواروں میں پاکستان کے شہروں میں کثرت سے ہوتا ہے۔ اندریں حالات ایسے ماحول میں انتظامیہ کس طرح پیشگی ہونے والے اس المیہ کے متعلق اندازہ لگا لیتی۔ مارشل لاء کی حکومت نجی کاموں پر کسی قانون کی غیر موجودگی میں کس طرح پابندی لگاتی۔

راولپنڈی ضلع کی انتظامیہ دن اور رات اپنے علاقہ میں امن وامان قائم رکھنے کی پابند تھی۔ تا کہ اس میں خلل نہ پڑے۔ لیکن مسٹر بھٹو کے پھانسی پانے کے بعد ہم متواتر ہوشیار تھے۔ حساس ادارے غیر موثر ثابت ہو رہے تھے اور ہمیں بروقت کوئی اطلاع فراہم نہیں کر رہے تھے۔ کسی ہونے والے اور متوقع حادثات کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ نیز مارشل لاء انتظامیہ کے اونچے عہدہ دار ہمیں گڑبڑ کرنے

والوں کے خلاف سخت کارروائی کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ انہیں خدشہ تھا کہ ان سے ہمدردی رکھنے والے وسیع پیمانے پر گڑبڑ شروع کر دیں گے۔ چنانچہ مارشل لاء کے اعلیٰ عہدہ دار اسے صحیح انداز میں لاگو کرنے سے گریزاں تھے۔

بھٹو کی پھانسی کے بعد مارشل لاء حکومت نے سول حکومت کے ماتحت عدالتوں کو مسائل کے حل کے لیے وسیع اختیارات دینے شروع کر دیئے۔ یہ امید ختم ہو گئی تھی کہ طریق کار میں آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ لہٰذا مارشل لاء حکومت نے ازخود اپنے اختیار کے دائروں کو محدود کر لیا۔ ہم نے پہلے ہی مارشل لاء کے شکایات کے دفتر کو ختم کر دیا تھا۔ اس قسم کی سہولیات اور کارروائیوں کو مارشل لاء حکومت کا سختی سے ختم کر دینا کسی صورت عوام کے لیے مفید نہ تھا۔ ڈی ایم ایل اے تو ایم ایل اے کے نائب تھے۔ اگر ایم ایل اے کو اپنے صوبہ میں انتظامات چلانے کے لیے وسیع اختیارات حاصل تھے تو ان کے نائب کو بھی شہری سرحدوں کے اندر ایسے ہی اختیارات ملنے چاہئیں تھے۔ اسی طرح ایس ایم ایل اے کو بھی اپنے زیر اختیار ضلع میں ذمہ داریاں پوری کرنے کا اہل ہونا چاہیے تھا۔ صرف نام کا ہی سربراہ ہونے سے تو مارشل لاء کے اثرات کو حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

امن و امان کی بگڑتی ہوئی صورت جس کا ہمیں تجربہ ہو رہا ہے، اس کی بڑی وجہ آج تک صلح کی حکمت عملی ہے جسے پاکستان میں مختلف حکومتوں نے اپنایا ہے جس میں مارشل لاء کی حکومت بھی شامل ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شخصیات کو قانون سے طاقتور بنا دیا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ حساس ادارے تعاون سے گریز کرتے ہیں۔ اور اس طرح ہمیں جرائم پیشہ افراد کے منصوبوں کا بروقت علم نہیں ہوتا۔ حساس ادارے تو انتظامیہ کے کان اور آنکھیں ہوتی ہیں۔ انہیں تو انتظامیہ کو سب سے اول مطلع کر دینا چاہیے۔ تاکہ گڑبڑ پھیلانے والوں کے منصوبوں کو خاک میں ملایا جا سکے۔ غالباً وہ تو اپنی کمانڈ کو ہی اطلاعات فراہم کرنے کو ترجیح دیتے ہیں اور ہمیں قیمتی اطلاعات میں حصہ دار نہیں بناتے۔ نتیجتاً انتظامیہ کو زک پہنچتی ہے۔ چنانچہ جب جنرل سوار نے ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کے فوری تبادلوں کے احکامات جاری کئے تو میں جانتا تھا کہ وہ ناراض ہیں۔ لیکن انہیں ان رکاوٹوں کا علم نہ تھا جس کا ہمیں سامنا تھا۔ اور اس کے باوجود ہم پورے جذبہ سے اپنی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔

لیکن جس بات نے مجھے زیادہ حیرت زدہ کر دیا، وہ یہ تھی کہ انسپکٹر جنرل پولیس اور ڈی ایم ایل اے کی طرف سے کسی قسم کا احتجاج نہ کیا گیا۔ انہوں نے تو ان افسران کے اچھے کام خاک میں ملا دیئے۔ چنانچہ میں نے ایم ایل اے سے کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہی۔ میں نے کہا: ''جناب عالی! آپ کے احکامات بجا احکامات ہیں' لیکن جناب! ہماری مشکلات کا تو جائزہ لیں۔ ہمیں کسی بھی

منبع سے امداد نہیں ملی۔ اور نہ ہی آپ (ایم ایل اے) کے ہیڈ کوارٹر سے گڑ بڑ پھیلانے والوں کے ارادوں کا ہمیں علم ہوا۔ ہم تینوں نے اپنی بہترین صلاحیتوں کے مطابق خدمات سرانجام دیں۔ اور راولپنڈی میں خوفناک ماحول میں امن و امان کو قائم رکھا۔ جسے مسٹر بھٹو کے تختہ دار پر لٹک جانے کے بعد پیدا کیا گیا تھا۔ اپنی زندگیوں کو داؤ پر لگا کر سخت رکاوٹوں میں ہم کام کر رہے ہیں اور اپنے فرائض ادا کر رہے ہیں۔ محافظوں کے بغیر ہم دھمکیوں کا سامنا کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس ہتھیار نہ ہونے کے برابر تھے۔ ہم نے بپھرے ہوئے ہجوموں کا بغیر ہتھیاروں کے سامنا کیا۔ ہم نے کسی سمت سے امداد کے لیے نہیں پکارا خواہ یہ ڈی ایم ایل اے ہوں یا سی ایم ایل اے۔ ہم نے اپنی سماجی اور خاندانی سرگرمیوں کو بالائے طاق رکھا اور دن رات اپنے آپ کو مستعد اور تیار رکھا۔ تاکہ ہماری ذمہ داری کے علاقہ میں امن و امان کو برقرار رکھا جائے۔ اور یہ قابو میں رہے۔ یہ تباہ کن دھماکہ محض حادثہ تھا، سبوتاژ نہیں۔ سالہا سال سے لوگ آتش بازی کے کاروبار کو چلا رہے ہیں۔ ان تمام سالوں میں حکومت پنجاب کی جانب سے کسی شخص نے نہ ان پر پابندی لگانے کی سفارش کی۔ اور نہ ہی لاہور کے دھماکہ کے بعد ایسا ہوا۔ ہماری اور ہمارے خاندانوں کی زندگیوں کو بڑے سے بڑا خطرہ ہمارے اعصاب پر دباؤ نہ ڈال سکا۔ اس کے باوجود آپ میرے ساتھیوں کی خدمات کو فراموش کر رہے ہیں۔ جناب عالی! آج مجھے کہنے دیجئے کہ سعید مہدی اور جہانزیب برکی کی خوبیوں کا اندازہ لگانے کے لیے میں ہی ایک فرد ہوں۔ کیونکہ میں نے دن کا بیشتر حصہ ان کے ساتھ گزارا ہے۔ ہمیں اس قسم کے زندگیوں کو وقف کرنے والے افراد پر فخر کرنا چاہیے۔ ہم ایک متحد ٹیم کی طرح کام کر رہے ہیں۔ مہربانی فرما کر اس انتظام کو تبدیل نہ کریں۔ ازراہ کرم اپنے احکامات پر نظر ثانی فرمائیں۔

خدا کا شکر ہے کہ جنرل سوار نے میری استدعا کو سنا۔ انہوں نے مکمل خاموشی سے میری باتوں کو سنا۔ انہوں نے دخل اندازی نہ کی۔ بلکہ مجھے بولنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ جب میں نے ختم کیا تو انہوں نے اپنا ارادہ تبدیل کر لیا تھا۔ انہوں نے اپنے احکامات واپس لے لیے۔ اور دونوں افسران کو معمول کے مطابق ایک جگہ خدمت کرنے کا موقع عطا کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد جہانزیب برکی کو ترقی دے دی گئی اور وہ بطور ڈی آئی جی پولیس ٹریفک لاہور چلے گئے بعد میں سعید مہدی کا تبادلہ بھی لاہور ہو گیا۔

ان کی جگہ نذیر احمد چوہدری بطور ڈپٹی کمشنر اور اسلم ملک بطور ایس ایس پی آئے۔ میں نے ان دونوں کو مارشل لاء ٹیم میں بہترین رکن پایا۔ ہمیں اپنے تعلقات کار میں کوئی مشکل یا دشواری پیش نہ آئی۔ مجھے ان سے تعلقات پر ہمیشہ فخر رہا ہے۔ ہم اپنے تعلقات کو پروان چڑھانے کے لیے ابھی کوششیں کر ہی رہے تھے کہ مجھے کھاریاں میں تبدیل کر دینے کے احکامات موصول ہوئے۔

میجر جنرل کا عہدہ

17انفنٹری ڈویژن کی قیادت

اپریل ۱۹۷۹ء میں میرا نام بھی اس فہرست میں شامل تھا جنہیں میجر جنرل کے عہدہ پر ترقی دینے کے لیے غور کیا جانا تھا۔ انتخابی بورڈ کی ترتیب کچھ ایسی تھی کہ اس میں تمام کور کمانڈر، تمام پی۔ ایس اوز اور ڈائریکٹر جنرل انٹر سروسز انٹیلی جنس شامل تھے۔ صدارت کے فرائض چیف آف دی آرمی سٹاف کے ذمہ تھے۔ بورڈ کی کارروائی کے اختتام پر مجھے ملٹری سیکرٹری کے دستخط شدہ خط سے اطلاع دی گئی کہ مجھے میجر جنرل کے عہدہ پر ترقی کے اہل قرار دے دیا گیا ہے۔ میرے اور میرے اہل خانہ کے لئے یہ بہت خوشی کا مقام تھا۔ لیکن اگلی تقرری کے بارے میں ابھی تک مجھے کوئی بھی حکم نامہ موصول نہیں ہوا تھا۔ کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل چشتی کے اے ڈی سی کا فون موصول ہوا۔

افتخار: ''ہیلو جناب! آپ کیسے ہیں؟''

میں: ''ہیلو افتخار: میں ٹھیک ہوں شکریہ۔ آج آپ نے مجھے کیسے یاد کیا؟ مجھے امید ہے ہر طرح سے خیریت ہے۔''

افتخار: ''سب کچھ ٹھیک ہے، کمانڈر آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

میں: ''شکریہ''

چشتی: ''ہیلو راحت آپ کیسے ہیں؟''

میں: ''بہت اچھا ہوں جناب شکریہ۔''

چشتی: ''کیسے حالات ہیں؟''

میں: ''سب اچھا، اللہ کا شکر ہے۔''

چشتی: ''آپ کو میجر جنرل کے عہدہ پر ترقی کی مبارک ہو۔''

میں: ''شکریہ جناب! آپ بلاشبہ بہت مہربان ہیں۔''

چشتی: ''آپ مکمل طور پر اس کی اہلیت رکھتے تھے۔''

میں: ''شکریہ جناب آپ کی مہربانی ہے۔''

چشتی: ''مجھے اُمید ہے کہ تعیناتی کے احکامات جلد نکل آئیں گے۔''

میں: ''جناب! میں کہاں جا رہا ہوں؟''

چشتی: ''مجھے معلوم نہیں۔ چند روز میں احکامات نکل آئیں گے۔''

میں: ''شکریہ''

چند روز کے بعد مجھے ایس ایم ایل اے کے دفتر میں صدر جنرل ضیاء الحق کی طرف سے فون آیا۔''

A.D.C: جناب السلام علیکم۔ آپ کیسے ہیں؟''

میں: ''میں ٹھیک ہوں۔ شکریہ۔''

A.D.C: ''جناب! صدر آپ سے بات کریں گے''

صدر: ''ہیلو راحت صاحب! آپ کیسے ہیں؟''

میں: ''السلام علیکم۔ جناب! میں ٹھیک ہوں۔ شکریہ''

صدر: ''میری طرف سے مبارک باد۔ میجر جنرل کے لیے آپ کی توثیق ہوگئی ہے۔''

میں: ''شکریہ جناب! آپ بے حد مہربان ہیں۔''

صدر: ''آپ اور صغیر جنرل آفیسر کمانڈنگ (۶ آرمڈ ڈویژن) دونوں کھاریاں میں کام کر کے ایک اچھی ٹیم ثابت ہوں گے۔''

میں: ''یقیناً جناب!''

صدر: ''۱۷ ڈویژن ایک اہم کمانڈ ہے۔ اور یہ فوج کی ریزرو فارمیشن بھی اور مجھے یقین ہے کہ آپ بہت عمدگی سے کام کریں گے۔''

میں: ''ان شاء اللہ جناب! آپ کا بے حد شکریہ''

صدر: ''اس سے مارشل لاء کے فرائض سے بھی آپ کو آرام مل جائے گا۔''

میں: ''شکریہ جناب!''

صدر: ''خوش رہو اور اپنا خیال رکھیں۔''

۱۷ ڈویژن ایک قابل احترام کمانڈ تھی۔ ۱۷ ڈویژن جیسا کہ صدر نے کہا، فوج کا ریزرو ڈویژن تھا۔ اور حملہ کرنے والی فورس کا ایک اہم حصہ جسے آرمرڈ ڈویژن کے ساتھ مل کر دفاع کے فرائض

سنبھالنے تھے۔ یہ دونوں ڈویژن کھاریاں میں موجود تھے۔ اور مشترکہ فورس کے لحاظ سے ان میں گہری وابستگی موجود تھی۔ جیسا کہ ظاہر ہے میں جتنی جلد ممکن ہو، روانگی کے لیے تیار تھا۔ لیکن تحریری احکامات موصول ہوئے تو ان میں کہا گیا تھا کہ میں متبادل کے آنے کے بعد وہاں سے چلوں گا۔ بہرحال میرے متبادل کا فیصلہ ابھی نہ ہوسکا تھا۔ منگلا میں کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل غلام حسین نے ان کی سٹرائیک کور میں آنے پر مجھے خوش آمدید کہا۔ انہوں نے مجھ سے یہ بھی دریافت کیا کہ وہ میرے لیے کیا کر سکتے تھے۔ اور انہوں نے جلد کمانڈ سنبھالنے کی اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ کیونکہ ۱۷ ڈویژن کو چھوڑنے والے کمانڈر میجر جنرل غلام محمد ریٹائرمنٹ پر جا رہے تھے۔ میں بظاہر اپنی مرضی پر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ بالآخر ۱۷ ڈویژن کی کمان سنبھالنے کے لیے مجھے احکامات موصول ہو گئے۔ ساتھ ہی کہا گیا کہ بریگیڈ کی کمانڈ نئے آنے والے کمانڈر کو سپرد کرنے کی خاطر راولپنڈی واپس آئیں۔ میں ایک روز کے لیے منگلا گیا تا کہ میجر جنرل کے عہدہ کا نشان زیب تن کر سکوں۔ میں جنرل غلام محمد کو ملنے کے لیے کھاریاں بھی گیا جو اسی روز ریٹائرمنٹ پر جا رہے تھے۔ میں شام تک راولپنڈی واپس آ گیا۔

اگلے چند ہفتوں میں نئے بریگیڈ کمانڈر کی تعیناتی کر دی گئی۔ ان کا اسم گرامی بریگیڈیئر ملک سرفراز تھا۔ جو راولپنڈی میں لاجسٹک ایریا کمانڈر کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ میں نے ان کو بریف کیا اور کھاریاں روانہ ہو گیا۔ چونکہ وہ پہلے ہی تجربہ کار فوجی تھے لہٰذا ان کو بریف کرنے کے لیے زیادہ وقت درکار نہ تھا۔

سب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے فرائض سے سبکدوش ہونے پر میں خوش تھا۔ یہ بہت بڑی تبدیلی تھی۔ اور مجھے ذہنی طور پر آسودگی کا احساس ہوا۔ اب میں اپنی پیشہ ورانہ کمانڈ کے فرائض پر متوجہ ہوسکتا تھا۔ ڈویژن مخصوص وقت کیلئے مشترکہ تربیتی سرکیمپ کی خاطر باہر جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اگلے سال ۱۹۸۰ء میں بے شمار مطالعاتی پیریڈ منعقد کرنے کا منگلا میں کمانڈر فرسٹ کور نے ہدایات بھیج دی ہوئی تھی۔

ڈویژن کو مختلف دفاعی کام سونپے گئے۔ ہر کام کے لیے ماڈل روم مباحثوں کا توجہ کے ساتھ مطالعہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں نقشوں اور فوجی دستوں کی تربیت شامل کی جاتی ہے۔ میں خوش قسمت تھا کہ میرے ساتھ بے حد لائق کمانڈرز موجود تھے۔ مثلاً بریگیڈیئرز اسلم، مشتاق، اجمل اور یونس جنہوں نے بڑی جانفشانی کے ساتھ ان کاموں اور تربیت کی منصوبہ بندی میں دلجمعی سے حصہ لیا۔ انہوں نے اپنی اپنی کمانڈ میں مقررہ عملی حالات میں کام کیا۔ میں نے بہت سے مواقع پر دیکھا کہ رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے تربیت کے اعلیٰ معیار کو یقینی بنانے کے لیے انہوں نے متواتر دو دو راتوں کو آرام نہ کیا۔ ایک مرتبہ تربیت کے دوران بریگیڈیئر اجمل کمر کی سخت درد کے باوجود اپنے علاقہ میں

کمانڈ کے فرائض جاری رکھنے پر بضد رہے۔ مجھے انہیں آرام کرنے کی خاطر قائل کرنا پڑا۔ تاکہ درد میں اضافہ نہ ہوجائے۔ ڈویژن کے تمام سٹاف افسران بھی برابر تربیتی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے کرنل قادر جو کرنل سٹاف تھے، ڈویژنل ہیڈ کوارٹر میں اعلیٰ رابطہ کار تھے۔ جو سٹاف کی سرگرمیوں کا خیال کرتے۔ انہوں نے تمام سٹاف افسران کو ہمیشہ تیار رکھا۔ تمام سطحوں پر کمانڈروں میں نہایت عمدہ تعلقات کو برقرار رکھنے کے لیے اعلیٰ صفات رکھتے تھے۔ میری ذاتی انتظامیہ کا مناسب انداز میں خیال رکھنے کے لیے میرے ہوشیار اے ڈی سی کیپٹن محمود (بعد میں بریگیڈئر) ان کو جرمنی لینگوئج کے لیے بھیج دیا گیا ان کی جگہ کیپٹن عمران یوسف نے لی جو نہایت ذہین اور سمارٹ آفیسر تھے۔ دونوں اے۔ ڈی۔ سی شاندار ثابت ہوئے۔ ان کا تعلق میری پلٹن 10FF سے تھا۔

ہم نے ڈویژن کے اندر بے شمار بہبودی کے اقدامات کئے۔ جس کا میں اپنی بیگم عصمت کا بہت مشکور ہوں انہوں نے لیڈیز کلب اور ویلفیئر سنٹرز کی تمام تر ذمہ داری سنبھال لی۔ لیڈیز کلب کے تمام ممبران خصوصی تعریف کی مستحق ہیں۔ جن کی عملی مدد اور لگن کے بغیر مقررہ ہدف پورا ہی نہ ہوسکتا تھا۔ فیملی ویلفیئر سینٹرز فوجیوں کے خاندانوں کے لیے تمام سرگرمیوں کے مرکز بن گئے۔ پرائمری سکول ''نونہال'' جس کی ابتدا بریگیڈیئر اسلم (بڈی) اور اس کے ساتھیوں نے کی ان وقتوں کی ایک خصوصی پیشکش تھی۔ جس نے مختصر عرصہ میں تعلیم کا اعلیٰ معیار حاصل کیا۔

ہم نے منگلا میں جنگی مشقوں کو ختم کیا ہی تھا کہ کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل غلام حسن نے مجھے سرگودھا ڈویژن میں مارشل لاء فرائض سنبھالنے کو کہا۔ مجھے میجر جنرل اے مجید جو ۸ ڈویژن سیالکوٹ کے کمانڈنگ آفیسر تھے اور اب لیفٹیننٹ جنرل کے عہدہ پر ترقی پا کر پشاور جا رہے تھے، سے چارج لینا تھا۔ میں نے فوجی انداز میں نرمی کے ساتھ احتجاج کیا۔ کیونکہ مارشل لاء کے فرائض کے لئے مجھے سرگودھا میں ڈیوٹی سرانجام دینی تھی۔ اس کے برعکس راولپنڈی میں میری مارشل لاء ڈیوٹی راولپنڈی میں ہی تھی جہاں کہ میری کمانڈ تھی۔ اس لئے مارشل لاء کا کام میری فوجی کمانڈ میں دخل انداز نہ ہوسکا۔ فوج میں احکامات ہوتے ہیں۔ میں حکم تو بجالایا لیکن ایک شرط پر یعنی یہ کہ مجھے فوجی ہوائی جہاز سرگودھا مارشل لاء ڈیوٹی کے سلسلہ میں آنے جانے کے لیے مل جایا کرے گا۔

ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سرگودھا

اگرچہ ہوائی جہاز میں سفر کرنے کی درخواست منظور کر لی گئی لیکن بعض اوقات کسی ایک یا دوسرے سبب کے باعث مجھے جہاز نہ ملتا۔ ان حالات میں طویل اور تھکا دینے والے سڑک کے راستہ ڈی ایم

ایل اے کے ہیڈ کوارٹر سرگودھا کی جانب چل پڑتا۔ اس میں سرگودھا، میانوالی، جھنگ اور فیصل آباد کے اضلاع شامل تھے۔ ہر ضلع کی اپنی مخصوص خوبیاں تھیں۔ گنجان آبادی والا ضلع فیصل آباد تھا۔ یہ صنعتی علاقہ ہے جو کپڑے کے کاروبار کا مرکز ہے۔ یہاں ہمیشہ امن و امان کے مسائل اٹھ کھڑے ہوتے۔ جس کی وجہ مزدور طبقہ کی وہاں بڑی تعداد تھی۔ بعض علاقوں میں مسلسل فرقہ وارانہ مسائل رہتے۔ مثلاً شیعہ سنی اور احمدیہ سنی کے جھگڑے عام ہوتے۔ سرگودھا کے قریب ہی ربوہ واقع تھا جو احمدیوں کی بہت بڑی درس گاہ ہے۔ دو سال بطور ڈی ایم ایل اے سرگودھا ڈویژن میں اکثر اوقات کشیدہ لمحات آئے۔ ہمیں ہمیشہ فرقہ وارانہ کشیدگی کا فکر رہتا۔ جب ربوہ میں احمدیوں کا سالانہ اجتماع ہوتا۔ بالکل انہی ایام میں سنی اپنا اجتماع کرتے جسے ختم نبوت (رسالت کا اختتام) کہا جاتا۔ اور یہ چنیوٹ میں منعقد ہوتا۔ ان دو جوشیلے فرقہ وارانہ مراکز کو صرف دریائے چناب الگ الگ کرتا۔ علاوہ ازیں ماہ محرم میں ہمیشہ بلوؤں کا خطرہ ہوتا۔ جھگڑوں کے مراکز میانوالی، بھکر اور جھنگ تھے۔ فیصل آباد بھی گرم مرکز تھا۔ اور جیسا کہ میں نے بتایا یہ صنعتی علاقہ کے سبب گھنی آبادی کا علاقہ تھا۔ اور یہاں مزدور طبقہ آباد تھا۔ ایگریکلچرل یونیورسٹی اور میڈیکل کالج بھی یہاں موجود تھے۔ اور یہ طلبہ کی ہڑتالوں کے مراکز تھے۔ دونوں میں سے ایگریکلچرل یونیورسٹی زیادہ خطرناک مرکز تھا۔ کیونکہ یہاں انتظامیہ بھی ان کاموں میں ملوث ہوتی تھی۔

یہاں بعض طلبہ ہوسٹلوں میں قیام پذیر تھے اور وہ 'فائر برانڈ' ہڑتالی تھے۔ پڑھائی میں تو ان کی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ صرف یونیورسٹی کی سرگرمیوں میں نمایاں نظر آنا چاہتے تھے۔ ہوسٹلوں میں جرائم پیشہ ذہن رکھنے والے طلبہ ہوتے۔ جن کے پاس اسلحہ اور دیگر ہتھیار ہوتے جنہیں عام استعمال میں لایا جاتا۔ یونیورسٹی اور ہوسٹلوں میں برادری، (قبائلی وفاداری) کا غلبہ ہوتا۔ ہوسٹلوں میں عرصہ دراز سے مقیم طلبہ موجود ہوتے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان سستے کوارٹروں میں وہ کب سے مقیم تھے۔ انہیں ڈگری یا امتحانات کے پاس کرنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ وہ تو زیادہ سے زیادہ دیر تلک ہوسٹلوں میں بطور طلبہ پیشہ ور غنڈے بن کر رہنا پسند کرتے۔ یونیورسٹی کی انتظامیہ پر کلیتاً ذمہ داری نہیں ڈالی جا سکتی۔ کیونکہ حکومت مناسب ڈسپلن لاگو کرنے کے لیے ضروری امداد فراہم نہیں کرتی۔ ایک موقع پر سٹوڈنٹ یونین کے دو مخالف گروہوں نے ایک دوسرے پر فائرنگ کر دی۔ بہت سے سخت زخمی ہو گئے۔ مارشل لاء انتظامیہ نے وائس چانسلر کو پوری پوری امداد کا یقین دلایا کہ وہ یونیورسٹی کے قانون کے مطابق جرائم پیشہ افراد کے خلاف قدم اٹھائے۔ یونیورسٹی انتظامیہ نے با دل نخواستہ کیمپس میں موجود جرائم پیشہ افراد کے خلاف کارروائی کی۔ کیونکہ انہیں ان کے ردعمل کی فکر لاحق تھی، یونیورسٹی بند کر دی۔

ہوسٹل خالی کروالئے گئے۔ اور بعض کے خلاف مقدمات درج ہو گئے۔ نئے وائس چانسلر میاں ممتاز کا تقرر عمل میں آیا۔ جنہیں امداد کی یقین دہانی کروائی گئی۔ اس مرحلہ کے بعد ہمیں یونیورسٹی میں کسی ناخوشگوار واقعہ کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

مجھے ڈویژن کی سطح پر مختلف محکموں کے سربراہوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ میری آمد کے بعد چند روز تک میں نے محبوب احمد کمشنر اور ملہی ڈی آئی جی کے ساتھ کام کیا۔ کچھ عرصہ بعد کمشنر کے چلے جانے پر حسن رضا پاشا نے چارج سنبھالا۔ وہ نہایت خوبرو اور چاک وچوبند آفیسر تھے۔ میں نے ہمیشہ ان کے مشورہ کی قدر کی۔ انہوں نے اس سے قبل سرگودھا کے ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ جس کے باعث وہ جاگیردار معاشرہ کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ایک سال بعد ان کی تبدیلی ہوگئی اور ان کی جگہ میاں اظہر آئے۔ وہ شریف النفس انسان تھے۔ ذاتی فائدہ کی خاطر کسی کے سامنے نہ جھکے۔ وہ اکثر بے حد ذہانت پر مبنی منصوبے بنایا کرتے۔ جس کے سبب لوگوں کے رہن سہن میں ترقی ہوتی۔ ان کی کوششوں کے باعث دودھ حاصل کرنے کے لیے مراکز قائم ہوئے اور اس طرح دلالوں کی اجارہ داری کا خاتمہ ہوگیا، جو بے حساب مالی فائدہ بٹور رہے تھے۔

چھوٹے مالکان زمین کی ایک پرانی شکایت آبپاشی کے لیے پانی کی کمی سے متعلق چلی آ رہی تھی۔ انہوں نے اس شکایت کو رفع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ پانی کی گزرگاہوں میں ریت یا مٹی کی تہہ لگ جانے سے پانی کی مقدار خاصی کم ہو جاتی تھی۔ چونکہ پانی وقت کی بنیاد پر مہیا کیا جاتا تھا۔ اس لئے زمین کے مالکوں کو نتیجتاً پانی کی کافی مقدار حاصل نہیں ہوتی تھی۔ اظہر نے مقامی انتظامیہ کی مدد سے زمینداروں کو پانی کے کھالوں کو نئے سرے سے رضاکارانہ طور پر کھودنے کے لیے تیار کیا۔ زمینداروں نے جذبے کے ساتھ کام کیا اور اس کا انعام پایا۔ جب کھدائی کا کام ختم ہو گیا تو پانی کی کافی مقدار ان کھالوں میں چلنے لگی اور مقررہ وقت تک کافی پانی ملنے لگا۔ دن میں کئی گھنٹے کام ہونے لگا جب کام جاری تھا تو زمینداروں کو لگن کے ساتھ محنت کرتے ہوئے دیکھ کر بے حد مسرت ہوتی۔ ان کے چہروں پر مسکراہٹ ہوتی۔ وہ قہقہے لگاتے اور ایک دوسرے کے ساتھ مزاح میں کام کرتے۔ کیسٹ پلیئروں کے سبب دور تک رضاکار محنتی افراد کھائیوں کے کنارے جھومتے گاتے تھے۔ گورنر جنرل جیلانی کو دورے کی دعوت دی گئی۔ وہ اس عمدہ کام کو دیکھ کر یقیناً بے حد خوش ہوئے۔ یہ کام بنیادی طور پر محکمہ انہار کو سرانجام دینا تھا۔ لیکن افسوس کہ وہ زمینداروں کی ایک عرصہ سے چلی آنے والی شکایت کو رفع نہ کر سکے۔ لیکن اب وہ بے حد مسرور تھے۔

ملہی ایک عمدہ، نرم گو اور خدا ترس پولیس آفیسر تھے ان کی جگہ نور محمد لغاری بطور ڈی آئی جی تعینات

ہوئے۔ وہ خوبرو اور نڈر آفیسر تھے۔ مجھے ان کے ساتھ کام کر کے فرحت محسوس ہوئی۔ انہوں نے ہمیشہ کارآمد مشوروں سے نوازا۔

فرقہ وارانہ مسائل

قانون اور امن وامان کے نقطہ نظر سے انتظامیہ کے لیے محرم ہمیشہ سے انتہائی فکر کا باعث رہا ہے۔ سرگودھا ڈویژن میں فرقہ وارانہ مسائل کا خطرہ ہمیشہ ''عاشورہ'' کے دوران میانوالی اور جھنگ کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ جھنگ میں ہی اسی طرح کے ہونے والے دو واقعات کا ذکر خصوصی طور پر ضروری ہے تاکہ پڑھنے والے ان مسائل کی نوعیت اور ان سے انتظامیہ کے نپٹنے کے طریقہ کار کو ٹھیک انداز سے سمجھ سکیں۔

اسسٹنٹ کمشنر کا اغوا

ڈپٹی کمشنر شہزاد حسن اور سپرنٹنڈنٹ پولیس احمد نسیم کے درمیان زبردست مفاہمت تھی اور وہ کسی بھی قسم کی صورت حال سے نپٹنے کے لیے اپنے فرائض کی ادائیگی میں فرض شناسی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ یہ دس محرم کا واقعہ ہے جب جلوس امن سے اختتام پذیر ہو گئے تھے۔ تقریباً رات آٹھ بجے شہزاد نے یہ کہتے ہوئے مجھے پریشان کن اطلاع دی کہ زیدی صاحب اسسٹنٹ کمشنر شورکوٹ کو دیوبندی مدرسہ (جو شورکوٹ شہر کے مضافات میں واقع ہے) کے پانچ سو اسلحہ بردار اساتذہ اور طالب علموں نے اغوا کرلیا ہے۔ شہزاد اور نسیم وقوعہ کی جگہ پر تفتیش کرنے کے لیے فوراً پہنچے۔ یہ ایک خطرناک صورت حال تھی اور شورکوٹ میں کسی بھی غیر یقینی صورت حال سے نپٹنے کے لیے اضافی پولیس بھیجی گئی تھی۔ ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس چاہتے تھے کہ اسسٹنٹ کمشنر کو بذریعہ گفت وشنید بازیاب کروالیں لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ قانون کی بالادستی قائم رہنی چاہیے اور مدرسے میں محصور اسسٹنٹ کمشنر کو بازیاب کروانے کے لیے طاقت کا استعمال ضروری ہے۔ میں نے مکمل طور پر اس اقدام کی حمایت کی وہ کشمکش میں مبتلا تھے کہ انہیں اسی رات بازیابی کے لیے کارروائی کرنی چاہیے یا اگلے دن کا انتظار کرنا چاہیے۔ اس لمحے وقت ہی سب سے بڑی چیز تھی اور ذرا سی دیر زیدی صاحب کی زندگی خطرے میں ڈال سکتی تھی۔ لہٰذا انہوں نے اسی رات زیدی صاحب کو بازیاب کروانے کا فیصلہ کیا۔

مدرسے کے رہائشیوں کو پولیس کے ایک بڑے جتھے نے پہلے ہی ہلا کر رکھ دیا تھا جو ضلعی انتظامیہ کی جانب سے اتنے سخت اقدام کی توقع نہیں رکھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ محض مصالحانہ گفتگو کی جائے گی۔ ایک سرکاری ملازم کو اغوا کرنے اور اسے غیر قانونی طور پر حبس بے جا میں رکھنے کے نتیجے میں

ہونے والی قانونی کارروائی کے بارے میں سوچتے ہوئے مدرسہ کے رہائشیوں نے زیدی صاحب کو عقبی دروازے سے باہر نکال دیا۔ جب پولیس وہاں پہنچی زیدی صاحب وہاں موجود نہ تھے۔ کچھ دیر بعد ڈپٹی کمشنر کو زیدی صاحب کا فون آیا کہ وہ اپنے گھر پہنچ چکے ہیں۔ اس کارروائی میں کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

تحقیقات سے پتہ چلا کہ ایک مذہبی رہنما بشیر خا کی نے زیدی صاحب کے اغوا کا منصوبہ بنایا تھا۔ قانون نے اپنا طریقہ کار اختیار کرتے ہوئے مجرم کے ساتھ انصاف کے تقاضے پورے کیے یہ ایک دلیرانہ اقدام تھا، جس کی شہزادا اور نسیم نے قانون کے رکھوالوں کی حیثیت سے بذات خود مثال قائم کی۔ مجھے بتایا گیا کہ اس واقعے کے بعد سے شورکوٹ میں فرقہ واریت کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ شاباش شہزاد، شاباش نسیم۔

7 محرم اور بابِ عمر

جھنگ میں سات محرم کا دن 1969ء کے المناک واقعات کے بعد سے انتظامیہ کے لیے اہمیت کا حامل رہا ہے۔ جب پانچ قیمتی جانیں شیعہ سنی فسادات کی وجہ سے ضائع ہوئیں۔

اس سال جھنگ شہر میں روایتی جلوس کے راستے میں ایک دروازہ بنایا گیا تھا جس پر باب عمر کا نام لکھا گیا تھا۔ جلوس نے اس دروازے کے نیچے سے گزرنے سے انکار کر دیا اور اشتعال میں آ کر گیٹ پر لکھی تحریر کو مٹانے کی کوشش کی۔ صورت حال بہت خطرناک ہوگئی اور بھڑکتے ہوئے جذبات کے ساتھ بے دریغ فسادات شروع ہو گئے جس کے نتیجے میں پانچ افراد موت کے منہ میں چلے گئے۔ یہ ایک بڑا المیہ تھا اور ایسے کسی بھی واقعے کے دوبارہ رونما ہونے سے بچنے کے لیے آئندہ عاشورہ کے موقع پر جلوس کے گزرنے کا راستہ تبدیل کر دیا گیا (اور کہا گیا) کہ وہ (جلوس) بجائے گیٹ کے نیچے سے گزارنے کے اس کے قریب سے گزارا جائے۔ اگر چہ یہ سب کچھ متعلقہ مذہبی رہنماؤں کی باہمی رضا مندی سے طے ہوا تھا لیکن پھر بھی سات محرم کو جب جلوس دروازے کے قریب پہنچتا ہے تو تناؤ پیدا ہونا معمول بن چکا ہے۔

1980ء میں ایک مرتبہ پھر شر انگیز صورت حال میں انتظامیہ کے بروقت اقدام کی وجہ سے شر انگیزی کا رخ موڑ دیا گیا۔ 6 اور 7 محرم کی رات کو انتظامیہ کو یہ خبر ملی کہ جلوس کے راستے میں واقع ایک مسجد میں بڑی تعداد میں سنی اکٹھے ہو رہے ہیں۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ ایک مذہبی رہنما مولانا حق نواز اشتعال انگیز تقریر کر رہے تھے اور سنیوں کو 7 محرم کے جلوس کے خلاف اشتعال دلا رہے تھے۔ مولانا کا یہ منصوبہ علاقے میں امن وامان قائم رکھنے میں مزاحم ثابت ہوا اور یوں انتظامیہ کی فوری

توجہ کا موجب بنا۔ اس دوران شیعہ حضرات جو پہلے ہی مسجد کے قریب واقع امام بارگاہ میں مقررہ وقت پر اپنا جلوس نکالنے کے لیے موجود تھے، بہت دل گرفتہ اور مشتعل تھے اور انتظامیہ سے مداخلت کرنے یا بذات خود صورت حال سے نپٹنے کے لیے کہہ رہے تھے۔

ڈی سی شہزاد اور سپرنٹنڈنٹ نسیم فوری طور پر مسجد میں گئے اور سنی مذہبی لیڈروں کی تقریروں کے لیے استعمال ہونے والے سٹیج پر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے مولانا حق نواز کو اشتعال انگیز تقریر کرنے اور جلوس نکالنے سے روکنے کے لیے قائل کرنے کے تمام طریقے استعمال کیے۔ انہوں نے مولانا کو ان کے ارادے سے پیدا ہونے والے خطرے سے بھی آگاہ کیا مگر مولانا حق نواز نے ان کی اس تنبیہ کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ ان کا یہ عدم تعاون ان کے بلاوے پر مسجد میں بڑی تعداد میں اکٹھے ہونے والے لوگوں پر محمول ہو سکتا تھا جنہیں وہ اپنی طاقت سمجھتے تھے۔ امن کے لیے تمام تدابیر کے ناکام ہو جانے پر انتظامیہ نے ایک حتمی راستہ نکالا کہ مسجد میں غیر قانونی طور پر اکٹھے ہونے والے اجتماع کو منتشر کرنے کے لیے طاقت کا استعمال کیا جائے۔ پولیس نے کارروائی کی اور فتنہ پھیلانے والے رہنماؤں کو، جن میں مولانا حق نواز بھی شامل تھے، کچھ دیر حراست میں رکھا قانونی کارروائی کی گئی اور گرفتار ہونے والوں کے ساتھ قانونی تقاضوں کو پورا کیا گیا۔

شہزاد اور نسیم نے بروقت صحیح فیصلہ کر کے ممکنہ تباہی کا رخ بدل دیا۔ میں اس بات کا قائل ہوں کہ انتظامیہ کو خود مختاری اور مکمل تعاون دیا جائے تو وہ حیرت انگیز کارنامے انجام دینے کی اہل ہو سکتی ہے۔

مارشل لاء قوانین کے تحت مقدمات کی سماعت

میں ڈی ایم ایل اے کی حیثیت میں کسی بھی مقدمہ کی سماعت کی منظوری دے سکتا تھا جو مارشل لاء کے قوانین کے تحت آتا ہو۔ اسے سمری یا سپیشل ملٹری کورٹ میں کارروائی کے لیے بھیج سکتا تھا۔ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا دفتر لاہور میں تھا۔ ایم ایل اے سپیشل ملٹری کورٹ کی کارروائی کی توثیق کرتے تھے اور سمری ملٹری کورٹ کی میں کسی بھی سنگین قسم کے مقدمہ مثلاً قتل یا اغوا کو سماعت کے لیے خصوصی فوجی عدالت میں بھیج سکتا تھا۔ لیکن اس مقدمہ کی توثیق ایم ایل اے کے اختیار میں تھی۔ سپیشل ملٹری کورٹ تین افراد پر مشتمل تھی۔ جس میں صدر اور فوج کی طرف سے ایک رکن تیسرا رکن سول انتظامیہ سے مجسٹریٹ ہوتا۔ دونوں عدالتوں میں فرد جرم ڈپٹی جج ایڈووکیٹ جنرل تیار کرتا جسے ڈی ایم ایل اے کے ہیڈ کوارٹر میں تعینات کیا گیا تھا۔

وقت کے گزرنے کے ساتھ بھٹو کا خطرہ ناپید ہو گیا۔ ایم ایل اے ہیڈ کوارٹرز کی طرف سے مداخلت

آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ انہوں نے بعض مقدمات کو روک دیا اور مزید اطلاعات کے لیے کہنا شروع کر دیا۔ بعض اوقات تو وہ مقدمہ کی سماعت کے لیے سول کورٹ میں بھیجنے کا حکم جاری کر دیتے۔ یہ صورت حال پریشان کن تھی کیونکہ مظلوم ڈی ایم ایل اے کی طرف دیکھتے جسے وہ انصاف کی علامت قرار دیتے تھے۔ میں تو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے نائب کے طور پر خدمات انجام دے رہا تھا۔ اور اس لیے میں اپنے ہر فیصلے کے لیے جواب دہ تھا۔ اگر میں غلطی پر تھا تو مجھے اپنے فرائض سے سبکدوش کر دینا چاہیے تھا۔ مداخلت اس لیے کی جاتی تھی کہ اس سے کسی کو سیاسی فائدہ حاصل ہوتا تھا۔ لیکن جن کو بالواسطہ مارشل لاء فرائض ادا کرنے کے لیے سونپے گئے تھے، یہ تو ان کی بدنامی کا باعث بنتا۔ اگر میں نے کسی مقدمہ کے متعلق فیصلہ کیا ہے کہ اسے خصوصی فوجی عدالت میں سماعت کے لیے لایا جائے جو بعد ازاں ایم ایل اے نے فیصلہ دیا کہ اسے قانونی لحاظ سے ایسا کرنا غلط ہوگا تو موخر الذکر منظوری کا اختیار رکھتے تھے۔ وہ بہ آسانی تمام کارروائی کو کالعدم قرار دے سکتے تھے۔ اور ملزم کو رہا کر سکتے تھے۔ یا پھر مقدمہ کو سول عدالت میں منتقل کرنے کا حکم دے سکتے تھے۔ کارروائی کو روک دینا جبکہ ابھی اس کا نتیجہ برآمد نہ ہوا ہو، خواہ مخواہ عوام کی طرف سے سخت نکتہ چینی کو دعوت دیتا ہے۔ لوگوں کو معلوم نہیں ہوگا کہ اسے ایم ایل اے نے کیوں روکا ہے۔ وہ یہ اندازہ لگانے میں حق بجانب ہوں گے کہ ڈی ایم ایل اے نے اپنا فیصلہ اثر ورسوخ یا رشوت کے سبب بدلا ہے۔ جیسا میں نے پہلے کہا ہے کہ ڈی ایم ایل اے تو انصاف کی علامت تھا۔ انہیں یہ سن کر تسلی نہ ہوگی کہ ان کا مقدمہ جو پہلے مارشل لاء قوانین کے تحت منظور کیا گیا تھا، اب یا تو اس کو قطعاً ختم کر دیا گیا ہے یا پھر اسے سول عدالت میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ایم ایل اے کی طرف سے اس قسم کی مداخلت پریشان کن تھی۔ آخر ایم ایل اے نے ایسا کیوں کیا؟ مجھے اس کا کوئی علم نہیں۔

ایک دلچسپ مقدمہ

سی ایم ایل اے جنرل محمد ضیاء الحق نے شہری امور میں فوج کی کم سے کم مداخلت کا فیصلہ کیا۔ ہمیں بھی فوجی عدالتوں میں مقدمات کی سماعت کو کم سے کم کرنے کی ہدایات موصول ہوئیں۔ اور یہ کہ ان مقدمات کو معمول کے مطابق سول عدالتوں میں فیصلہ کے لیے بھیجا جائے لیکن عوام مقدمات کی فوجی عدالتوں میں سماعت کو ترجیح دیتے تھے، کیونکہ انہیں سستا اور تیزی سے انصاف ملتا تھا۔

یہاں میں ایک مقدمہ کی مثال پیش کرتا ہوں جسے ایم ایل اے نے روک دیا تھا۔ ایک روز میں اپنے دفتر میں معمول کے مطابق شکایات کو سن رہا تھا۔ مجھے ملنے سے پہلے شکایات سیل میں اپنی تکالیف

کو رجسٹر کروانا لازمی تھا۔ انچارج شکایات سیل تکالیف کا خلاصہ مع اپنی سفارشات کے میرے پاس بھیجتے ۔ صرف یقینی تکالیف والوں کو ملنے کے لئے بلوایا جاتا۔ ایک شکایت کو میں نے رد کر دیا۔ شکایت کنندگان نے فوراً دوسری بھیج دی اور مجھے ملنے کے لئے دوبارہ کہا۔ اس مرتبہ میں نے درخواست دہندہ سے اتفاق کیا اور شکایات سیل والوں نے شنوائی کی تاریخ مقرر کر دی۔ چار اشخاص مع ایک ادھیڑ عمر خاتون کے میرے سامنے آئے ۔ خاتون نے مجھے خطاب کرتے ہوئے کہا ''آپ کیسے ایڈمنسٹریٹر ہیں کہ آپ ایک فریادی کو مل بھی نہیں سکتے ؟ میں کہاں جاؤں؟ کوئی سول آفیسر میری نہیں سنتا اور آپ فوجی ہو کر میری بات سننے سے انکاری ہیں۔ اگر ایسا ہی کرنا ہے تو مجھے گولی مار دیں۔ یا مجھے جیل میں بھجوا دیں۔ جہاں میں گل سڑ جاؤں اور مر جاؤں۔'' اب اس نے رونا شروع کر دیا۔

اسے پرسکون کرنے میں مجھے کچھ وقت لگا۔ میں نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ آپ لوگ سول عدالتوں میں جائیں اور اپنی شکایات کا ازالہ کروائیں۔ وہ متفق نہ ہوئی اور اس نے پھر سے آہ وزاری شروع کر دی۔ لہٰذا میں نے اسے کہا کہ اپنی شکایت کی وضاحت کرے۔ اس نے کہا کہ مجھے میرے خاوند سے الگ کر دیا گیا ہے اور میں اپنے رشتہ داروں کے ہمراہ رہ رہی ہوں اور میرے ساتھ میری اکلوتی بیٹی ہے جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔ مجھے میری ماں سے ورثہ میں ایک مربع زرعی اراضی ملی ہے۔ بدنیتی پر مبنی محرکات کے سبب میرے خاوند کے بھائی جبراً کہہ رہے ہیں کہ تم اپنی بیٹی کو میرے بیٹے سے بیاہ دو۔ میرے خاوند کا خاندان اس لئے متمنی ہے کہ وہ اس طرح میری جائیداد پر قابض ہو جائیں۔ کچھ عرصہ قبل میرے خاوند کے خاندان نے میری زمین پر جبراً قبضہ کر لیا۔ اور مجھے باہر نکال دیا۔ مقدمہ رجسٹر کروایا گیا اور اسسٹنٹ کمشنر نے میرے خاوند کی پارٹی کو جرائم پیشہ افراد کا گروہ قرار دیا۔ اس کے باوجود انہوں نے میری بیٹی کو اغوا کر لیا۔ اس نے مزید کہا کہ جب میں تھانے میں جاتی ہوں تو کوئی میری فریاد نہیں سنتا۔ مجھے خطاب کرتے ہوئے اس نے کہا کہ میں کس عدالت میں جاؤں۔ کیونکہ کوئی بھی میری فریاد سننے کے لیے تیار نہیں ہے؟ میں قائل ہو گیا کہ وہ واقعتاً ستم زدہ ہے اور اسے انصاف ملنا چاہیے۔ اس کی موجودگی میں، میں نے سرگودھا کے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو ٹیلی فون کیا اور اس مقدمہ کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ لیکن بظاہر وہ اس مقدمہ کی تفصیلات سے آگاہ تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہو گیا کہ اس کے خاوند کا گروہ کسی بااثر افراد سے امداد حاصل کرتا تھا۔ میں نے ایس پی کو کہا کہ اگلے دو روز میں لڑکی کو برآمد کرے۔ اس اثناء میں شکایات سیل کو کہا گیا کہ وہ اس شکایت کے قانونی پہلوؤں کا جائزہ لے۔ تاکہ فوجی عدالت میں اس کی سماعت کی موزونیت کو دیکھا جائے۔

اگلے روز ڈاکٹر باجوہ (ماہر چشم) جو تیسویں برس میں ہوں گے مجھے ملنے کے لئے آئے وہ ریٹائرڈ

فوجی تھے اور اپنا نجی کلینک چلا رہے تھے۔ میرے پیشرو نے جنرل مجید ڈاکٹر باجوہ کے دوست تھے، نے تعارف کرواتے ہوئے کہا تھا کہ جب وہ آئیں تو انہیں ملنے کا موقع فراہم کریں۔ وہ کبھی کبھی مجھے ملنے کے لیے آیا کرتے۔ اس مرتبہ جب وہ مجھے ملنے کے لیے آئے تو انہوں نے اس خاتون کے مقدمہ کے متعلق مجھ سے بات کی اور کہا کہ مارشل لاء والوں کو اس قضیہ سے ہٹ جانا چاہیے۔ کیونکہ یہ تو ان لوگوں کا خاندانی تنازعہ ہے۔ میں یہ نہ سمجھ سکا کہ کس طرح اس قضیہ کو خاندان پر ہی چھوڑ دیا جائے۔ اس کی زمین پر بالجبر قبضہ کرلیا گیا ہے۔ اس کی بیٹی کو اغوا کیا گیا ہے اور اس کے خاوند کے بھائی کے بیٹے کے ساتھ زبردستی شادی پر مجبور کیا گیا ہے۔ میں نے ڈاکٹر سے استفسار کیا کہ ان کا اس میں کیا مفاد ہے؟ جواب میں انہوں نے کہا کہ وہ میری برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے اس کا انداز پسند نہ کیا اور کہا کہ پہلے لڑکی کو حاضر کریں میں نے ان سے کہا کہ مقدمہ کا باقی حصہ میں بعد میں دیکھوں گا۔ انہوں نے کہا کہ وہ لڑکی کو اگلے روز پیش کر دیں گے۔ لیکن اس بات پر بضدر ہے کہ مقدمہ کو فوجی عدالت میں زیر سماعت نہ لایا جائے۔ اگلے روز لڑکی کو شکایات سیل کے سامنے پیش کیا گیا۔ شکایات سیل کے انچارج نے مجھے اطلاع دی کہ لڑکی سکون آور ادویات کے سخت اثر تلے ہے۔ اور یہ کہ جب اس نے اپنی ماں کو دیکھا تو چیخ ماری اور بھاگ کر اس کے گلے سے جا چمٹی۔ انہوں نے سفارش کی کہ لڑکی کو حفاظت کی غرض سے جیل بھجوادیا جائے۔ اور اس کا بیان اگلے روز مجسٹریٹ قلمبند کرے۔ تب تک وہ اپنے حواس کا بہتر استعمال کرنے کے قابل ہو جائے گی۔

اگلے روز لڑکی نے اپنا بیان قلمبند کروایا جس میں اس نے اپنے اغوا کنندگان پر الزام لگایا کہ انہوں نے اسے کوئی انجکشن دیئے جن کے سبب وہ غنودگی میں رہی۔ لڑکی نے اپنی والدہ کے پاس رہنے کا انتخاب کیا۔

لڑکی اور اس کی ماں دونوں کو جانے کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن اس کے خاوند کے گروہ کے خلاف اغوا کا مقدمہ درج کر دیا گیا۔ مقدمہ کو فوری فوجی عدالت میں زیر صدارت لیفٹیننٹ کرنل ہارون سماعت کے لیے دے دیا گیا۔ ہیڈ کوارٹر میں ابھی سماعت جاری تھی کہ ایم ایل اے نے ہمیں اسے روکنے کے لیے کہا اور نیز یہ کہ اس کی کارروائی کے کاغذات ایم ایل اے کے ہیڈ کوارٹر کو بھیج دیئے جائیں۔ ایم ایل اے کے موجود نہ ہونے کے سبب میں نے ان کے چیف آف سٹاف کو کہا کہ مقدمہ کی سماعت مکمل کرنے کی اجازت دی جائے اور بعد ازاں اس کی تفصیلات ایم ایل اے کے ہیڈ کوارٹر کو روانہ کر دی جائیں گی۔ میں نے ایم ایل اے سے بھی بات کی۔ انہوں نے کہا کہ مقدمہ روک دیا جائے۔ جب تک کہ ہم آپس میں تبادلہ خیال نہ کرلیں۔ ان کا خیال تھا کہ آخر اس مقدمہ میں کون سی

ایسی بات ہے جو دو جرنیل آپس میں کوئی فیصلہ نہ کر سکیں۔

لہٰذا میں ایم ایل اے سے تبادلہ خیال کرنے کے لیے لاہور روانہ ہوا۔ عدالت کے صدر لیفٹیننٹ کرنل ہارون اور ڈپٹی جج ایڈووکیٹ جنرل میجر مظہر کو بھی لاہور پہنچنے کی ہدایت کی۔ نیز انہیں کہا کہ وہ متعلقہ کاغذات لے کر آئیں۔ ہوسکتا ہے کہ کسی نکتہ کی وضاحت کے لیے ہمیں کہا جائے۔ میرا خیال تھا کہ ایم ایل اے میرے ساتھ مقدمہ کو خفیہ طور پر زیر بحث لائیں گے۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے ایم ایل اے کے ساتھ ان کے ایڈووکیٹ جنرل، قانونی سٹاف آفیسر اور ان کے علاوہ دو اور افراد کو وہاں اپنے ساتھ تبادلہ خیال کے لیے تشریف فرما دیکھا۔ قانونی ماہرین کو اپنے خلاف صف آرا دیکھ کر میں نے بھی ایم ایل اے کی اجازت سے اپنے دو افسران کو اندر بلا لیا جو کاغذات لے کر آئے تھے۔ اب ہونے والی بحث کے بعد ایڈووکیٹ جنرل بضد تھے کہ مقدمہ سول عدالت میں منتقل کیا جائے۔ میں بھی بضد تھا اور میں نے زور دیا کہ مقدمہ کو میرے اختیارات کے اندر مکمل کیا جانا چاہیے۔ اور صرف اس کے بعد ہی ایم ایل اے اپنے اختیارات کا استعمال کریں۔ اور مقدمہ پر نظر ثانی کریں۔ ایم ایل اے حیرت کا ایک اور عنصر درمیان میں لے آئے جب انہوں نے کہا کہ ''میرے تو ہاتھ باندھے گئے ہیں۔ یہ ہدایات تو صدر کی طرف سے موصول ہوئی ہیں جو سی ایم ایل اے بھی ہیں۔'' میں نے کہا کہ میرے کسی قسم کے فیصلہ کے باوجود آپ کو میری حمایت کرنی چاہیے۔ سماعت کی تکمیل کی اجازت دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ عدالت فیصلہ کا اعلان نہیں کرے گی۔ جب تک کارروائی کا آپ مکمل طور پر جائزہ نہ لے لیں۔

میں نے مزید کہا کہ ''آپ بحیثیت ایم ایل اے کارروائی کو کالعدم قرار دے سکتے ہیں۔ اور سزا کو ختم کر سکتے ہیں۔'' انہوں نے واضح طور پر کہا کہ اگرچہ انہیں افسوس ہے لیکن مقدمہ کو ہر صورت سول عدالت میں منتقل کیا جائے۔ یہ سی ایم ایل اے کی جانب سے حکم ہے۔ ایک بے نتیجہ طویل بحث کے بعد ہم نے رخصت ہونے کا فیصلہ کیا۔ میں کھاریاں واپس آ گیا اور میں نے سی ایم ایل اے کو ٹیلی فون پر مقدمہ کی وضاحت کی انہوں نے کہا کہ ایم ایل اے نے پچھلی مرتبہ میرے ساتھ اس مقدمہ کا ذکر کیا تھا۔ میں نے ان سے ملنے کی اجازت طلب کی جو مجھے مل گئی۔ حاضر ہونے کے لیے میں کھاریاں سے راولپنڈی پہنچا۔ پنجاب ہاؤس میں میری رہائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ میں نے صدر کے چیف آف سٹاف سے بات کی۔ اور اگلے روز صدر سے ملاقات کے لیے انہوں نے مجھے وقت دے دیا۔

جب میں صدر کے سی او ایس سے ملا تو میں حیرت زدہ رہ گیا کہ وہ پہلے ہی اس مقدمہ کے متعلق جانتے تھے۔ انہوں نے بڑے غور سے مجھے سنا اور صدر سے تبادلہ خیال کے لیے چلے گئے۔ کچھ وقت

کے بعد سی او ایس واپس آئے اور کہنے لگے۔ ''صدر آپ سے ملاقات کریں گے'' لیکن سی او ایس کو صدر نے پھر طلب کر لیا۔ وہ واپس لوٹے اور کہنے لگے کہ صدر کا فیصلہ ہے کہ عدالت مقدمہ کی سماعت جاری رکھے۔ لیکن فیصلہ کے اعلان کے بغیر کارروائی ایم ایل اے کو روانہ کر دے۔ اس اثنا میں سی او ایس نے ایم ایل اے سے بات کی۔ سی او ایس نے مجھے ہدایت کی کہ رات تک اگر ایم ایل اے نے آپ کو ٹیلیفون نہ کیا تو آپ خود ان سے بات کریں اور ہماری گفتگو کا حوالہ دیں۔ میں نے سلام کیا اور کھاریاں لوٹ گیا۔

ایم ایل اے نے مجھے فون نہیں کیا۔ لہٰذا میں نے انہیں فون پر صدر کے سی او ایس کی ہدایات بتا دیں۔ ایم ایل اے نے ناراضگی سے جواب دیا: ''جاری رکھیں۔ ہم تو صرف احکامات مانتے ہیں۔'' پھر اچانک انہوں نے ٹیلیفون کو منقطع کر دیا۔ جب مقدمہ کی سماعت اختتام پذیر ہوئی تو مقدمہ کی کارروائی ایم ایل اے کو روانہ کر دی گئی۔ جنہوں نے فوراً کارروائی اور فیصلہ کو مسترد کر دیا۔ عدالت نے ان کے احکامات کو تسلیم کر لیا۔ میں نے تحریراً استدعا کی کہ مستقبل میں ہماری رہنمائی کے لیے بتلایا جائے کہ فیصلے کو کن وجوہات کی بناء پر مسترد کر دیا گیا ہے۔ بہرحال ایم ایل اے ہیڈ کوارٹر نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہم بالکل درستگی کرنے کے لیے تیار تھے۔ ہمارے عمل یا عدالت کی کارروائی میں اگر کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو یا پھر قانون کے مطابق عمل نہ کیا گیا ہو۔ لیکن کسی قسم کی درستگی کی نشان دہی نہ کی گئی۔

تجاوزات ہٹانا

اس دور کا ایک اہم کارنامہ تجاوزات کو ہٹانا ہے۔ ہم نے اس کا آغاز فیصل آباد سے کیا جہاں بریگیڈیئر محمد یونس ایس ایم ایل اے تھے۔ انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا ہم تجاوزات کے خلاف قدم اٹھا سکتے ہیں جو شہر کی گلیوں تک بُری طرح پھیل چکی ہیں۔ عام سڑکیں اور گلیاں خوانچہ فروشوں کے باعث بند ہو چکی ہیں۔ ان لوگوں نے شارع عام پر دکانیں کھڑی کر رکھی ہیں۔ لوہے کے کاروباری حضرات نے بڑی بڑی سڑکوں پر اپنی دکانیں غیر قانونی طور پر بنا ڈالی ہیں۔ اسی طرح بڑے بڑے رہائشی بنگلوں کے مالکان نے بھی میونسپلٹی کی جگہ پر تجاوزات کھڑے کر رکھے ہیں۔ اور غیر قانونی تعمیرات کے سبب ٹریفک میں رکاوٹ پیدا کر دی ہے۔ میں نے بریگیڈیئر یونس کی تجویز پر اجلاس میں غور کیا اور انہیں اقدامات کرنے کی اجازت دے دی۔

ابھی کارروائی شروع کی تھی کہ ایم ایل اے اور سی ایم ایل اے سیکرٹریٹ کی جانب سے سخت احتجاج کیا گیا۔ ایم ایل اے نے مجھ سے بات کی اور کہا: ''اگر آپ اس قسم کے منصوبوں پر عمل کرتے

رہے تو امن و امان کا مسئلہ پیدا ہو جائے گا پاکستان میں کہیں بھی اس نوعیت کے اور اتنے بڑے پیمانے پر کسی منصوبے پر عمل نہیں کیا گیا۔'' ہم جو بالواسطہ اس مسئلہ سے وابستہ تھے قطعاً بے چین نہیں تھے۔ میں نے ایم ایل اے کو یقین دہانی کروائی کہ امن و امان کا کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہوگا۔ اور مقامی انتظامیہ خوانچہ فروشوں کے لیے متبادل جگہ کا بندوبست کردے گی، جس سے یہ لوگ اپنا کاروبار جاری رکھ سکیں گے۔ جب ہم نے تجاوزات ہٹانے کا منصوبہ مکمل کر لیا تو لیفٹیننٹ جنرل غلام جیلانی خاں ایم ایل اے کو فیصل آباد کا دورہ کرنے کی دعوت دی گئی۔ ہم نے ان کے دورہ کے دوران انہیں شہر میں سے گزارا اور انہیں وہ جگہیں دکھلائیں جو اب مختلف نظر آ رہی تھیں۔ ان کی تسلی ہوگئی اور بلاشبہ وہ خوانچہ فروشوں کے لیے مستقل کاروبار کی جگہ کے انتظامات کو دیکھ کر خوش ہوئے۔

تجاوزات بعض بااثر افراد نے بھی کھڑی کر رکھی تھیں۔ یہاں تک کہ ڈپٹی میئر نے بھی میونسپلٹی کی جگہ پر تعمیر کھڑی کر رکھی تھی۔ لیکن انہوں نے از خود مہربانی کر کے اسے ہٹا لیا۔ فیصل آباد کے عوام کے تعاون سے کسی قسم کا امن و امان کا مسئلہ پیدا نہ ہوا۔ وہ اپنے شہر کو صاف ستھرا اور ہر قسم کی رکاوٹوں سے پاک دیکھنے کے متمنی تھے۔ بریگیڈیئر یونس اور ان کی ساتھیوں نے شاندار کارنامہ سرانجام دیا۔ فیصل آباد کے لوگوں نے تعاون کیا، جنہوں نے ابتداً اس منصوبے کی مخالفت تو کی، لیکن بعد ازاں تعاون کرنے لگے۔

یہ خبر تمام پنجاب میں پھیل گئی۔ دوسرے ڈویژنوں میں ایم ایل انتظامیہ اپنے اپنے شہروں میں تجاوزات ہٹانے کی خاطر چل نکلی۔ ہم نے سرگودھا شہر سے بھی تجاوزات کا خاتمہ کر دیا۔ ہم نے سیٹلائٹ ٹاؤن سے اس کا آغاز کیا، کیونکہ یہ امراء کے طبقہ کی رہائش گاہ تھی۔ ہمیں یقین تھا کہ اگر ہم یہاں کامیاب ہو گئے تو غریب لوگ مخالفت میں نہیں اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ہم اس کام میں ابھی مصروف تھے کہ مجھے احکامات موصول ہوئے کہ خیر سگالی کے مشن کے ساتھ چین اور شمالی کوریا کیلئے روانہ ہوں۔ اس دورہ کے اختتام پر مجھے پاکستان ملٹری اکیڈیمی کی کمانڈ سنبھالنے کے لیے تبدیل کر دیا گیا۔

جاگیردارانہ طریقوں پر چند خیالات

چین اور شمالی کوریا کے خیر سگالی مشن کے اپنے تجربات کا تذکرہ کرنے سے قبل سرگودھا ڈویژن جو میری مارشل لاء کمان کے تحت تھا، وہاں کے جاگیرداری طریقوں پر چند جستہ جستہ خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔

سرگودھا میں بطور ڈی ایم ایل اے مجھے وسیع تجربات حاصل ہوئے جس سے مقامی تہذیب اور

ہونے والے جرائم کی نوعیت کا علم ہوا۔ علاقہ میں اب بھی جاگیرداری معاشرہ میں ہونے والے جرائم بے حد سنگین ہیں۔ قتل، اغوا اور جائیداد پر زبردستی قبضہ چند بڑے بڑے جرائم ہیں۔ برطانوی اقتدار کے دوران بڑے بڑے سرداروں کو ان کی وفاداریوں کے صلہ میں زمین کے وسیع رقبہ جات بطور ذاتی جاگیر انعامات کے طور پر عطا کئے گئے۔ اپنے اپنے متعلقہ علاقہ میں لوگوں پر اپنا اقتدار قائم رکھنے کی خاطر جاگیرداروں نے مقامی انتظامیہ کی ملی بھگت سے بالواسطہ طور پر اپنے اپنے قبیلوں پر اختیارات قائم کر لیے۔ یہ انتظام برطانوی حکمرانوں کے مفاد میں تھا۔ بہت سے سنگین جرائم جن کا ارتکاب ہوتا، ان کا سراغ نہ ملتا۔ اقدام قتل جس میں انسانی جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بعد بہتے پانی میں اسے بہا دیا جاتا، ان کی تفتیش نہ ہوتی۔ جبکہ ایسے جرائم کے لیے گواہ بھی دستیاب نہ ہوتے۔ مزارعین کی نوجوان لڑکیاں اغوا کر لی جاتیں۔ لیکن کسی جگہ مقدمہ درج نہ کروایا جاتا۔ ظاہراً ستم زدہ بے حد ناخوش تھے۔ انہیں انصاف کہاں سے ملتا۔ وہ تو جاگیرداری معاشرہ میں پھنس چکے تھے، اور متواتر تکالیف کا شکار تھے۔

ایک گاؤں کا جاگیردار

جناب اے (ان کی بیٹی کے احترام میں اصل نام پوشیدہ ہے) ایک بڑے جاگیردار تھے جو دریائے چناب کے کنارے واقع ایک گاؤں میں رہتے تھے جو چنیوٹ کی سب ڈویژن ہے۔ ایک مخصوص بڑے جاگیردار، جو اپنی عدالت برگد کے درخت کے نیچے لگاتے تھے اور جو مجرم ثابت ہو، اسے فوری ختم کر دیا جاتا اور جس کے لیے موت کا حکم جاری کرتے اس کے ٹکڑے کر کے دریائے چناب میں پھینک دیا جاتا۔ وہ اپنے گاؤں میں دہشت کی علامت سمجھے جاتے تھے اور کوئی بھی ان کے خلاف اٹھنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بہت سے لوگ جو اس علاقے سے غائب ہوئے وہ آج تک بازیاب نہ ہو سکے۔

ان کی ایک بیٹی تھی جس کی شادی کی عمر گزر چکی تھی اس کی شادی اس لیے نہیں ہوئی تھی کہ اسلامی قانونِ وراثت کی وجہ سے ان کی جائیداد چھن جانے کا خوف تھا۔ اس (جاگیردار) نے بیٹی کا ذہن دینی علوم کی طرف مبذول کروانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے اس نے سرگودھا ڈسٹرکٹ میں واقع فروکہ نام کے گاؤں کے دینی معلم کی خدمت حاصل کی۔ اس عورت نے اپنے استاد کو باپ کے گھر سے بھاگ جانے کے لیے استعمال کیا۔ تاہم جناب ''اے'' ان کے اس منصوبے سے آگاہ ہو گئے اور انہوں نے برگد کے درخت کے نیچے ایک عدالتی کارروائی کے ذریعے معلم (استاد) کی موت کا حکم جاری کر دیا۔

معلم (استاد) کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے دریائے چناب میں پھینک دیا گیا۔

چند دنوں کے بعد دینی معلم کا والد اپنے گمشدہ بیٹے کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے جناب ''اے'' کے گھر گیا۔ جناب ''اے'' نے اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا اور اس کے جسم کے ٹکڑے بھی دریائے چناب میں پھینک دیئے۔ تین ہفتے گزر گئے اور کسی نے بھی وہاں کی مقامی پولیس کو طلاع نہیں کی۔ اس دوران دینی معلم (استاد) کا دور کا رشتے دار ڈی آئی جی پولیس سرگودھا عرفان ملہی سے ملا اور اسے بتایا کہ اس کے دور شتے دار غائب ہو گئے ہیں۔

ڈی آئی جی نے اس شریف آدمی کو جو کہ بہت غریب تھا، ایس پی جھنگ احمد نسیم کے پاس بھیج دیا۔ جناب نسیم نے محتاط انداز میں تحقیقات کیں اور دریافت کیا کہ بیٹے اور باپ دونوں کو جناب ''اے'' نے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ نسیم نے فوری طور پر گاؤں کا دورہ کیا اور وہاں کے مقامی لوگوں کا اعتماد حاصل کرنے کی تمام تدابیر آزمائیں۔ حتیٰ کہ اس نے گواہوں کی حفاظت کی یقین دہانی کے ساتھ ساتھ نام پوشیدہ رکھنے کا بھی یقین دلایا۔ بالآخر ایک مقدمہ درج ہوا اس کے بعد جلد ہی نسیم نے پولیس کا ایک دستہ ساتھ لیا اور جناب ''اے'' کے ڈیرے پر اچانک دھاوا بول دیا۔ جناب ''اے'' اور ان کا بیٹا حیرت زدہ رہ گئے کیونکہ کبھی بھی کوئی ان کی جائیداد کی حدود میں داخل نہیں ہوا تھا۔ نسیم کو جناب ''اے'' کے مقامی عینی شاہدوں سے حاصل ہونے والی گواہی کے سوا جرم کی کوئی نشانی نہیں ملی، نسیم کو واقعہ کو ختم کرنے کے لیے مختلف اطراف سے دباؤ کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس نے مزاحمت کی اور واقعہ کا میرے ساتھ ذکر کیا۔ میں نے ان کی رائے کی تائید کی اور ان سے کہا کہ کارروائی کے لیے چالان ہیڈ کوارٹر ڈی ایم ایل کو بھیجیں۔ مقدمے کی اس کی اصل نوعیت کے اعتبار سے فوجی عدالت میں کارروائی ہوئی اور عدالت نے چارہ جوئی کرتے ہوئے ملزم کے استحقاق کے مطابق فیصلہ سنایا اور ثابت کیا کہ مارشل لاء غریبوں کو زیادہ عزت اور تحفظ دیتا ہے۔

جاگیرداروں کا جاگیردار

جب میں پہلی مرتبہ کمشنر، ڈی آئی جی، مقامی ڈپٹی کمشنر اور ایس پی کے ہمراہ کالا باغ کے دورہ پر گیا، ہمیں ایک بے حد دلچسپ داستان سنائی گئی۔ کچھ عرصہ قبل ایس پی جو بعد ازاں بطور آئی جی پولیس ریٹائر ہوا، اس کی تعیناتی میانوالی میں ہوئی۔ اپنے ضلع کا دورہ کرتے ہوئے وہ کالا باغ پہنچا۔ معمول کے مطابق ایسے دوروں میں وہ اپنا اردلی اور خانساماں ساتھ لے گیا۔ کالا باغ میں رات قیام کرنے کے لیے اس نے ارادہ کر لیا۔ ریسٹ ہاؤس پہنچنے کے بعد دو افراد فروٹ کے ٹوکرے لے کر اس کے

پاس آئے اور انہوں نے مرحوم نواب کالاباغ کی جانب سے اسے خوش آمدید کہا۔ ایس پی نے پھل قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ چونکہ وہ ڈیوٹی پر ہے اس لیے اسے کسی پھل کی ضرورت نہیں۔ دونوں ملازم واپس چلے گئے اور انہوں نے نواب صاحب کو اس امر کی اطلاع کر دی۔ اس کے بعد نواب صاحب کے منیجر آئے اور انہوں نے پوچھا کہ وہ رات کو کیا تناول کرنا پسند کریں گے۔ ایس پی نے ایک مرتبہ پھر نہایت نرمی سے انکار کر دیا، اور اپنی گزشتہ بات دہرائی اور کہا کہ چونکہ وہ ڈیوٹی پر ہیں، اس لیے انہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں اور یہ کہ ان کا خانساماں ان کے ہمراہ ہے۔ لہٰذا انہیں کسی امداد کی ضرورت نہیں۔ منیجر نے بضد کہا کہ جو بھی آفیسر کالاباغ آتا ہے وہ نواب صاحب کا مہمان ہوتا ہے، اور یہ کہ ایسا نامناسب ہوگا اگر آپ نواب صاحب کی روایتی مہمان نوازی کو منظور نہیں کریں گے۔ تاہم اس مرحلہ پر ایس پی نے اپنی بے عزتی محسوس کی اور منیجر کو جانے کے لیے کہا کہ تم جاؤ اور اپنا کام کرو۔ منیجر ریسٹ ہاؤس سے رخصت ہو گیا اور نواب صاحب کو تمام مکالمہ کے متعلق اطلاع کر دی۔

اس کے تھوڑی دیر بعد ایس پی کا خانساماں مقامی مارکیٹ سے خورد ونوش کی چند اشیاء خریدنے کے لیے گیا۔ اس نے دکاندار سے کچھ چیزیں مانگیں جو اس کے سامنے کثیر ڈھیر کی صورت میں پڑی تھیں۔ لیکن دکاندار نے کچھ بھی بیچنے سے انکار کر دیا۔ خانساماں اگلے دکاندار کے پاس گیا اور اسے وہی جواب ملا۔ سب دکانداروں نے خانساماں کے پاس کوئی بھی شے بیچنے سے انکار کر دیا۔ تمام دکانداروں کو معاندانہ رویہ اختیار کئے ہوئے پا کر وہ ریسٹ ہاؤس واپس آ گیا اور اس نے ایس پی کو مطلع کیا کہ یہاں سے وہ کوئی بھی چیز نہیں خرید سکے گا۔ جب تک کہ کالاباغ کے حدود سے باہر کوئی چیز نہ خرید لی جائے۔ وہ کوئی بھی شے نہیں پکا سکے گا۔ ایس پی بے حد ناراض ہوا۔ لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکا، سوائے اس بات کے کہ اس نے اپنا دورہ مختصر کر دیا، اور میانوالی واپس چلا گیا۔ شاید مستقبل میں وہ اپنے لیے کھانے پینے کی اشیاء اپنے ہمراہ لے جاتا ہوگا۔

یہ وہ انداز تھا جس طرح نواب کالاباغ کی حدود میں اپنا اختیار قائم رکھتے۔ وہ مہمان نواز تھے، لیکن کسی کو اپنی خواہش یا اختیار کے خلاف کچھ بھی کرنے کی اجازت نہ دیتے۔ وہ جاگیرداری کی ایک بین مثال تھی۔ ہمیں ایس پی کے کردار کی پختگی کی تعریف کرنی چاہیے۔ وہ مرحوم نواب کے سامنے نہ جھکا، اور روایتی ملازمت کے قوانین سے چمٹا رہا۔

چین کا دورہ

میں نے حکومت پاکستان کی طرف سے چین اور شمالی کوریا کے دوستانہ دورے پر بھیجے جانے والے

فوجی وفد کے ساتھ جانے کے لیے تیاری کی۔ جنرل سوار خان وائس چیف آف آرمی سٹاف کو وفد کا قائد نامزد کیا گیا۔ یہ دورہ میری سترہویں ڈویژن کی کمانڈ اور میرے سرگودھا کے ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے فرائض سے تقریباً دو ہفتے کی غیر حاضری کا متقاضی تھا۔ وفد کے ایک اور رکن بریگیڈئر جواد خان تھے جو آزاد کشمیر میں فوجی دستے کی قیادت کر رہے تھے۔ میں 1974ء کے اوائل میں نیشنل ڈیفنس کالج کے طلبہ کے ہمراہ ایک تعلیمی دورے پر چین گیا تھا۔ دونوں دوروں کی تربیت میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ لیکن میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے ان دونوں خاص ادوار کو بذات خود دیکھا ہے ایک 1974ء میں اور دوسرا 1982ء میں اور ان میں سے ہر ایک دور کی اپنی الگ خاصیت ہے۔

چین 1974ء میں

چین ابھی ابھی ایک انقلاب سے گزر رہا تھا جسے ثقافتی انقلاب (Green Revolution) کہا جاتا ہے۔ یہ انقلاب نئے استحصالی طبقے کی افزائش روکنے کے لیے تشکیل دیا گیا تھا۔ مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لیے شہری اور دیہی علاقوں کے درمیان مسلسل تحریک کا عمل جاری تھا۔ وہ علم بانٹتے، اکٹھے رہتے اور آپس کے مسائل کو جاننے کی کوشش کرتے اور یوں افہام و تفہیم کے بہتر تصور کو اجاگر کرتے۔ اس میں کارکنوں، کسانوں اور سپاہیوں کے مسلسل تحریک کا عمل دخل تھا۔ ہمیں چین کے انتظامی افسروں نے بتایا کہ چین کا ثقافتی انقلاب فرسودہ علم میں روح پھونکنے اور چینی لوگوں کی سست روی اور کاہلی کو ختم کرنے میں مددگار ثابت ہوا ہے۔

خود کفالت ایک نعرہ نہیں بلکہ زندگی گزارنے کا ایک طریقہ ہے۔ چین کے لوگوں کو جب بھی کسی قدرتی آفت یا جنگ سے نپٹنے کی تیاری کے لیے پکارا جاتا تو وہ بحیثیت ایک قوم کے پوری لگن اور قربانی کے جذبے کے ساتھ حالات سے مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح حصہ لیتے تھے۔ یہ بات چین کی متاثر کن قیادت کی ترجمانی کرتی ہے جو چینی عوام کے جوش و جذبے کو حکومت کی ایک پکار کے جواب میں بہت بلندی تک بڑھا سکتی ہے۔

میں نے چین کے لوگوں کو دبے ہوئے اور مشکل حالات میں زندگی گزارتے ہوئے دیکھا۔ دو عہد اس آہنی دیوار کے پیچھے زندگی بسر کرتے ہوئے گزر چکے تھے اور اس غلامی کی زنجیر کو توڑ دینے کے احساسات میں جوش آنا شروع ہو چکا تھا۔ ماؤ کا ثقافتی انقلاب ہی صرف ایک عارضی بندوبست تھا اور یہ کتنے عرصے تک مؤثر رہتا۔ اس کا انحصار صرف وقت پر ہے کہ جب لوگ آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو حاصل کر کے رہتے ہیں خواہ اس کے لیے کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔

چین 1982ء میں

چین میں ہمیں چند ایک فوجی طرز کی تربیتی مشقیں دکھانے کے لیے بھی لے جایا گیا۔ ہمیں چین کی بھاری صنعت سمیت جہاز سازی کے کارخانے کا دورہ کروایا گیا جہاں آبدوز کشتیاں بنائی جا رہی تھیں۔ چینیوں نے اپنی روایتی مہمان نوازی کے ساتھ ساتھ ہمارے سیاحتی سفر میں چند ایک مشہور سیر گاہوں کی سیر بھی شامل کر دی تھی۔ ہم نے اس ہوائی جہاز کے ذریعے سفر کیا جو چینیوں نے ہماری سہولت کے لیے تیار کر رکھا تھا۔ یہ جہاز ہمارا چین اور کوریا کا دورہ مکمل ہونے تک ہمارے استعمال میں رہا۔ چونکہ میں نے 1974ء میں چین کا پہلا دورہ نیشنل ڈیفنس کالج کے طالب علم کے طور پر کیا تھا لہٰذا میں نے دیکھا کہ چینی معاشرے میں قابل ذکر تبدیلی رونما ہوئی ہے مجھے وہ زیادہ بے تکلف اور مہربان لگے۔ وہ انگریزی سیکھنے کے بہت شوقین تھے۔ اس دورے کے دوران چینی کسی بھی ایسے شخص سے تبادلہ خیال کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے جو ان سے انگریزی زبان میں بول سکتا تھا۔

صرف سائیکلیں ہی اب نقل و حرکت کا بڑا ذریعہ نہیں رہی تھیں۔ بہت سی اقسام کی گاڑیاں سڑکوں پر چل رہی تھیں۔ ان کی تنگ سڑکیں ٹریفک کی بندش کا شکار رہتی تھیں۔ میں نے چینی جوڑوں کو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کیسٹ پلیئر پکڑے پارکوں میں چہل قدمی کرتے دیکھا۔ ہمیں جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں لے جایا گیا۔ ہمیں چین میں رہنے والے کچھ چینی مسلمانوں کے ساتھ ملنے کا موقع بھی دیا گیا۔ چین کے اس مسرور کن دورے کے بعد ہم اپنے خاص جہاز پر شمالی کوریا روانہ ہو گئے۔

شمالی کوریا

ہمارا جہاز شمالی کوریا کے دارالخلافہ پیونگ یانگ پر اترا۔ میرا اس کمیونسٹ ملک کا پہلا دورہ تھا۔ شمالی کوریا کے دورے کے دوران پیونگ یانگ ہمارا مستقل ٹھکانہ رہا۔ یہاں پر پھر ہمیں بہت سی فوجی سرگرمیاں دکھانے لے جایا گیا۔ ان کے زیادہ تر بھاری جنگی ڈھانچے پہاڑوں میں کھودی گئی سرنگوں میں نصب کیے گئے تھے۔ اسی طرح ان کے دفاعی صنعتی مرکز اور کارخانے بھی پہاڑوں کو کاٹ کر تعمیر کیے گئے تھے۔ ان کارخانوں میں کام کرنے کا ماحول مثالی دکھائی دیتا تھا۔ تاہم کوریا کے لوگ محنتی اور زیادہ کام کرنے والے محسوس ہوتے تھے۔ شمالی کوریا کے لوگوں کا طرز زندگی بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ میں نے اپنے 1974ء کے دورے کے دوران چین میں دیکھا تھا۔ شمالی کوریا کے لوگوں کو زمین دوز راستہ بنانے پر بہت فخر تھا۔ وہ ہمیں زیر زمین (Under ground) ریل کی سواری کرنے کے لیے لے گئے۔ تمام سٹیشن اور پلیٹ فارم بہت زیادہ صاف ستھرے تھے۔ ریل گاڑی آرام دہ اور تیز رفتار

تھی۔ یہ کشادہ پلیٹ فارم اس طرز کے بنائے گئے تھے کہ کسی ہوائی حملے کی صورت میں یہ تحفظ کے لیے استعمال ہو سکیں۔ ہم جہاں کہیں بھی گئے ہم نے ان کے رہنما کم ال سنگ کا مجسمہ وہاں کے سپاہیوں اور کسانوں سمیت نمایاں طور پر کھڑا ہوا دیکھا۔ یوں لگتا تھا کہ شمالی کوریا کے لوگ کم ال سنگ کو پوجتے تھے جیسا کہ چینی ماؤ کو پوجتے تھے۔

ہمارے دورے کے آخری دن ہمیں کم اِل سنگ سے ملاقات کے لیے لے جایا گیا۔ اس کا گھر خوبصورت پھولوں کی کیاریوں سے لدے ہوئے ایک آراستہ باغیچے میں تعمیر کیا گیا تھا۔ ڈیوٹی پر موجود محافظوں کے سوا گھر کے اردگرد زندگی اور اس کی سرگرمیاں یا معمولات نظر نہیں آتے تھے۔ میں نے سوچا کہ گھر کے اردگرد کو درختوں سے اس لیے خالی رکھا گیا ہے کہ محافظ اس کی بغیر کسی رکاوٹ کے نگرانی کر سکیں۔ کم اِل سنگ کے گھر پہنچنے کے بعد ان کے سٹاف نے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں ایک لفٹ میں سوار ہونے کو کہا جس کے ذریعے ہم ایک خوبصورت سے سجے ہوئے ہال میں پہنچ گئے، جس کے ساتھ ایک کانفرنس روم بھی تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب ہم اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے کم اِل سنگ اندر آ گئے۔ وہ ستر سال کے معلوم ہوتے تھے۔ ہمارے سامنے بیٹھنے سے پہلے انہوں نے ہر ایک کے ساتھ مسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا۔ ان کی گردن پر کافی زیادہ ابھری ہوئی سوجن نظر آ رہی تھی۔ یہ کوئی رسولی لگ رہی تھی ہمارے آدھے گھنٹے کے دورے کے دوران انہوں نے جنرل سوار خان کو بار بار درخواست کی کہ وہ پاکستان کے صدر جنرل ضیاء الحق کو ان کی طرف سے شمالی کوریا کا دورہ کرنے کی دعوت دیں۔ پھر ہمیں واپس بڑے ہال میں چیئرمین کے ساتھ مشترکہ تصویر بنانے کے لیے لے جایا گیا۔ میں نے غور کیا کہ جب بھی چیئرمین ان کے آگے سے گزرتے تھے محافظ جھکتے تھے۔

شمالی کوریا کی حکومت اعلیٰ درجے کے مرکزی نظام پر قائم ہے۔ 1949ء سے اقتدار کورین ورکرز پارٹی جس کے قائد کم اِل سنگ ہیں، کے پاس تھا۔ میرے لیے یہ بہترین تجربہ تھا کہ میں اس کمیونسٹ زندگی کا مشاہدہ کر سکا۔

پاکستان ملٹری اکیڈمی

جنرل سوار خان، بریگیڈیئر جواد اور میں چین اور شمالی کوریا کا دورہ براستہ ہانگ کانگ کرنے کے بعد کراچی کے ہوائی اڈہ پر اترے۔ پانچویں کور کے کمانڈر جنرل جمال نے ہمارا استقبال کیا اور پاکستان ملٹری اکیڈمی (پی ایم اے) کو کمانڈ کرنے کے لئے میری تقرری پر مجھے مبارکباد دی۔ کھاریاں میں اپنی ڈویژنل کمان میں پہنچ کر مجھے کمانڈر کے پیغام کے مطابق باقاعدہ توثیق کے احکامات موصول ہو گئے۔

مجھے کبھی بھی خیال نہ آیا کہ ایک روز میں بھی پاکستان ملٹری اکیڈمی کی کمانڈ کروں گا۔ اگرچہ ایسا کرنے کی مجھے شدید خواہش تھی۔ اپنے کیریئر کو دیکھتے ہوئے مجھے توقع تھی کہ جی ایچ کیو میں بطور پرنسپل سٹاف آفیسر (پی ایس او) خدمات سرانجام دوں گا۔ لیکن وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔

کاکول میں پی ایم اے ایک نہایت ہی ارفع ادارہ ہے جو ریگولر کمشنڈ آفیسرز (سیکنڈ لیفٹیننٹ) کو پاک فوج کے لئے تیار کرتا ہے اور دیگر دوست ممالک کے لئے ایسی ہی خدمات فراہم کرتا ہے۔ یہ فوج میں کیریئر کے لئے جونیئر لیڈر کے داخلہ کی راہ ہموار کرتا ہے۔ ہر آفیسر جو یہاں سے گریجوایشن کرتا ہے۔ اس کی پیشہ وارانہ تکمیل کا انحصار اس امر پر مبنی ہے کہ پی ایم اے اس کو کس طرح تربیت دیتا ہے۔ اس ادارہ کا گریجویٹ اپنی باری پر پاک فوج کی کمان سنبھالتا ہے۔

کوئٹہ کا کمانڈ اور سٹاف کالج ایک اور ارفع ادارہ ہے جو گریڈ دو کے افسروں کی چیدہ چیدہ تقرریوں کی خاطر افسران کی تربیت کرتا ہے۔ اس ادارہ میں داخلہ مقابلے کے امتحان کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس قابلیت کے بغیر آفیسر کی فوج میں گردش کی ترقی گھٹ کر رجمنٹ کی سطح پر فوجی تربیت یا کمتر گریڈ کی سٹاف تقرریوں تک محدود رہ جاتی ہے۔ یہاں تک کہ لیفٹیننٹ کرنل یا اس کے اوپر کے درجوں تک اس کی ترقی کے مواقع خال خال ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے فوجی جن میں فیلڈ مارشل منٹگمری آف الامین شامل ہیں، نے یہاں سے گریجوایشن کی۔ بہت سے بیرونی ممالک کے آفیسرز

یہاں کے گریجوایٹ ہیں۔

تیسرا اعلیٰ ادارہ راولپنڈی میں نیشنل ڈیفنس کالج ہے۔ یہاں طلبہ کو ان کے کیریئر کی گزشتہ اعلیٰ کارکردگی کی بناء پر چیف آف آرمی سٹاف نامزد کرتے ہیں جو این ڈی سی دو کورسز میں سے کسی ایک کے لئے آتے ہیں۔ ایک نیشنل ڈیفنس کورس اور دوسرا آرمڈ فورسز وار کورس ہے۔ دونوں کورسز میں سے میجر جنرل کے بڑے عہدہ کے لئے ایک کا ہونا ضروری ہے۔ کمانڈ اینڈ سٹاف کالج کا گریجویٹ نہ ہونے والا شخص نیشنل ڈیفنس کورس یا آرمڈ فورسز وار کورس کے لئے نامزد نہیں کیا جا سکتا۔

میں اپنی نئی ذمہ داری بطور کمانڈنٹ پی ایم اے کو سنبھالنے کے لئے منتظر تھا جہاں میں نے جنٹلمین کیڈٹ (جی سی) کی حیثیت سے دو سال تک نہایت ہی قابل افسران، ٹیوٹرز اور سٹاف کے زیر سایہ تربیت حاصل کی تھی۔ میں نے یہاں انسٹرکٹر پلاٹون کمانڈر کی حیثیت میں بھی اس ادارہ کی خدمت کی تھی۔ اس وقت میں میجر تھا اور اب میں نے اس ادارہ کی کمانڈ سنبھالنا تھی۔ سی او اے ایس کی طرف سے میرا انتخاب میرے لئے بے حد عزت افزائی کا مقام تھا اب مجھے بھی فوج کے لئے بہترین جونیئر افسران کو فوج میں بھیجنے کا موقع ملا۔

میری تقرری کے تھوڑا عرصہ بعد میں نے اپنے پیشرو سے رابطہ کیا تا کہ اکیڈیمی میں اپنی آمد کے متعلق تفصیلات طے کر سکوں۔ میں کھاریاں کو مقررہ وقت کے مطابق چھوڑنے کے لئے بے حد مشتاق تھا۔ کیونکہ 17 ڈویژن کی کمانڈ کے لئے میرے متبادل کمانڈر کا پہلے ہی انتخاب ہو چکا تھا اور اس کی آمد کی تاریخ بھی مقرر ہو چکی تھی۔ بعض وجوہات کی بناء پر پی ایم اے کے کمانڈنٹ زیادہ عرصہ وہاں ٹھہرنا چاہتے تھے اور انہوں نے تجویز کیا کہ میں جولائی ۱۹۸۲ء کو اکیڈمی پہنچوں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں 17 ڈویژن کی کمان کو چھوڑنے میں دیر کروں یا جی ایچ کیو کی منظوری سے پی ایم اے میں حاضری کے لئے حاصل شدہ وقت میں مزید توقف کروں۔ لہٰذا میں نے پی ایم اے کے کمانڈنٹ کو اطلاع دی کہ چونکہ میرے بدلے میں آنے والے ترقی پر آ رہے ہیں۔ لہٰذا نئے جنرل آفیسر کو کمانڈ مقررہ تاریخ پر تفویض کر رہا ہوں۔ میں نے ان کو مزید بتلایا کہ میں کاکول میں کچھ تعطیلات گزارنا چاہتا ہوں۔ اُنہوں نے اتفاق کر لیا۔ لہٰذا میں بمع فیملی اور ساز و سامان کے ساتھ اکیڈمی پہنچ گئے۔ ہمارا ٹھہرنے کا انتظام پی ایم اے گیسٹ ہاؤس میں کیا گیا تھا۔

ہم دوپہر کا کول پہنچے۔ ڈپٹی کمانڈنٹ از راہ کرم میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ ضرورت کی صورت میں انہیں بلا بھیجا جائے۔ میں اپنے اے ڈی سی کیپٹن عمران یوسف کو ہمراہ لایا تھا جب تک کہ ہم کمانڈنٹ ہاؤس میں منتقل نہ ہو جائیں۔ چونکہ انہوں نے سامان باندھنے اور سفر میں ہماری اعانت کی

تھی لہٰذا کمانڈنٹ ہاؤس میں منتقل ہونے تک انہیں ہماری مدد کرنے کی ضرورت تھی۔ اگلے روز میں نے شام کو کمانڈنٹ کو ٹیلیفون کیا اور ان کا شکریہ ادا کیا اور بتلایا کہ ہم گیسٹ ہاؤس میں اطمینان سے رہائش پذیر ہیں۔

چونکہ ہم اکیڈیمی میں ماہ رمضان کے دوران پہنچے، ہم نے روزہ رکھا ہوا تھا۔ گیسٹ ہاؤس میں ہمارے پہنچنے کے کچھ وقت بعد افطار کے لئے اشیاء جن میں شربت اور کھجوریں شامل تھیں، آفیسرز میس سے آئے اور نہایت ہی عمدہ رات کا کھانا ڈپٹی کمانڈنٹ بریگیڈیئر بھٹی کی جانب سے بھیجا گیا۔ اگلے روز سحری اور کھانے کے انتظامات آفیسرز میس میں کر لئے گئے۔

اکیڈیمی میں چندروز قیام کی وجہ سے مجھے کمانڈ سنبھالنے سے قبل اِدھر اُدھر اشیاء کو خود دیکھنے کا موقع ملا۔ کھاریاں میں 17 ڈویژن کی کمانڈ چھوڑنے سے قبل میں نے ان افسران سے تجاویز پیش کرنے کے لئے کہا جنہوں نے حال ہی میں اکیڈیمی سے گریجوایشن کی تھی اور ایسی ہی تجاویز ان افسروں سے بھی مانگیں جنہوں نے بطور انسٹرکٹر وہاں خدمات سرانجام دی تھیں۔ میں نے ان کی سفارشات کا مطالعہ کیا۔ جن میں کئی ایک تخلیقی اور خوبصورت تھیں۔ انہیں ذہن میں رکھ کر جب بھی میں اکیڈیمی کیمپس میں چلتا پھرتا تو ان تجاویز کا تجزیہ کرتا۔ اس طرح اکیڈیمی میں نئے اور پرانے حالات سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ مثال کے طور پر نئے کیڈٹوں کے لئے 'رگڑا' (ragging) یکسر ختم کر دیا گیا۔ لیکن جب میں وہاں زیر تربیت تھا تو ہر صورت مشکلات کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔ پرانی عمارت میں کیڈٹوں کے میس اب بھی بارش کے دوران ٹپکتے۔ کیڈٹوں کے لئے غسل خانے کثیر تعداد میں قابل استعمال نہیں تھے۔ کیونکہ پانی کے چھیاسٹھ کنکشن اکیڈیمی کے لئے پانی کے ذخیرہ سے سویلین، حاضر اور ریٹائرڈ فوجی افسران کو بلا جواز دے دیئے گئے تھے۔ جنہوں نے کاکول کے اردگرد کالونیوں میں رہائش گاہیں تعمیر کر رکھی تھیں۔ پی ایم اے کی بجائے انہیں کنٹونمنٹ بورڈ کو پانی کے کنکشنوں کے لئے کہنا چاہئے تھا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ اکیڈیمی کے گھوڑوں کو پی ایم اے سے تعلق نہ رکھنے والے افراد سواری کے استعمال میں لاتے تھے۔ میں نے پہلے ایڈریس میں اکیڈیمی کے افسران کو یاد دلایا کہ سہولیات کیڈٹوں کے لئے ہیں وہ سہولیات جن پر کیڈیٹس کا حق ہے وہ انہیں نہ مل سکیں تو پھر ہمیں یہاں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ لہٰذا کیڈٹوں کے حالات میں بہتری کے لئے میں نے بعض سخت اقدامات اٹھائے۔

جب میں نے رخصت ہونے والے کمانڈنٹ جنرل امران اللہ کے اعزاز میں دیئے گئے کھانے میں روایتی الوداعی تقریر کی تو میں نے کہا کہ ہم اکیڈیمی میں کوئی تبدیلی نہیں کریں گے جو اکیڈمی کی

روایات کے عین مطابق نہ ہو۔

میری تقریر کو بعض نے یہ سمجھا کہ میں اپنے پیشرو کے کردار میں کلیتاً تبدیلی لانے کے درپے ہوں۔ میرے قیام کے دوران ریکارڈ اس امر کی گواہی دے گا کہ میری طرف سے لائی گئی تمام تبدیلیاں اکیڈیمی میں زندگی کے طریق کار کے عین مطابق تھیں۔

اکیڈیمی کا مقصد منتخب نوجوانوں کو فوج میں جونیئر کمانڈروں میں ڈھالنا ہے۔ یہ مستقبل کے لیڈروں کے طور پر ان کی متواتر اور ترقی پذیر نشوونما کے لئے ابتدائی خصائص کے طور پر ضروری ہیں۔ کیڈٹوں کو پابندی اور لگن کے ساتھ اسلام کے سپاہیوں کی شاندار روایات سکھائی جاتی ہیں اور بے حد احتیاط سے مناسب ضابطہ اخلاق، اعلیٰ کردار، ذمہ داری، بھروسہ اور قیادت جیسے اوصاف سکھائے جاتے ہیں۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے انہیں مضبوط تعلیمی اور فوجی علوم سکھائے جاتے ہیں تاکہ وہ اپنے پیشہ وارانہ مسائل کو کامیابی سے حل کر سکیں اور مستقبل کی ذمہ داریاں پوری کر سکیں۔

پاکستان ملٹری اکیڈیمی ترقی کی مختلف منازل سے گزری ہے وہ اپنے ابتدائی لکڑی کے گھروں سے لے کر جن کا تعلق جنگ بوئر کے زمانہ سے ہے۔ جدید دور کی عالیشان پختہ عمارات تک پہنچی ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ جدیدیت کے عمل کے دوران اس کا عالیشان ماضی نہ بھلایا جائے، بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کر لیا جائے۔ چنانچہ ہم نے ایک عجائب گھر کی بنیاد رکھنے کا فیصلہ کیا اور ترجیحی بنیادوں پر اکیڈیمی کے اندر پرانی اشیاء کا سیکشن بنایا گیا۔ ایک میوزیم کمیٹی بنائی گئی جس کے وقفے وقفے سے اجلاس ہوتے اور میں ان اجلاس کی صدارت کرتا۔ تمام فیصلوں کو ضبط تحریر میں لایا جاتا۔ ریکارڈ کی خاطر ایک کاپی کو عجائب گھر میں محفوظ کر لیا جاتا۔ میجر طفیل ڈی اے ڈی او ایس (DADOS) نے پرانی گاڑیوں کی تلاش میں سرتوڑ کوششیں کیں اور آرڈیننس ڈپوؤں سے انہیں ڈھونڈا اور میوزیم کے لئے ان کے حصول کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں بریگیڈیئر زبیر بعد میں میجر جنرل ڈی او ایس (DOS) نے پرانے ہتھیاروں کی تلاش اور حصول کے لئے قابل قدر امداد فراہم کی۔ ہمیں توقع تھی کہ اس میوزیم کی وجہ سے کیڈٹوں کے اندر تسلسل کا جذبہ پروان چڑھے گا۔ وہ ماضی کے ہتھیاروں اور مشہور آفیسر کو جانیں گے جنہوں نے اکیڈیمی کے اندر رہ کر مہارتیں حاصل کیں۔

پی ایم اے میوزیم کا افتتاح ۱۴ مارچ ۱۹۸۴ء کو صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے انجام دیا۔ میوزیم کی عمارت کے اندر اکیڈیمی کی تاریخ کو مکمل طور پر محفوظ ہوتا دیکھ کر وہ بے حد متاثر ہوئے۔ ان کی ستائش کا اس وقت اظہار ہوا جب انہوں نے اپنے افتتاحی خطاب میں اعلان فرمایا کہ میوزیم کو اکیڈیمی کے ماسٹر پلان میں شامل کر لیا جائے۔

چیف آف دی آرمی سٹاف کا حکم

پی ایم اے کے متعلق چیف آف دی آرمی سٹاف کا اپنے دستخطوں کے ساتھ میرے دائرہ کار کے متعلق ایک مفصل حکم موصول ہوا۔ کیڈٹوں کے معاملات میں جن کو نکالا جائے یا جن کو ٹرم دہرانے کے لئے کہا جائے میرا فیصلہ حتمی ہوگا۔ کسی آفیسر کو اکیڈیمی سے فوری تبدیلی کے لئے میں سفارش کروں گا۔ کیڈٹوں کی تربیت کے سلسلہ میں مجھے قدرے ردوبدل کا اختیار تھا۔ اکیڈیمی کی بنیادی منظور شدہ حکمت عملیوں کو تبدیل کرنے کا مجھے اختیار نہ دیا گیا۔ اگر ایسی کسی تبدیلی کی ضرورت پڑتی تو اسے ''ریویو کمیٹی'' کے سپرد کیا جاتا جو اس کی منظوری دیتی۔ ریویو کمیٹی جی ایچ کیو میں متعلقہ ڈائریکٹوریٹ کے ڈائریکٹر پی ایم اے کے کمانڈنٹ اور ڈائریکٹر آف سٹڈیز پر مشتمل تھی۔ اس کی صدارت انسپکٹر جنرل ٹریننگ اور اویلوایشن (آئی جی ٹی اینڈ ای) کرتے۔ یہ نہایت اعلیٰ حکمنامہ تھا۔ جس کے باعث کمانڈنٹ کی مرضی سے اکیڈیمی میں تبدیلیوں کا سدباب نہیں ہوسکتا تھا۔

ہم نے ضروری سمجھا کہ ہم ایک ایسے فورم کی تشکیل کریں، جہاں حکمت عملی کے متعلق فیصلے کئے جائیں۔ لہٰذا پالیسی کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس کے اراکین میں ڈپٹی کمانڈنٹ، ڈائریکٹر آف سٹڈیز (ڈی او ایس) تمام بٹالین کمانڈر اور متعلقہ سٹاف آفیسرز شامل تھے۔ پالیسی کمیٹی کی منظوری کے بغیر ہم نے اکیڈیمی میں کسی چیز کو متعارف نہ کروایا۔ میں اجلاس کی صدارت کرتا اور اس کی کارروائی کو تحریر میں لایا جاتا۔

وقفے وقفے کے بعد ہونے والے پالیسی کمیٹی کے اجلاس میں کیڈٹوں میں نظم وضبط کے زوال پر اکثر بحث کی جاتی۔ عام طور پر اکیڈیمی میں ریگنگ کے خاتمہ اور کیڈٹ کے قانونی اختیارات پر غور کیا جاتا۔ ہمارا خیال تھا کہ حکم کو ماننا اچھی سپاہیانہ زندگی کی بنیاد ہے اور ہم اسے صرف اسی صورت پیدا کرسکتے ہیں جب ہم سینئر کیڈٹوں کو جونیئر کیڈٹوں پر کوئی غلطی کرنے پر سزا کا اختیار دے دیں۔ ساتھ ہی ساتھ کیڈٹوں کو بااختیار بنا کر زیادہ موثر بنایا جائے۔ انہیں رعایات اور قانونی اختیارات دیئے جائیں۔ صرف رینک پہن لینے سے وہ کیڈٹ جو بااختیار بنایا گیا ہو، نظم وضبط قائم نہیں رکھ سکتا جب تک کہ وہ اپنے اختیار کا استعمال نہ کرے۔ چنانچہ اس نکتہ کو ریویو کمیٹی کو بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔

ریویو کمیٹی سے منظوری لینے کے بعد ریگنگ کو دوبارہ جاری کیا گیا اور جن کیڈٹوں کو بااختیار بنایا گیا تھا، ان کو اختیار سونپ دیا گیا۔ فوج کے اعلیٰ حلقوں میں ہلچل شروع ہوگئی جو اس کے خلاف تھے، میرے خیال میں ان کی مخالفت تعصب پر مبنی تھی کیونکہ ان میں سے بعض کے بچے اکیڈیمی میں تھے، جنہیں سخت دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ہم خوش تھے کیونکہ بااختیار کیڈٹ اپنی کمپنیوں کو موثر انداز میں

چلا رہے تھے۔ ریویو کمیٹی کو اپنا اجلاس ششماہی منعقد کرنا پڑتا۔ جب یہ اپنے پروگرام پر نہ چل سکتی تو یہ میرا کام آسان بنا دیتی، کیونکہ میں صدر سے ملاقات کر کے فیصلوں کو جلد حاصل کر لیتا۔ لیکن صدر سے ملاقات مشکل کام ہوتا کیونکہ ریاست کا سربراہ ہونے کے ناطے وہ ہمیشہ مصروف رہتے۔

تنظیم

پاکستان کے عالم وجود میں آنے کے فوراً بعد کاکول میں نومبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان ملٹری اکیڈیمی کی بنیاد رکھی گئی۔ جنٹلمین کیڈٹوں کے پہلے کورس میں انڈین ملٹری اکیڈیمی ڈیرہ دون کے وہ کیڈٹ شامل تھے جنھوں نے آزادی کے وقت پاکستان کے لئے اپنا انتخاب دیا۔ ۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو پاکستان کی پہلی بٹالین وجود میں آئی۔ مارچ ۱۹۴۸ء قائداعظم محمد علی جناحؒ نے پہلا کرنل ان چیف بننا منظور فرمایا اور ازراہ کرم اسے قائداعظمؒ کے نام پر موسوم کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ قائداعظمؒ نے اکیڈیمی کے افتتاح اور بٹالین کو پرچم عطا کرنے کے لئے ذاتی طور پر تشریف لانا تھا مگر ہر ایک کو دکھ اور ناامیدی کا سامنا کرنا پڑا کہ اکیڈیمی ایسی عزت افزائی سے محروم رہ گئی۔ قائداعظم کی بے وقت علالت اور بعدازاں ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو رحلت سے پورا ملک سوگوار ہو گیا۔ اب ۱۹۷۵ء سے ہر سال ۲۵ دسمبر کو جنٹلمین کیڈٹوں کا دستہ قائداعظمؒ کے یوم ولادت پر ان کے مزار پر صبح سے شام تک گارڈ کے فرائض ادا کرتا ہے۔

بعض نہایت ہی اہم تنظیمی تبدیلیاں 1965ء اور 1971ء کی بھارت کے ساتھ جنگوں کے باعث عالم وجود میں آئیں۔ چنانچہ یکم دسمبر 1965ء کو دوسری پاکستان بٹالین کھڑا کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ 1976ء میں جونیئر کیڈٹ بٹالین (جے سی بی) وجود میں آئی۔ جونیئر کیڈٹ (جے سی) نے دو سال کی کامیاب تربیت کے بعد ریگولر کورس میں شمولیت اختیار کی۔

اکیڈمی میں کیڈٹوں کو مخصوص ملٹری گروپوں میں منقسم کر دیا جاتا۔ پی ایم اے میں تین بٹالین تھیں۔ ہر بٹالین میں چار کمپنیاں اور ہر کمپنی میں چار پلاٹون تھیں۔ کیڈٹوں میں لیڈرشپ کے اوصاف پیدا کرنے کے لئے ان پلاٹونوں میں جونیئر، انٹر، اپر اور سینئر ٹرم کیڈٹ شامل تھے۔ وہ افسران جو پلاٹونوں کی کمانڈ کرتے، پلاٹون کمانڈر کہلواتے۔ ہر پلاٹون میں 25 کیڈٹ تھے۔ پلاٹون کمانڈر اپنی پلاٹون کے کیڈٹوں کی تخمین کے ذمہ دار تھے۔ وہ ضرورت پڑنے پر انہیں مشاورت بھی مہیا کرتے۔ پلاٹونوں کی سرگرمیوں میں رابطہ پیدا کرنے کے لئے کمپنی کمانڈر ذمہ دار ہوتا جو عام طور پر میجر ہوتا۔ چار کمپنیوں کا ذمہ دار کمانڈنگ آفیسر ہوتا جسے بٹالین کمانڈر کہتے۔

نمایاں کارکردگی کے دائرہ میں آنے والے کیڈٹوں کو تقرریاں سونپی گئیں۔ ہر کمپنی کو مخصوص تقرریاں

دی گئیں۔ چنانچہ وہ اپنی اپنی کیڈٹ پلٹنوں کو باہمی مقابلوں کے لئے تیار کرنے کے لئے دن رات محنت کرتیں۔ تمام مقابلوں کے لئے کمپنی کو بنیادی اکائی قرار دیا گیا۔ ٹرم کے اختتام پر جو کمپنی زیادہ سے زیادہ سکور حاصل کرتی اسے مہمانوں کی موجودگی میں گریجوایشن پریڈ پر قائداعظم پرچم عطا کیا جاتا۔ چنانچہ اس کمپنی کو چیمپئن کمپنی کا نام دیا جاتا۔ وہ اگلی ٹرم کے آخر تک ایسا کہلاتی۔ کمپنی میں تقرریاں رکھنے والوں کو بیرکوں میں جگہ دی جاتی۔ جہاں وہ اپنے دفاتر بنا کر اپنی اپنی کمپنی کے معاملات پر غور کرتے۔ یہ کچھ کیڈٹوں میں لیڈر شپ کی خوبیاں اجاگر کرنے کے لئے کیا جاتا۔ کیڈٹوں کو عام طور پر مساوی مواقع فراہم کئے جاتے۔ کیڈٹوں کو پہلی دو ٹرموں میں یہ عارضی اختیارات سونپے جاتے۔ تاکہ وہ اپنے آپ کو موثر لیڈر ثابت کر سکیں۔ وہ کیڈٹ جو اپنے آپ کو نمایاں ثابت کرتے انہیں تیسری ٹرم میں مقابلتاً اہم تقرریاں عطا کی جاتیں اور اسی طرح چوتھی ٹرم کے لئے اہم ترین تقرریاں دی جاتیں۔ کمپنی میں عمدہ تقرریاں نبھانے کا مطلب افسران کے لئے انتظامی امور میں سہولت ہونا تھا۔

نصاب

تربیتی نصاب کی دو اقسام تھیں: ایک وہ جو اکیڈمی میں میٹریکولیٹ (دس جماعتیں پاس) کر کے آتے اور چار سال کی تربیت پاتے اور اس طرح جو ایف اے یا ایف ایس سی (بارہ جماعتیں پاس) کر کے آتے اور دو سال کی تربیت پاتے۔ وہ جو چار سال کے لئے آتے انہیں پہلے دو سال کے لئے جونیئر کیڈٹ بٹالین میں داخلہ دیا جاتا اور انہیں جونیئر کیڈٹ کا نام دیا جاتا۔ انہیں ایف اے یا ایف ایس سی کے لئے مقررہ نصاب ختم کروایا جاتا۔ جونیئر کیڈٹوں کو جنٹلمین کیڈٹوں کے ساتھ شامل ہونے کی اجازت نہ دی جاتی تھی جب تک کہ وہ پی ایم اے میں نہ پہنچ جاتے۔ ان کی ہر شے الگ تھی۔ ان کی گریجوایشن پریڈ بھی آڈیٹوریم کے اندر ہوتی۔ جس کے بعد ان کی سائنس، فوٹو اور آرٹس کلبوں کی نمائش ہوتی۔ اس تقریب کا اختتام ان کے والدین اور مہمانوں کے لئے تیراکی کے پول کے پاس تواضع کے ساتھ ہو جاتا۔

دو سال کے بعد کامیاب جونیئر کیڈٹوں کو ایف اے، ایف ایس سی پاس کر کے پی ایم اے میں بالواسطہ داخلہ لینے والے کیڈٹوں میں ترقی دے دی جاتی۔ اس مرحلے پر جونیئر کیڈٹ اور بالواسطہ آنے والوں کی آمیزش کر دی جاتی۔ اور اب تمام جنٹلمین کیڈٹ بن جاتے۔

اکیڈیمی میں تربیت کے دو رُخ تھے، یعنی ایک اکیڈیمک نصاب اور دوسرا فوجی تربیت۔ دو سال کی تربیتی مدت چار ٹرموں یا اکیس ہفتوں کے فی سمسٹر پر مشتمل تھی۔ ہر کورس کے پہلے دو سمسٹر اکیڈیمک

سمسٹر کہلاتے اور وہ زیادہ تر اکیڈیمک نصاب کے لئے مختص ہوتے جس میں بیچلر ڈگری کے لئے مخصوص نصاب کو ختم کروایا جاتا۔ آخری دو ٹرموں کو ملٹری سمسٹر کہتے اور یہ فوجی تربیت پر مرکوز ہوتی۔ ملٹری ٹرم کے لئے ترقی بی اے یا بی ایس سی ڈگری کے واسطے لازمی شرط تھی۔ ملٹری ٹرم کے اختتام پر جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوتا جس میں کیڈٹوں کو ڈگریاں عطا کی جاتیں۔ اس موقع پر جن کیڈٹوں نے فضیلت حاصل کی ہوتی انہیں دوسرے انعامات اور میڈل ان کی کھیلوں، بیرونی تربیت اور مطالعہ میں کارکردگی کے لئے عطا کئے جاتے۔

پاسنگ آؤٹ پریڈ ایک نرالا موقع ہوتا۔ اس روز فخر، مسرت اور تکمیل کا جذبہ گریجوایشن کرنے والے کیڈٹوں کی آنکھوں میں جھلکتا۔ وہ دن ان کیڈٹوں کی کامیاب تربیت کی تکمیل کے اعتراف کا دن تھا اور اس کے صلہ میں انہیں شان وشوکت سے کمیشن عطا کیا جاتا۔ تمام کیڈٹوں کے لئے فوج میں کمیشن کے حصول سے قبل بی اے، بی ایس سی کی ڈگری کا حصول لازمی تھا۔ صدر یا سروسز چیف میں سے کوئی مہمان خصوصی ہوتا۔ مہمانوں میں بیرونی ممالک کے سفیر، فوجی اور سویلین افسران، سیاست دان، وزراء، والدین اور ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد شامل ہوتے۔ پریڈ ایک گھنٹہ اور پینتالیس منٹ ہوتی۔ بیسٹ آل راؤنڈ کیڈٹ کو سورڈ آف آنر عطا کی جاتی اور اس کا رنر اَپ، چیف آف آرمی سٹاف کین حاصل کرتا۔ اس کے بعد مہمان اپنے اپنے انکلوئر میں چلے جاتے جہاں ان کی تواضع ہوتی۔ اس موقع پر کیڈٹ اپنے عزیزوں اور والدین میں بڑے فخر اور انبساط سے مل جل جاتے۔ اس وقت عزت اور وقار سے گریجویٹ اکیڈیمی سٹاف کا شکریہ ادا کرتے جنہوں نے ان کی ٹریننگ کے دوران اپنے حلقۂ اختیار کے مطابق مدد کی تھی، اُن سے گلے ملتے۔ دوپہر تک اکیڈیمی خالی خالی نظر آنے لگتی۔ کیڈٹ چار ہفتوں کی تعطیل پر رخصت ہو جاتے۔ اسی طرح افسران، سویلین سٹاف، بیرے، انسٹرکٹر اور ٹھیکیدار سب رخصت پر چلے جاتے۔ صرف کچھ سٹاف ضروری امور نپٹانے کے لئے رہ جاتا۔

تخمینے پر ایک نظر

ایک موقع پر اعزازی شمشیر عطا کیے جانے کی سفارش کردہ فہرست بٹالین کمانڈر کی طرف سے میرے پاس آئی۔ دستاویز کی تفاصیل کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ بات ظاہر ہوئی کہ ایک کمپنی سینئر انڈر آفیسر نے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا بہ نسبت اس کے جس کو نمبر ایک قرار دیا گیا تھا۔ میں نے مجوزہ نام کے ساتھ اتفاق نہ کیا۔ چنانچہ میں نے اس کے حق میں تبدیلی کردی جو دستاویز کی بناء پر بہتر کارکردگی دکھانے والا نظر آیا۔ کیونکہ میں سفارش کردہ نام کے ساتھ بغیر دیکھے اتفاق نہیں کرسکتا تھا۔ اس مشاہدے سے

ثابت ہوا کہ تخمین کے طریق کار کو زیادہ موثر بنانے کے لئے چند اقدامات کی ضرورت تھی۔

اکیڈیمی میں ہر سال اوسطاً تین سو طلبہ کی تعداد داخلہ کے لئے آتی۔ نئے طلبہ کو آٹھ پلاٹونوں میں برابر کی تعداد میں تقسیم کر دیا جاتا اور اس طرح دو بٹالینوں میں پوری تعداد آ جاتی۔ نئے طلبہ کی تربیت کی تمام تر ذمہ داری کسی ایک بٹالین کے کمانڈنگ آفیسر کو سونپی جاتی۔ تربیت کی ذمہ داری بھی اسی بٹالین کمانڈر کے پاس ہی رہتی۔ لیکن انتظامی اور نظم وضبط کے امور کی ذمہ داریاں اپنے اپنے بٹالین کمانڈر کے بالواسطہ اختیار میں تھیں۔ کمانڈ اور کنٹرول کا بظاہر یہ ایک ناقص اور غیر مؤثر طریقہ تھا۔ میں نے پالیسی کمیٹی کے ساتھ اس طریقے پر تبادلہ خیال کیا۔ میں نے تجویز پیش کی کہ تین سو طلبہ کا ہر گروپ برابر کے کیڈٹوں میں دو بٹالینوں میں منقسم کر دیا جائے۔ جیسا کہ موجودہ طریق کار تھا۔ لیکن تربیت اور نظم و ضبط کے اعتبار سے ان کے حصہ کے کیڈٹوں کو متعلقہ بٹالین کمانڈر کے ماتحت کر دیا جائے۔ لہٰذا دونوں کمانڈر آنے والے طلبہ کے لیے برابر کی ذمہ داری لیں۔ جہاں تک کیڈٹوں کی تخمین کا تعلق ہے، دونوں بٹالین کمانڈر اپنے اپنے کیڈٹوں کی تخمین کے ذمہ دار ہوں گے اور اسے ڈپٹی کمانڈنٹ کو ارسال کریں گے جو چیف انسٹرکٹر بھی تھے۔ چنانچہ وہ کیڈٹوں کی تخمین پر تبادلہ خیال کریں گے اور کیڈٹوں کی پوری کلاس کا مجموعی میرٹ تیار کر کے فہرست تیار کریں گے۔ اس سسٹم کو اپنانے سے نہ صرف کیڈٹوں کی تخمین میں یکسانیت پیدا ہو جائے گی بلکہ ہر بٹالین کمانڈر پر انتظامی بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا۔ پالیسی کمیٹی نے اسے منظور کر لیا۔

اب میں صدر سے متعلقہ پالیسی کی منظوری حاصل کرنے کے لئے اُن سے ملاقات کے موقع کا منتظر رہا۔ کیونکہ نظر ثانی کمیٹی کے پاس اس کا منظور ہونا محال تھا۔ خوش قسمتی سے مجھے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے اجلاس میں شمولیت کا موقع ملا۔ جہاں ملک کی تمام یونیورسٹیوں کے وائس چانسلروں نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں میری شرکت خالصتاً پی ایم اے کے وائس چانسلر بلحاظ عہدہ کے طور پر ہوئی۔ پی ایم اے ڈگری عطا کرنے والا ادارہ ہے۔ صدر جنرل محمد ضیاء الحق اس مجلس خاص کی صدارت کرنے کے لئے تشریف لائے۔ جب اجلاس اختتام پذیر ہوا اور صدر نے رخصت ہونے کی تیاری کی تو میں اجازت طلب کر کے صدر کی کار میں پریذیڈنٹ ہاؤس تک ان کے ہمراہ گیا۔ راستہ میں متذکرہ بالا منصوبہ جس کا ذکر ہوا، میں نے ان کے سامنے پیش کیا۔ اُنہوں نے فوراً اس کی زبانی منظوری دے دی اور فرمایا کہ وہ خود وی سی او اے ایس کو مطلع کر دیں گے۔ ہم نے اس کو جاری کر دیا جس کی وجہ سے کیڈٹوں کی کارکردگی کا جائزہ مزید بہتر طریقے سے ہونے لگا۔

خوش قسمتی سے میرے پاس لائق بٹالین کمانڈر موجود تھے۔ لیفٹیننٹ کرنل ملک سلیم (بعد میں میجر

جنرل) اخلاق (بعد میں کرنل) توقیر ضیاء (بعد میں لیفٹیننٹ جنرل) اکرام الحسن (بعد میں بریگیڈئر) شفقت (بعد میں بریگیڈئر) کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنی لیڈر شپ سے متعلقہ کمانڈ میں سرگرمی پیدا کی۔ وہ اپنے فرائض کے پابند تھے اور گریجوایشن کرنے والے کیڈٹوں کے لئے بہتر معیار کے حصول کی خاطر انہوں نے اَن تھک محنت اور جانفشانی سے کام لیا۔ دونوں سٹاف افسران لیفٹیننٹ کرنل نثار اور میجر چوہان (دونوں بعد میں بریگیڈئر) نے لگن اور وفاداری سے کام کیا وہ بخوشی دیر تلک کام کرتے رہتے تا کہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں درجۂ کمال حاصل کریں۔

صدر تک رسائی

پاکستان میں تعلیم کا معیار جو کیڈٹ امیدواروں کی آزمائش کے نتائج کا جائزہ لینے سے سامنے آتا ہے، ہر سال گرتا نظر آتا ہے۔ یہ امیدوار تعلیم کے بہتر معیار کا مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ اس صورت میں جب ان کا ملک کے عام معیار سے مقابلہ کیا جائے۔ لیکن پھر بھی یہ بہترین قرار نہیں دیا جا سکتا۔ میرا فرض یہ تھا کہ میں اکیڈیمی میں ایسا ماحول پیدا کروں جس میں ان کیڈٹوں میں موجود تمام خصائص کو پروان چڑھایا جا سکے۔ صرف اسی طرح وہ فوج کے لئے بہترین ممکنہ جونیئر آفیسر بن سکتے تھے۔ ملک میں پھیلے تمام سکولوں اور کالجوں میں تو تعلیم کے معیار کو میں تبدیل نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اکیڈیمی میں ایسی سہولیات کو مہیا کیا جا سکتا تھا، جن سے فوج میں شمولیت کے لئے آنے والے کیڈٹوں کو بہترین جونیئر لیڈر بنایا جا سکتا تھا۔ اس طرح ان کی کمان میں آنے والوں کو ملک کے دفاع کی خاطر بہترین تربیت دی جا سکتی تھی۔ میں ملک میں تعلیم کے معیار کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہا تھا جو بطور کیڈٹ اکیڈیمی میں آنے والے طلبہ کے تعلیمی معیار سے ظاہر ہوتا تھا۔ اسی طرح فوج اکیڈیمی کے معیار کو مختلف رجمنٹوں میں تعینات کردہ سیکنڈ لیفٹیننٹوں کی اہلیت سے پرکھ سکتی تھی جو اپنے روزمرہ کاموں اور فرائض کو ادا کر رہے تھے۔ جب سیکنڈ لیفٹیننٹ متعلقہ آرمز اور سکولوں میں بنیادی کورسز میں شمولیت کرتے تو اس سے فوج کو ہمارے گریجوایٹوں کو پرکھنے کا ایک اور موقع ملتا۔ میں تو یکساں تربیت کے نتیجہ میں ایسے افسران کو پیدا کر سکتا تھا۔ جن کی بنیاد پیدل فوج پر استوار تھی لیکن جس کے ساتھ دوسرے آرمز اور سروسز کی بنیاد بھی شامل تھی۔ چنانچہ کورس کے خاتمہ کے بعد کیڈٹوں کے میرٹ کی فہرست سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہر گریجوایٹ نے بطور انفنٹری سپاہی تربیت حاصل کی ہے اور اس کی حیثیت کیا ہے۔ دوسرے آرمز اور سروسز کے لئے کیڈٹوں کے رجحان یا افادیت کو اس کا پلاٹون کمانڈر پرکھتا تھا جو کیڈٹوں کے ساتھ قریبی رابطہ رکھتا۔ یہ مشکل کام تھا۔ جس کے لئے اعلیٰ اوصاف کے افسران بطور پلاٹون کمانڈر درکار تھے۔

جنگ کے موجودہ طریق کار کی تیزی سے بدلتی ہوئی بنیادوں کے پیش نظر تربیت میں جدیدیت کی ضرورت ہے۔فوج میں نئے ہتھیار متعارف کروائے جا رہے ہیں اور ملٹری ٹیکنالوجی میں کمپیوٹر کو پہلے ہی استعمال میں لایا جا رہا ہے۔مشرق میں ہمارا مخالف ملک بھارت پہلے ہی اپنی جنگی مشینری کو قابلیت کے اعلیٰ معیار پر برقرار رکھنے کی سعی کر رہا ہے۔اپنی عددی کمزوری پر قابو پانے کے لئے ہمیں انتہائی قابل افسران کو پیدا کرنا ہے۔اس فریضے کو میں نے اپنے سامنے رکھا۔اس کے حصول کی خاطر بہترین تدریسی عملہ کی ضرورت تھی جو ابتداً کیڈٹوں کو تدریسی اور بعد ازاں وسیع اور سخت ترین فوجی تربیت میں سے گزاریں۔تربیت کے کورس کے لئے مقررہ وقت میں توسیع نہ دے سکتا تھا۔جب ایک موضوع اختتام پذیر ہوتا ہم اس کو دہرا نہیں سکتے تھے۔لہٰذا پاکستان ملٹری اکیڈیمی میں وقت کیڈٹوں کے لئے بے حد اہم شے تھی۔ان مقاصد کے حصول کے لئے مجھے جنرل ہیڈ کوارٹر کی جانب سے کھلی اور واضح امداد کی ضرورت تھی۔چیف آف آرمی سٹاف جو ملک کے سربراہ تھے،ان تک آسانی سے پہنچنا مشکل تھا کہ میں ان کے ساتھ اکیڈیمی کے معاملات پر تبادلۂ خیال کر سکتا۔لیکن مجھے اس امر کا بخوبی علم تھا کہ فوج کی طرف سے مقررہ ہدف کا حصول میرے لئے ایک مشکل کام ہوگا۔لہٰذا دستیاب مواقع پر میں نے صدر کو اکیڈیمی کی امداد پر آمادہ کرنے کے لئے بریف کرنا شروع کیا۔

مارچ 1983ء کو منعقد ہونے والی گریجوایشن پریڈ کا معائنہ کرنے کے لئے صدر جنرل ضیاء الحق کو دعوت دی گئی۔انہوں نے ہماری دعوت کو منظور فرمایا اور کیڈٹوں نے شاندار فوجی ڈرل کا مظاہرہ کرتے ہوئے صدر مملکت اور دیگر معزز مہمانوں کے سامنے پریڈ کی۔جب تقریب اختتام پذیر ہوئی تو مہمانوں کی تواضع کی گئی۔ان اطمینان کے لمحات میں صدر نے سفیروں،سینئر ریٹائرڈ اور حاضر سروس افسران اور کیڈٹوں کے والدین سے گرمجوشی سے ملاقات کی۔خصوصاً ان والدین سے جن کے بچوں نے تربیت کے دوران امتیازی پوزیشنیں حاصل کیں۔وہ اکیڈیمی کے سٹاف کو بھی ملے۔بعد ازاں میں صدر کے ہمراہ پی ایم اے گیسٹ ہاؤس تک گیا۔جہاں وہ خصوصی مہمان کی حیثیت سے اقامت پذیر تھے۔جب کار گیسٹ ہاؤس کے پورچ تک پہنچی تو میں نے صدر کو اکیڈیمی کے امور کے متعلق آگاہ کیا۔ہماری گفتگو کو دیکھتے ہوئے ملٹری سیکرٹری اور ڈرائیور کار سے باہر چلے گئے۔میں اپنے منصوبوں کی وضاحت کرتا رہا اور تکمیل کے لئے ان کی طرف سے امداد کی ضرورت پر زور دیتا رہا۔میں زیادہ تر بولتا رہا۔مجھے بہترین افسران،بہتر کوالیفائیڈ سٹاف،تربیت کی اعانتیں،اپنے فرائض کی مقررہ حدود کے اندر رہ کر ادائیگی جو خود انہوں نے بطور سی او اے ایس متعین کی ہوئی تھیں،ان سب کی تکمیل کی ضرورت پر زور دیا۔ہماری گفتگو آدھا گھنٹہ جاری رہی۔وائس چیف آف آرمی سٹاف اتنا عرصہ برآمدہ میں منتظر ٹہلتے رہے۔سیکورٹی

گارڈ، پولیس، افسران اور حدنظر تک ہر شخص کی نگاہیں کار پر مرکوز تھیں۔ جہاں صدر مملکت پاکستان ملٹری اکیڈیمی کے کمانڈنٹ کے ساتھ منتظر تمام افراد کو چھوڑ کر محو گفتگو تھے۔ صدر نے سب کو منتظر رکھا تا کہ فوج کی جانب سے متعین مقاصد کے حصول میں مجھے کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ اس آدھے گھنٹہ میں مجھے جو درکار تھا وہ مجھے صدر سے مل گیا۔ اُنہوں نے کار کو چھوڑا تو ہر چہرہ پر طمانیت کے آثار تھے۔ کار کو چھوڑنے سے قبل میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ میرے متعلق کوئی منفی بات سنیں تو مجھے طلب کریں۔ انہوں نے اپنی مخصوص مسکراہٹ سے جواب دیا: ''قطعاً پروانہ کریں۔ بعض تمہارے خلاف باتیں کرتے ہیں۔ میں انہیں ایک کان سے سنتا ہوں اور دوسرے سے نکال دیتا ہوں'' مجھے ایسا سن کر تسلی ہوگئی۔

ہر شخص جس نے مجھے صدر کے ساتھ دیکھا اسے تجسّس تھا۔ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ ہم نے کیا باتیں کیں۔ ہم نے کسی شخصیت کے متعلق بحث نہیں کی تھی اور نہ ہی میں نے کسی کے متعلق کوئی شکایت کی تھی۔ میں نے صرف ان کی اعانت چاہی جو بطور کمانڈنٹ مجھے اپنی ذمہ داری کے لئے درکار تھی۔ لہٰذا کوئی ایسی بات نہ تھی جو میں کسی سے تذکرہ کرتا، جو یہ جاننے کے متمنی تھے کہ صدر اور میرے درمیان کار کے اندر کیا باتیں ہوئیں۔

بعد ازاں صدر کے احترام میں دوپہر کے کھانے کے لیے آفیسر میس میں تشریف لائے۔ جہاں سینئر آفیسرز ان کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے وہ باتیں جو ہمارے درمیان ہوئیں کسی دوسرے کو اس میں حصہ دار نہ بنایا۔ وہ جو گیسٹ ہاؤس میں حاضر نہ تھے اور وہ میری ذاتی گفتگو جاننے کے لئے بے چین تھے کہ میرے اور صدر کے درمیان کیا باتیں ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ مجھے کچھ بھی کہنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ لیکن کسی نے رقابت کے بیج بودیئے جس کا مجھے بقایا ملازمت میں سامنا کرنا پڑا۔

کیڈٹوں کا معیار

پی ایم اے میں داخلہ کھلے مقابلہ سے ہوتا ہے۔ کوئی شخص بھی قطع نظر اس کی مالی پوزیشن کے فوج میں کمشن کے لئے درخواست دے سکتا ہے۔ وہ جو فوج میں نچلے درجوں میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں وہ بھی درخواست دے سکتے ہیں۔ صرف ایک ہی شرط پیش نظر رکھی جاتی ہے کہ درخواست دہندہ فوج کی جانب سے عائد کردہ شرائط کو پورا کرتا ہو۔ کثیر تعداد میں درخواست دہندگان کے باعث انٹرویو کی بناء پر چھانٹی کی جاتی ہے۔ اس کا اہتمام پورے ملک میں جی ایچ کیو مقررہ مراکز پر کرتا ہے۔ انٹرویو کامیابی سے پاس کرنے والوں کو تحریری امتحان دیا جاتا ہے۔ پاس ہو جانے والے امیدواروں کو طبی معائنہ کے لئے بلایا جاتا ہے۔ جسمانی لحاظ سے موزوں امیدواروں کو سلیکشن بورڈ کے روبرو پیش

ہونا پڑتا ہے۔ اس بورڈ میں امیدوار کی شخصیت اور کردار کے خصائص کے متعلق تخمین سازی کی جاتی ہے۔ کامیاب درخواست دہندگان کے نام جی ایچ کیو میں کامیاب امیدواروں کی فہرست میں درج کئے جاتے ہیں جو پی ایم اے میں شمولیت اختیار کرتے ہیں۔ اکیڈیمی میں داخلہ کے بعد ہر امیدوار سے یکساں سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ 72 پی ایم اے لانگ کورس میں مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ جی سی نسیم حسن ولد ریٹائرڈ صوبیدار اللہ دتہ کو سورڈ آف آنر اور اکیڈیمی میڈل کے دونوں اعزازات عطا کئے گئے یہ کیڈٹ غریب خاندان سے آیا تھا۔

سوائے اُردو کی کلاسوں کے اکیڈیمی میں ذریعہ تعلیم انگریزی تھا۔ نیز کیڈٹ آپس میں اور اپنے افسران کے ساتھ انگریزی زبان میں بات چیت کرتے۔ ہم کیڈٹوں کی انگریزی بول چال کی اصلاح کرنا چاہتے تھے تا کہ انہیں اپنے آپ پر یقین ہو اور مسائل کے حل میں اس بین الاقوامی زبان سے کام لے سکیں۔ ملک کے اندر سکولوں اور کالجوں میں تعلیمی معیار کے گرنے کے سبب یہی کیڈٹ جو ان اداروں کی پیداوار تھے، عام طور پر انگریزی میں کمزور نظر آتے۔ ان کے اساتذہ کو محنت شاقہ کر کے کم از کم مطلوبہ معیار پر لانا پڑتا۔ ذریعہ تعلیم اُردو رکھنے والے کیڈٹوں کو اس پس منظر کے باعث ایسے کیڈٹوں سے سخت مقابلہ کرنا پڑتا جنھوں نے انگریزی ذریعہ تعلیم کے ساتھ سکولوں اور کالجوں میں تعلیم پائی ہوتی۔ اردو میڈیم والوں کے لئے اضافی کلاسز کا بندوبست کرنا پڑتا۔

ایک روز لیفٹیننٹ کرنل اکرام الحسن جو جونیئر کیڈٹ بٹالین کے کمانڈنگ آفیسر تھے، میرے ساتھ طے شدہ ملاقات کے لیے جونیئر کیڈٹوں کے عمومی معیار کے متعلق بات چیت کرتے ہوئے کہنے لگے کہ انہوں نے حال میں ایک جونیئر کیڈٹ کو اپنے بوٹوں کے کھلے تسموں کے ساتھ سڑک پر چلتے ہوئے دیکھا۔ وہ کہنے لگے کہ انہوں نے اسے کھڑا کیا اور کہا کہ اپنے بوٹوں کے تسمے بند کرے۔ جونیئر کیڈٹ خاموش رہا۔ اُنہوں نے دوبارہ تسمے بند کرنے کا حکم دیا۔ جونیئر کیڈٹ پھر بھی بے حس و حرکت ہوشیار کھڑا رہا۔ جب انہوں نے پھر بلند آواز میں تسمے بند کرنے کے لئے کہا تو جونیئر کیڈٹ نے رونا شروع کر دیا۔ میں حیرت زدہ رہ گیا اور میں نے پوچھا ''تم رو کیوں رہے ہو؟ میں تو صرف تمہیں تسمے بند کرنے کے لئے کہہ رہا ہوں۔'' اب بھی روتے ہوئے اس نے جواب دیا کہ ''جناب! مجھے تسمے بند کرنا نہیں آتے'' لہٰذا کمانڈنگ آفیسر نے اسے تسمے بند کرنا سکھایا۔

درس گاہ کے اساتذہ کا انتخاب

اکیڈیمی کے تدریسی عملہ میں ایک سو انیس مختلف مضامین میں ایم اے اور دو کے پاس ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں تھیں۔ پورے تدریسی عملہ کا تعلق آرمی ایجوکیشن کور سے تھا۔ انسٹرکٹروں کو بطور آفیسر منتخب

کرنے کی نگرانی جنرل ہیڈ کوارٹر نے کی۔ ایک مرتبہ نئے منتخب کردہ انسٹرکٹر اکیڈمی میں تعینات ہوئے۔ مجھے معلوم ہوا کہ ان میں سے کئی ایک اپنے اپنے مضامین میں کمزور تھے۔ جب میں نے تحقیقات کیں تو مجھے بتلایا گیا کہ جی ایچ کیو سلیکشن بورڈ میں بہت سے اراکین میں سے صرف ایک کا تعلق آرمی ایجوکیشن کور سے تھا اور وہ ان کا ڈائریکٹر تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آرمی ایجوکیشن کور والا شخص فزکس میں ماہر تھا تو بورڈ میں کوئی بھی فرد ریاضی، جغرافیہ یا دوسرے مضامین کے متعلق تخمین سازی کرنے کے اہل نہ ہوگا۔ لہٰذا بورڈ صرف فزکس کے امیدواروں کو منتخب کرنے کا اہل ہوگا۔ میں نے تجویز کیا کہ بورڈ میں ہمیشہ اضافی اراکین کو شامل کیا جائے اور وہ بطور رکن شمولیت کریں جب بھی کسی مخصوص مضمون کا انتخاب مقصود ہو۔ میں نے ان کو یاد دلایا کہ اکیڈیمی میں ہمارے پاس بہترین افسروں کا گروپ موجود ہے۔ اور جب کسی مخصوص مضمون کی ضرورت ہو تو ہم انتخابی عمل میں مدد دینے کی خاطر ان کو مہیا کر سکتے ہیں۔ میں نے صدر کے ساتھ اس مسئلہ پر تبادلۂ خیال کیا اور ان کی منظوری کے بعد بالآخر بورڈ کی تشکیل میں تبدیلی کر دی گئی۔ میرے پاس کوالیفائڈ افسران تھے جن میں کرنل ڈاکٹر اللہ بخش، کرنلز محمد علی، شوکت، نواب، ارشاد، سمیع الدین، ولی اور میجر ڈاکٹر فیوض الرحمٰن، میجرز عزیز، صفدر، افتخار عالم اور کئی دوسرے موجود تھے۔ یہ تجربہ کار لائق آفیسرز تھے۔

کھیلوں کی سہولتوں میں توسیع

تربیتی سرگرمیوں کے حصہ کے طور پر ہر کیڈٹ کو یہ موقع فراہم کیا جاتا کہ وہ کھیلوں میں شامل ہو۔ اکیڈیمی میں کھیلوں کے میدانوں کی تعداد کیڈٹوں کی تعداد کے مقابل محدود تھی۔ چنانچہ بہت سے کیڈٹوں کو کھیلوں کے پیریڈ کے دوران سڑکوں پر لمبی دوڑ مکمل کرنے کو کہا جاتا۔ اس کمی کو درست کرنے کے لئے ہم نے اقدامات کئے۔ چنانچہ کیمپس میں تمام خالی جگہوں میں اضافی کھیل کے میدان بنائے گئے۔ کم جگہوں پر والی بال اور باسکٹ بال کے میدان بنا دیئے گئے۔ کوارٹر گارڈ کی نامناسب جگہ کے سبب پولو کے میدان جس میں جسمانی تربیت کا انتظام بھی کیا جاتا تھا، معیاری میدان سے کم رہ گیا۔ لہٰذا نئے پولو میدان کی ضرورت تھی۔ میجر جنرل اسلم (بڈی) جو ڈائریکٹر جنرل فرنٹیئر ورکس آرگنائزیشن (ایف ڈبلیو او) تھے اور میرے کورس کے ساتھی تھے، اُنہوں نے کھلی جگہوں کو ہموار کرنے کے لئے اور کھیلوں کے میدان بنانے کے لئے مشینری مہیا کی۔ یہ ان کی مکمل اعانت کا نتیجہ تھا کہ ہم وسیع قطعات کو کھیل کے میدانوں میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہوئے اور تربیت اور کھیل کے میدان حاصل کر سکے۔ لیفٹیننٹ کرنل ملک سلیم کی قائدانہ صلاحیت کی بدولت سیکنڈ پاکستان بٹالین کے کیڈٹ بخوشی اس بات پر آمادہ ہو

گئے کہ وہ نئی پولو گراؤنڈ سے اپنے ہاتھوں سے چھوٹی چھوٹی پتھر کی کنکریاں چن لیں اور اسے پولو کے لئے موزوں بنا دیں۔ سلیم نے اپنا دعویٰ درست کر دکھایا، جب انہوں نے محال کو ممکن بنا کر دکھا دیا۔

تجاوزات کے خلاف آئینی جنگ

مجھے تجاوزات کے مسئلے میں دھمکی کا بھی سامنا کرنا پڑا جو پچھلے کئی برسوں سے جگہ جگہ بن گئی تھیں۔ ہم نے تجاوزات کو نشانہ بازی اور ہتھیاروں کی تربیت والے علاقوں سے تو ہٹانے کا بندوبست کر لیا لیکن پی ایم اے سڑک سے ان کو ہٹانے کے لئے ہمیں دو سال تک آئینی جنگ لڑنی پڑی۔

ایبٹ آباد سے پی ایم اے کاکول جانے والی سڑک پر تجاوزات کے باعث رکاوٹیں کھڑی ہو گئیں۔ اس پر نجی مکانات تعمیر ہو گئے۔ نیز غیر قانونی طور پر تعمیر کردہ مسجد کے کچھ حصے جو تقریباً پانچ فٹ تھے، پی ایم اے کی سڑک پر آ گئے تھے۔ یہ اکیڈیمی کی نجی سڑک تھی اور بظاہر اس کی دیکھ بھال اکیڈیمی کی ذمہ داری تھی۔ ہم نے حکومت کی جگہ پر غیر قانونی تجاوزات والوں سے بالواسطہ بات چیت کی۔ جس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ چنانچہ ہمیں سول عدالت میں تقریباً دو برس تک مقدمہ لڑنا پڑا۔ جس کے نتیجہ میں ہمیں تجاوزات کو ہٹانے کا حق مل گیا۔ تجاوزات کو ہٹائے جانے کے بعد سڑک کی بہتری کے لئے جی ایچ کیو نے فنڈز مہیا کئے۔ سڑک کی بہتری کے منصوبوں پر میرے جانشین نے کام کیا۔ اب یہ سڑک زیادہ کشادہ اور خوبصورت نظر آتی ہے۔

بہبودی کے اقدامات

ایک طرف تو کیڈٹوں کو بہترین جونیئر لیڈر بنانے کے لئے ہماری توجہ مرکوز رہی۔ لیکن دوسری جانب اکیڈیمی میں تعینات سٹاف کے خاندانوں کی بھلائی کو بھی ہم نے نظر انداز نہ کیا۔ سٹاف میں فوجی اور سویلین دونوں افراد موجود تھے۔ میں اپنی بیگم عصمت کا ممنون ہوں جس نے میری اس ذمہ داری کو سنبھالا اور لیڈیز کلب کو ادارہ کے طور پر چلایا۔ پی ایم اے لیڈیز کلب نے پی ایم اے سکول کو جدید ترین خطوط پر دوبارہ منظم کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ سکول میں مانٹیسوری، نرسری، پریپ اور کلاس اول تھیں۔ جن کا باقاعدہ افتتاح 14 مارچ 1984ء کو بیگم محمد ضیاء الحق نے کیا۔ اس کو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھانے اور ترقی دینے کا منصوبہ بنایا گیا۔ ہماری خوش قسمتی سے سٹاف کے گھرانوں میں بعض ٹرینڈ خاتون اساتذہ موجود تھیں۔ انہوں نے سکول کی خاطر رضاکارانہ طور پر کچھ وقت نکالنے پر اتفاق کیا۔ بیگم اکرام اور بیگم نقوی خصوصی طور پر ہمارے شکریے کی مستحق ہیں۔ ان کی مساعی جمیلہ سے بچوں کا تعلیمی معیار بلند ہوا۔

لیڈیز کلب کا ایک اور کارنامہ چائلڈ ویلفیئر سنٹر تھا۔ بعض افسران کی بیگمات نے جونیئر کمشنڈ افسروں اور جوانوں کے خاندانوں کی بھلائی کے لئے سرگرمی سے حصہ لیا۔ ان خاندانوں کو بنیادی طبی سہولتیں فراہم کی جاتیں۔ ووکیشنل سنٹر نے افسروں کی بیگمات اور ان کی نوجوان بچیوں کو سلائی کڑھائی، نٹنگ اور ایمبر ائڈری سکھانے کا اہتمام کیا۔ نیز انہیں سجاوٹ اور میک اَپ کا فن بھی سکھایا۔ انہیں ماہر اساتذہ نے تربیت دی اور ان کا امتحان محکمہ سماجی بہبود نے لیا اور کامیاب امیدواروں کو ڈپلومے دیئے۔ اس سلسلہ میں خصوصی اقدامات کے لئے ہم مسز صدیق کی کوششوں کو سراہتے ہیں۔

سینئر ساتھیوں پر ایک نظر

اکیڈیمی میں ہر آفیسر اپنے انداز میں خوب تھا میرے لئے ہر ایک کے خصائص کو بیان کرنا محال ہے۔ چنانچہ میں صرف سینئر ساتھیوں کے متعلق ہی چند الفاظ لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ بریگیڈیئر سعید کھوکھر کے پاس ریاضیات میں ماسٹرز ڈگری تھی اور وہ اکیڈمی میں بطور ڈائریکٹر آف سٹڈیز تعینات ہوئے تھے۔ وہ ڈسپلن کے حامی استاد تھے اور اپنے ماتحتوں پر خود بھی ڈسپلن رکھتے تھے۔ مروجہ طریقہ کار کے مطابق اس امر کی اجازت نہ تھی کہ ڈپٹی کمانڈنٹ کی غیر حاضری میں ڈی او ایس جو بریگیڈیئر تھے، قائم مقامی کے فرائض سرانجام دیں۔ یہ فریضہ سینئر بٹالین کمانڈر جو لیفٹیننٹ کرنل ہوتے تھے، کے سپرد کیا جاتا تھا۔ جبکہ ڈی او ایس جو بریگیڈئر تھے اور اکیڈیمی میں موجود بھی ہوتے، فوج عہدہ کے مطابق کام کرتے لیکن اس صورت میں ایک پرانے اصول کی صریحاً خلاف ورزی ہو رہی تھی۔ چنانچہ میں نے اس مروجہ طریق میں تبدیلی کا فیصلہ کیا جو اس طرح ہوگا کہ ڈپٹی کمانڈنٹ کی غیر حاضری میں ڈی او ایس بطور قائم مقام ڈپٹی کمانڈنٹ کام کرے گا۔

بریگیڈیئر کھوکھر ایک قابل ڈی او ایس تھے اور اب انہیں بطور ڈپٹی کمانڈنٹ کام کرنا تھا۔ تاوقتیکہ کوئی مستقل فرد اپنے فرائض نہیں سنبھال لیتا۔ لہٰذا اکیڈیمی کی انتظامیہ میں لوگوں کے ساتھ کام کرتے ہوئے مجھے بریگیڈیئر کھوکھر کی خوبیوں کو پرکھنے کا موقع ملا۔ مجھے یہاں تذکرہ کرتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ وہ ایک نہایت اعلیٰ اور سخت منتظم ثابت ہوئے۔ سٹاف کے بعض افراد شاید سٹاف کے معاملات کو سختی سے حل کرنے پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ لیکن وہ اپنے ماتحتوں سے اس کی توقع رکھتے تھے۔ وہ یقیناً بطور ڈپٹی ایک بے حد مددگار فرد ثابت ہوئے جیسا کہ ان سے توقع تھی۔ میں نے بریگیڈیئر کھوکھر کو ایجوکیشن کور سے بے حد وفادار پایا۔ وہ دفتر ہی میں میرے ساتھ بہت سے معاملات پر تبادلۂ خیال کرتے۔ لیکن جب ایک مرتبہ مجھ سے فیصلہ سن لیتے تو عملی جامہ پہنانے کے دوران کبھی

مخالفت میں ایک لفظ بھی نہ نکالتے ۔خواہ دفتر میں ان کا میرے ساتھ اختلاف ہی کیوں نہ رہا ہو۔
ان کے بعد بریگیڈیئر شیر افگن کیانی ڈپٹی کمانڈنٹ بن کر آئے۔ وہ بہت باکمال آفیسر تھے۔ 1965ء کی جنگ کے بعد ہم نے اکٹھے بطور کیپٹن انسٹرکٹر اکیڈیمی میں خدمات سرانجام دی تھیں۔ انہوں نے اکیڈیمی کی انتظامیہ کو بہتر بنانے کے لئے مثبت خدمات سرانجام دیں اور کیڈٹوں کے لئے بیرونی مشقوں کو دوبارہ تحریر کیا۔ وہ اکیڈیمی میں اپنا دو سال کا عرصہ پورا نہ کر سکے۔انہیں سعودی عرب میں تین سال کی تعیناتی کے لئے نامزد کر دیا گیا تھا۔
بریگیڈئیر کیانی کی جگہ بریگیڈیئر چوہدری اشرف (بعد میں میجر جنرل) کو تعینات کیا گیا۔ وہ نہایت محنتی آفیسر تھے۔ وہ اپنے کام کی تکمیل کے لئے مکمل دلجمعی اور محنت سے کام لیتے۔ میں نے زیادہ سے زیادہ فرائض ان کو تفویض کرنا شروع کر دیئے۔ان کا طرز تکلم متاثر کن اور مدلل ہوتا اور جو کوئی بھی ان کو سنتا تسلیم کئے بغیر نہ رہتا۔ وہ دوسروں سے معاملات طے کرنے میں ثابت قدم رہتے لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنے ماتحتوں اور ساتھیوں کو بے حد سودمند مشورے بھی دیتے۔ ان کے مشورے میرے لئے بے حد قیمتی ہوا کرتے۔ وہ ٹینس کے ایک عمدہ کھلاڑی تھے اور ان کی بدولت پی ایم اے کی ٹینس کورٹوں میں رونق لوٹ آئی۔مزاج کے اعتبار سے وہ جدت پسند تھے۔
پاکستان ملٹری اکیڈیمی میں کمانڈ کا ہر روز میرے لئے چیلنج کا دن ہوتا۔ مجھے یہ کام پسند تھا۔ میں اس ادارہ کی پیداوار تھا اور فوج میں میری کامیابیاں اسی ادارہ سے حاصل کردہ تربیت کی مرہون منت تھیں۔ یہ ڈگری عطا کرنے والا ادارہ تھا اور اس نے اکیڈمک اور ملٹری ادارہ کے طور پر ترقی پائی تھی۔ کیڈٹوں کی تربیت میں کم وبیش 250۔افسر نے میری اعانت کرتے تھے۔اس میں تقریباً نصف کے پاس ایم اے کی ڈگری تھی۔ بلکہ دو کے پاس ڈاکٹریٹ کی ڈگری۔ ان میں بعض سینئر افسران شامل تھے۔ڈپٹی کمانڈنٹ بطور چیف انسٹرکٹر کام کرتے تھے۔ وہ فوجی تربیت کے ذمہ دار تھے اور ان کی امداد کے لئے مکمل سٹاف موجود تھا۔ بیرونی تربیت میں تمام مشقوں کے لئے وہ ذمہ دار تھے۔ڈائریکٹر آف سٹڈیز تمام اکیڈمک تدریسی شعبوں کے سربراہ تھے۔ وہ بیچلر ڈگری نصاب کی تیاری میں کیڈٹوں میں رابطہ پیدا کرتے۔ ہر شعبہ میں متعدد انسٹرکٹر ہوتے۔ جن کا سب سے سینئر فرد سربراہ ہوتا۔ کمانڈنٹ بلحاظ عہدہ یونیورسٹی کا وائس چانسلر تھا جو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے اجلاسوں میں شرکت کرتا۔ میں نے چھ جلسۂ تقسیم اسناد کی صدارت کی۔ ساتویں کنووکیشن کے لئے لیفٹیننٹ جنرل اقبال نے صدارت کی۔

جی ایچ کیو میں تبدیلی کے احکامات

اگست 1985ء میں مجھے پاکستان ملٹری اکیڈیمی کو جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی خاطر جی ایچ کیو میں ایک کانفرنس میں طلب کیا گیا جس کی صدارت وی سی او اے ایس نے کرنا تھی۔ مقررہ تاریخ کو میں جی ایچ کیو پہنچا تو معلوم ہوا کہ مذکورہ کانفرنس میں بہت سے مسائل زیر غور آئیں گے اور پی ایم اے کی جدیدیت کا منصوبہ ان میں سے ایک ہوگا۔ میں سیدھا وائس چیف آف آرمی سٹاف کے پرائیویٹ سیکرٹری کے پاس پہنچا انہوں نے مجھے بتلایا کہ تقریباً ایک گھنٹہ بعد پی ایم اے کی باری آئے گی۔ اس طرح چونکہ میرے پاس ایک گھنٹہ کا وقت تھا۔ لہٰذا میں وائس چیف آف دی جنرل سٹاف کے پاس ایک عام ملاقات کے لئے چلا گیا۔ ایک روز قبل ہونے والی بعض تبدیلیوں کے علاوہ جن کے احکامات نکل چکے تھے، وی سی جی ایس نے مجھے بتایا کہ ساتویں ڈویژن کے جی او سی جنرل آصف نواز (بعد میں جنرل) کو اکیڈیمی کی کمان سنبھالنے کے لئے تعینات کیا جا رہا ہے۔

ساڑھے تین سال کا عرصہ کافی مدت نہ تھی کہ جو منصوبے میں نے بنائے تھے۔ ان کو حقیقت میں ڈھالا جا سکتا۔ لیکن جو کچھ بھی میں نے حاصل کیا یہ میرے ساتھیوں کی اعانت کا نتیجہ تھا۔ وہ تمام جو اس ادارہ کے ساتھ منسلک تھے۔ ہر ایک نے اپنے اپنے میدان میں اعلیٰ خدمت کی مثال قائم کی۔ اب رخصت ہونے کا وقت آن پہنچا تھا۔ لہٰذا مجھے جی ایچ کیو کے لئے تبدیلی کے احکامات موصول ہو گئے۔ اس تعیناتی کا تعلق ملک کی سیکنڈ لائن فورسز سے تھا۔ چونکہ یہاں میں نے پہلے خدمت سرانجام نہ دیں تھیں، میں اس کے متعلق کچھ زیادہ نہیں جانتا تھا۔

نیشنل گارڈز

اکتوبر ۱۹۸۵ کو میں جنرل ہیڈکوارٹرز پہنچا اور ڈائریکٹر جنرل نیشنل گارڈز کے فرائض سنبھال لیے۔ میرے پیشرو میجر جنرل شفیق ایک مکمل پیشہ ور آفیسر تھے۔ جنہوں نے مجھے نیشنل گارڈز کی تنظیم اور فرائض کے متعلق تفصیلی بریفنگ دی۔ چونکہ مجھے اس سے قبل اس سیکنڈ لائن فورس کے متعلق زیادہ معلومات حاصل نہ تھیں جسے مختصر سے عرصہ میں دفاع پر مامور کیا جا سکتا تھا، میں نے فیصلہ کیا کہ میں ان تینوں ڈائریکٹروں سے مفصل بریفنگ حاصل کروں، جو نیشنل گارڈز کے ایک ایک حصہ کو چلاتے تھے۔

تنظیم

نیشنل گارڈز تین حصوں میں منقسم تھی۔ مجاہد فورس (لغوی طور پر ایک ایسی طاقت جو اپنے ملک کی خاطر بطور دینی فریضہ جنگ کے لیے تیار ہو) جانباز فورس (لغوی معانی ایک ایسی طاقت جس کے سپاہی اپنے ملک کی خاطر جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے تیار ہوں) اور نیشنل کیڈٹ کور (این سی سی)۔
نیشنل گارڈز کا ہر سیکٹر ہیڈکوارٹر ضرورت کے وقت جانباز اور این سی سی کی بھرتی، تربیت، انتظامی امور اور سرگرمیوں کا ذمہ دار تھا۔ تمام ملک کو گیارہ سیکٹروں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اور ہر سیکٹر ایک بریگیڈیئر کی کمانڈ میں تھا۔ پاکستانی فوج کی باقاعدہ تربیت یافتہ ٹیمیں ہر سیکٹر ہیڈکوارٹر میں متعین کی گئی تھیں۔ تربیت کے لیے انسٹرکٹروں کی گشتی ٹیمیں بنائی گئی تھیں اور وہ ٹرانسپورٹ میں تقریباً خود کفیل تھیں۔ ٹرانسپورٹ میں کسی کمی کو پورا کرنا اس فارمیشن کی ذمہ داری تھی جس سے وہ منسلک ہوتی۔ جی ایچ کیو میں میرے تین ڈائریکٹر تھے جن میں سے ہر ایک مجاہد، جانباز اور این سی سی کے امور میں میری اعانت کے لیے موجود تھا۔ ہر ایک ڈائریکٹر اپنے سٹاف افسران کے ہمراہ تربیت کے مقاصد کے حصول کی سعی کرتا۔ جن کا چیف آف دی آرمی سٹاف نے تربیت کے مقاصد میں تعین فرمایا تھا۔ میرے ڈائریکٹروں میں ہر ایک قابل اور فرض شناس افسر تھا۔

مجاہد فورس

اسے انفنٹری رجمنٹ کے خطوط پر منظم کیا گیا۔ کمانڈنگ آفیسر اور ایجوٹینیٹ کو باقاعدہ فوج سے تعینات کیا گیا۔ جب کبھی مجاہد بٹالین کو حاضری کا حکم دیا گیا، کوشش کی گئی کہ بقیہ کمان کی بناوٹ مجاہد فورس کے اندر سے منظم کی جائے۔

مجاہد فورس ایک رضا کار تنظیم ہے جسے عوام کو قائل کر کے بھرتی کیا جاتا ہے۔ مجاہد فورس میں شمولیت باضابطہ پیشہ نہ تھا۔ ان کو صرف ضرورت کے وقت بلایا جاتا۔ یہ کوئی جبری بھرتی نہ تھی۔ یہ تو پاکستانی شہریوں پر مشتمل رضا کار تنظیم تھی یعنی جب افواج پاکستان کو ضرورت پڑتی یا پھر ملک کی سرحدوں کو محفوظ کرنے کی ضرورت پڑتی تو مجاہدوں کو بلایا جاتا۔ ان کی ملازمتوں کو ان کے مالکان تحفظ کی یقین دہانی کرواتے جب تک کہ وہ اپنی فوجی خدمات سے واپس نہ آ جاتے۔ بھرتی ان کے گھروں کے پاس کے علاقوں سے کیا جاتا۔ لیکن تربیت کا انتظام باضابطہ فوج کی وہ رجمنٹ کرتی جس کے ساتھ وہ بطور رضا کار منسلک ہوتے۔ جب فرائض کی ادائیگی کے لیے ان کو بلایا جاتا تو ڈی جی این جی ہیڈ کوارٹر کی طرف سے انہیں معاوضہ ملتا۔ جب ایک مرتبہ اس کو بھرتی کر لیا جاتا تو کوئی شخص مجاہد فورس کو ترک کرنے کی استدعا نہ کر سکتا۔ سوائے بے حد مجبوری کی صورت میں کہ جس کا خیال کیا جاتا۔ تمام مجاہدوں پر پاکستانی فوجی قوانین کا اطلاق ہوتا۔ یہ فورس تمام ملک میں لام بندی اور صف آرائی کے لیے موجود رہتی تھی۔

مجاہد ٹریننگ رجمنٹ

مجاہد فورس ان رضا کاروں پر مشتمل تھی جن کی بھرتی اور تنظیم اسی طرح رجمنٹوں میں کی جاتی جیسا کہ پاکستانی فوج کی انفنٹری رجمنٹوں کو منظم کیا جاتا۔ انہیں ان کے عملی پروگرام کے قریبی علاقوں سے بھرتی کیا جاتا۔ لہٰذا بھرتی کی یہ حکمت عملی انہیں اپنے گھروں کی حفاظت کرنے کے لیے اُبھارتی اور اس لیے وہ مجاہد فورس میں داخلہ لیتے۔ بھرتی، تربیت اور انتظامی امور کو انفنٹری رجمنٹوں کے سپرد کیا جاتا۔ ہر مجاہد رجمنٹ کو انفنٹری رجمنٹ کے ساتھ منسلک کیا جاتا۔ نیشنل گارڈز کے سیکٹر ہیڈ کوارٹر مجاہد فورس کے ذمہ دار نہیں تھے۔ مجاہد فورس کے جی ایچ کیو میں ڈائریکٹر تربیت کے اُن مقاصد کے حصول کی سعی کرتے، جنہیں مجاہد رجمنٹ کے لیے مقرر کیا جاتا اور یہ انفنٹری رجمنٹوں کے ذریعے ہوتا۔ اس انتظام میں سنگین خامی تھی۔ چونکہ اجتماع، تربیت اور انتظامی امور کی تمام تر ذمہ داری مقررہ انفینٹری رجمنٹوں پر ہوتی، لہٰذا مختلف رجمنٹوں میں معیار کی یکسانیت کا فقدان ہونے کی وجہ سے اُن مجاہد رجمنٹوں کا معیار بھی مختلف ہوتا جنہیں وہ تربیت مہیا کرتیں۔ اس طریق کار میں نقائص کا بغور جائزہ لینے سے جسے میں نے مجاہدوں

کے ڈائریکٹر کی مدد سے حاصل کیا، میں نے وی سی او ایس کے سامنے ایک منصوبہ پیش کیا۔ اس منصوبہ میں ہر کور میں ایک مجاہد رجمنٹ کا مستقل موجود رکھا گیا۔ اس رجمنٹ میں کمانڈ کے عنصر کو نان کمشنڈ افسروں سے شروع کیا جاتا۔ رجمنٹ کو کسی دوسری رجمنٹ کی مانند چھاؤنی میں رکھا جاتا۔ تیار رجمنٹ کو مجاہد گارڈز کے کمانڈروں کے کمانڈ اور کنٹرول میں دیا جاتا۔ غیر منظم مجاہد رجمنٹوں کو یکے بعد دیگرے تیار مجاہد رجمنٹوں کے پروگراموں سے آٹھ ہفتے کی تربیت کے دوران سے گزارا جاتا۔ سب سے بڑا فائدہ جو اس طریق کار سے ہوا وہ تربیت میں یکسانیت تھی۔ دوسرا فورس کو اپنائیت کا احساس ہوتا اور ضرورت کے وقت امداد کے حصول کے لیے وہ اپنے آپ کو تیار رکھتے۔ تیسرا یہ کہ سینئر آفیسر جیسے سیکٹر کمانڈر ہر وقت فارمیشن ہیڈ کوارٹر میں مشاورت کے لیے حاضر ہوتا۔ اس انداز فکر کو وی سی او اے ایس جنرل عارف نے پسند کیا اور اسے عملی جامہ پہنانے کے متعلق کہہ دیا۔ اس کے طریقوں میں بہتری کے سبب اس فورس کے موثر ہونے سے ہم سب کو بے حد اطمینان ہوا۔

مجاہدوں کے لیے رجمنٹل سنٹر

چند عملی ضروریات کے پیش نظر بعض مجاہدوں کی رجمنٹوں کو پنشن کے اہل ہونے کی خاطر کافی لمبا عرصہ خدمات سرانجام دینا پڑتیں۔ ان رجمنٹوں کے پنشن کے ریکارڈوں کو منظم اور محفوظ رکھنے کی خاطر مجاہدوں کے ڈائریکٹر بریگیڈیئر مسعود الحسن نے اپنے اوپر ذمہ داری قبول کی۔ سی او اے ایس نے ایک الگ رجمنٹل سنٹر کی منظوری دی۔ اور فیلڈ پے آفس کی ڈی جی این جی کے ماتحت کام کرنے کی بھی منظوری دی۔ تاہم سنٹر کے لیے مالی معاونت ماہرین امور مالیات کے ساتھ طویل مجادلہ کے بعد ہی حاصل ہو سکی۔

یہ کامیابی بریگیڈیئر مسعود نے حاصل کی اور فوج میں کسی بھی آرمز یا سروس کے خطوط پر مجاہد فورس کی تنظیم کرنا شروع کر دی۔ کامیابی سخت محنت کے بعد بریگیڈیئر مسعود اور اس کے سٹاف نے حاصل کی تھی۔ جس کے لئے وہ قابل ستائش ہیں۔ ان کے مؤثر دلائل اور رعب دار آواز کے ساتھ ساتھ طویل نوٹ لکھنے کی اہلیت نے وزارت مالیات کی ناقابل تسخیر دیواروں کو توڑ پھوڑ دیا۔

جانباز فورس

جانباز فورس کے دو حصے ہیں: جانباز طیارہ شکن بیٹریاں اور جانباز انفینٹری کمپنیاں۔ دونوں کو فوج میں ان کے مقابل فورسز کے مطابق منظم کیا گیا۔ دونوں کو آسان ہدف (وی پی) کے خلاف مخاصمانہ ہوائی یا زمینی حملہ کے دفاع کی تربیت دی گئی۔

نیشنل گارڈز کے سیکٹر ہیڈ کوارٹرز طیارہ شکن بیڑیوں اور انفنٹری کمپنیوں کے لیے افرادی قوت کی بھرتی اور تربیت کے ذمہ دار تھے۔ موزوں نوجوان جو آسان ہدف کے قریب سکونت پذیر تھے، کو بھرتی کے لیے ترجیح دی جاتی۔ یوں امن کے زمانہ میں ان کی ذمہ داریوں میں کم سے کم خلل ہوتا۔ جانباز فورس آسان ہدف پر تربیت کے لیے جمع ہوتی۔ جہاں تربیت دینے والے بھی موجود ہوتے۔ تربیت کے لیے درکار اسلحہ بھی یہاں لایا جاتا۔ جانبازوں کو سال میں چار ہفتوں کی سخت تربیت کے لیے بلایا جاتا جس کا خاتمہ نشانہ بازی کے رینجوں پر مشق کے بعد ہو جاتا۔

جانبازوں کے طیارہ شکن نشانے کا جائزہ لینے کے لیے میں ملتان رینجز پر پہنچا۔ نشانہ کے لیے تمام معاونتوں کا انتظام ایئر ڈیفنس رجمنٹ کی طرف سے کیا جاتا۔ ڈی جی این جی اخراجات کے لیے مالی معاونت مہیا کرتا۔ نشانہ بازی کی مشق کے طریقہ کار سے میری تسلی نہ ہوئی۔ نشانہ کی مشقوں کے درمیان اوقات کے لمبے وقفے کرنے کی اجازت دی جاتی۔ اس قسم کی تاخیر کے سبب نشانہ بازی کے پیریڈ ان اوقات میں چلے جاتے۔ جب ہوا بڑی تیزی سے چلتی اور اس کے سبب ڈرون طیاروں پر قابو نہ رکھا جا سکتا۔ لہٰذا میں نے این جی نشانہ بازی کو طیارہ شکن رجمنٹ کے شیڈول سے کلیتاً الگ کر دیا۔

بریگیڈیئر جواہر راولپنڈی این جی سیکٹر کی کمانڈ کر رہے تھے۔ وہ بے حد تجربہ کار اور قابل ہوا باز تھے۔ میں نے جو کچھ ملتان رینجز پر دیکھا۔ میں نے ان سے اس کے متعلق تبادلہ خیال کیا۔ اور میں نے ان سے کہا کہ کیا وہ ایسے ڈرونز کو بنا سکتے ہیں جن کو جانباز ریموٹ کنٹرول سے اڑا سکیں۔ بریگیڈیئر نے فوراً اتفاق کر لیا۔ ڈائریکٹر جانباز نے ضروری مالی معاونت مہیا کر دی۔ جواہر نے اس پراجیکٹ پر فوراً کام کا آغاز کر دیا۔ جانباز فورس کے اندر سے کاریگر افرادی قوت کوئی مسئلہ نہ تھا۔ فورس کے پاس باصلاحیت وہیکل مکینکس، الیکٹرونک ٹیکنیشنز، بڑھئی، ڈرافٹسمین، کلرک، معمار، مزدور، اساتذہ اور کاشتکار موجود تھے۔ جن میں سے ہم نے محدودے چند کا تذکرہ کیا ہے۔ آپ کام کی تفصیل کا تذکرہ کریں۔ کام کرنے والا فوراً میسر ہو جائے گا۔ تھوڑے سے عرصہ میں بریگیڈیئر جواہر نے ڈرون کو بنا لیا۔ اور اس کی اڑان کا ہمارے سامنے مظاہرہ کیا۔ یہ ایک نمایاں کامیابی تھی۔ اب ہر سیکٹر ہیڈ کوارٹر سے بہترین طیارہ شکن نشانہ بازوں کو تیار کر کے راولپنڈی میں تربیت کے لیے طلب کیا۔ بلوچستان کے نشانہ باز سب پر بازی لے گئے۔ جواہر نے ایک مرتبہ پھر تربیت یافتہ افراد کی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا جو ڈرونز سے کام لیتے تھے۔ یہ ایک عمدہ کارنامہ تھا۔ انہوں نے چالو پراجیکٹ کے لیے تربیت یافتہ افرادی قوت بھی مہیا کر دی۔ بعدازاں ہر قسم کی نشانہ بازی جانباز کرتے۔ بریگیڈیئر جواہر اور اس کی ٹیم نے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ اگلی نشانہ بازی رینجز پر نیشنل گارڈ کے لیے جانباز فورس نے سرانجام

دی۔ میں اس جذبہ کو کبھی بھلا نہیں سکتا۔ جسے کام میں لا کر جانباز فورس نے اپنی نشانہ بازی کی۔ میں ان کی نشانہ بازی کی مشقوں سے کبھی غیر حاضر نہ رہتا۔ ہم جانباز ٹیموں کے درمیان نشانہ بازی کے مقابلوں کا اہتمام کرتے جو مختلف سیکٹروں سے آیا کرتے۔ نشانہ بازی کو جوش اور جذبہ سے کام میں لانے کا نظارہ دید کے قابل تھا۔ ان کی ڈرل کی حرکات بے عیب تھیں۔ مقابلوں کا جائزہ لینے کے لیے ماہرین کی ٹیمیں موجود ہوتیں۔ پہلی تین ٹیموں کو انعامات دیئے جاتے۔ نشانہ بازی کے انفرادی انعامات الگ ہوتے جو حسبِ مراتب عطا کئے جاتے۔ طیارہ شکن فائرنگ میں خود انحصاری ایک بڑی کامیابی تھی۔

طلبی کی اطلاعات

تمام سیکٹر ہیڈ کوارٹروں کو اچھی طرح منظم کیا گیا تھا۔ انہوں نے ہر اس شخص کا مکمل ریکارڈ محفوظ رکھا ہوا تھا جو کبھی ان کا حصہ تھا۔ ڈی جی این جی کی طرف سے افراد کو تیار رہنے کی اطلاع موصول ہونے پر سیکٹر ہیڈ کوارٹرز افراد کو طلبی کے اطلاع نامے ارسال کرتے۔ تیاری کے احکامات کو پہلے ہی ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے نشر کر دیا جاتا۔ سول انتظامیہ کی عنایت سے مساجد کے لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے بھی اعلانات کر دیئے جاتے تھے۔ تیز ترین طریقہ مقامی جانباز افسروں کی وساطت سے اپنے اپنے افراد کو ذاتی طور پر بلانے کا طریقہ تھا۔ یہ افسران غیر تیار افراد سے قریبی تعلق رکھتے۔ اور نیشنل گارڈز کے سیکٹر ہیڈ کوارٹرز سے بھی رابطہ رکھتے۔ افسران کو ان کے افراد کا مکمل پتہ معلوم ہوتا۔ یہ تیاری کا تیز ترین طریقہ تھا۔

نیشنل کیڈٹ کور اور خواتین کا حفاظتی دستہ

نیشنل کیڈٹ کور کے دو حصے ہیں: این سی سی لڑکوں کے کالجوں اور ویمن گارڈ لڑکیوں کے کالجوں کے لیے۔ دونوں حصوں کا ایک ہی نصاب ہے جس میں معمولی تبدیلی سے یہ لڑکیوں کے لیے کم مشکل بنایا گیا ہے۔ تربیت کالجوں کے اندر ہی فراہم کی جاتی ہے۔ جس کے لیے تربیت کا عملہ جس کا تعلق نیشنل گارڈز سے ہے، ایک کالج سے دوسرے کالج تربیت کے لیے شیڈول کے مطابق پہنچتا ہے۔ کالج کا پرنسپل ہر چھ ماہ بعد دس متواتر یوم مقرر کرتا ہے جس میں رضا کار طلبہ کو سخت تربیت ٹریننگ ٹیموں کے ذریعے فراہم کی جاتی ہے۔ تربیت کے کل چار دورانیے دو سالوں میں دس دس ایام کے لیے مختص کئے جاتے لہٰذا تمام مقررہ نصاب دو اکیڈمک سالوں میں ختم کروایا جاتا۔ رینجوں پر نشانہ بازی تربیت کا آخری مرحلہ قرار دیا جاتا۔ جس میں طلبہ گہری دلچسپی کا مظاہرہ کرتے۔ دوسرے سال کے اختتام پر مشقیں منعقد کی جاتیں۔ اور جو طلبہ کامیاب ہو جاتے، وہ اپنی اپنی کالج گراؤنڈوں میں پریڈوں کا اہتمام کر کے آخری تقریب منعقد کرتے۔ جسے مہمانوں کی کثیر تعداد دیکھتی۔ کامیاب طلبہ کو سرٹیفکیٹ عطا کئے جاتے۔ جو

انہیں اپنے مجموعی اکیڈمک سکور میں بیس نمبروں کے اضافہ کا حقدار بناتے۔اس طرح انہیں اپنی کلاس میں مزید ترقی کا موقع مل جاتا۔کالجوں کے پرنسپل حضرات نے عام طور پر تربیت دینے والے عملہ کے ساتھ تعاون کیا۔اور بعض حالات میں ان کی دیکھ بھال میں نہایت فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔لیکن بلوچستان کے ایک کالج نے تربیت دینے والے عملہ کو رہائش کی سہولت نہ دے کر عدم تعاون کا مظاہرہ کیا۔تربیت دینے والے عملہ کے پاس کہیں بھی رہنے کے لیے جگہ نہ تھی۔کالج کی اعانت کے بغیر این سی سی کو تربیت مہیا کرنا محال تھا۔تربیت دینے والے عملہ کو رہائش کی سہولت درکار تھی۔بلکہ تربیت کے سامان کو بھی کہیں رکھنا تھا۔سیکٹر کمانڈر کی سفارش پر میں نے فوراً تربیت کی سہولت کو واپس لے لیا۔جب سیکٹر کمانڈر نے تربیت دینے والے عملہ کو واپس منگوالیا تو ہر کالج کے طلبہ نے احتجاج کرنا شروع کر دیا۔ کیونکہ اس طرح بظاہر انہیں اضافی نمبروں کے موقع سے ہاتھ دھونے پڑے۔پرنسپل کو سیکٹر کمانڈر کو معافی نامہ تحریر کرنا پڑا۔اور اس طرح تربیت کی سہولت کو دوبارہ بحال کر دیا گیا۔

مجھے ڈائریکٹر این سی سی اور ڈبلیو جی نے بتلایا کہ بلوچستان کے ایک اور کالج میں طلبہ نے تربیتی عملہ کے انسٹرکٹروں سے بدسلوکی کا مظاہرہ کیا اور ان سے بدتمیزی سے پیش آئے۔وہاں سے بھی تربیت کی سہولت واپس لے لی گئی۔طلبہ بہت چیخے چلائے لیکن تربیت کو کم و بیش ایک سال بعد جاری کیا گیا، جب طلبہ نے تحریری معافی نامہ داخل کیا۔اگر طلبہ اپنے اساتذہ کا احترام نہیں کریں گے،تو وہ کسی سے بھی احترام کے ساتھ پیش نہیں آئیں گے۔ایسا رویہ قطعاً قابل قبول نہیں۔طالبات نے ہمیشہ اچھے اخلاق کا مظاہرہ کیا اور اپنی تربیت کو سنجیدگی سے لیا۔مردوں کے بعض کالج بھی بہت عمدہ تھے۔

این سی سی اور ڈبلیو جی تربیت نے بیرونی ممالک میں بھی ہر دلعزیزی حاصل کر لی۔خلیجی ریاستوں میں بعض کالج پاکستانی سفارت خانوں کی بالواسطہ نگرانی میں چل رہے تھے۔ان کالجوں کا پاکستان کی یونیورسٹیوں سے الحاق تھا اور تمام پرچہ جات پاکستان سے روانہ کئے جاتے تھے،اور نتائج کو بھی وہی یونیورسٹی تیار کرتی،جس کے ساتھ ان کا الحاق تھا۔یہ لڑکے اور لڑکیاں این سی سی تربیت حاصل کرنے کے مشتاق تھے اور اس طرح بیس نمبروں کے اضافی فائدہ سے مستفید ہونے کے متمنی تھے۔ان غیر ملکی طلبہ اور طالبات کے لیے این سی سی اور ڈبلیو جی کی تربیت کا اہتمام پاکستان میں کیا گیا،جس کے لیے سعودی عرب میں پاکستان کے سفیر نے استدعا کی تھی۔یہ طلبہ اپنے اخراجات پر پاکستان آئے۔اور انہوں نے خود اپنے رہائشی انتظامات کئے۔کراچی اور اسلام آباد میں تربیت کے دو مراکز کھولے گئے۔ ان دونوں مراکز میں طلبہ اور طالبات کے لیے الگ الگ تربیت کا بندوبست کیا گیا۔طلبہ اور طالبات کو اپنی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی پسند کے مرکز کا انتخاب کرنے کی اجازت دی گئی۔بریگیڈیئر

جواہر نے اسلام آباد اور بریگیڈیئر کیانی نے کراچی میں ان مراکز کو بے حد عمدگی سے منظم کیا۔ میں نے ان طلبہ سے ملاقات کی اور ان کو خطاب کیا۔ ان کا رویہ مثالی تھا اور انہوں نے اپنی تربیت سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ اپنے اساتذہ کے لیے وہ بے حد احترام سے بھرے تھے اور ہر نئی چیز کو جاننے کے دلدادہ تھے۔ ان کے چار ہفتوں کے قیام کے دوران مکمل نصاب کو ختم کروایا گیا۔ اور یہ بڑی مسرت کی بات تھی کہ وہ سب کے سب کامیاب ہو گئے۔ بہت خوب جواہر! بہت خوب کیانی۔

اس سکیم کو چلتے رہنا چاہیے۔ اس سے نہ صرف کالجوں میں ڈسپلن قائم رہتا ہے بلکہ اچھے طلبہ فوجی پیشہ کو اپنانے کے لیے مائل ہوتے ہیں۔

میرے دورے

میرے کام کی نوعیت میں وسیع سفر ناگزیر تھا۔ جب بھی ممکن ہوا میں نے شہری ہوائی سفر اختیار کیا۔ جہاں شہری ہوائی سفر کی سہولت موجود نہ تھی، میں نے جی ایچ کیو کے فراہم کردہ دو سیٹوں والے جہاز کا سہارا لیا، مگر ایسی جگہ جہاں اترنے کی سہولت موجود تھی۔ جہاں اترنے کی سہولت موجود نہ تھی میں نے ہیلی کاپٹر کا استعمال کیا۔ نزدیکی جگہوں پر میں سٹاف کار میں چلا جاتا۔ تمام سہولیات کے باوجود جو مجھے میسر تھیں، میں تربیت کی تمام ٹیموں تک نہ پہنچ سکا۔ تربیت کی ٹیمیں تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھیں اور دور دراز کے علاقوں میں موجود ٹیموں تک صرف سڑک کے ذریعے ہی پہنچا جا سکتا تھا۔ بہر حال میں لمبے عرصہ کے لئے جی ایچ کیو سے غیر حاضر نہ رہ سکتا تھا۔ جہاں تربیت دینے والی ٹیموں تک پہنچنا ضروری تھا وہاں دفتر کے روزمرہ کے کام کرنا بھی اتنا ہی اہم تھا۔ دفتر میں نیشنل گارڈز کو زیادہ فعال بنانے کا ریسرچ کام جاری تھا۔ مکمل پراجیکٹ کے لیے ڈائریکٹروں سے مل کر رابطے کا کام جاری رکھنا لازمی تھا۔

سندھ میں بھرتی کا کام مشکل تھا۔ لیکن حر قبیلہ نے تمام کام میں مکمل تعاون کیا۔ یہ تعاون ان کے رہنما پیر پگاڑو کی امداد سے حاصل ہوا۔ تربیت دینے والی ٹیموں نے پیر صاحب کے نامزد کردہ افراد کے ساتھ قریبی تعلق قائم رکھا۔ جنہیں خلیفہ کا نام دیا جاتا۔ حر اچھے لڑاکے ہیں اور سخت حالات میں بھی زندگی گزار سکتے ہیں۔ وہ اپنے خیالات کے اظہار میں بالکل بے باک ہیں۔ اگر تربیت کے طریقہ میں تبدیلی درکار ہوتی تو اس کا اظہار فوراً کرتے۔ تیار مجاہد فورس کے دورہ کے وقت مجھے سکھر میں مقامی فارمیشن نے ہیلی کاپٹر فراہم کیا۔ میں حر رجمنٹوں کے ہمراہ پورا دن گزارتا۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ صرف انفنٹری آفیسر ہی مجاہد رجمنٹ کی کمانڈ کرے۔ ابھی تک ان کی رجمنٹ کے لیے کمانڈنگ آفیسر کا تقرر عمل میں نہیں آیا تھا۔ بعد ازاں مجھے اطلاع ملی کہ وہاں کمانڈنگ آفیسر جس کی تعیناتی کی گئی، سگنل کور سے تھا۔

سندھ کا اندرون حصہ کم آبادی والا علاقہ ہے۔ لیکن وہاں سڑکوں بجلی اور ٹیلی فون کا جال پھیلا ہوا ہے۔ لوگ غریب ہیں لیکن ان کے قبائلی سردار امیر ہیں۔ ان دنوں ڈاکوؤں نے لوٹ مار شروع کر دی تھی۔ اور مجاہد رجمنٹوں کو ڈاکوؤں کے خلاف کارروائی کے لیے تیار کر دیا گیا تھا۔ حالات اس قدر مشکل تھے کہ مجھے اس علاقہ پر ہیلی کاپٹر کو نیچی پرواز کے لیے استعمال میں نہ لانے کا مشورہ دیا گیا۔ عام طور پر یہ بھی کہا گیا کہ علاقہ کے بڑے بڑے زمینداروں نے جرائم پیشہ افراد اور ڈاکوؤں کو پال رکھا ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ ڈاکو پولیس کے چھاپوں سے کس طرح بچے رہتے ہیں۔ مجھے بتلایا گیا کہ حکومت نے پبلک کال آفس (پی سی او) کا بندوبست عوام کی سہولت کے لیے کر رکھا ہے۔ لیکن امراء کے گھروں کے صحنوں میں لگایا گیا ہے اور انہیں چلانے والے افراد کا تعلق بھی ان لوگوں کے ساتھ تھا۔ لہٰذا چھاپہ مار پارٹی اپنا عمل شروع کرتی تو ٹیلی فون کے ذریعے ہر ایک کو اطلاع فراہم کر دی جاتی۔ اس سے انہیں پیشگی خبر ہو جاتی اور وہ وڈیرے کے گھر سے فرار ہو جاتے اور اپنی پناہ گاہوں میں چلے جاتے۔

بلوچستان کے اندرونی علاقہ میں بھی ہمیں اسی نوعیت کا مسئلہ درپیش تھا اور بھرتی کے مسائل تھے۔ میرا خیال ہے کہ کم آبادی کے سبب ایسا تھا۔ کیونکہ جن کو بھرتی کیا گیا وہ بے حد مشتاق اور اعلیٰ درجہ کے سپاہی تھے۔

نیشنل گارڈز کے تمام درجوں کی میں بے حد تعریف کروں گا۔ جس طرح انہوں نے اپنے فرائض کو ادا کیا، اس میں ایک لگن تھی۔ اگرچہ بعض سپاہیوں میں طبی معیار کے لحاظ سے کمی تھی لیکن انہوں نے اسے کبھی اپنے فرائض کی ادائیگی میں آڑے نہ آنے دیا۔ بعض مقامات پر رسدی وسائل کی سہولیات کی کمی تھی۔ لیکن جو کام بھی ان کے سپرد کئے گئے، اسے مکمل کرنے میں تن دہی سے کام لیا۔ اور خطرات کو خاطر میں نہ لائے۔ اکثر کو اپنے خاندان والدین کی نگرانی میں چھوڑنے پڑتے۔ کیونکہ ان کی ملازمت کی ضروریات اس امر کا تقاضا کرتیں۔ اور وہ عمدگی سے ان کی دیکھ بھال نہ کر سکتے۔ سیکنڈ لائن فورس ہونے کے ناطے بعض سہولیات سول انتظامیہ کی جانب سے مہیا کی جاتیں۔ بعض اوقات اس قسم کے تعاون میں سول انتظامیہ کی طرف سے کوتاہی کا مظاہرہ ہو جاتا۔ لیکن اس کے باوجود تربیت دینے والا عملہ اپنے فرائض عمدگی سے ادا کرتا۔ ہر سیکٹر کمانڈر نے اس عظیم سیکنڈ لائن فورس کو جنگی تیاری میں رکھنے کے لیے بڑی فرض شناسی سے اپنا حصہ ادا کیا۔ انہوں نے بے حد شاندار کارنامہ انجام دیا۔

نیشنل گارڈز کے ڈائریکٹوریٹ جنرل میں ڈائریکٹرز اور سٹاف جذبے کے ساتھ کام کرنے والے جوان تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے سیکنڈ لائن فورسز کو زندہ متحرک قوت بنانے میں اپنا اپنا کردار ادا کیا۔ جس قسم کی تبدیلیاں تجویز کرنے کے متعلق انہوں نے مشورے دیئے، اس سے ان کے اختراعی

ذہنوں کی عکاسی ہوتی ہے، اور وہ ان کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کا ثبوت ہے۔ بھارت کی ''براس ٹیک'' مشق کو پاکستان کے لیے خطرہ سمجھا گیا۔ کیونکہ بھارت کی تمام فوجی قوت کو پاکستان کے مشرقی بازوؤں کے علاقہ جات کے اگلے حصوں کے قریب مجتمع کر دیا گیا۔ پاکستان کی مسلح افواج نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا اور اجتماع افواج کا حکم دے دیا گیا۔ مجاہد رجمنٹوں، جانباز طیارہ شکن بیٹریوں اور جانباز انفنٹری کمپنیوں کو تیاری کا حکم دے دیا گیا۔ سیکٹر ہیڈ کوارٹروں اور فارمیشن ہیڈ کوارٹروں نے کم از کم وقت میں تیاری مکمل کر لی۔ یہ نیشنل گارڈز کے لیے ایک آزمائش تھی اور وہ اس میں آبرومندانہ طریقے سے پورے اترے۔ سیکنڈ لائن فورسز اپنے ہتھیاروں اور اسلحہ سمیت اپنی ڈیوٹی کے مقام پر کمربستہ تھے۔ فوراً ہی تیار ہو جانے کی اہلیت کی وجہ سے نیشنل گارڈز نے نہایت نمایاں طور پر ہندوستان کو اس کے جارحانہ عزائم سے روکنے میں اہم کردار ادا کیا۔

چند تاثرات

جدید جنگ ٹیکنالوجی کے اعتبار سے بے حد ترقی کر چکی ہے اور قومی میزانیہ پر اس کا بڑا بھاری بوجھ ہوتا ہے۔ پاکستان جیسا ملک ایک طویل جنگ کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اور ناکافی خود انحصاری کے باعث کثیر فوج جو حساس جنگی آلات اور ہتھیاروں سے لیس ہو، کا بوجھ اپنے سے مضبوط مخالف کا مقابلہ کرنے کے لئے برداشت نہیں کر سکتا۔ جہاں ہم پاکستان کو معاشی اعتبار سے مضبوط کرنا چاہتے ہیں وہاں اس کی سالمیت، اقتدار اعلیٰ اور سرحدوں کی حفاظت بھی کرنے کے متمنی ہیں۔ پاکستانیوں کی حیثیت میں ہم میں اپنی افرادی قوت کے استعمال کرنے کی پوری پوری اہلیت ہونی چاہیے۔ چینیوں نے اپنے انسانی وسائل کے موثر استعمال کے باعث صرف تین دہائیوں سے قدرے زیادہ مدت میں عظیم قوت کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران سویت یونین کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لیے اپنی تمام افرادی قوت کو کام میں لانے کا کام فن لینڈ نے کیا اور تین ماہ مقابلہ کیا۔ اور اس طرح روسیوں کے اس دعوے کو کہ وہ تقریباً دو ہفتوں کے اندر فن لینڈ پر قابض ہو جائیں گے، غلط ثابت کر دیا۔ سوئزرلینڈ کے پاس صرف ۳۵۰۰ باقاعدہ فوجی ہیں۔ لیکن کسی بھی ناگہانی حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ ۵۸۲۵۰۰ افراد کو جمع کر سکتا ہے۔ آخری مثال اسرائیل کی ہے جو اپنی تمام افرادی قوت کو ضرورت کے لمحے اکٹھا کر سکتا ہے۔

جنگوں کو کبھی بھی صرف باقاعدہ افواج کے سہارے نہیں لڑا جا سکتا۔ جنگ کو جیتنے یا اسے طوالت دینے کا اہل ہونے کے لیے تمام قوم کو کھڑا ہونے اور ملک کے دفاع کے لیے اپنی ذمہ داری کو تسلیم کرنا

چاہیے۔ دنیا کی بعض ترقی یافتہ اقوام اپنی جنگی قوت کے باوجود سٹیزن آرمی کے نظریہ کے متعلق سنجیدگی سے سوچ بچار کر رہی ہیں۔ تا کہ اپنے دفاعی اخراجات کو بچا کر اپنے ملک کے معاشی حالات کو درست کرنے کے لیے کام میں لا سکیں۔ حب الوطنی اور شوق کا مظاہرہ جو وہ اپنے کاموں میں دکھاتے ہیں، اس سے انہوں نے یہ درجہ حاصل کر لیا ہے کہ وہ بحیثیت قوم کسی بھی لمحے ہتھیار اٹھانے کی اہلیت رکھتے ہیں اور دشمن پر ضرب کاری لگا سکتے ہیں۔

ایک کثیر با قاعدہ فوج رکھنے سے اخراجات بے شمار ہوتے ہیں۔ لیکن ہم ملک کی سالمیت اور اقتدار اعلیٰ کو درپیش ممکنہ خطرات سے غافل نہیں ہو سکتے۔ حکومت کو اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ اور اپنے وسائل کے مطابق زمینی افواج کو تیار کرنا چاہیے۔ ہمارے پاس اسلامی نظریات کی حامل افرادی قوت ہے جو طاقت کا ایک نا قابل شکست منبع ہے۔ آیئے ہم اپنے ملک کی معاشی حالت کو سنوارنے کی سعی کریں۔ اور ساتھ ہی ساتھ مضبوط ریزرو فورس کو بنائیں جو نیشنل گارڈز کی صورت میں ہو۔ جو ہماری بین الاقوامی سرحدوں کی حفاظت کی ضامن ہو۔ تمام تندرست شہری اپنے اپنے حصہ کا کردار ادا کریں۔

نیشنل گارڈ کو اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ مسلح افواج کو فوراً بڑھانے کے کام آ سکتے ہیں۔ ہم بہتر تربیت یافتہ اور مسلح ہوں گے تو بہتر انداز میں اور مضبوطی سے جدید جنگ کے اچانک آ دھمکنے کی صورت میں ہم میں کھڑے ہونے کی قوت ہوگی۔ جنگ کے لیے کسی بھی ملک میں تیاری اس وقت مکمل ہوگی جب اس کے تمام شہری بہتر طور پر تربیت یافتہ ہوں گے۔ اور سیکنڈ لائن فورس کی صورت میں ان کے پاس مناسب اسلحہ ہوگا۔ پاکستان میں اس کی بنیادیں پہلے ہی رکھی جا چکی ہیں۔ اور اس پر مضبوط ڈھانچہ استوار کرنے کے متعلق سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ لہٰذا آیئے ہم سب اپنے ملک کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے متحد ہو جائیں۔

تحریر مابعد

میری زندگی اور کیریئر کے مختصر احوال سے جنہیں ان صفحات میں سلسلہ وار درج کیا گیا، بہت سے قومی اہمیت کے نہایت دقیق مسائل مرکزِ نگاہ بنے ہیں۔

پہلا قابل توجہ مسئلہ ہماری بڑھتی ہوئی آبادی کے شدید دباؤ کا وہ اثر ہے جو عوام کے لیے سہولیات اور اخلاقیات پر پڑا ہے۔ ایک بڑی وجہ کہ عوام اپنے مقدمات کو سول عدالتوں کی بجائے مارشل لاء کی قائم کردہ عدالتوں میں لے جانے کو ترجیح دیتے، یہ تھی کہ سول قانونی نظام نے تیزی سے پھیلنے کی کوشش نہیں کی تاکہ عوامی مقدمات کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو قابلیت کے ساتھ روک سکتے۔ جس کا ہماری آبادی کو سامنا ہے اور جو خوفناک اور دھماکہ خیز شرح سے بڑھ رہے ہیں۔ ہماری بڑھتی ہوئی آبادی کا یہ قدرتی نتیجہ ہے کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے سرکاری اراضی اور شاہراہوں پر ناجائز تجاوزات کا سہارا لے لیا ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی اس امر کا تقاضا تو نہیں کرتی کہ تجاوزات کو درست قرار دے دیا جائے۔ لیکن اس سے ایسے عمل کو تو سمجھا جا سکتا ہے۔ جس تیزی سے آبادی کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اگر اس کو روکا نہ گیا اور بتدریج منقلب نہ کیا گیا تو کسی بھی حکومت کا کوئی بھی منصوبہ ملک کے لیے کامیابی کے ساتھ پایہ تکمیل تک نہ پہنچے گا۔

اس وقت ہماری سڑکوں، ریلوے، ہوائی جہازوں، سکولوں اور دفاتر میں جگہوں کی کمی ہے۔ جن کی ان سے توقع کی جا رہی ہے۔ ایک گونہ مکمل انتشار ہمارے چند ہی قدموں کے فاصلہ پر نظر آ رہا ہے۔ اگر ہم نے کامیابی کے ساتھ اس کا کوئی سدباب نہ کیا۔ اور اس طرح آبادی میں تیزی کے رجحان کے فوری اور سنگین مسئلہ کے حل کے اقدامات نہ کئے تو پھر تباہی کا سامنا ہوگا۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے وطن عزیز کی پینتالیس سالہ حیات مبارکہ میں کئی سویلین حکومتوں کو ناکام ہوتے دیکھا اور تین مارشل لاء ادوار کا نظارہ کیا ہے۔ ان ناکامیوں کو بالواسطہ طور پر اخلاقی بے راہ روی کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے اس بے راہ روی نے وقتاً فوقتاً مختلف اشکال اپنائیں۔ لیکن یہ شناسا صورتیں تھیں۔ مثلاً خویش پروری، دھوکہ دہی، غبن اور اثر اندازی وغیرہ۔ اس المیہ نے اخلاقی بے راہ

روی کو اجاگر کر دیا ہے جو ہمارے اکثر شہریوں کا طرۂ امتیاز بن چکی ہے۔ بے شک وہ کسی بلند منصب پر ہی کیوں نہ فائز ہوں۔ ہم میں سے ہر شخص کو جو کسی بھی منصب پر ہو، عوام میں اخلاقی تعلیم کی سعی کرنی چاہیے۔ اور اس طرح اپنے زیر اثر لوگوں میں یکجہتی، خوش اخلاقی اور وطن سے محبت کے جذبات کو ابھارنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اسے والدین کو ترجیحی بنیادوں پر اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔ اسی طرح اساتذہ کو اپنے شاگردوں کو تعلیم دیتے ہوئے، مالکان کو اپنے ملازمین کے لیے حکمت عملی بناتے ہوئے اور ہمارے پروفیسروں کو ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اپنے طلبہ کی رہنمائی کرتے ہوئے۔ اسی طرح عوام کی امانت میں خلل ڈالنے والوں کو روکنے کے لیے آہنی ہاتھوں سے کام لینا چاہیے اور ماضی کی طرح نہیں کرنا چاہیے۔ جو عوام کی امانت میں خیانت کے مرتکب ہوں ان کے ساتھ مکمل انصاف اور سختی کا سلوک کیا جانا چاہیے۔ ایسے لوگوں کو جان لینا چاہیے کہ ان کے اعمال کو برداشت نہیں کیا جائے گا اور وہ سزا سے بچ نہیں سکیں گے۔

تیسرے پاکستان ملٹری اکیڈیمی میں بطور کمانڈنٹ میں نے ملک میں تعلیم کے معیار کو گرتے اور اس کے اثرات کو دیکھا۔ اس سنگین اور قابل نفرت پستی کے اسباب میں سے ایک سبب بھٹو دور میں نجی اور دینی مدارس اور کالجوں کو قومی ملکیت قرار دیا جانا تھا۔ اگر ممکن ہو تو ان اعلیٰ تعلیمی اداروں کو ان کے اصل مالکان کو واپس کر دینا چاہیے۔ انہیں مکمل اختیارات دے دینا چاہیے نیز ان کو مالی وسائل مہیا کرنے چاہئیں تاکہ ان اداروں کے پرانے تعلیمی معیار کو پھر سے اجاگر کرنے کی کوشش کی جا سکے۔ ہمارے عوام کی اشد ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تعلیمی سہولیات مہیا نہیں کی جا سکیں۔ بنیادی تعلیم کی شرح صرف ۱۳ فیصد سے اندازاً ۲۰ فیصد تک ہمارے ملک کی پوری تاریخ میں پہنچی ہے۔ زیادہ سے زیادہ مالی وسائل اور افراد اس پاکیزہ کام میں تخلیقی انداز میں صرف کیے جانے چاہئیں تاکہ پاکستان میں تعلیم کا معیار اسی سطح تک بلند کیا جا سکے، جو جدید معاشرہ کی ضروریات کو پورا کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ مستقبل کی تعلیمی ضروریات میں مثبت تدریسی عمل کو شامل کیا جائے۔ جس میں خاندانی منصوبہ بندی کے مسئلہ کے ساتھ ٹریفک کے قوانین نجی اور پبلک اخلاقیات کو بھی شامل کیا جائے۔

چوتھا یہ کہ ہماری آبادی دوگنا، تین گنا یا چار گنا تک جا پہنچی ہے ہمارے شہروں میں لوگوں کا طوفان آ گیا ہے۔ اس سے ہماری میونسپل حکومتوں کے لیے بے شمار مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک ٹریکٹر کے استعمال سے ہمارے فارموں میں پندرہ کاشتکاری کرنے والے مزدور بیکار ہو گئے ہیں۔ اس طرح بیکار مزدور اور ان کے خاندان شہروں کی طرف رخ کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اس افراتفری میں اس امید کے سہارے کہ شہروں میں وہ کوئی ملازمت حاصل کر کے ایک عمدہ اور خوبصورت طرز کو اپنانے

کے اہل ہو جائیں گے، معیار زندگی کو بلند کرنے کے لیے ایسی تدابیر کی ضرورت ہے، جس سے نجی صنعتوں کو دیہی علاقوں میں لگانے اور بے گھر افراد کو ملازمتیں مہیا کرنے کی طرف رغبت دلائی جا سکے۔ اس منصوبے سے دیہی علاقوں کو پنپنے کا موقع ملے گا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس سے پاکستان کے بڑے شہروں اور قصبوں میں آبادی کے بڑھنے اور یکجا ہونے کو بھی روکا جا سکے گا۔

پانچویں یہ کہ اس کتاب میں جن سالوں کا احاطہ کیا گیا ہے، ان میں ہمارے ملک کے اندر سیاسی عدم استحکام چھایا رہا ہے۔ ایک ضرب المثل ہے کہ نیا جھاڑو اچھی صفائی کرتا ہے۔ اسی طرح ہر نئی حکومت نے پرانی حکومت کے جاری پراجیکٹوں کو معطل کر دیا اور اپنا پروگرام شروع کر دیا۔ نتیجتاً بہت سے ضروری منصوبے بند کر دیئے گئے اور کبھی بھی انہیں تکمیل تک نہ پہنچایا گیا۔ ہمیں انفرادی مفادات کو متفقہ قومی منصوبوں اور مقاصد کے مقابل دبانا چاہیے جو ہمیں اخلاقی، معاشی، فوجی اور معاشرتی اعتبار سے بلندیوں پر لے جائیں گے۔ مثلاً سوئٹزرلینڈ میں ۱۹۵۹ء (87) سے وہی چار جماعتی قومی حکومت چلی آ رہی ہے۔ ہمیں صرف ۱۹۵۹ء سے تا حال سوئٹزرلینڈ اور اپنی ترقی کا موازنہ کرنا چاہیے کہ کس طرح فوری درکار سیاسی ذمہ داری اور مضبوطی کو مطمع نظر بنایا جا سکتا ہے۔

آخر میں میں کہوں گا کہ میں نے سویلین اور فوجی حکومتوں کو یکے بعد دیگرے ناکام ہوتے دیکھا ہے۔ اس نے یقیناً ایسا مرحلہ سامنے لا کھڑا کیا ہے کہ جہاں دینی رہنماؤں کو حکومت سازی میں اپنا زیادہ فعال کردار پیش کرنا چاہیے۔ اس مرحلہ پر ہمیں بے حد محتاط ہونے کی ضرورت ہے کہ وہ جنہوں نے یہ نتیجہ اخذ کر رکھا ہے کہ اجتہاد کے دروازے بند ہو چکے ہیں، اپنے نظریے کو قوم پر نہ تھوپ دیں۔ ہمیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''تم مقدمات کا فیصلہ کیسے کرو گے؟'' معاذ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا ''خدا کی کتاب کے مطابق۔'' اگر کتاب میں مقدمہ کے متعلق کچھ بھی موجود نہ ہو'' رسول اللہ ﷺ نے پوچھا۔ ''تو پھر رسول خدا کی سنت کے مطابق'' ''اگر سنت میں بھی اس کے متعلق کچھ نہ ہوا۔'' رسول خدا ﷺ نے دریافت کیا۔ ''پھر میں آزادانہ طور پر اپنے دماغ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔'' معاذ رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا۔ تو پھر رسول اللہ ﷺ نے معاذ کے اس متبادل فیصلہ کی منظوری دے دی (88)۔

قیمتی وقت ضائع ہو چکا ہے۔ ہمارے عہد کے تقاضوں کے مطابق ترقی نہیں ہو سکی۔ بار بار عوام کی امانتوں کو نقصان پہنچایا گیا ہے۔ لیکن اب بھی سب کچھ ہو سکتا ہے۔ سب کچھ تباہ نہیں ہوا۔ میرا

87۔ اے پی ملز فلسفا رم اینڈ شنکو ٹو سوڈا۔ فیوچرز ریسرچ کرنسی آؤٹ لک نیویارک شیرسن لیمین یکم نومبر، ۱۹۹۱ء صفحہ ۱۶)

88۔ جناح سے ضیاء تک مصنف محمد منیر صفحہ ۱۴۷

ایمان ہے کہ ہماری عظیم قوم عاقل اور بددیانتی سے پاک قیادت کی زیر نگرانی قائداعظم کے خواب کو پورا کرنے کے لیے ضروری اقدامات کرے گی۔ اور ملک کی بنیاد رکھنے والے دوسرے رہنماؤں کی تمنائیں پوری کرے گی۔ ہمارے عظیم عوام مناسب قیادت کے تحت موجودہ حالات میں بے شمار مکاروں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ جن کا انہیں سامنا ہے اور ہمارے ملک کو ایشیا میں مثالی مقام دلا سکتے ہیں۔

ضمیمہ وخاکے

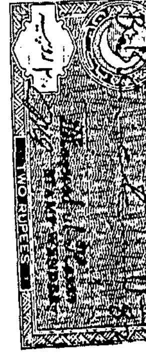
ضمیمہ

حیات محمد ولد نواب محمد خان کے بیان کی تصدیق کی نقل

جس نے جناب بھٹو کی میت کو غسل دیا تھا

حیات محمد ولد نواب محمد خان کی سیشن جج راولپنڈی کی عدالت میں بیان کی کاپی

کیس نمبر $\frac{\text{20-4-1982}}{\text{20-11-1979}}$ 36OF



STATEMENT HAYAT MUHAMMAD S/O NAWAB KHAN IN THE COURT OF SESSION JUDGE RAWALPINDI

CASE NO. 36 OF $\frac{\text{20-4-1982}}{\text{20-11-1979}}$

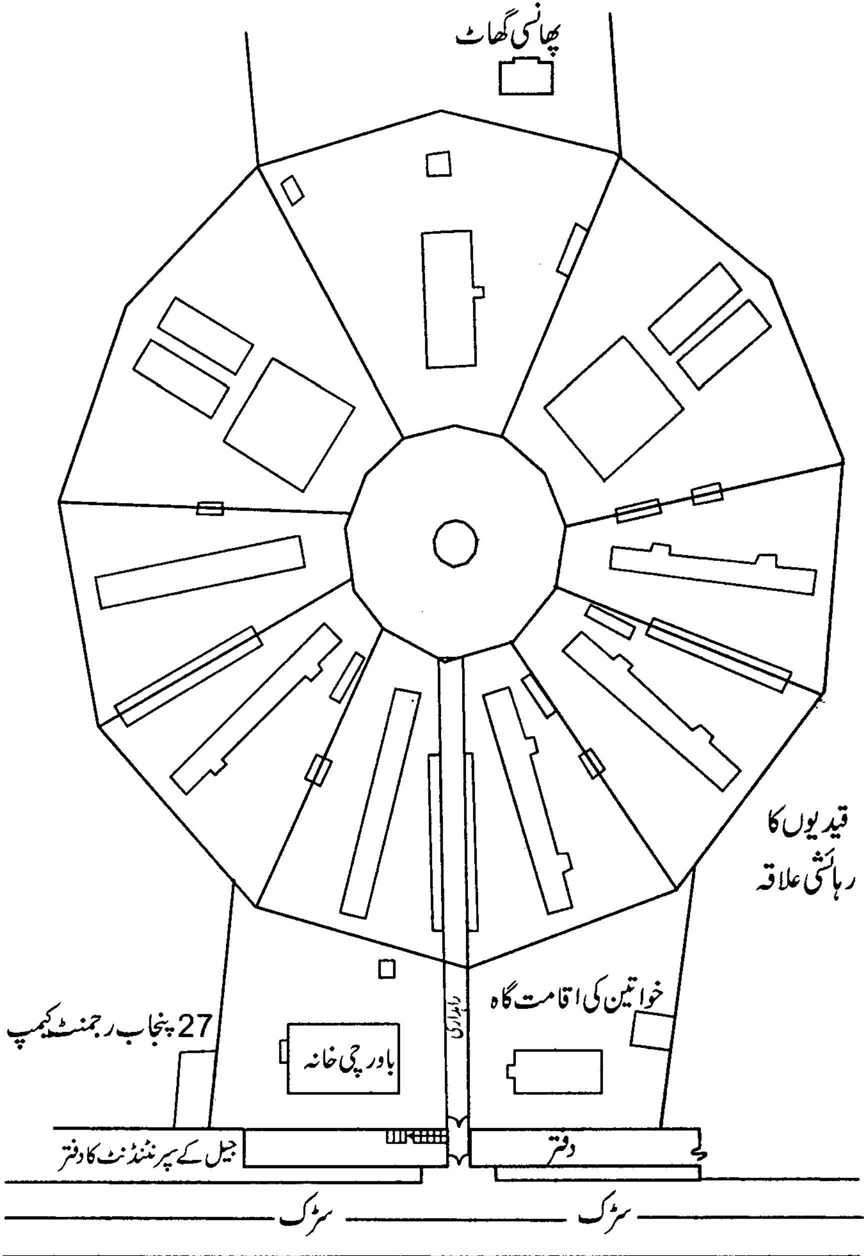
ATTESTED

16-2-85

حیات محمد ولد نواب محمد خان۔ اعوان۔ 57 سال۔ خادم مسجد بھوسہ منڈی راولپنڈی مجھے 3\4 اپریل 1979ء کی درمیانی شب ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی لے جایا گیا۔ میں تقریباً 12 بجے رات جیل میں پہنچا۔ تقریباً تین بجے مجھے کہا گیا کہ میں بھٹو صاحب کی نعش کو غسل دوں۔ میں نے چنانچہ انہیں غسل دیا۔ ان کی نعش بالکل ٹھیک ٹھاک تھی کوئی چوٹ وغیرہ نہ تھی۔

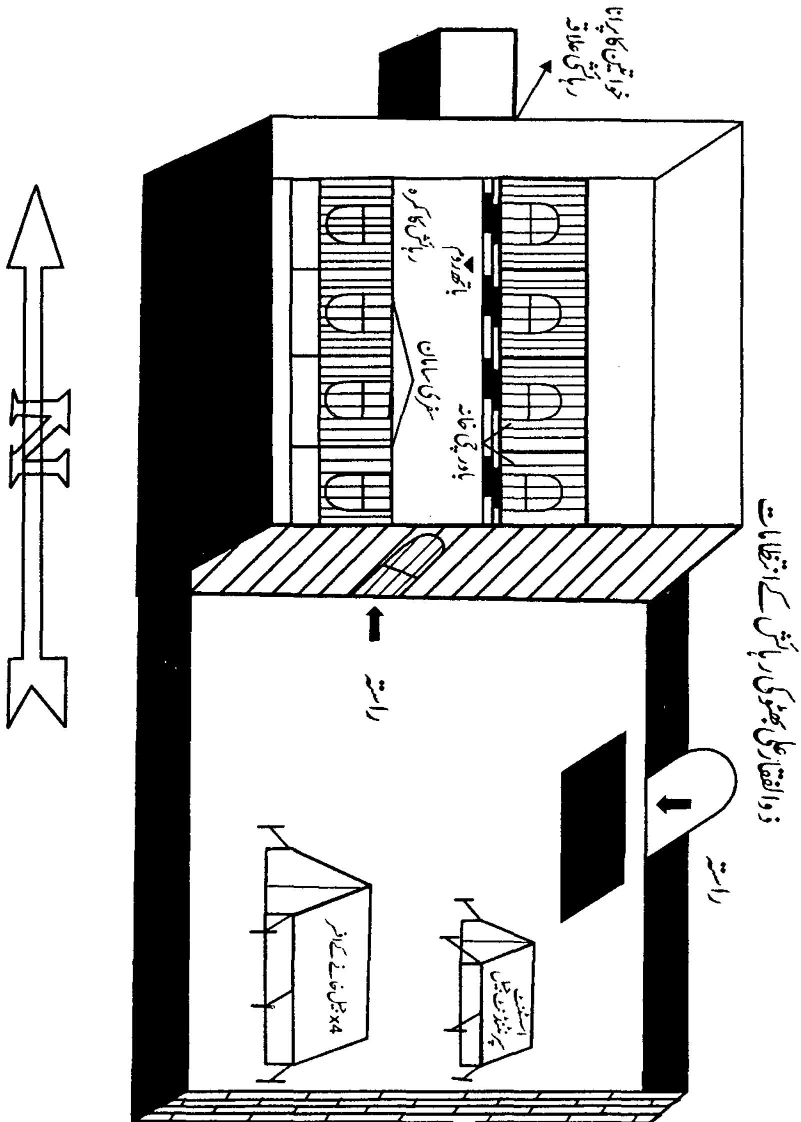
خاکہ نمبر 1

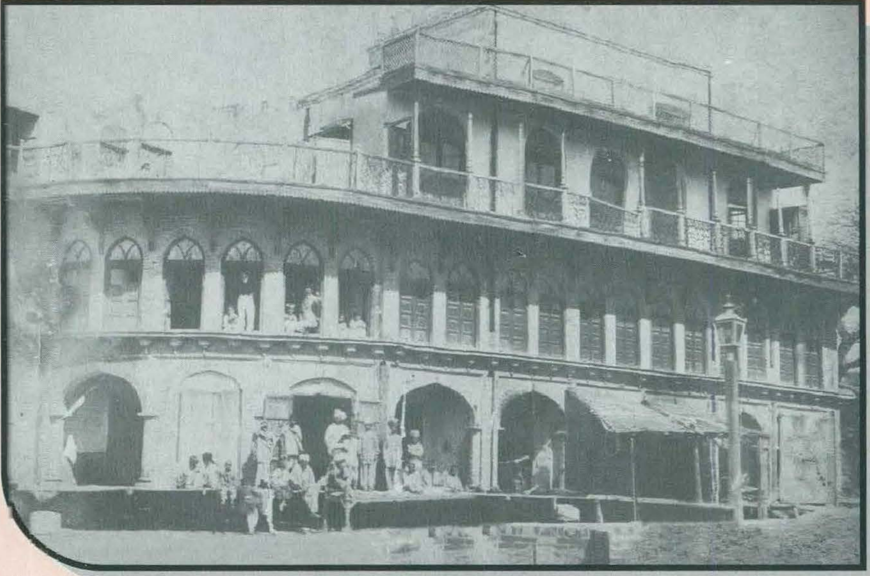
ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی کا مقامی نقشہ



خاکہ نمبر 2

ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی کا مقامی نقشہ





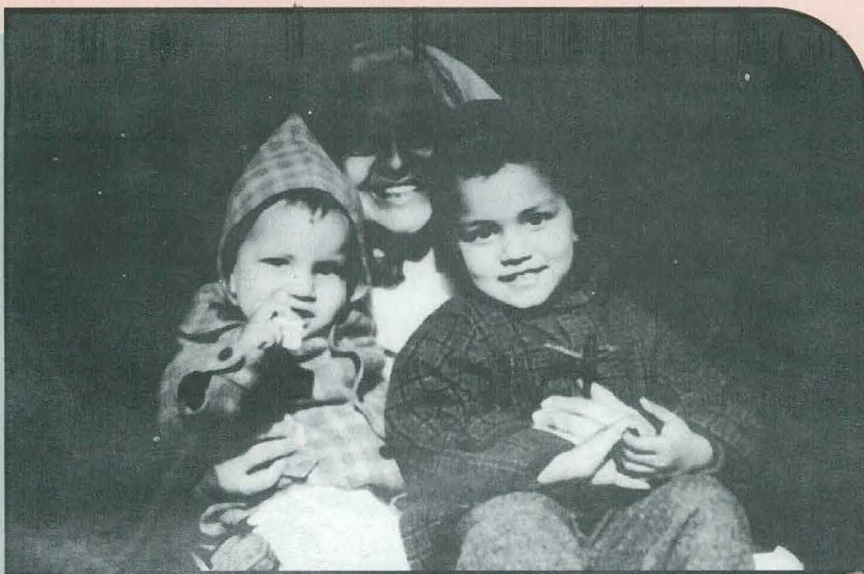
آبائی گھر فضل منزل سیالکوٹ



خاندان کے بزرگوں اور دیگر اہل خانہ کی ایک یادگار تصویر



والدین اور بھائی



والدہ، افضل اور احمد



جوائنٹ سروسز پری کیڈٹ ٹریننگ سکول دی پاسنگ آوٹ کی ایک جھلک



جوائنٹ سروسز پری کیڈٹ ٹریننگ سکول دی کرکٹ ٹیم



بطور کیڈٹ پی۔ایم۔اے کا کمال سنیئر ٹرم



گورنر جنرل پاکستان غلام محمد سے اپنی پاسنگ آؤٹ کے موقع پر سی این سی ٹرافی لیتے ہوئے



خوشگوار ماحول پی۔ایم۔اے کاکول انٹرٹرم



پلوٹون کمانڈر انسٹرکٹر پی۔ایم۔اے میں اپنے کیڈٹس کے ساتھ



انفنٹری سکول فورٹ بینیگ جارجیا امریکہ میں اپنے رُفقائے کار کے ساتھ



کرنل ادروس اور 14 ایف ایف کے ساتھی بھارتی ٹینک پر قابض



ناردرن سکاؤٹس کی یادیں



گلگت میں ناردرن سکاؤٹس کی ٹیم کی طرف سے پولو کھیلتے ہوئے سفید ہیٹ میں



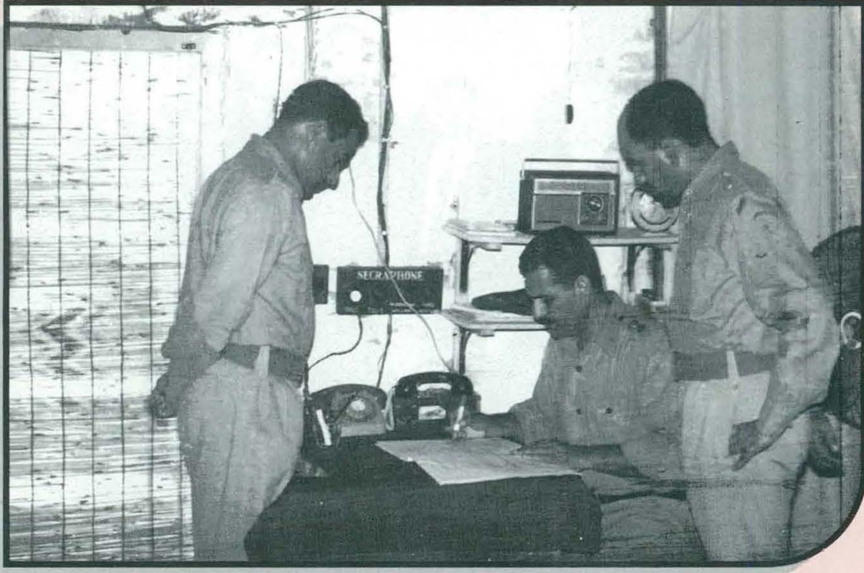
کرنل (ر) محمد شفیع درانی کے ساتھ پلاٹون کمانڈرز انسٹرکٹرز پی۔ایم۔اے کی ایک یادگار تصویر



سٹاف کالج کوئٹہ کرنل وجاہت (بعدازاں میجر جنرل) کے ساتھ



میجر جنرل (ر) نصیر احمد چوہدری کے ہمراہ 14FF کے اعزاز میں بڑے کھانے کے موقع پر



میجر رحمان (بعدازاں کرنل) اور میجر نعمت (بعدازاں بریگیڈئر) کے ساتھ صادق آباد کے ایک بنکر میں



جنرل عظمت بخش اعوان کے ساتھ صحرا میں پاکستان بھارت 1971ء کی جنگ کے بعد



نیشنل ڈیفنس کالج کے وفد کے ساتھ دیوارِ چین پر



نیشنل ڈیفنس کالج میں گریجویشن کی تقریب کے موقع پر میجر جنرل نصیر احمد چوہدری کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے



بحیثیت پریڈ کمانڈر پاکستان ڈے پریڈ صدر جنرل محمد ضیاالحق کے ہمراہ۔ 23 مارچ 1979ء



لیفٹیننٹ جنرل فیض علی چشتی سے تمغہء بسالت حاصل کرتے ہوئے



پرووسٹ مارشل کی حیثیت سے غیر ملکی ملٹری پولیس افسران کے ساتھ



شمالی کوریا کے نائب صدر کے ساتھ ملٹری سیکرٹری کی حیثیت سے



111 بریگیڈ کمانڈر یونٹ انسپکشن کرتے میجر محسن کے ساتھ (بعد ازاں میجر جنرل)



میس میں ایم پی افسران کے ساتھ



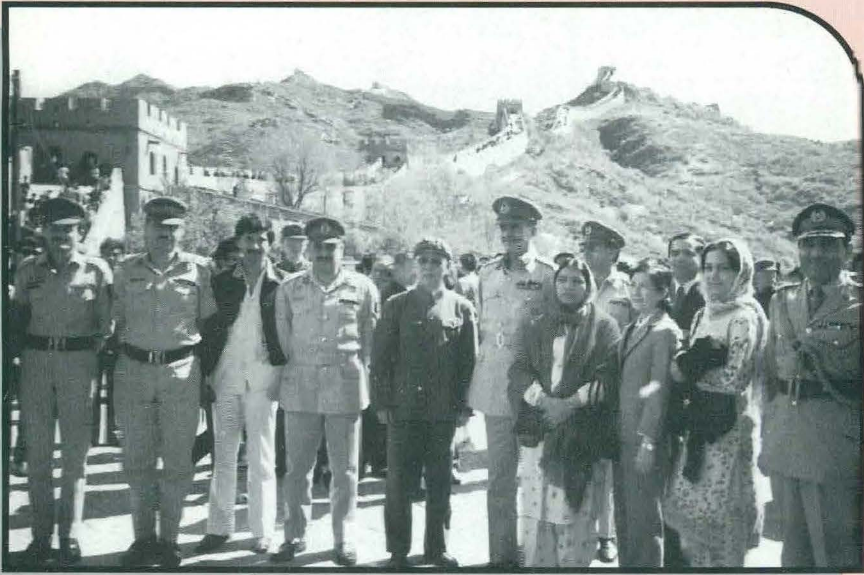
جنرل اختر عبدالرحمان شہید ایم پی سکول ڈیرہ اسمٰعیل خان انعامات دیتے ہوئے



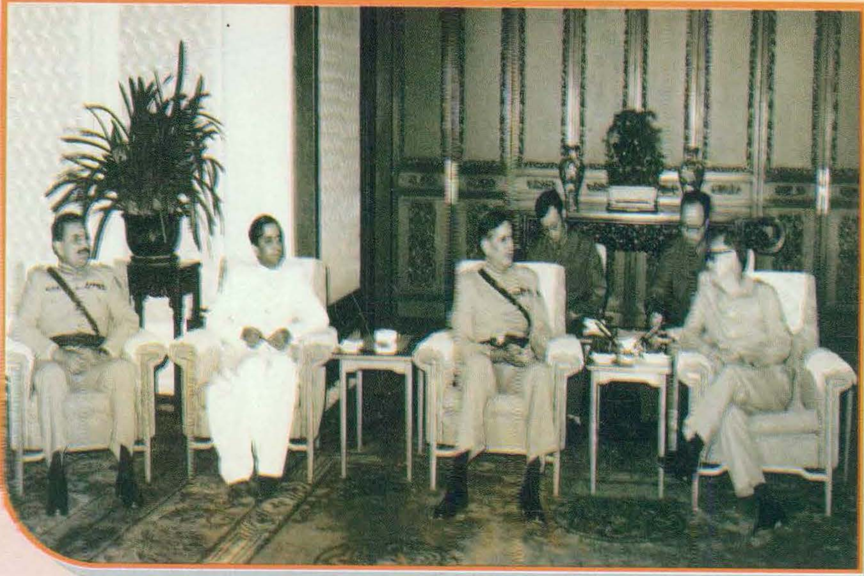
بحیثیت کمانڈر 7 ڈیژن کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل غلام حسن کے ساتھ، لیفٹیننٹ کرنل نسیم رانا
(بعد ازاں لیفٹیننٹ جنرل) کی یونٹ کے دورے کے موقع پر



جنرل سوار خان کے ساتھ چین کے دورہ پر



جنرل سوار خان کے ساتھ دیوارِ چین پر



جنرل سوار خان کے ہمراہ چینی وزیر اعظم کے ساتھ مصروفِ گفتگو



چین کے وزیر اعظم کو خدا حافظ کہتے ہوئے



شمالی کوریا کے سربراہ کمِلسن کے ساتھ



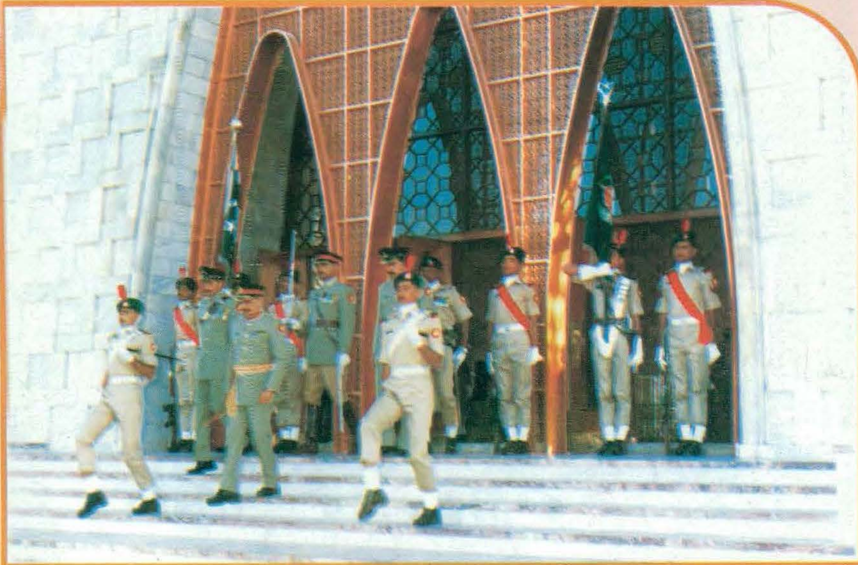
کمانڈنٹ پاکستان ملٹری کاکول کی حیثیت سے صدر پاکستان کے ساتھ، صدر پریڈ کا معائنہ کر رہے ہیں



پاکستان ملٹری اکیڈمی کی کانووکیشن کے موقع پر



پاکستان ملٹری اکیڈمی کے پہلے کمانڈنٹ بریگیڈیر انگل اور ان کی اہلیہ کے ساتھ کمانڈنٹ ہاؤس کاکول میں



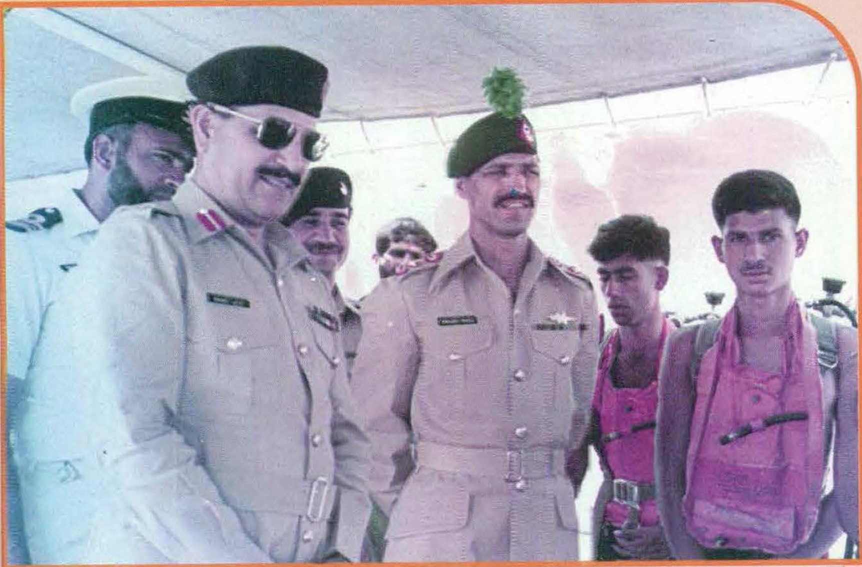
قائداعظم کے یوم پیدائش پر ان کے مزار پر کیڈٹ کی گارڈ ماؤنٹنگ کی تقریب کا ایک منظر



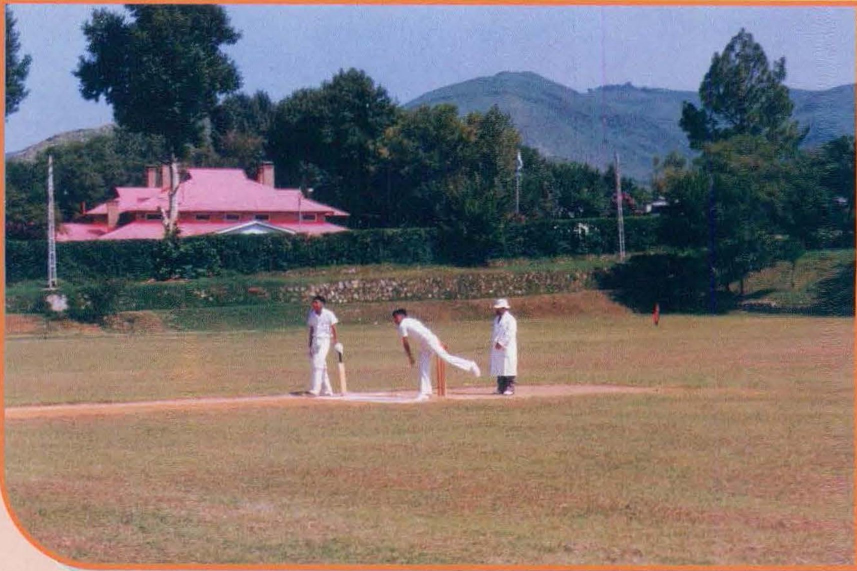
جنرل ضیاء الحق سے ہلال امتیاز کا اعزاز حاصل کرتے ہوئے



گنی (افریقہ) میں ایئر مارشل قریشی اور ایڈمرل عالم کے ساتھ



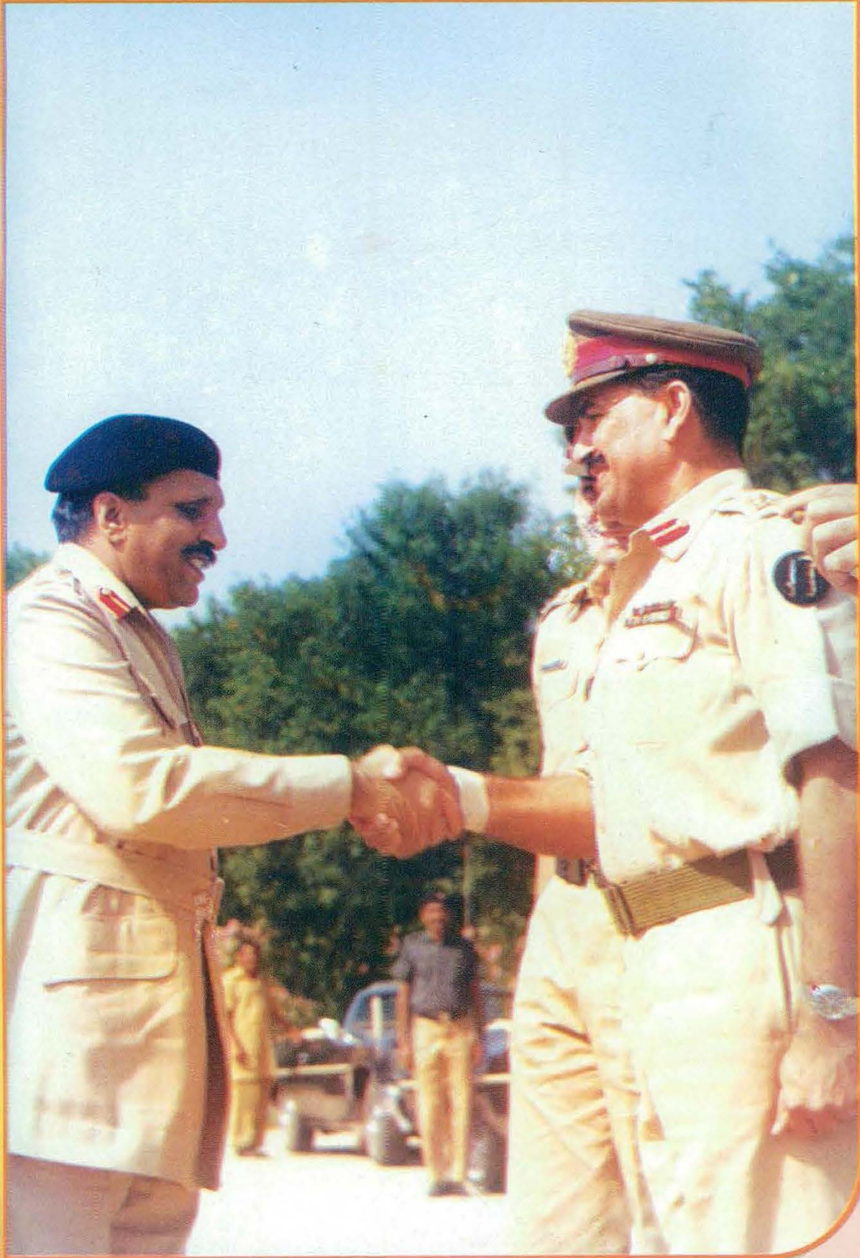
پاکستان نیوی کے ساتھ کراچی میں ٹریننگ کے دوران



کاکول کرکٹ کھیلتے ہوئے، پس منظر میں کمانڈنٹ ہاؤس نظر آرہا ہے



جنرل ضیاء الحق کے ساتھ بریگیڈیر امامی (بعد ازاں میجر جنرل) اور انکے اہل خانہ



جنرل ضیاء الحق کھاریاں کے دورے پر



کھاریاں جے او سی ہاؤس میں ایک یادگار تصویر



جنرل جیلانی کیساتھ بطور ڈی ایم ایل اے سرگودھا ڈویژن



ڈائریکٹر جنرل نیشنل گارڈ کی حیثیت سے جانباز فورس کی تربیتی مشق کا معائنہ کرتے ہوئے



ڈائریکٹر جنرل نیشنل گارڈز کراچی دورہ کرتے ہوئے



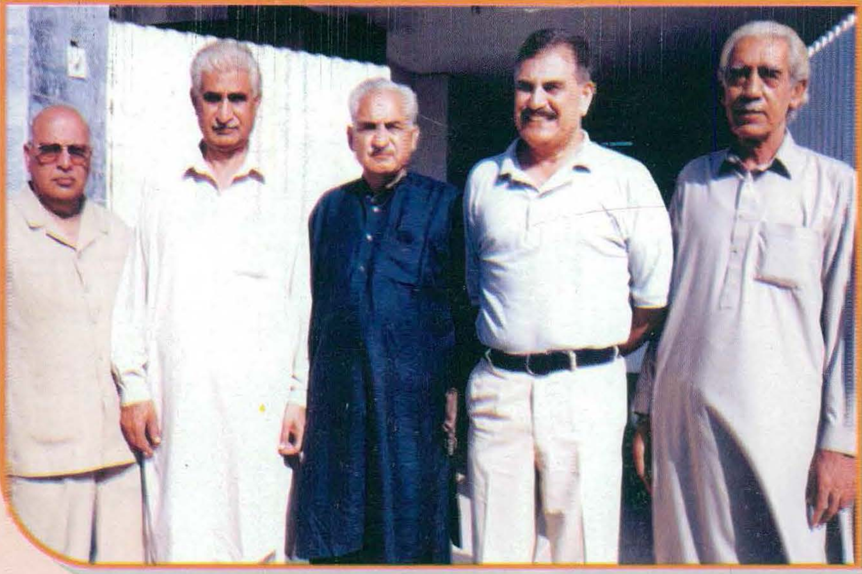
بحیثیت کرنل آف دی بٹالین (10 فرنٹیر فورس رجمنٹ) کی تقریب کے موقع پر



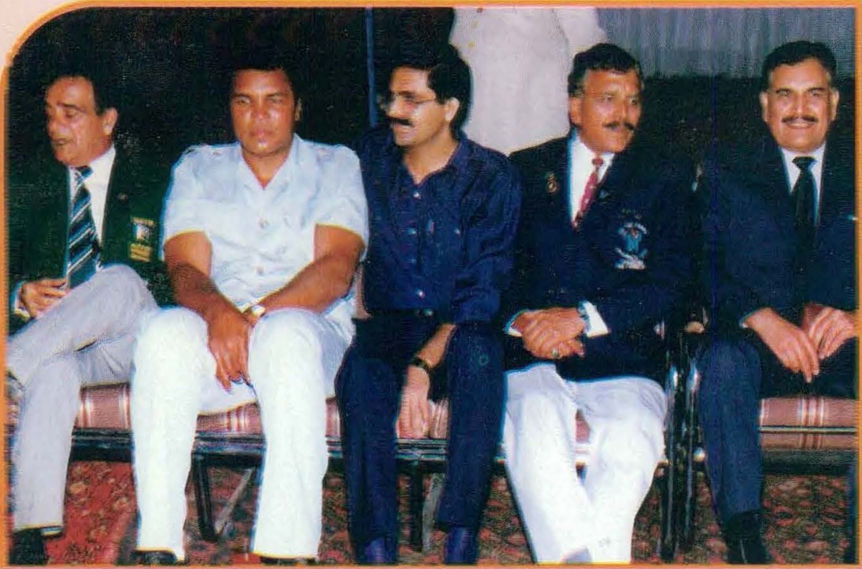
10 ایف ایف میس میں کرنل خداداد کے ساتھ



بیافو گیانگ گلیشیر (سکردو) آٹو وائچ کیساتھ



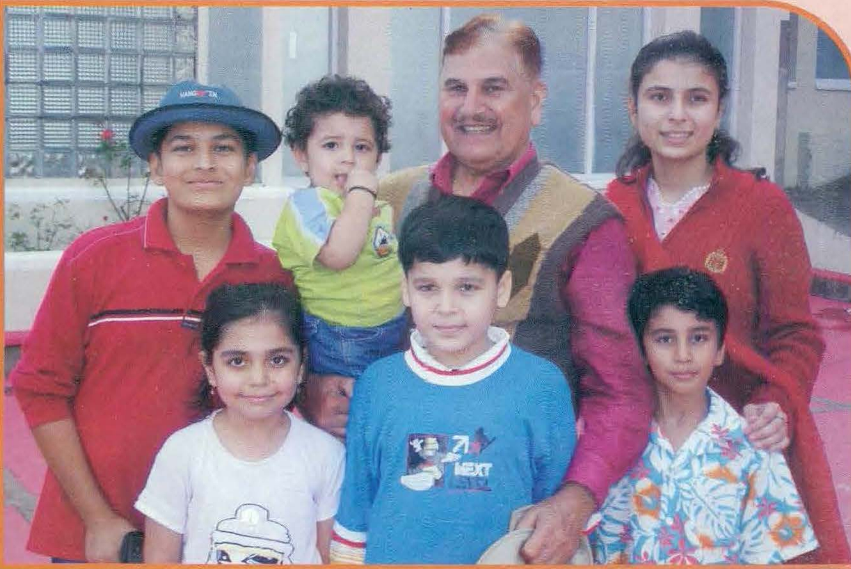
مرے کالج سیالکوٹ کے پرانے ہم جماعت ساتھی دائیں سے بائیں بشیر، مصنف، غوری، حشمت اور وارث



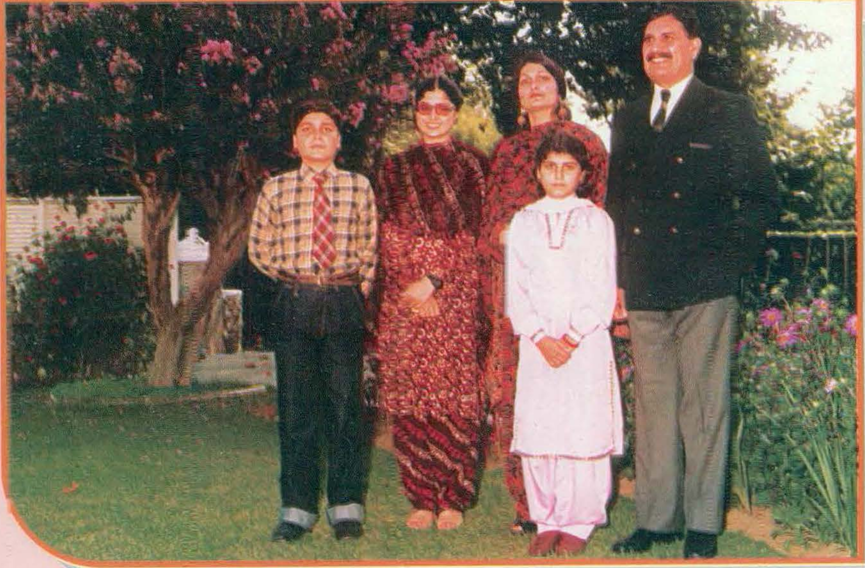
ورلڈ چمپین محمد علی باکسر



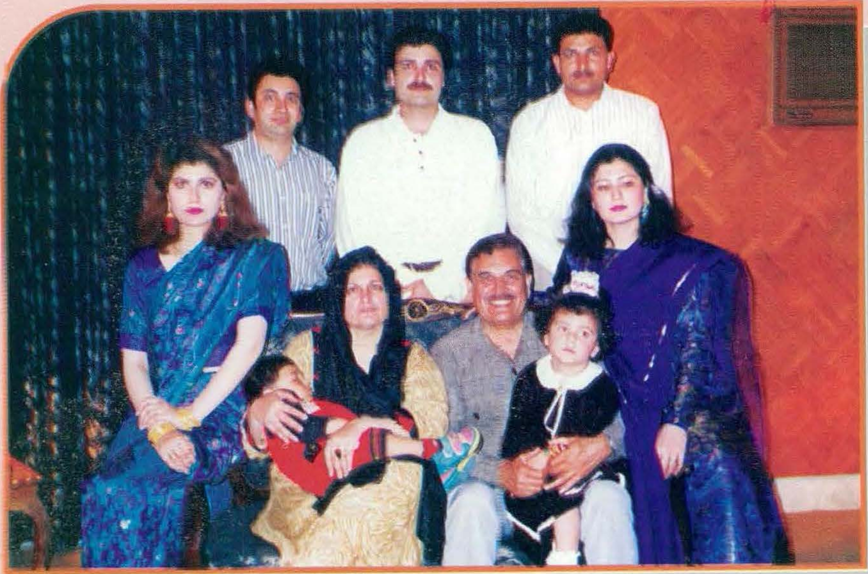
ڈاکٹر مصطفیٰ اور اہل خانہ کی یادگار تصویر



اپنے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کے ساتھ



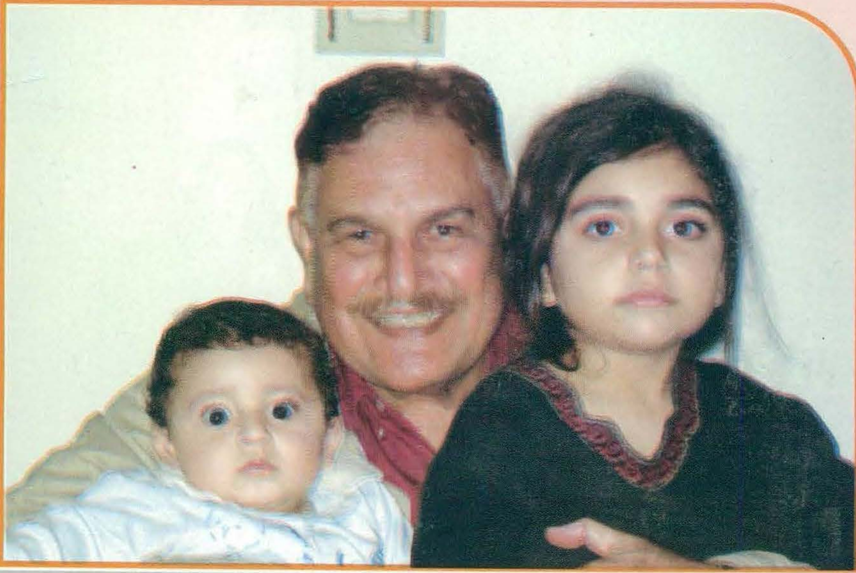
اپنے اہل خانہ کے درمیان



اپنے اہل خانہ کے درمیان



اپنے بچوں، پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کے ساتھ



اپنے پوتے اور پوتی کے ساتھ

کچھ راحت بیتی کے بارے میں

میجر جنرل (ر) راحت لطیف کی خودنوشت پاکستان سے پرجوش محبت کرنے والے ایک سچے سپاہی کی داستان حیات ہے۔ اس سوانح کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ طولانی حاشیہ آرائی۔ خیالی محفل بازی۔ طرز بیان کی جادوگری۔ محیر العقول افسانوی مہمات اور جوانی کی لذیذ حکایات سے پاک ہونے کے باوجود، قاری کے دل پر براہ راست اثر کرتی ہے۔ راحت لطیف کا سپاہیانہ انداز تکلم پڑھنے والوں کو کھرے اور بے لاگ حقائق سے آشنا کرتا ہے اور قاری، وطن عزیز کے شمالی علاقہ جات کی سنگلاخ چٹانوں پنجاب کے سرحدی میدانوں، سندھ کے ریگستانوں، بلوچستان کے پہاڑوں اور مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) کی دریائی موجوں پر تیرتے ہوئے انسانی جذبات کی تھرتھراہٹ کو سوانح نگار کے ساتھ ساتھ اپنے دل میں بھی محسوس کرتا چلا جاتا ہے۔ زندگی کے سخت موسموں سے نبرد آزمائی اس خودنوشت میں یادوں کے کنول کھلاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ پاکستان کے سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے ایام اسیری، پھانسی اور آخری لمحات کے حقیقی مناظر اس خودنوشت کا ایک اہم حصہ ہیں جنہیں اپنی تاریخی حیثیت کے پیش نظر، کسی رنگ آمیزی کے بغیر ضبط تحریر میں لایا گیا ہے یہ کتاب ثابت کرتی ہے کہ بلند ترین پہاڑی چوٹیوں پر سرکش گھوڑوں کو سرپٹ دوڑانے والا ایک جیالا سپاہی میدانِ خودنوشت میں اپنا قلم بھی اس انداز سے دوڑا سکتا ہے کہ نجی زندگی کے جزیرے اور عملی زندگی کے دھارے یکجان ہوتے ہوئے دکھائی دینے لگیں۔

ظفر علی راجا



ساگر پبلشرز

فرسٹ فلور 30 الحمد مارکیٹ غزنی سٹریٹ 40 اردو بازار لاہور۔ Ph:042-37230423